معظمؓ علی

نسیم حجازی

معظّم علی

نسیم حجازی



فرحین پبلیشنگ کمپنی ج F کھجوری روڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

پہلا باب

معظم علی مُرشدآباد کے قید خانے کی ایک کوٹھری میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے ماضی کی داستان اُن اُمیدوں، آرزوؤں، حوصلوں اور ولولوں کی داستان تھی جو پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کی شکست کے ساتھ دم توڑ چکے تھے۔ زندگی کے دامن میں اب اُس کے لیے مہیب تاریکیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

وہ پہلے بھی مُرشدآباد سے کوسوں دُور ایک قید خانے میں رہ چکا تھا۔ لیکن وہاں اپنی تاریک کوٹھری میں وہ اس مُرشدآباد کا تصور کر سکتا تھا جس کا ہر گوشہ قوسِ قزح کی انگینیوں سے لبریز تھا۔ حال کی تلخیاں اُسے مستقبل کی مسرتوں کا پیغام دے سکتی تھیں۔ اسیری کی رات کے تاریک پردے اُٹھا کر وہ صبحِ آزادی کے آفتاب کی سُنہری کرنیں دیکھ سکتا تھا۔ اڑلیسہ کی سرحد کے پار وہ قید خانہ منزل کے راستے کی ایک منزل تھی اور اسے یقین تھا کہ کسی دن وہ اس منزل سے گزر کر وہ پھر اس دنیا میں پہنچ جائے گا، جہاں زندگی کی مسکراہٹیں اس کے استقبال کے لیے موجود ہیں۔ لیکن مرشدآباد میں اس کی اسیری کا زمانہ ان ستاروں کی جھلملاہٹ سے محروم تھا جو تاریک رات کے مسافروں کو صبح کا پیغام دیتے ہیں۔

کوٹھری کی دیوار میں چھت کے قریب ایک چھوٹا سا روزن تھا اور قید کے ابتدائی ایام میں اس روزن سے سورج کی شعاعیں اسے دنیا کا پیغام دیا کرتی تھیں جہاں ابھی تک اُمید کا ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ وہ تصور میں اپنے ماحول کی بھیانک تاریکیوں سے نکل کر اس مکان

کی چار دیواری میں جا پہنچتا جو اُس کی موہوم اُمیدوں کی آخری جائے پناہ تھا۔ وہ اُن کمروں کا طواف کرتا جہاں کبھی مسرت کے قہقہے گونجتے تھے۔ اچانک فرحت مکان کے کسی گوشے سے نمودار ہوتی اور وہ کہتا "فرحت! فرحت!! میں آگیا ہوں۔ میں زندہ ہوں، میں تمھارے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ قید خانے کی تنہائیوں میں تم ہر وقت میرے ساتھ تھیں۔ میرے سپنے اور آرزوئیں سب تمھارے لیے تھیں۔ مجھے ڈر تھا کہ تم کہیں جا چکی ہو اور میں تمام عمر تمھیں تلاش کرتا رہوں گا۔ کاش! قید خانے میں مجھے تمھارا کوئی پیغام مل سکتا۔ فرحت! اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہم مرشد آباد سے کہیں دُور نکل جائیں گے اور اپنے لیے ایک نئی دنیا آباد کریں گے۔ تمھارے ساتھ رہ کر میں کبھی یہ محسوس نہیں کروں گا کہ میں کاروانِ حیات کا ایک لٹا ہوا مسافر ہوں"۔

پھر اس کی کوٹھڑی میں اور قیدی آئے اور انھوں نے بتایا کہ فرحت اور اس کے والدین تمھاری گرفتاری کے اگلے دن مرشد آباد سے ہجرت کر گئے تھے۔

اس کے بعد معظم علی کو مستقبل کے متعلق موہوم اُمیدیں مایوسیوں سے زیادہ کرب انگیز محسوس ہوتی تھیں۔ وہ فرحت کو ان دیکھے صحراؤں، جنگلوں اور پہاڑوں میں تلاش کیا کرتا تھا۔ کبھی وہ اسے کسی دور افتادہ بستی کی جھونپڑی میں دیکھتا اور کبھی وہ اسے کسی پُر رونق شہر کے محل میں نظر آتی تھی۔ پھر اُس شہاب ثاقب کی طرح جو ایک ثانیہ کے لیے تاریک فضا میں نور کے خزانے بکھیرنے کے بعد روپوش ہو جاتا ہے۔ فرحت کی دلکش تصویریں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں اور وہ حال اور مستقبل کے بھیانک خلا سے نکل کر ماضی کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کرتا۔ کبھی تصور اسے اس مکان میں لے جاتا جہاں اس نے زندگی کی ابتدائی مسکراہٹیں دیکھی تھیں۔ کبھی وہ اس محلّے کی گلیوں میں گھومتا جہاں وہ اپنے بچپن کے دوستوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ سنِ شعور سے لے کر قید خانے میں پہنچنے تک کی زندگی اسے ایک خواب معلوم ہوتی تھی ــــ ایک ایسا خواب جو دلکش بھی تھا اور بھیانک بھی۔

معظم علی اُس قوم کا فرد تھا جو صدیوں تک اس ملک میں اپنی سطوت و اقبال کے پرچم لہرانے کے بعد زوال کے آخری مرحلوں میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے اس وقت آنکھ کھولی تھی جب مغلوں کی عظیم الشان سلطنت لامرکزیت اور انتشار کی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد چند سال کے اندر اندر ہندوستان کا وہ دفاعی حصار پیوندِ زمین ہو چکا تھا جسے تیمور کے جانشینوں نے تعمیر کیا تھا۔ دلی کے تخت پر قبضہ کرنے کے لیے حریص قسمت آزماؤں کے لشکر موجود تھے۔ ملک کی سیاست ہر ضابطۂ اخلاق سے آزاد تھی۔ نام نہاد بادشاہ اپنے وزیروں، اہلکاروں اور بعض اوقات خواجہ سراؤں کے ہاتھ میں شطرنج کے مہرے تھے۔ طالع آزماؤں کی تلواریں کبھی تاج پہننے والوں کے سر قلم کرتی تھیں اور کبھی تاج پہنانے والوں کے خون میں نہاتی تھیں۔ اقتدار کی مسند تک پہنچنے کے لیے ایک قسمت آزما کی لاش دوسرے قسمت آزما کے لیے زینے کا کام دیتی تھی، عہد شکنی، عیاری، فریب، سازش اور قتل، لال قلعے کی دیواروں میں جنم لینے والی داستانوں کے مستقل عنوان بن چکے تھے۔ لال قلعہ سے باہر ہر صوبیدار اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے کی فکر میں تھا۔

مرکز اور صوبوں میں علاقائی سیاست کا یہ دَور المناک بھی تھا اور دلچسپ بھی۔ بادشاہ سلامت کبھی کسی امیر کی تلوار سے مرعوب ہو کر اور کبھی اس کی خوشامد سے خوش ہو کر اسے کسی علاقے کی صوبیداری کی سند عطا فرماتے۔ وہ صوبائی دارالحکومت کی طرف روانہ ہوتا تو اسے راستے میں یہ خبر ملتی کہ شہنشاہِ والا تبار نے اپنا پہلا حکم نامہ منسوخ فرما کر کسی اور کو صوبیداری کی سند عطا کر دی ہے اور وہ بھی اپنے لاؤ لشکر سمیت صوبائی دارالحکومت کا رُخ کر رہا ہے۔

پھر صوبے کے اُمراء کا ایک گروہ پہلے امیدوار کے ساتھ اور ایک دوسرا گروہ دوسرے امیدوار کے ساتھ مل جاتا۔ دونوں میں جنگ ہوتی ــــ ہارنے والا اُمیدوار اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا اور اس کا خون جیتنے والے کی سند پر مُہر تصدیق ثبت کر دیتا۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ صوبیداری کا ایک اُمیدوار شاہی فرمان کے عوض ایک معقول رقم پیش کرتا اور دوسرا امیدوار اس سے زیادہ

رقم دے کر اپنے لیے ایک اور فرمان حاصل کر لیتا۔

۱۷۲۵ء میں سلطنتِ دہلی کے ایک ہوشیار وزیر نظام الملک آصف جاہ نے اپنی شاطرانہ چالوں کی بدولت دکن میں مضبوطی سے قدم جما لیے۔ وہ بظاہر دلی کے نام نہاد بادشاہ کا صوبیدار تھا لیکن عملاً دکن کے سیاہ و سفید کا مالک بن چکا تھا۔ ۱۷۴۸ء میں نظام الملک کی وفات کے بعد اس کے بیٹے ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے تھے۔

نظام الملک آصف جاہ اوّل کے اسلاف، سلطنت خوارزم پر تاتاریوں کے حملوں کے زمانہ میں ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ اسی طرح ایک اور خاندان ترکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان میں آباد ہوا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں اسی خاندان کا ایک فرد محمد جانِ جہاں انورالدین حکومت کا ادنیٰ ملازم تھا۔ لیکن اورنگ زیب کی موت کے بعد جب ہر قسمت آزما کے لیے ترقی کے راستے کھلے تھے۔ یہی جانِ جہاں، خانِ جہاں بن گیا اور کرناٹک کی نظامت پر فائز ہوا۔ ۱۷۴۹ء میں انورالدین خانِ جہاں نے وفات پائی اور کرناٹک کی حکومت اُس کے بیٹے محمد علی والا جاہ کے ہاتھ میں آئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بنگال اور جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں پر فرنگی تاجروں کی بستیاں مسلحہ خانوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ ایک طویل کشمکش کے بعد انگریز اور فرانسیسی تاجر اپنے پرتگالی اور ولندیزی حریفوں کو مات دے چکے تھے اور اب وہ ہندوستان کی تجارتی منڈیاں تلاش کرنے کی بجائے اس ملک کے سیاسی اقتدار کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ انھوں نے ملک کے اندرونی خلفشار سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ جب کسی صوبہ میں حکومت کے دو دعوے داروں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی تو ایک فریق انگریزوں کی حمایت حاصل کرتا اور دوسرا فریق اپنا مستقبل فرانسیسیوں کے ساتھ وابستہ کر دیتا۔

دکن میں نظام الملک آصف جاہ اوّل کے جانشین کبھی انگریزوں اور کبھی فرانسیسیوں کے ہاتھ میں کھیلتے رہے۔ کرناٹک میں محمد علی والا جاہ انگریزوں کی بساطِ سیاست کا ایک مہرہ تھا

اور فرانسیسی، کرناٹک کی حکومت کے ایک اور دعوے دار چندا صاحب کے طرف دار بن گئے تھے۔ چندا صاحب نے کرناٹک کے بیشتر حصوں پر قبضہ کر کے محمد علی کو ترچنا پلی میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ چند سال تک محمد علی ایک ایسا حکمران تھا۔ جس کے قبضے میں کوئی ملک نہ تھا اور جس کی رعایا زیادہ تر اپنے خاندان کے افراد، چند نوکروں، جی حضوریوں اور خوشامدیوں تک محدود تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ انگریزوں کی سنگینوں کے پہرے میں باقاعدہ دربار لگاتا تھا۔ اس کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے تھے اور اسے نواب والا جاہ، امیر الہند، عمدۃ الملک، آصف الدولہ محمد علی خاں، بہادر ظفر جنگ، سپہ سالار، صاحب السیف والقلم، مدبر امرائے عالم، فرزندِ عزیز از جان کے القاب و خطابات سے پکارا جاتا تھا۔ جب انگریز، فرانسیسیوں سے کرناٹک کا کوئی علاقہ فتح کرتے تو یہ سپہ سالار اپنی حرم سرا میں جشن مناتا اور جب انھیں اپنی افواج کو تنخواہ دینے کے لیے روپے کی ضرورت ہوتی تو اس مدبر امرائے عالم کو مفلوک الحال عوام سے ٹیکس وصول کرنے کے کام پر لگا دیا جاتا۔

پہلے چندا صاحب نے فرانسیسیوں کی خدمات کے صلے میں کرناٹک کے بعض علاقے ان کے حوالے کر دیئے۔ پھر جب محمد علی کی باری آئی تو اس نے انگریزوں کو عملاً کرناٹک کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔ بظاہر کرناٹک محمد علی کی شکارگاہ تھا لیکن شکار کھیلنے والے انگریز تھے۔

دلی کے تخت کے ساتھ نوابانِ اودھ کا تعلق بھی برائے نام تھا۔ ۱۷۴۰ء میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کی حکومت پر علی وردی خاں نے قبضہ جما لیا۔ اس زمانے میں جنوبی ہند کی طرح بنگال میں بھی انگریز تاجر اپنے قدم جما چکے تھے۔ لیکن علی وردی خاں ایک بیدار مغز اور دور اندیش حکمران تھا۔ اور اس نے فرنگی تاجروں کو جو مراعات دیں ان کی ایک اہم شرط یہ تھی کہ وہ اپنی تجارتی بستیوں میں قلعے یا دفاعی چوکیاں تعمیر نہیں کریں گے۔

اس زمانے میں ہندوستان کی ایک اور بڑی طاقت مرہٹے تھے جو مغلیہ سلطنت کے کھنڈروں پر اپنی سلطنت کی بنیادیں استوار کرنے کی فکر میں تھے۔

معظم علی نے اس وقت آنکھ کھولی تھی جب ہندوستان مرہٹہ لٹیروں کے لیے ایک وسیع شکارگاہ بن چکا تھا۔ اس کا باپ محمود علی، علی وردی خان کی محافظ فوج میں پانچ سو سواروں کا سالار تھا۔ مُرشد آباد کے شہر سے باہر ایک نئے محلے میں محمود علی کے مکان کے سامنے ایک بہت بڑے جاگیردار مرزا حسین بیگ کا قلعہ نما محل تھا۔ جس کی چار دیواری کے اندر رہائشی مکان کے علاوہ گھوڑوں کے اصطبل اور نوکروں اور پہرے داروں کے کمرے تھے۔ معظم علی کا باپ ایک فوجی افسر ہونے کے باوجود مرزا حسین بیگ کے مقابلے میں ایک معمولی حیثیت کا آدمی تھا۔ ابتدا میں ان کے تعلقات محض رسمی تھے۔ لیکن ان کے بیٹوں کی دوستی آہستہ آہستہ انھیں بھی ایک دوسرے کے قریب لے آئی۔ حسین بیگ کا چھوٹا بیٹا افضل بیگ، معظم علی سے دو سال بڑا تھا۔ اور بڑا جس کا نام آصف بیگ تھا، معظم علی کے بڑے بھائی یوسف علی کا ہم عمر تھا۔ بچپن میں یوسف اور معظم محلے کے دوسرے بچوں کی طرح حویلی میں چلے جاتے اور دن بھر آصف بیگ اور افضل کے ساتھ کھیلتے رہتے۔

حویلی میں ایک سُنہری بالوں والی کم سن لڑکی بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی، اور معظم علی کو اس کے معصوم قہقہے بہت پسند تھے۔ یہ لڑکی افضل کی چھوٹی بہن تھی اور اس کا نام فرحت تھا۔

محمود علی اور اس کی بیوی کو حسین بیگ کے خاندان کے مقابلے میں اپنی کمتری کا احساس تھا تاہم انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ ان کے بچے کسی کے مقابلے میں حقیر سمجھے جائیں۔ چنانچہ ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی کہ ان کے بچوں کا لباس اگر حسین بیگ کے بچوں کی طرح قیمتی نہ ہو تو کم از کم صاف ستھرا ضرور ہو۔ پھر جب آصف اور افضل مُرشد آباد کے بہترین مکتب میں داخل ہوئے تو محمود علی نے یوسف اور معظم کو بھی اسی مکتب میں داخل کر دیا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ افضل اور آصف بگھی پر سوار ہو کر جاتے تھے اور یوسف اور معظم کو پیدل جانا پڑتا تھا۔ پھر جب یہ بچے آپس میں بہت

زیادہ گھل مل گئے تو آصف اور افضل اصرار کر کے معظم اور اس کے بھائی کو اپنی بگھی پر بٹھا لیتے۔ گھر پر حسین بیگ کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک معقول تنخواہ پانے والا اتالیق مقرر تھا اور معظم اور یوسف کا باپ فرصت کے اوقات میں خود ہی انھیں پڑھا دیا کرتا تھا۔

امراء کے بچوں کے لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ فوجی تربیت بھی ضروری خیال کی جاتی تھی۔ چنانچہ جب آصف اور افضل ذرا بڑے ہوئے تو حسین بیگ نے ان کی فوجی تربیت کے لیے ایک تجربہ کار فوجی افسر کی خدمات حاصل کرلیں۔ وہ انھیں شہسواری، تیراندازی اور نیزہ بازی سکھایا کرتا تھا۔ لیکن محمود علی نے اس کام کے لیے کسی اور کی خدمات کی ضرورت محسوس نہ کی۔ مُرشد آباد میں بہت کم لوگ ایسے تھے جو گھوڑے کی سواری اور تلوار، نیزہ اور بندوق کے کھیلوں میں اس کی برابری کا دعویٰ کر سکتے تھے۔

اس کے گھر میں ایرانی قالین نہ تھے لیکن اس کے اصطبل میں عربی نسل کے تین چار گھوڑے ضرور موجود رہتے تھے۔ سونے چاندی کے برتنوں کی بجائے وہ اپنے ذاتی اسلحہ خانے کی بہترین تلواروں اور بندوقوں پر فخر کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی مصروف زندگی سے بچوں کے لیے تھوڑا بہت وقت نکالتا اور انھیں گھوڑوں پر سوار کرا کے شہر سے باہر کسی کھلے میدان میں لے جاتا۔



مرزا حسین بیگ کے کتب خانہ میں سینکڑوں کتابیں تھیں اور یہ کتابیں اس نے پڑھنے کا شوق پورا کرنے سے زیادہ اپنے دوستوں کو دکھانے کے لیے جمع کر رکھی تھیں۔ معظم کو پڑھنے کا شوق تھا اور وہ کبھی کبھی افضل بیگ سے کتابیں مانگ لایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ اُس کے گھر گیا تو افضل اور آصف دیوان خانے کے باہر ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھے اپنے عمر رسیدہ اتالیق سے سبق لے رہے تھے۔ ان کی توجہ کتابوں کی طرف تھی۔ معظم علی کچھ دیر تذبذب کی حالت میں چند قدم دور کھڑا رہا۔ اچانک اتالیق نے اس کی طرف دیکھا اور کہا "بھئی تم کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ کھیلنے کا وقت نہیں یہ پڑھ رہے ہیں۔ بھاگ جاؤ!"

یہ بات معظم علی کے لیے غیر متوقع تھی اور وہ چند ثانیے یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ افضل بیگ نے اس کی طرف دیکھا اور اپنے اتالیق سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یہ کتابیں لینے آیا ہے مجھے اجازت دیجیے۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

اتالیق جس قدر کھیلنے والے لڑکوں کو ناپسند کرتا تھا اسی قدر اسے پڑھنے والوں سے دلچسپی تھی۔ اُس نے دوبارہ معظم کی طرف دیکھا اور افضل سے کہا۔ "اچھا جاؤ لیکن جلدی آنا"!

افضل بیگ اُٹھ کر معظم علی کے ساتھ چل دیا۔ دیوان خانے کے چند کمروں کے طویل برآمدے سے گزرنے کے بعد دو کونے کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے جس کا ایک دروازہ رہائشی مکان کے صحن کی طرف کھلتا تھا۔ کمرے میں ساگوان کی خوبصورت الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ افضل بیگ نے کہا۔ "تم اطمینان سے اپنے لیے کتابیں نکال لو میں استاد کے پاس جاتا ہوں۔"

افضل بیگ بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ معظم علی اس کمرے میں کئی بار پہلے بھی آچکا تھا۔ اسے اپنے مطلب کی کتابیں نکالنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ کوئی پندرہ منٹ بعد وہ دو عربی اور تین فارسی کی کتابیں لے کر باہر چل دیا۔ واپسی پر وہ افضل اور آصف کے قریب سے گزرا تو اتالیق نے اسے دیکھتے ہی آواز دی۔ "میاں صاحبزادے ذرا اِدھر آؤ"! معظم جھجکتا ہوا عمر رسیدہ اتالیق کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اتالیق نے کہا۔ "دکھاؤ کون سی کتابیں پڑھتے ہو تم"؟ معظم نے کتابیں آگے بڑھا دیں۔ اتالیق نے یکے بعد دیگرے تمام کتابیں کھول کر دیکھیں اور قدرے حیران ہو کر کہا۔ "تم یہ کتابیں پڑھ سکتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"میرا مطلب ہے کہ تم انھیں سمجھ بھی سکتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"اچھا ہم تمھارا امتحان لیتے ہیں۔" یہ کہہ کر اتالیق نے عربی کی ایک کتاب اُٹھا کر کھولی اور

معظم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اچھا یہ پڑھ کر سناؤ"!

معظم نے اطمینان سے چند سطریں پڑھ کر سنا دیں تو اتالیق نے ترجمہ کرنے کے لیے کہا۔ معظم نے کسی جھجک کے بغیر ترجمہ سنا دیا تو اتالیق نے سوال کیا۔ "تم کہاں تعلیم پاتے ہو؟"

"جی میں افضل کے ساتھ پڑھتا ہوں۔"

"تم کہاں رہتے ہو؟"

"جی اسی محلہ میں اس مکان کے بالکل سامنے۔"

"تم . . . . تم محمود علی خان کے بیٹے ہو؟"

"جی ہاں۔"

اتالیق کچھ کہنا چاہتا تھا کہ پیچھے سے کسی کی آواز سنائی دی۔ "یہ کون ہے"؟

اتالیق نے مڑ کر دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ تشریف رکھیے"! مرزا حسین بیگ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ شاید محمود علی کا لڑکا ہے؟"

"جی ہاں میں ابھی اس سے متعارف ہوا ہوں بہت ہونہار بچہ ہے۔ دیکھیے یہ آپ کے کتب خانہ سے صحیح فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ یہ کتابیں اس عمر کے بچوں کے لیے بہت مشکل ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں صاحبزادوں کے ساتھ اسے بھی پڑھا دیا کروں؟"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ غریب لڑکے محنتی ہوتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ آصف اور افضل کے لیے ایسے لڑکے کی رفاقت اچھی رہے گی۔" یہ کہہ کر حسین بیگ معظم علی کی طرف متوجہ ہوا۔ "برخوردار تم مکتب سے چھٹی کے بعد یہاں آجایا کرو۔ میں محمود علی سے بھی کہہ دوں گا۔"

"جی بہت اچھا۔" معظم علی نے تشکر کے ساتھ نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔

آصف نے کہا۔ "ابا جان معظم کا بڑا بھائی یوسف علی میرا ہم جماعت ہے اگر آپ کی اجازت ہو تو وہ بھی یہاں آجایا کرے۔"

حسین بیگ نے جواب دیا: "اگر تمھارے استاد کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میری طرف سے اجازت ہے۔"

اتالیق نے کہا: "جی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اندرونی چار دیواری کے پھاٹک سے ایک نوکر نمودار ہوا اور اُس نے حسین بیگ کو سلام کرنے کے بعد اتالیق کی طرف متوجّہ ہو کر کہا: "جناب شیر علی خاں صاحب پوچھتے ہیں کہ صاحبزادے کب فارغ ہوں گے؟"

اتالیق نے جواب دیا: "بس میں آج کا کام ختم کر چکا ہوں، یہ جا سکتے ہیں۔"

آصف اور افضل اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

افضل نے کہا: "معظّم آؤ تم بھی، ہم آج کل پستول چلانے کی مشق کر رہے ہیں۔" معظّم علی جھجکتا ہوا اپنے دوستوں کے ساتھ چل دیا۔

حسین بیگ نے اتالیق سے کہا: "چلیے آج آپ بھی اپنے شاگردوں کا نشانہ دیکھیے۔"

اتالیق کا نام عبدالقدوس تھا اور اس کا شمار مرشد آباد کے چند چیدہ علماء میں ہوتا تھا وہ حسین بیگ کے ساتھ باتیں کرتا ہوا محل کی اندرونی چار دیواری سے نکل کر بیرونی احاطے میں داخل ہوا تو وہاں پھاٹک سے چند قدم دور دیوار کے ساتھ ایک برآمدے میں بچوں کا فوجی استاد دکھائی دیا، وہ انھیں دیکھتے ہی آگے بڑھا۔ حسین بیگ نے کہا: "ہم آپ کے شاگردوں کا نشانہ دیکھنے آئے ہیں۔"

شیر علی نے کہا: "یہ میری خوش قسمتی ہے اور مجھے امید ہے کہ میرے شاگرد آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔ چلیے!"

حسین بیگ نے کہا: "شیر علی، یہ محمود علی کا بیٹا ہے۔ مولوی صاحب نے آج زبردستی اسے اپنا شاگرد بنا لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس کا امتحان لیں۔"

شیر علی نے جواب دیا: "جناب اس کا امتحان لینے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اسے باہر میدان میں گھوڑا بھگاتے اور نشانہ بازی کرتے دیکھا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ نوکروں اور پہریداروں کی کوٹھڑیوں کے قریب پہنچ کر رُکے۔ باہر کی فصیل کے قریب ایک درخت کے نیچے چند سپاہی جمع تھے۔ اور ایک میز پر چار پستول رکھے ہوئے تھے، سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک درخت کی شاخ کے ساتھ ایک تختی لٹک رہی تھی جس کے درمیان پان کی شکل کا ایک سُرخ نشان بنا ہوا تھا۔ سپاہی حسین بیگ کو دیکھ کر ادب سے اِدھر اُدھر ہٹ گئے اور شیر علی کے اشارے پر آصف نے پستول چلا دیا۔ نشانہ سُرخ نشان کے نچلے کنارے پر لگا۔ اس کے بعد افضل کی باری آئی اور اس کی گولی سرخ نشان سے کوئی دو اِنچ باہر لگی۔ تاہم اس کی عمر کے لحاظ سے یہ بھی ایک کارنامہ تھا اور بوڑھا استاد مرزا حسین بیگ کی طرف دادطلب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"اچھا اب دوبارہ کوشش کرو!" اس نے کہا۔

بچوں نے خالی پستول میز پر رکھ دیئے اور بھرے ہوئے پستول اٹھا لیے۔ افضل کی دوسری کوشش قدرے بہتر تھا لیکن آصف کا ہاتھ ہل گیا اور اس کی گولی تختی کو چھوئے بغیر نکل گئی۔ دو سپاہی میز کے قریب کھڑے پستول بھرنے میں مصروف تھے۔ آصف نے اپنی کھسیاہٹ چھپانے کے لیے جلدی سے خالی پستول میز پر رکھا اور بھرا ہوا پستول اٹھا لیا۔ اب اس کی گولی نشانے پر لگی۔ افضل کی باری آئی تو وہ بھرا ہوا پستول اٹھا کر خود نشانہ لگانے کی بجائے معظّم علی کی طرف بڑھا اور بولا: "اب تمھاری باری ہے۔"

معظّم نے قدرے توقف کے بعد اپنی کتابیں ایک سپاہی کے ہاتھ میں دے دیں اور افضل کے ہاتھ سے پستول لے لیا۔

حسین بیگ نے کہا: "میاں صاحبزادے دیکھنا کسی آدمی کو زخمی نہ کر دینا!"

افضل نے کہا: "جی آپ فکر نہ کریں اس کا نشانہ بہت اچھا ہے۔"

معظّم آگے بڑھا۔ اس نے نشان کی طرف دیکھا۔ پھر اچانک پستول والا ہاتھ اوپر اٹھایا اور

آنکھ جھپکنے کی دیر میں لیلیٰ وبادی دیکھنے والے سرخ نشان کے عین وسط میں ایک سوراخ دیکھ رہے تھے ۔

معظم علی نے خالی پستول میز پر رکھ دیا اور سپاہی کے ہاتھ سے کتابیں لے کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ حسین بیگ نے آگے بڑھ کر اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ "شاباش! تمھارا نشانہ بہت اچھا ہے ۔"

"جی میرے بھائی کا نشانہ مجھ سے بہتر ہے۔"

حسین بیگ نے میز سے ایک پستول اٹھایا اور معظم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم انعام کے حقدار ہو ۔ یہ لو اور دیکھو ۔ جب تم بڑے ہو کر جنگ کے میدان سے سرخرو ہو کر آؤ گے تو میں تمھیں اپنے اسلحہ خانے کی بہترین بندوق اور اپنے اصطبل کے بہترین گھوڑے کا حقدار سمجھوں گا۔"



اس واقعہ کے تین دن بعد حسین بیگ کے ہاں مرشد آباد کے چند امراء کی دعوت تھی اور محمود علی کو پہلی بار اس کے دسترخوان پر بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا تھا ۔ ایک ہفتہ بعد حسین بیگ کی بیوی نے شہر کی چند معزز خواتین کو دعوت دی اور اس نے معظم علی کی ماں آمنہ کو بھی مدعو کیا۔ حسین بیگ کی بیوی بظاہر آمنہ کے ساتھ تپاک سے پیش آئی لیکن اونچے طبقے کی اکثر خواتین نے اس کے ساتھ بے تکلف ہونا پسند نہ کیا اور اپنی میزبان کے ظاہری خلوص کے باوجود آمنہ یہ بات محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی کہ کمسن بچوں کی دوستی اور ان کے دعوتیں اور ملاقاتیں اس خلیج کو نہیں پاٹ سکتیں جو ان کے درمیان حائل ہے ۔ فرحت کی عمر اس وقت آٹھ سال کے قریب تھی اور وہ بہت خوبصورت تھی ۔ امراء کی چند لڑکیاں جو اپنی ماؤں کے ساتھ اس دعوت میں شریک تھیں اسے اپنی طرف متوجہ کرنے میں ایک دوسری سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں ۔ بڑی عمر کی عورتیں اس کی شکل وصورت اور اس کے لباس سے متاثر تھیں اور وہ کسی کو "خالہ جان سلام!" اور کسی کو "چچی جان سلام!" کہہ کر باری باری سب سے دعائیں لے رہی تھی ۔ آمنہ کے کوئی لڑکی نہ تھی ۔ وہ اس کی

طرف بار بار محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی لیکن فرحت نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ ایک بار اس کی ماں نے کہا۔ "فرحت! بیٹی تم نے اپنی خالہ کو سلام نہیں کیا" اور فرحت نے بے توجہی سے آمنہ کی طرف دیکھا اور "خالہ جان سلام" کہہ کر ایک خوش پوش امیرزادی کے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف ہو گئی تاہم آمنہ کے دل سے اس کے لیے ہزاروں دعائیں نکل رہی تھیں لیکن کاش یہ شوخ اور حسین لڑکی جسے آمنہ نے پہلی نظر میں ہی اپنی بیٹی سمجھ لیا تھا اس کی دعائیں سن سکتی۔ کاش وہ اونچے طبقے کی دوسری خواتین کی طرح اسے اپنے پاس بٹھا سکتی اس کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کر سکتی ۔ اس کے سنہری بالوں کو اپنے ہاتھوں سے سنوار سکتی' وہ دور ہی دور سے ان شوخ آنکھوں کی طرف دیکھ رہی تھی جن میں ہمالیہ کے دامن کی جھیلوں کی دلکشی اور گہرائی نظر آتی تھی' وہ اس کے خوبصورت دانت دیکھ رہی تھی جو ہنستے وقت موتیوں کی طرح چمکتے تھے۔ دعوت کے اختتام پر وہ اپنے دل میں یہ احساس لے کر نکلی کہ حسین بیگ کی بیوی اور اس کے درمیان اجنبیت کی دیوار بدستور کھڑی ہے ۔

لیکن یہ دیوار زیادہ دیر تک قائم نہ رہی ۔ یوسف اور معظم کے ساتھ افضل اور آصف کی بے تکلفی بڑھتی گئی ۔ پہلے جب وہ مدرسے جانے کے لیے بگھی پر سوار ہو کر گھر سے نکلتے تھے تو معظم اور یوسف ڈیوڑھی کے سامنے ان کے انتظار میں کھڑے رہتے ۔ اب اگر انھیں کبھی دیر ہو جاتی تو آصف اور افضل اپنی بگھی ان کے دروازے کے سامنے کھڑی کر کے انھیں بلا لیتے ۔ گھر میں اپنے والدین کے ساتھ ان کی باتیں ایک دوسرے کے متعلق ہوتیں ۔ "ہم آج فلاں جگہ سیر کے لیے گئے تھے" "آج ہماری فلاں محلے کے لڑکوں کے ساتھ لڑائی ہو گئی تھی ۔ ہم صرف چار تھے اور ہم نے اتنے لڑکوں کو مار بھگایا تھا" "آج پیراکی میں ہمارا مقابلہ ہوا تھا اور فلاں سب سے آگے نکل گیا تھا" "آج فلاں نشانہ بازی اور فلاں نیزہ بازی میں اول آیا تھا" حسین بیگ کے گھر میں افضل ہمیشہ معظم علی کی اور آصف ہمیشہ یوسف کی کسی نہ کسی خوبی کی تعریف کرتا۔ اسی طرح جب معظم اور یوسف سونے سے پہلے اپنے والدین کو دن بھر کے واقعات سناتے تو معظم کی زبان پر بار بار افضل کا نام آتا اور یوسف کی زیادہ باتیں عام طور پر آصف کے متعلق ہوتیں چنانچہ ڈیڑھ ماہ کے بعد جب آمنہ دوسری بار حسین بیگ کے ہاں گئی تو افضل کی ماں اس کے ساتھ انتہائی بے تکلفی سے پیش آئی۔

وہ ایک دوسری کو اپنے اپنے بیٹوں کے بچپن کے واقعات سنا رہی تھیں اور فرحت گہری دلچسپی کے ساتھ ان کی باتیں سن رہی تھی ۔ کبھی آمنہ معظم یا یوسف کی کسی شرارت کا ذکر کرتی تو وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتی ÷



وقت گزرتا گیا ۔ لڑکپن سے جوانی کی ابتدائی منزل میں قدم رکھتے ہی معظم علی کا بھائی یوسف اور حسین بیگ کے دونوں بیٹے فوج میں بھرتی ہو گئے ۔ یوسف ایک سال کی ملازمت کے بعد پچاس سواروں کا افسر بن گیا ۔ آصف اور افضل دربار میں اپنے خاندانی اثر و رسوخ کے باعث ترقی کی منازل نسبتاً زیادہ تیز رفتار سے طے کر رہے تھے ۔ آصف ایک سال کی ملازمت کے بعد دو سو اور افضل ایک سو سواروں کا کمان دار بن چکا تھا ۔ معظم علی کا باپ محمود علی اس عرصے میں ترقی کر کے محافظ فوج کے ایک ہزار سواروں کا افسر بن چکا تھا ۔ اس کے لیے یوسف کی ترقی کی رفتار اطمینان بخش تھی ۔ لیکن معظم علی کے مستقبل کے متعلق وہ پہلے جس قدر پُر امید تھا ۔ اب اسی قدر پریشان ہو رہا تھا ۔ معظم علی نے فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کر دیا تھا اور اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس میں سپاہیانہ اوصاف کی کمی تھی ۔ محمود علی جانتا تھا کہ اس میں ایک سپاہی کی تمام خوبیاں موجود ہیں ۔ جرأت ، ہمت ، عزم اور استقلال کے علاوہ وہ ایک غیر معمولی قوتِ فیصلہ اور بہترین قائدانہ صلاحیتوں کا مالک تھا ۔ کتابوں سے دلچسپی کے باوجود اسے سپاہیانہ زندگی پسند تھی ۔ وہ ہر روز علی الصبح سواری ، نیزہ بازی اور نشانہ بازی کی مشق کیا کرتا تھا ۔ تیر کر دریا عبور کرنا اس کے لیے ایک معمولی بات تھی ۔ اسے شکار کا بھی شوق تھا اور اب تک وہ تین شیر اور پانچ چیتے مار چکا تھا ۔ لیکن محمود علی جب کبھی اس کے سامنے فوج میں بھرتی ہونے کا مسئلہ چھیڑتا ۔ وہ یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کرتا " ابا جان آپ مجھے مجبور نہ کریں ۔ مجھے سوچنے کا موقع دیں ۔ ابھی میری تعلیم پوری نہیں ہوئی ۔ ابھی مجھے بہت کچھ سیکھنا ہے " اور آمنہ ہمیشہ اس کا ساتھ دیتی ، وہ کہتی " آپ معظم علی کے متعلق اس قدر پریشان کیوں ہیں ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے !"

معظم علی اپنا زیادہ وقت عبدالقدوس کے پاس گزارا کرتا تھا ۔ ایک دن محمود علی نے جا کر اس سے شکایت کی " دیکھیے قبلہ معظم کے مستقبل کے متعلق بہت بڑی توقعات تھیں اور میرا خیال تھا کہ آپ کی شاگردی سے اس کی خدا داد صلاحیتیں اور چمک اٹھیں گی ۔ لیکن اب اس کی حالت دیکھ کر مجھے بے حد مایوسی ہو رہی ہے ۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک سپہ سالار بنے گا ۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں کے سوا اسے کسی چیز سے دلچسپی ہی نہیں ۔ اگر میں کسی بڑی جائداد کا مالک ہوتا تو مجھے تمام عمر اس کے گھر بیٹھنے پر اعتراض نہ ہوتا لیکن آپ جانتے ہیں میری جائداد صرف تلوار ہے خدا کے لیے آپ اسے سمجھائیں !"

عبدالقدوس نے اطمینان سے جواب دیا " آپ کو معظم علی کے متعلق مایوس نہیں ہونا چاہیے ، مجھے یقین ہے کہ وہ دنیا میں نام پیدا کرے گا ۔ ایک سلطنت کو سپاہی کی تلوار کے علاوہ عالم کے قلم کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے ۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ معظم علی کسی شہر کا قاضی یا صوبے کا حاکم بننے کے لیے پیدا ہوا ہے ۔ آپ اسے پڑھنے کا شوق پورا کرنے دیں ، مجھے اس کی خدا داد صلاحیتوں پر اعتماد ہے ۔ اس میں اتنی سمجھ ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے متعلق خود فیصلہ کر سکے ۔ اگر آپ نے اپنا کوئی فیصلہ اس پر ٹھونسنے کی کوشش کی تو یہ اس کے حق میں مضر ہو گا ۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہونے دیں ۔ اگر اس نے اپنی مرضی سے سپاہی بننے کا فیصلہ کیا تو اس میدان میں بھی عزت اور شہرت کی کوئی منزل اس سے دور نہیں ہو گی "

محمود علی نے مطمئن ہو کر کہا " قبلہ میں معظم سے مایوس نہیں ہوں ، لیکن اس کے تمام ساتھی فوج میں شامل ہو چکے ہیں اور لوگ مجھے طعنے دیتے ہیں "

" لوگوں کی پروا نہ کیجیے ، جو نوجوان اپنے لیے نئے راستے تلاش کرتے ہیں ۔ انھیں اپنی عمر کے ایک حصے میں لوگوں کے طعنے سننے ہی پڑتے ہیں "

عبدالقدوس کے ساتھ ایک طویل بحث کے بعد محمود علی کی پریشانی کسی حد تک دور ہو چکی تھی اور اس کے بعد اگر اس کا کوئی دوست یہ سوال کرتا کہ معظم علی فوج میں کیوں شامل نہیں ہوا ،

تو وہ جواب دیتا:

"معظم علی ایک عالم ہے مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے قلم سے بنگال کی زیادہ خدمت کرسکے گا۔"



فرحت گیارہ سال کی عمر سے پردہ کیا کرتی تھی اور معظم نے اسے گزشتہ دو سال سے نہیں دیکھا تھا۔ معظم کی ماں کبھی کبھی اس کا ذکر کیا کرتی تھی۔ ایک دن وہ اس سے مل کر آئی تو اس نے معظم علی سے کہا۔ "بیٹا آج فرحت تمھارے متعلق پوچھتی تھی!"

معظم علی کے گال اور کان حیا سے سُرخ ہو گئے اور اس نے سوال کیا۔ "متعلق کیا پوچھتی تھی؟"

ماں نے جواب دیا: "بیٹا وہ یہ پوچھتی تھی کہ تم فوج میں بھرتی کیوں نہیں ہوتے؟"

معظم نے مسکرا کر کہا: "امی جان مجھے افسوس ہے کہ اب آپ کو میری وجہ سے چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے طعنے سننے پڑتے ہیں۔"

ماں نے جواب دیا: "بیٹا اس نے مجھے طعنہ نہیں دیا بلکہ وہ تو اپنی طرف سے ہمدردی کر رہی تھی۔ اور اب وہ چھوٹی لڑکی نہیں۔ ماشاءاللہ اب وہ جوان معلوم ہوتی ہے۔ اس کی ماں اس کی پیدائش کے دن سے اس کی شادی کی تیاریاں کر رہی ہے۔ مرشد آباد کے بڑے بڑے گھرانوں سے رشتے آتے ہیں لیکن وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی اور فرحت ہے بھی اس قابل کہ کسی نواب کے گھر جائے۔ مرزا صاحب بڑی دھوم دھام سے اس کی شادی کریں گے۔ لکھنؤ سے مرزا صاحب کے کسی عزیز نے اپنے بیٹے کے لیے رشتہ مانگا تھا۔ اور حسین بیگ بھی رضامند ہو گئے تھے۔ لیکن فرحت کی ماں نہیں مانتی۔"

معظم جانتا تھا کہ اس کی ماں فرحت سے بہت پیار کرتی ہے اور فرحت کا ذکر آجانے تو اس کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر شرارت آمیز تبسم لاتے ہوئے ماں کو چڑانے کی نیت سے کہا۔ "امی جان! فرحت وہی لڑکی تو نہیں جس کی ناک چپٹی اور رنگ

سیاہ تھا بالکل توے کی طرح۔ اور اس کی ایک آنکھ بھی ذرا چھوٹی تھی؟"

"شرم کرو!" ماں نے بگڑ کر کہا اور معظم اٹھ کر ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔ دو سال پہلے کی ایک ایسی صورت کے دھندلے سے نقوش اس کے ذہن پر اُبھر رہے تھے جو شوخ بھی تھی اور معصوم بھی۔

چند دن بعد ایک خوشگوار حادثہ پیش آیا۔ معظم علی صبح سویرے کوئی کتاب لینے افضل کے گھر گیا۔ وہ پہلی ڈیوڑھی سے گزرنے کے بعد اندرونی چار دیواری کے پھاٹک کے قریب پہنچا تو آصف اور افضل فوجی لباس پہنے باہر نکل رہے تھے۔ دو نوکر صحن میں ان کے گھوڑے لیے کھڑے تھے۔

معظم نے انھیں دیکھتے ہی کہا: "بھائی یوسف کہتے تھے کہ آج چھٹی ہے اور میں کتاب لینے آیا تھا۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

افضل نے کہا: "آج چھٹی ہے لیکن ہم چوگان کھیلنے جا رہے ہیں۔ آؤ تم کتاب لے لو!"

"لیکن جلدی آنا!" آصف نے کہا۔ "وہ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"ابھی آتا ہوں۔"

افضل، معظم علی کو ساتھ لے کر کتب خانے کے سامنے پہنچا تو باہر کے برآمدے کی طرف کھلنے والا دروازہ اندر سے بند تھا۔

افضل نے کہا: "آج اباجان باہر گئے ہوئے ہیں اور شاید نوکر نے اندر سے یہ دروازہ بند کر دیا ہے۔ آؤ اس طرف چلتے ہیں۔"

وہ واپس مڑے اور دیوان خانے کے ایک وسیع کمرے سے گزر کر اندرونی صحن کے قریب پہنچے تو معظم کچھ سوچ کر رک گیا۔

افضل نے مڑ کر کہا۔ "آجاؤ گھر والے سب اوپر ہیں۔ یہاں کوئی نہیں۔"

معظم علی افضل کے پیچھے صحن سے گزر کر کتب خانے میں داخل ہوا۔ افضل نے کہا "آپ اطمینان سے کتابیں تلاش کرو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے میں جاتا ہوں۔"

افضل باہر کا دروازہ کھول کر نکل گیا۔ معظم نے ایک الماری کھولی اور کتابیں نکال نکال کر دیکھنے لگا۔ دو تین الماریوں کو دیکھنے کے بعد وہ کونے کی ایک الماری کے پاس کھڑا ایک کتاب کے ورق الٹ رہا تھا۔ اچانک اسے کسی کے پاؤں کی آہٹ اور معاً بعد ایک دلکش نسوانی آواز سنائی دی: "بھائی جان آپ ابھی تک۔۔۔۔؟"

معظم علی نے مڑ کر دیکھا اور ایک ثانیہ کے لیے متحیر سا ہو کر رہ گیا۔ ایک نوعمر لڑکی جو بے خیالی میں کمرے کے درمیان پہنچ چکی تھی اس کی نسبت کہیں زیادہ بدحواسی کے ساتھ ایک غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا کر رہی تھی۔ معظم علی ایک نظر سے زیادہ اس کی طرف نہ دیکھ سکا۔ اس نے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا:۔

"معاف کیجیے میں۔۔۔۔؟"

معظم علی اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا ــــ لڑکی فوراً مڑ کر دروازے کی طرف بھاگی اور کمرے سے باہر نکل گئی ـــ روشنی کی کرن کی طرح جو آئینے کو چھونے کے بعد اپنا رُخ بدل لیتی ہے یا سمندر کی لہر کی طرح جو ساحل سے ٹکرا کر واپس چلی جاتی ہے۔

یہ لڑکی فرحت تھی۔ معظم علی نے اسے دو سال کے بعد دیکھا تھا اور وہ بھی ایک لمحہ کے لیے۔ اس کے ذہن میں اس کے کوئی واضح نقوش نہ تھے۔ تاہم اُسے یہ احساس ضرور تھا کہ اگر وہ اسے تمام عمر دیکھتا رہتا تو بھی اس کی نگاہوں کی تشنگی دور نہ ہوتی۔ وہ اپنے دل میں ایک خوشگوار دھڑکن محسوس کر رہا تھا۔ لیکن یہ دھڑکن چند لمحوں سے زیادہ نہ رہی۔ معظم علی ہوائی قلعے تعمیر کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ انتہائی سکون کے ساتھ الماری سے ایک اور کتاب نکال کر دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں کا یہ خوشگوار تصادم اس کے نزدیک محض ایک حادثہ تھا ـــ ماضی کا حادثہ جس کا اس کے حال اور مستقبل سے کوئی تعلق نہ تھا ـــ وہ جانتا تھا کہ زندگی میں ان کے راستے ایک دوسرے سے جدا ہیں، اور اگر وہ بھٹک کر تھوڑی دیر کے لیے کسی چوراہے پر ایک دوسرے سے آملیں تو بھی ان کی منزل کبھی ایک نہیں ہو سکتی۔ فرحت مرزا حسین بیگ

کی بیٹی تھی اور وہ اتنا شاعر نہ تھا کہ زمین پر کھڑا ہو کر ستاروں سے باتیں کرتا۔



کوئی آدھ گھنٹہ کی تلاش کے بعد معظم ایک کتاب لے کر باہر نکلا تو برآمدے کے آخری سرے پر پہنچ کر اسے حسین بیگ دکھائی دیا۔ معظم نے بڑھ کر اسے سلام کیا اور حسین بیگ نے "وعلیکم السلام" کہہ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ معظم علی نے کہا: "میں یہ کتاب لینے آیا تھا۔"

برآمدے میں چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ حسین بیگ نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "معظم بیٹھ جاؤ میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

معظم علی اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ حسین بیگ نے قدرے توقف کے بعد کہا "برخوردار تمہارے متعلق مجھے بڑی مایوسی ہوئی ہے۔ کتابوں سے دلچسپی کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنے باقی فرائض سے آنکھیں بند کر لو۔ ابھی شاہی محل کے باہر تمہارے ابا جان ملے تھے۔ مجھے ان کی باتیں سن کر بڑا افسوس ہوا۔ میرا خیال تھا کہ تم ایک سپاہی بن کر اپنے خاندان کا نام روشن کرو گے۔ شیر علی تمہارے متعلق کہا کرتا تھا کہ تم کسی دن سپہ سالار بنو گے۔ لیکن تم کتابوں کے شوق میں خداداد صلاحیتیں ضائع کر رہے ہو۔ آخر تم فوج میں شامل ہونے سے کیوں ڈرتے ہو؟ جسمانی لحاظ سے تم بنگال کے ہزاروں نوجوانوں کے لیے قابلِ رشک ہو۔ نیزہ بازی، شہسواری اور نشانہ بازی میں بہت کم نوجوان تمہارا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ تمہیں خدا نے ذہانت بھی دی ہے، اگر تم اپنے بھائی کی طرح دو سال قبل فوج میں شامل ہو گئے ہوتے تو اب تک شاید دو سو سوار تمہاری کمان میں ہوتے۔ لیکن اگر تمہیں ایک معمولی افسر کی حیثیت سے فوج میں شامل ہونا پسند نہیں تو میں تمہاری سفارش کر سکتا ہوں۔ علی وردی خاں کے ساتھ میرے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ میر مدن میرا دوست ہے۔ اگر تم چاہو تو میں ابھی تمہیں اس کے پاس لے چلتا ہوں۔"

معظم علی نے کچھ دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد کہا: "چچا جان میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ لیکن میرے فوج میں بھرتی نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ میں ایک عام سپاہی کی حیثیت سے ابتدا نہیں

کرنا چاہتا۔ میں جس فوج کا ادنیٰ سپاہی بننا پسند نہیں کرتا اس کا سپہ سالار بننا بھی پسند نہیں کروں گا۔ جس دن مجھے اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ میں ایک سپاہی بن کر قوم اور وطن کی کوئی خدمت سرانجام دے سکتا ہوں۔ اس دن میرے سامنے یہ سوال نہیں ہوگا کہ میں ایک سپاہی ہوں یا سپہ سالار۔ میرے سامنے صرف یہ سوال ہوگا کہ میں نے جس مقصد کے لیے تلوار اٹھائی ہے وہ کس حد تک پورا ہو رہا ہے۔ اپنے ضمیر کا اطمینان میرے لیے سب سے بڑا انعام ہوگا۔"

حسین بیگ نے کہا "اور وہ دن کب آئے گا جب تم قوم اور وطن کے لیے تلوار اٹھانے کی ضرورت محسوس کرو گے ؟"

معظم علی نے جواب دیا "جب ہماری قسمت کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگی جو اجتماعی حیات کے اصولوں پر یقین رکھتے ہوں۔ موجودہ دور میں ہماری سب سے بڑی بیماری ہماری لامرکزیت ہے اور اس لامرکزیت کا باعث ان بیشمار طالع آزماؤں کی ہوسِ اقتدار ہے جو ہندوستان کو اپنی چھوٹی چھوٹی شکار گاہوں میں تقسیم کر چکے ہیں۔ موجودہ حالات میں ایک سپاہی کی تلوار چند امراء کی مسندوں کی حفاظت کر کے ان کے اقتدار کی مدت میں چند مہینوں یا چند برسوں کا اضافہ کر سکتی ہے لیکن قوم کی اجتماعی بقا کی ضمانت نہیں دے سکتی۔"

حسین بیگ اس قسم کی گفتگو سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے قدرے تلخ ہو کر کہا "ہماری گفتگو بنگال کی فوج کے متعلق تھی جو ایک طرف مرہٹوں کی لوٹ مار اور دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے جارحانہ عزائم کے خلاف ہمارا واحد سہارا ہے۔"

معظم علی نے جواب دیا "جی ہاں، لیکن بدقسمتی سے علی وردی خاں کی فوج کے سپاہیوں اور جرنیلوں کو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ بنگال کے دوست کون ہیں اور دشمن کون ہیں ؟"

حسین بیگ فطرتاً حکومت پسند تھا اور علی وردی خاں سے اُسے غایت درجہ کی عقیدت تھی۔ وہ بنگال کے حکمران کی ذات کو تنقید یا تبصرے سے بالاتر سمجھتا تھا۔ اس نے انتہائی کوشش کے ساتھ اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا "برخوردار مجھے امید ہے کہ علی وردی خاں کے متعلق بات کرتے وقت

تم سنجیدگی کا ثبوت دو گے اور اس بات کا لحاظ رکھو گے کہ وہ ہمارا حکمران ہے۔"

معظم علی نے کہا "چچا جان معاف کیجیے، میں نے علی وردی خاں کی ذات کے متعلق ابھی تک کچھ نہیں کہا، بیشک وہ ہمارا حکمران ہے۔ لیکن اگر کوئی حکومت اپنے اعمال پر نکتہ چینی کا حق مجھے نہیں دیتی تو وہ مجھ سے اپنی حفاظت کے لیے تلوار اٹھانے کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتی۔ مجھے علی وردی خاں کی بہت سی خوبیوں کا اعتراف ہے۔ ملک کے کئی دوسرے حکمرانوں سے وہ یقیناً بہتر ہیں۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جس سلطنت کی مرکزی قوت نہ ہونے کے برابر ہو وہ زیادہ دیر کسی قوم کی آزادی اور بقا کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ آپ اس بات کا اعتراف کریں گے کہ دہلی میں مسلمانوں کی سطوت کے پرچم سرنگوں ہو چکے ہیں اور عالمگیرؒ کی عظیم سلطنت کے کھنڈروں پر اپنے اقتدار کے گھروندے تعمیر کرنے والے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کی جدوجہد کسی اجتماعی نصب العین کے حصول کے لیے نہیں بلکہ محض اپنی ذاتی اغراض کے لیے ہے۔ مسلمان صدیوں کی حکومت کے بعد من حیث القوم اب بتدریج اُس تباہی کا سامنا کر رہے ہیں جو انتشار اور لامرکزیت میں مبتلا ہونے والی اقوام کی آخری سزا ہوتی ہے۔"

حسین بیگ نے کہا "عالمگیرؒ کے جانشین نااہل ہیں اور اب اگر تم دہلی کے دربار کی حالت دیکھو تو علی وردی خاں جیسے لوگوں کا دم غنیمت سمجھو گے۔ اگر ایسے لوگ دہلی کے نااہل اور مفلوج حکمرانوں سے مایوس ہو کر اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہ کرتے تو اب تک سارا ملک ہمارے دشمنوں کے قبضے میں چلا جاتا۔ آج مرشد آباد، لکھنؤ اور حیدر آباد کے حالات یقیناً دہلی کے حالات سے بہتر ہیں۔"

"آپ درست کہتے ہیں لیکن آپ آج کی بجائے کل کے متعلق سوچیں۔ درخت سے کٹی ہوئی شاخیں زیادہ دیر سبز نہیں رہتیں۔ میں اورنگ زیب عالمگیرؒ کے نااہل جانشینوں سے کہیں زیادہ ان قسمت آزماؤں کو موجودہ حالات کا ذمہ دار سمجھتا ہوں جن میں کسی اچھے حکمران کو مسندِ حکومت پر بٹھانے کی جرأت و ہمت یا دیانت نہ تھی ـــ دلی کے نااہل، مفلوج اور بے بس حکمران ان کی گروہی سیاست کی پیداوار تھے۔ لال قلعہ ان کے لیے زور آزمائی کا اکھاڑہ تھا۔ بادشاہوں

کے تاج ان کے ہاتھوں کے کھلونے تھے۔ ہر گروہ کی یہ خواہش تھی کہ دہلی کے حکمران کی حیثیت ایک بےبس دعاگو سے زیادہ نہ ہو، اور وہ اس کی سرپرستی میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے۔ ایک گروہ کسی نااہل حکمران کو اپنی بساطِ سیاست کا مہرہ سمجھ کر تخت پر بٹھاتا تھا اور دوسرا گروہ اسے تخت سے اتار کر اس سے زیادہ نااہل امیدوار کے سر پر تاج رکھنے کی جدوجہد شروع کر دیتا تھا۔ اگر ان حالات سے فائدہ اٹھا کر دہلی سے باہر چند صوبہ داروں نے اپنے سروں پر چھوٹے چھوٹے تاج رکھ لیے ہیں تو ہم پر کوئی احسان نہیں کیا۔

اگر دہلی کے امراء نیک نیت ہوتے اور ان کی سیاست قوم کے اجتماعی مفاد کے تابع ہوتی تو وہ یقیناً اپنی ذاتی سودا بازیوں کی خاطر نااہل حکمران تلاش نہ کرتے۔ انھوں نے جس مستعدی کے ساتھ چند فاترالعقل حکمرانوں کو تخت پر بٹھانے کی جدوجہد کی تھی۔ اگر اسی مستعدی کے ساتھ کسی اجتماعی نصب العین کے حصول یا کسی ضابطۂ اخلاق کی فتح کے لیے جدوجہد کرتے تو وہ دہلی کے تخت کے لیے بہترین حکمران تلاش کر سکتے تھے لیکن وہ کسی اصول یا ضابطۂ اخلاق کی فتح کو اپنی ذاتی خواہشوں اور امنگوں کی شکست سمجھتے تھے۔ وہ کسی اصول یا مقصد کے لیے قربانی دینے کی بجائے ہر اصول اور مقصد کو اپنی ذاتی خواہشات پر قربان کرنا سیکھ چکے تھے۔ دہلی کی سلطنت کے زوال کی وجہ صرف یہی نہیں کہ اس کے حکمران برے تھے بلکہ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بےضمیر امراء جو سلطنت کے ستون کہلاتے تھے ہر برائی میں اپنی بھلائی تلاش کرتے تھے۔"

حسین بیگ کے لیے معظم علی کی گفتگو کا صرف وہ حصہ قابلِ توجہ تھا جو بنگال اور علی وردی خاں کے ساتھ تعلق رکھتا تھا۔ دہلی کے امراء سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی اور معظم علی اگر ان کے لیے اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ استعمال کرتا تو بھی اسے اعتراض نہ ہوتا۔ اس نے کہا "برخوردار مجھے دہلی کے امراء یا حکمرانوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اگر انھوں نے برائی کا بیج بویا تھا تو انھیں کئی بار اس کی سزا مل چکی ہے۔ دہلی کئی بار مرہٹوں اور جاٹوں کے ہاتھ لٹ چکی ہے لیکن ہمیں ان لوگوں کا شکرگزار ہونا چاہیے جنھوں نے ایسے حالات میں بھی بنگال، اودھ اور دکن کو تباہی سے بچا لیا ہے۔ وہ ہمارے محسن ہیں۔ بنگال میں علی وردی خاں ہماری عزت اور آزادی کا آخری محافظ ہے۔ خدا

کرے اس کا سایہ چند برس اور ہمارے سر پر رہے اور تم جیسے نوجوان بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں!"

حسین بیگ ان الفاظ پر اس ناخوشگوار بحث کو جو اس کے لیے کافی حد تک ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی، ختم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن معظم علی نے کہا:

"چچا جان آپ برا نہ مانیں۔ مستقبل کے مورخ ان صوبہ داروں کو موجودہ صورت حالات کی خرابی سے بری الذمہ قرار نہیں دیں گے جنھوں نے دہلی کے دربار کی سازشوں سے فائدہ اٹھا کر سلطنت کو آپس میں تقسیم کر لیا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی پوری سلطنت پر قبضہ کر لیتا اور اس کا مقصد یہ ہوتا کہ قوم کو تباہی سے بچایا جائے تو کم از کم میں اس سے اس کا حسب و نسب نہ پوچھتا۔ اگر وہ اپنے کردار سے قوم کا نجات دہندہ ثابت ہوتا تو میں ایک رضاکار کی حیثیت سے اس کے جھنڈے تلے جان دینا اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتا۔ اس کی فوج کا معمولی سپاہی بن کر مجھے یہ اعتماد ہوتا کہ جب وہ کوئی غلط قدم اٹھائے گا تو میں اسے روک سکوں گا۔ اس کی امنگیں میری امنگیں ہوتیں، اس کے دل کی دھڑکنیں، میرے دل کی دھڑکنیں اور اس کے ضمیر کی آواز میرے ضمیر کی آواز ہوتی۔ اور اس کی شکست کو میں اپنی شکست سمجھتا۔ پھر ایسے شخص کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے طالع آزماؤں کے کسی گروہ کی حمایت کی ضرورت پیش نہ آتی۔ وہ ایک مقصد کے لیے ایثار اور قربانی کا ولولہ لے کر میدان میں نکلتا اور عوام کی اجتماعی قوت اس کے ساتھ ہوتی۔ وہ عوام کے لیے جھونپڑے تعمیر کرتا اور اس کے اقتدار کی مسند مرمریں ایوانوں کی بجائے ان کے دلوں میں ہوتی۔ لیکن یہ لوگ جنھیں آپ قوم کا نجات دہندہ خیال کرتے ہیں۔ مجھے کسی ایسے اجتماعی اصول کے علمبردار نظر نہیں آتے جس کی فتح کو قوم کی فتح سمجھ سکوں۔ یہ لوگ ہمارے احساس اور شعور کی بجائے ہماری بےحسی کی پیداوار ہیں۔ ان کی مثال اس درخت کی ہے جس کی جڑیں زمین کے اوپر اوپر پھیلی ہوتی ہیں اور جسے گرانے کے لیے ہوا کا ایک جھونکا کافی ہوتا ہے۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہمیں مرہٹوں کی لوٹ مار اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہوسِ ملک گیری سے بچانا چاہتے ہیں۔ لیکن کیا یہ حقیقت

نہیں کہ وہ ایک دن مرہٹوں کے خلاف جنگ کرتے ہیں اور دوسرے دن ان کے دوست بن جاتے ہیں اور اگر مرہٹے انھیں مدد دینے کے لیے تیار ہو جائیں تو وہ اپنے مسلمان ہمسایہ پر حملہ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ انگریز ہماری آزادی کے بدترین دشمن ہیں۔ لیکن ان میں سے کون ہے جس نے اپنی کسی نہ کسی ذاتی مصلحت کے پیش نظر انگریزوں کو اس ملک میں پاؤں جمانے کے لیے مدد نہیں دی؟ ان کا منتہائے نظر صرف ذاتی اقتدار ہے اور مجھے ڈر ہے کہ ذاتی اقتدار کے تحفظ کے لیے یہ لوگ کسی دن قوم کی بقا کو بھی داؤں پر لگا دیں گے۔"

حسین بیگ نے جھنجلا کر کہا: "تم علی وردی خاں کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ انگریزوں یا مرہٹوں کے ساتھ کوئی سازباز کر سکتا ہے یا قوم کی آزادی کو داؤں پر لگا سکتا ہے۔"

حسین بیگ کے تیور دیکھ کر معظم چند ثانیے خاموش رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "چچا جان میں نے یہ باتیں اس لیے کہی ہیں کہ میں آپ کی بے حد عزت کرتا ہوں اور میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ کو میرے متعلق کوئی غلط فہمی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ آپ علی وردی خاں کا بہت احترام کرتے ہیں لیکن موجودہ حالات سے آپ میری نسبت کہیں زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ انگریزوں کو اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ لیکن میں جس چیز کو خطرناک سمجھتا ہوں وہ اُن کی مصلحتیں ہیں — ایک ایسے حکمران کی مصلحتیں، جس کا اقتدار کسی مقصد کے لیے جدوجہد کا ثمر نہیں بلکہ اپنی ذاتی ذہانت اور حکمت عملی کا نتیجہ ہے۔ جو لوگ کسی مقصد کیلئے جدوجہد کرتے ہیں، ان کی سب سے بڑی پونجی وہ تربیت یافتہ رائے عام ہوتی ہے جسے وہ اپنے نصب العین کے حصول کے لیے بیدار کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا اقتدار اگر لوگوں کی بھلائی کے لیے ہو تو عوام کا اجتماعی شعور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر ان کے لیے کوئی خطرہ پیدا ہو تو رائے عامہ اُن کے لیے ڈھال کا کام دیتی ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے قسمت آزما قسم کے لوگوں سے جوڑ توڑ یا سودے بازی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ان کے دوستوں اور ساتھیوں کو ساری قوم اپنے دوست سمجھتی ہے۔ ان کے دشمن سب کی نگاہوں میں دشمن ہوتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اپنی تمام ذاتی خوبیوں کے باوجود علی وردی

خاں کا شمار ایسے لوگوں میں نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے صرف اپنی ذاتی قابلیت یا ہوشیاری کے بل بوتے پر حکومت حاصل کی ہے۔ اور اس حکومت کے تحفظ کے لیے بھی وہ چند ہوشیار آدمیوں کی حمایت یا دوستی کافی سمجھتے ہیں۔ بنگال کو جب کوئی اندرونی خطرہ پیش آتا ہے تو وہ انگریزوں یا مرہٹوں کی معاندانہ سرگرمیوں سے چشم پوشی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی بیرونی خطرہ درپیش ہو تو وہ اپنے بدترین غداروں کو بھی معاف کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ بیشک وہ ایک ہوشیار سیاست دان اور تجربہ کار جرنیل ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں بنگال کے سپاہی کا ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا اصل محاذ کہاں ہے۔"

حسین بیگ کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ اس نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا:

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ علی وردی خاں انتہائی ناقابل اعتماد آدمی ہے جو حسب ضرورت اپنے دوست اور دشمن بدلتا رہتا ہے؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں نے علی وردی خاں کو ناقابل اعتماد نہیں کہا لیکن اگر آپ بُرا نہ مانیں تو یہ ضرور کہوں گا ان کے گرد ایسے آدمی جمع ہیں جنھیں میں قابل اعتماد نہیں سمجھتا اور اگر ان کے سامنے ایک حکمران کی ذاتی مصلحتیں نہ ہوتیں تو ان کے دربار میں ان لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہ ہوتی۔"

حسین بیگ نے کہا: "اور تم یہ بھی کہتے ہو کہ علی وردی خاں کے سپاہیوں کو یہ علم نہیں کہ ان کا محاذ کہاں ہے؟"

"جی ہاں اور میں غلط نہیں کہتا!"

"شاید علی وردی خاں کو بھی یہ علم نہ ہو کہ ان کا محاذ کہاں ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے بتادو اور میں اس کے کانوں تک تمھاری یہ آواز پہنچا دوں؟"

معظم علی نے حسین بیگ کی طنز سے بھری ہوئی مسکراہٹ کی کوئی پروا نہ کی۔ اس نے جواب دیا۔ "جی انھیں بتلانے کی ضرورت نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میر جعفر جیسے لوگ کسی کے وفادار نہیں ہوسکتے۔"

حسین بیگ کو میر جعفر کے متعلق کوئی خوش فہمی نہ تھی تاہم وہ علی وردی خاں کی فوج کے ایک افسر کے بیٹے کی زبان سے اس کے خلاف کچھ سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا: "دیکھو برخوردار اگر تم فوج میں شامل نہیں ہونا چاہتے تو میں تمھیں مجبور نہیں کرسکتا لیکن علی وردی خاں کے ساتھیوں کے متعلق زبان کھولتے وقت تمھیں محتاط رہنا چاہیے۔ یہ لوگ سلطنت کے ستون ہیں اور تمھارا والد فوج کا ملازم ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تمھارے خیالات اس قدر باغیانہ ہیں۔ میں نے انتہائی ضبط سے کام لے کر تمھاری باتیں سنی ہیں۔ لیکن اس مکان کی چار دیواری سے باہر اگر تم نے کسی کے ساتھ اس قسم کی باتیں کیں تو تمھارے لیے اچھا نہ ہوگا۔ تم افضل اور آصف کے دوست ہو اور میں اس کی اجازت نہیں دوں گا کہ تم ان کے سامنے ایسے خیالات کی تبلیغ کرو۔ تم ابھی بچے ہو۔ لیکن وقت آنے پر تمھیں معلوم ہوجائے گا کہ علی وردی خان بنگال کے مسلمانوں کا آخری سہارا ہے۔"

معظم علی نے کرسی سے اٹھ کر کہا: "چچا جان اگر میں نے کوئی تلخ بات کہہ دی ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن آپ یقین رکھیں وقت آنے پر میں یہ ثابت کرسکوں گا کہ بنگال کے مسلمانوں کا مستقبل مجھے کسی سے کم عزیز نہیں۔"



اگلے روز معظم اور یوسف، اپنے باپ کے ساتھ عشا کی نماز کے لیے مسجد کی طرف جا رہے تھے کہ حسین بیگ کے نوکر نے پیچھے سے آواز دی۔ وہ رک گئے اور نوکر نے قریب آکر محمود علی سے کہا "مرزا صاحب نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔"

محمود علی نے لڑکوں کی طرف متوجہ ہوکر کہا: "تم جاؤ میں ان سے مل آؤں۔"

محمود علی نوکر کے ساتھ چلا گیا تو یوسف نے معظم علی سے کہا: "معظم مرزا صاحب نے ابا جان کو کس وقت بلایا ہے۔ خیر تو ہے؟"

معظم نے جواب دیا: "بھائی جان معلوم ہوتا ہے آج میری شامت آئے گی۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"کل میری باتوں سے مرزا صاحب خفا ہوگئے تھے۔"

"کیوں، تم نے ان سے کیا کہا تھا؟"

"وہ میرے فوج میں بھرتی نہ ہونے کے متعلق پریشان تھے۔ اور میں نے ان کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"اور اب وہ زیادہ پریشان ہوں گے۔ تم نے علی وردی خاں کے متعلق ضرور کوئی ایسی ویسی بات کہی ہوگی؟"

"میں نے موجودہ حالات پر تبصرہ کیا تھا اور انھوں نے شاید یہ سمجھا کہ میں علی وردی خان کی حکومت کا باغی ہوں۔"

"تمھیں مرزا صاحب کے ساتھ نہیں الجھنا چاہیے۔ وہ پرانی وضع کے آدمی ہیں، اور علی وردی خاں کے ساتھ ان کے مراسم بہت گہرے ہیں۔"

یوسف اور معظم نے نماز کے بعد کچھ دیر محمود علی کا انتظار کیا اور پھر گھر کی طرف چل دیے۔ گھر پہنچ کر وہ صحن میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد محمود علی بھی آگیا اور اس نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کسی تمہید کے بغیر کہا: "معظم، تم نے کل مرزا صاحب سے کیا باتیں کی تھیں؟"

"ابا جان میں نے ان کی یہ غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی تھی کہ میرے فوج میں بھرتی نہ ہونے کی وجہ خوف یا کاہلی ہے۔ مرزا صاحب بہت زیادہ خفا تو نہیں تھے؟"

"نہیں، بلکہ وہ اس بات پر پریشان تھے کہ وہ تمھارے ساتھ سختی سے پیش آئے تاہم

وہ تاکید کرتے تھے کہ تمھیں علی وردی خاں اور ان کے امراء کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔"

معظم علی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اباجان انھوں نے یہ تو ضرور کہا ہو گا کہ میں بہت نالائق ہوں۔"

"نہیں، وہ یہ کہتے تھے کہ تمھارا بیٹا میرے لیے ایک معمّا ہے۔ کبھی میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ ایک سادہ دل نوجوان ہے اور کبھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ ہوشیار ہے۔ وہ کہتے تھے ایسے نوجوان یا تو دنیا میں نام پیدا کرتے ہیں اور یا اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے لیے مصیبت کا باعث بن جاتے ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔ "اباجان میں بھائی جان سے ابھی یہ کہہ رہا تھا کہ وہ میری شکایت کریں گے اور آپ گھر آکر میری خوب مرمت کریں گے۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ وہ آئندہ مجھے اپنے گھر کی چاردیواری کے قریب نہیں پھٹکنے دیں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی اچھے آدمی ہیں۔"

"تم نے ان سے میر جعفر کے خلاف کچھ کہا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"وہ ہر اس آدمی کو اچھا سمجھتے ہیں جو میر جعفر کو بُرا خیال کرتا ہے۔"

"لیکن انھوں نے مجھے تو ڈانٹ دیا تھا۔"

"یہ ان کی ظاہرداری تھی لیکن تمھیں ایسے خیالات کسی اور کے سامنے ظاہر نہیں کرنے چاہئیں۔"

"اباجان میں محتاط رہوں گا۔"

"مرزا صاحب ایک اور بات کہتے تھے۔"

"وہ کیا؟"

"وہ کہتے تھے کہ معظم علی کے لیے میرے کتب خانے کا دروازہ ہر وقت کھلا رہے گا لیکن مجھے اس دن خوشی ہوگی جب وہ میرے اسلحہ خانے سے تلوار اور میرے اصطبل سے گھوڑا لینے آئے گا۔"

دوسرا باب

ایک دن مُرشدآباد میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ پنڈت بھاسکر کی قیادت میں راگھو جی بھونسلہ کی چالیس ہزار مرہٹہ فوج بردوان کی طرف بڑھ رہی ہے۔ علی وردی خاں مُرشدآباد سے باہر شکار کھیل رہا تھا۔ اس نے مرہٹوں کی پیشقدمی کی خبر ملتے ہی بردوان کا رُخ کیا اور مُرشدآباد اور دوسرے شہروں کی افواج کو یہ حکم بھیجا کہ وہ راستے میں اس کے ساتھ آملیں۔ دو دن کے اندر اندر مُرشدآباد کی چھاؤنی خالی ہوگئی اور سپاہیوں کے صرف چند دستے شہر اور شاہی محل کی حفاظت کے لیے رہ گئے۔ چند دن بعد یہ خبر آئی کہ علی وردی خاں کا ایک کمان دار میر حبیب اور فوج کے چند اور افسر بنگال سے غداری کرکے مرہٹوں کے ساتھ مل گئے ہیں اور پنڈت بھاسکر نے یہ اعلان کیا ہے کہ بنگال کی فوج سے غداری کرنے والوں کو مرہٹہ فوج میں اپنے سابقہ عہدوں پر لے لیا جائے گا۔ مُرشدآباد میں سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔

محمود علی، یوسف علی اور حسین بیگ کے دونوں بیٹے آصف بیگ اور افضل مرشدآباد کی فوج کے ساتھ محاذ جنگ کی طرف روانہ ہوچکے تھے۔

معظم علی کو پہلی بار نہایت شدت کے ساتھ اس بات کا احساس ہوا کہ محلّے کے وہ لوگ جن کے بیٹے جنگ کے لیے جاچکے ہیں۔ اسے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

شاہی محل کا داروغہ معظم علی کے باپ کا دوست تھا اور وہ ہر روز علی الصباح اس کے پاس جنگ کے تازہ حالات معلوم کرنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ داروغہ سے

ل کر واپس آیا تو اسے اپنی ماں کا چہرہ بے حد مغموم دکھائی دیا۔

"کیا ہوا امی جان؟" اس نے سوال کیا۔

"کچھ نہیں بیٹا! کوئی اچھی خبر آئی ہے؟"

"ہاں امی جان آج کی خبریں کچھ اچھی ہیں۔ مرہٹے چند جھڑپوں کے بعد پیچھے ہٹ گئے ہیں لیکن ابھی کوئی فیصلہ کن معرکہ نہیں ہوا۔ آپ اس قدر غمگین کیوں ہیں؟"

"بیٹا!" ماں نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے فرحت سے یہ توقع نہ تھی!"

"کیا ہوا امی جان؟" معظم نے بدحواس ہو کر سوال کیا۔ "فرحت نے کیا کہا؟"

"اس میں فرحت کا قصور نہیں بیٹا۔ اصل میں وہ لڑکیاں جو اس کے ساتھ آئی تھیں بہت بدتمیز تھیں۔"

"فرحت یہاں آئی تھی؟"

"ہاں وہ ابھی گئی ہے۔"

"آخر کیا کیا اس نے؟"

ماں نے اُٹھ کر ایک الماری سے کانچ کی چند چوڑیاں نکالیں اور معظم علی کو دکھاتے ہوئے کہا "یہ دیکھو! فرحت آج اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ آئی تھی۔ اس کے ساتھ سلطان خاں کی لڑکی بھی تھی۔ مجھے وہ کبھی پسند نہیں آئی۔ لیکن آج اس نے بہت زیادتی کی۔ پہلے اس نے یہ کہا کہ تم بزدلی کی وجہ سے فوج میں شامل نہیں ہوئے، پھر اس نے اپنی چوڑیاں اتار کر میرے سامنے رکھ دیں اور کہنے لگی معظم بھائی کو ہماری طرف سے یہ تحفہ دے دیجیے۔"

تھوڑی دیر کے لیے معظم علی کی رگوں کا خون سمٹ کر اس کے چہرے میں آگیا۔ اس نے کہا "اور فرحت نے کیا کہا؟"

"فرحت نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ اپنی سہیلیوں کا منہ بند کرے گی۔ لیکن وہ خاموشی سے ہنستی رہی۔"

"امی جان اگر آپ کو ایسی باتوں سے صدمہ ہوا ہے تو میں اکیلا مرہٹوں کے لشکر کے سامنے کھڑا ہو جاؤں گا۔ آپ اطمینان رکھیے۔ وقت آنے پر کوئی آپ کے بیٹے کو بزدل نہیں کہے گا اور وہ سلطان خاں جس کی صاحبزادی نے آپ کو میرے لیے چوڑیاں دی ہیں خود مرہٹوں کے حملے کی خبر سنتے ہی شہر سے ہجرت کے لیے تیار ہو گیا تھا اور میں نے اسے بڑی مشکل سے روکا تھا۔ امی جان میں فوج کے ساتھ اس لیے نہیں گیا کہ موجودہ حالات میں میرا مرشد آباد میں رہنا زیادہ ضروری ہے۔ شہر سپاہیوں سے قریباً خالی ہو چکا ہے۔ اگر دشمن نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر چند تیز رفتار دستے اس طرف بھیج دیئے تو یہ محلّہ تو درکنار شاہی محل بھی محفوظ نہیں رہے گا اور شہر سے باہر یہ ہمارا محلہ تو بہت ہی غیر محفوظ ہے۔ میں مرزا صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔"

"لیکن بیٹا خدا کے لیے فرحت کی شکایت نہ کرنا۔ اس کی نیت بری نہ تھی۔"

معظم علی نے کہا۔ "نہیں امی جان میں آصف اور افضل کی بہن کی شکایت نہیں کر سکتا لیکن یہ چوڑیاں سنبھال کر رکھیے۔"



معظم علی، حسین بیگ کے محل میں داخل ہوا تو وہ بیرونی احاطے میں بندوق سے نشانہ بازی کر رہا تھا اور آٹھ دس سپاہی اس کے گرد کھڑے تھے۔ معظم علی کچھ دیر خاموش کھڑا رہا اور جب حسین بیگ اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے کہا۔

"چچا جان آج میں کتب خانہ کی بجائے آپ کا اسلحہ خانہ دیکھنے آیا ہوں۔"

حسین بیگ مسکرایا۔ "تمھیں تلوار کی ضرورت ہے یا بندوق کی؟"

"ابھی مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ آپ کے کتب خانے میں ڈیڑھ ہزار کتابیں ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے اسلحہ خانے میں کتنا سامان ہے؟"

"اگر استعمال کرنے والے ہوں تو سامان بہت ہے۔ لیکن میں تمھاری اس اچانک گرمجوشی کی وجہ نہیں سمجھ سکا!"

معظم علی نے جواب دیا: "شہر فوج سے خالی ہو چکا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر دشمن نے ہوشیاری سے کام لیا تو مرشدآباد پر اچانک قبضہ کر لینا اس کے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ اور یہ محلہ تو بہت ہی غیر محفوظ ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو آپ کا مکان اس محلے کے لیے قلعے کا کام دے سکتا ہے۔ آپ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر مجھے کسی فوجی عہدہ کی ضرورت ہو تو آپ میری سفارش کر سکتے ہیں۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اس قلعے کا محافظ مقرر کر دیا جائے۔"

حسین بیگ نے کہا: "لیکن میرے پاس صرف پندرہ تربیت یافتہ سپاہی اور پانچ چھ بیکار نوکر رہ گئے ہیں۔ اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو تم اتنے آدمیوں کے ساتھ کیا کر سکو گے؟"

"آدمیوں کی فکر نہ کیجیے۔ خطرے کے وقت محلے کا ہر آدمی یہاں پہنچ جائے گا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے انھیں تربیت دینے کا موقع مل جائے۔ انھیں اسلحہ اور بارود کی ضرورت ہوگی اور یہ فراہم کرنا آپ کا کام ہوگا۔"

"برخوردار تم نے میرا اسلحہ خانہ نہیں دیکھا۔ میرے پاس کوئی اڑھائی سو بندوقیں اور تقریباً اتنے ہی پستول اور تلواریں ہیں۔ بارود اتنا ہے کہ اگر استعمال کرنے والے ہوں تو وہ ایک ہفتے میں بھی ختم نہیں ہوگا۔ دو توپیں جو میں نے پانچ سال قبل خریدی تھیں اندر پڑی ہوئی ہیں اور آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ انھیں کہاں نصب کیا جائے۔ اب اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو یہ فیصلہ اس قلعہ کا محافظ کرے گا۔"

"تو آپ کو میری خدمات منظور ہیں؟"

حسین بیگ نے ہنستے ہوئے جواب دیا: "معظم علی میں تمھیں اپنے قلعے کا محافظ اور اپنی ان افواج کا سپہ سالار مقرر کرتا ہوں جن کی تعداد سر دست پندرہ تربیت یافتہ اور چھ غیر تربیت یافتہ سپاہیوں سے زیادہ نہیں۔"

معظم علی نے کہا: "آپ کا سپہ سالار آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔"

حسین بیگ نے معظم کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "بیٹا میں تم سے کبھی مایوس نہ تھا۔"

معظم نے کہا: "ہمیں آج ہی اپنا کام شروع کر دینا چاہیئے۔ آج شام آپ محلے کے با اثر لوگوں کو یہاں جمع ہونے کی دعوت دیں!"

"بہت اچھا، لیکن میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمھیں اچانک یہ خیال کیسے آیا ہے کہ مرشدآباد کو واقعی کوئی خطرہ ہے؟"

"چچا جان اگر خطرہ نہ ہو تو بھی ہمیں تیار رہنا چاہیے۔ ابھی آپ نشانہ بازی کی مشق کر رہے تھے۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا تھی کہ آپ ہنگامی حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہتے ہیں۔"

حسین بیگ نے جواب دیا: "یہ درست ہے کہ محاذ پر اپنے سپاہی بھیج دینے کے بعد مجھے کبھی کبھی یہ خیال پریشان کرتا ہے کہ اگر کوئی سر پھرا اس طرف آنکلے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ مجھ سے زیادہ ہمارے گھر میں فرحت ایسی باتیں سوچا کرتی ہے۔ جس دن سے آصف اور افضل گئے ہیں۔ وہ صبح شام باقاعدہ نشانہ بازی کی مشق کیا کرتی ہے۔ ایک دن اس نے خواب دیکھا تھا کہ ڈاکو ہمارے گھر میں گھس آئے ہیں۔ احتیاط کرنا اچھی بات ہے تاہم میں یہ نہیں سمجھتا کہ مرہٹے محاذِ جنگ چھوڑ کر اس طرف آنکلیں گے۔ لیکن تم اس مسئلہ میں بہت سنجیدہ ہو اور تمھاری باتوں سے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مرہٹوں کا لشکر واقعی مرشدآباد کا رُخ کر رہا ہے۔"

معظم علی نے کہا: "چچا جان میرے خدشات بلاوجہ نہیں۔ مرہٹے فتح کی بجائے لوٹ مار کے لیے آئے ہیں۔ اب تک انھوں نے اپنے راستے کی بستیوں اور شہروں کو برباد کیا ہے لیکن بہت کم مقامات ایسے ہیں جن پر انھوں نے قبضہ کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ بنگال کی زیادہ دولت مرشدآباد میں ہے اور ہمارے غدار

جوان کے ساتھ جا ملے ہیں۔ انھیں یہ بھی بتا چکے ہوں گے کہ مرشد آباد پر حملہ کرنے سے کسی فائدے کی امید نہ ہو تو بھی وہ محاذِ جنگ سے ہماری فوج کی توجہ ہٹانے کے لیے چند دستے اس طرف بھیج سکتے ہیں۔ آپ میر حبیب کو جانتے ہیں وہ ایک ہوشیار آدمی ہے۔ اور مرشد آباد کے چپہ چپہ سے واقف ہے۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو اب تک مرشد آباد پر قبضہ کر چکا ہوتا۔ آپ نے سنا ہو گا کہ جگت سیٹھ نے اپنے محل کی حفاظت کے لیے ڈیڑھ سو آدمی بھرتی کیے ہیں اور ہمارے استاد شیر علی کو بھی ملازم رکھ لیا ہے۔ آج صبح جب میں محاذِ جنگ کی خبریں معلوم کرنے کے لیے شاہی محل کے داروغہ کے پاس جا رہا تھا تو راستے میں شیر علی خاں ملے اور انھوں نے اصرار کیا کہ میں بھی جگت سیٹھ کی ملازمت کروں۔ لیکن نے جواب دیا کہ میں ایک کروڑ پتی مہاجن کے خزانوں کی حفاظت کرنے کی بجائے اپنے محلّے کے کسی غریب آدمی کے دروازے پر پہرہ دینا بہتر سمجھتا ہوں۔ چچا جان ہو سکتا ہے کہ میرے خدشات محض وہم ثابت ہوں۔ لیکن جب تک جنگ ختم نہیں ہوتی اور ہماری فوج واپس نہیں آتی میں اطمینان کا سانس نہیں لے سکتا۔ اب اگر اجازت ہو تو میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ کے محل کی دفاعی حالت کیسی ہے اور اسے بہتر بنانے کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"بہت اچھا تم اپنا کام کرو، میں محلّے کے آدمیوں کو دعوت بھیجتا ہوں" یہ کہہ کر حسین بیگ اپنے نوکروں کی طرف متوجہ ہوا ۔۔ "تم سب اچھی طرح سن لو کہ آج سے معظم علی تمھارا حاکم ہوگا اور اسے کسی شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔"



شام کے وقت حسین بیگ کے دسترخوان پر محلّے کے تیس چیدہ چیدہ آدمی جمع تھے پہلے حسین بیگ نے انھیں جمع کرنے کی غرض و غایت بیان کی اور اس کے بعد معظم علی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مہمانوں کی اکثریت یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھی کہ مرشد آباد کو کوئی خطرہ پیش آسکتا ہے۔ وہ محض احتیاط کے طور پر اپنے اپنے زیرِ اثر لوگوں کو منظم کرنے کے لیے تیار تھے

صرف دس آدمی ایسے تھے جنھیں حسین بیگ اور معظم علی کے خیالات سے پوری طرح اتفاق تھا اور جنھوں نے ان کے ساتھ صدقِ دل سے تعاون کا وعدہ کیا۔

اگلے دن صرف بیس نوعمر لڑکے اور تیس بڑی عمر کے آدمی جن میں سے اکثر محلّے کے غریب دکاندار، مزدور اور چند امیر گھروں کے نوکر تھے۔ حسین بیگ کے مکان پر حاضر ہوئے حسین بیگ کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی لیکن معظم علی کے نزدیک یہ ابتدا بُری نہ تھی۔ اس نے اسلحہ خانے سے بندوقیں نکال کر ان میں تقسیم کیں اور انھیں محلّے سے باہر ایک کھلے میدان میں نشانہ بازی کے لیے لے گیا۔ دوسرے دن پندرہ اور آدمی ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور ایک ہفتہ کے بعد معظم علی سے فوجی تربیت حاصل کرنے والے رضاکاروں کی تعداد ڈیڑھ سو تک پہنچ گئی۔

اس کے اپنے دو نوکر صابر اور جمال خاں بھی رضاکاروں میں شامل ہو چکے تھے۔ جمال خان چند برس بنگال کی فوج میں ملازمت کر چکا تھا۔ لیکن صابر کو تلوار اور بندوق سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ صرف جمال خاں کی رقابت کی وجہ سے رضاکاروں کی پریڈ میں شامل ہوتا تھا۔ تین دن اپنے ساتھیوں کے قہقہے سننے کے بعد ایک روز محض اتفاق سے اس کا پہلا نشانہ ہدف پر لگا اور وہ بندوق وہیں پھینک کر بھاگتا ہوا معظم علی کے پاس پہنچا اور بلند آواز میں چلّایا:

"سرکار میرا نشانہ ٹھیک ہو گیا ہے اب مجھے چھٹی دیجیے، گھر میں بہت کام ہے۔"

معظم علی کی یہ مہم اب آہستہ آہستہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر رہی تھی۔ کچھ لوگ اپنی مرضی سے اور کچھ مجبوراً اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ ہر روز تین چار گھنٹے رضاکاروں کو تربیت دینے کے بعد حسین بیگ کے محل میں چلا جاتا۔ جہاں حسین بیگ نے اس کی ہدایات کے مطابق چالیس مزدور پرانی دیواریں مرمت کرنے اور مختلف مقامات پر مورچے بنانے کے کام پر لگا رکھے تھے۔ معظم علی ان کا کام دیکھتا۔ محل کے مختلف گوشوں میں چکر لگاتا اور اگر کوئی نئی بات ذہن میں آتی تو انھیں ہدایات دے کر چلا آتا۔ پھر وہ محلّے کی گلیوں میں پھرتا اور خاص خاص مقامات

پر مورچے تعمیر کرنے کا مشورہ دیتا۔ چند دنوں میں محلّے کی ہر گلی کے ناکے پر پھاٹک لگ چکے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ لوگ بھی اس کام میں دلچسپی لینے لگے جو چند دن پہلے اپنے گھروں میں بیٹھ کر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد قریباً ہر روز اس کے چند چیدہ چیدہ ساتھی حسین بیگ کے مکان پر جمع ہو کر دن بھر کی کارگذاری کا جائزہ لیتے اور اگلے دن کے لیے پروگرام بناتے۔



ایک دن مرزا حسین بیگ کی دعوت پر شیر علی نے اس کی حویلی کے دفاعی انتظامات کا معائنہ کیا۔ ڈیوڑھی سے گزر کر اندر داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ بیرونی فصیل کے ساتھ ساتھ تھوڑے فاصلے پر اینٹوں کے ستون تعمیر ہو رہے ہیں۔ اس کے استفسار پر معظم علی نے بتایا کہ فصیل زیادہ چوڑی نہیں۔ جب ان ستونوں پر لکڑی کے تختے ڈال دیئے جائیں گے تو سپاہیوں کے لیے جگہ نکل آئے گی۔ فصیل کا کنارہ ذرا اونچا ہوگا۔ اور یہ سپاہیوں کے لیے ڈھال کا کام دے گا۔ باقی تین طرف یہ کام ختم ہو چکا ہے۔ چلیے آپ کو دکھاتا ہوں۔"

شیر علی نے بیرونی احاطے میں فصیل کا چکر لگانے کے بعد حسین بیگ سے کہا "مرزا صاحب آپ نے تو اس مکان کو قلعہ بنا دیا ہے۔"

معظم علی نے کہا "ڈیوڑھی کی چھت پر بھی ہمارا مورچہ کافی مضبوط ہے۔ لیکن یہ سب عارضی انتظامات ہیں۔ اگر وقت ہوتا تو میں مرزا صاحب کو یہ چار دیواری گرا کر نئی فصیل تعمیر کرنے کا مشورہ دیتا۔ چلیے آپ کو اندرونی حصّہ دکھاتا ہوں۔"

شیر علی ان کے ساتھ اندرونی احاطے میں داخل ہوا۔ معظم علی نے اسے رہائشی مکان کی نچلی منزل کی کھڑکیوں اور دروازوں کے پیچھے ریت کی بوریوں کے مورچے دکھانے کے بعد کہا "آپ اسی قسم کے انتظامات بالائی منزل میں بھی دیکھیں گے۔ میں نے چھتوں پر بھی مورچے بنوا دیئے ہیں اگر دشمن اندرونی احاطے تک پہنچ گیا تو اسے ہر کمرے کے دروازوں اور کھڑکیوں کے علاوہ چھتوں اور برآمدوں کے مورچوں سے گولیوں کی بارش کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تاہم

میں ان انتظامات کو کافی نہیں سمجھتا۔ ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ اندرونی احاطے کی دیواریں بہت کمزور ہیں۔ اور ان کی بلندی بھی زیادہ نہیں۔۔ دشمن بیرونی احاطے میں داخل ہونے کے بعد انھیں آسانی سے پھاند کر اندر آسکتا ہے ان کی بنیاد اس قدر کمزور ہے کہ انھیں اونچا بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے میرا ارادہ ہے کہ اس کے آگے ایک خندق کھود دی جائے اور اسے پانی سے بھر دیا جائے۔ اس کے بعد اگر وقت ملا اور مرزا صاحب نے میری تجویز سے اتفاق کیا تو خندق کے ساتھ بانس گاڑ دیئے جائیں گے، جو قریباً ایک گز زمین کے اندر اور کوئی اڑھائی گز زمین کے باہر ہوں گے۔ بانس کی یہ باڑھ زیادہ مضبوط نہیں ہوسکتی لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ دشمن دیوار پھاندنے اور خندق عبور کرنے کے بعد براہِ راست رہائشی مکان میں ہمارے آخری مورچوں پر حملہ نہیں کر سکے گا۔ مکان کے مورچوں سے ہماری گولیاں خندق میں گرنے والوں کو سر اٹھانے کا موقع نہیں دیں گی۔ مرزا صاحب کے پاس دو توپیں ہیں اور انھیں دروازے کے سامنے نصب کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اس طرف صحن میں ایک کھائی کھودی جائے گی جس میں پچاس ساٹھ سپاہی چھپ کر بیٹھ سکیں گے۔ اگر دشمن نے دروازہ توڑ کر اندر آنے کی کوشش کی تو اسے سب سے پہلے ہماری توپوں کی آتش بازی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پھر بھی یہ تمام انتظامات عارضی ہیں اور ایک غیر متوقع حملے کے پیش نظر کیے گئے ہیں۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ مرہٹے بیرونی فصیل توڑنے یا پھاندنے کے بعد کسی منظم فوج کی بجائے ایک میلے کی بھیڑ کی شکل میں اندرونی احاطے میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ اور ان کا نصب العین صرف لوٹ مار ہوگا۔ اگر ہم نے ایک بار ان کے دانت کھٹے کر دیئے تو وہ دوبارہ حملہ کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔"

شبیر علی نے کہا "لیکن برخوردار! اتنے بڑے کام کے لیے ایک طویل عرصہ چاہیئے۔ تمھارے خیال میں ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں کتنا وقت لگے گا؟"

"اگر پچاس ساٹھ آدمی روز کام پر لگا دیئے جائیں تو یہ کام چند دن میں ختم ہوسکتا ہے لیکن

بدقسمتی سے مرزا صاحب کو میری بہت سی تجاویز سے اتفاق نہیں ۔"

حسین بیگ نے شیر علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "مجھے معظم کی کسی تجویز سے اختلاف نہیں لیکن اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بہت وقت چاہیے ۔ اور پھر اگر ہمارا یہ وہم غلط ثابت ہوا کہ مرہٹوں کی فوج محاذ جنگ چھوڑ کر اس طرف آنکلے گی تو شہر کے لوگ میرا مذاق اڑائیں گے ۔ اوروں کو تو چھوڑیئے میرے اپنے بیٹے واپس آکر یہ کہیں گے کہ اباجان آپ کو کیا ہوگیا تھا ۔ اب بھی یہ حالت ہے کہ مرشدآباد میں میرے بعض دوست میری دماغی حالت پر شبہ کرتے ہیں ۔"

شیر علی نے کہا: "مرزا صاحب! لوگوں کی نکتہ چینی کی پروا نہ کیجیے ۔ خدا کرے کہ مرشدآباد کے متعلق ہمارے خدشات بے بنیاد ثابت ہوں لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ مرہٹے اگر میدان جنگ سے شکست کھا کر واپس بھی چلے گئے تو ہمیں مستقبل میں کوئی اور خطرہ پیش نہیں آسکتا ۔ موجودہ دور میں ہمیں ہر وقت غیر متوقع حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے ۔ عقلمند لوگ ہمیشہ بارش سے پہلے اپنے مکانوں کی چھتیں مرمت کرتے ہیں اور موجودہ زمانے میں بارش سے زیادہ دشمن کے حملے کے متعلق سوچنا پڑتا ہے ۔ بعض گھٹائیں برسات کے موسم میں بھی برسے بغیر گزر جاتی ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ جو لوگ بارش کے آثار دیکھتے ہی اپنی چھتوں اور پرنالوں کی مرمت کا کام شروع کر دیتے ہیں وہ احمق ہیں ۔"

حسین بیگ نے کہا: "محلے میں میرے متعلق یہ بات بھی مشہور ہو چکی ہے کہ میرے پاس بڑا خزانہ ہے اور میں یہ سب کچھ اس کی حفاظت کے لیے کر رہا ہوں ۔"

شیر علی نے کہا: "مرزا صاحب آپ اپنا کام جاری رکھیے ۔ اگر آپ کے پاس خزانہ نہیں تو شاید کسی دن خزانوں والے یہاں پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں ۔ جگت سیٹھ اپنے خزانے کی حفاظت کے لیے بہت فکر مند ہے ۔ اب تک وہ اپنے محل کو دفاعی لحاظ مضبوط بنانے کے لیے ہزاروں روپے خرچ کر چکا ہے ۔ مجھے اس نے اپنے محل کا محافظ مقرر کیا ہے لیکن اب

تک میں نے جو کچھ کیا ہے وہ معظم علی کی اس کارگزاری کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا ۔ معظم علی نے اس محلے کے لوگوں میں جو مدافعانہ جذبہ بیدار کیا ہے وہ قابل تحسین ہے ۔ لیکن جگت سیٹھ نے جو کرائے کے سپاہی بھرتی کیے ہیں ان میں سے بعض کے متعلق تو مجھے یہ اندیشہ ہے کہ خطرے کے وقت وہ شاید اپنی بندوقوں کی حفاظت بھی نہ کر سکیں ۔"

وہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ حویلی کی دوسری طرف بندوق چلنے کی آواز سنائی دی ۔ شیر علی نے چونک کر کہا: "یہ بندوق کی آواز شاید اندر سے آئی ہے ۔"

حسین بیگ مسکرایا: "یہ افضل کی بہن ہوگی ۔ وہ بالائی منزل کے دریچے سے بندوق چلانے کی مشق کیا کرتی ہے ۔"

تھوڑی دیر اور باتیں کرنے کے بعد شیر علی نے حسین بیگ سے رخصت چاہی ۔ معظم علی اسے ڈیوڑھی تک چھوڑنے کے لیے آیا ۔ دروازے پر پہنچ کر شیر علی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "معظم آج جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس کے بعد مجھے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ کئی سال فوج میں ملازمت کرنے کے بعد بھی تمھارے مقابلہ میں میری معلومات بہت کم ہیں ۔ میں یہ چاہتا ہوں تم کسی دن تھوڑی دیر کے لیے جگت سیٹھ کے محل میں آکر میرے انتظامات کا جائزہ لو ۔ یقیناً تم مجھے کوئی کارآمد مشورے دے سکو گے ؟"

"آپ جس وقت حکم دیں ۔ میں حاضر ہوں ۔"

"اگر فرصت ملے تو آج ہی کسی وقت آجاؤ!"

"بہت اچھا ۔ میں آج ظہر کی نماز کے بعد حاضر ہو جاؤں گا ۔"



چند دن بعد حسین بیگ کے محل کے بیرونی احاطے اور فصیل کے دفاعی انتظامات مکمل ہوگئے تو معظم علی نے اندرونی چار دیواری کے ساتھ خندق کھودنے کو کہا ۔

حسین بیگ نے جواب دیا: "جو کچھ ہم کر چکے ہیں کافی ہے ۔ ہمیں اس گھر کا حلیہ اس قدر

نہیں بگاڑنا چاہیئے کہ سارا مکان گرا کر از سر نو تعمیر کرنا پڑے "

"بہت اچھا چچا جان! جیسے آپ کی مرضی۔ اتنی تیاری سے کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو ہم دشمن کو چند گھنٹوں کے لیے روک سکیں گے۔"

معظم علی یہ کہہ کر وہاں سے چلا آیا لیکن حسین بیگ کے کانوں میں اس کے الفاظ دیر تک گونجتے رہے وہ سارا دن بے چین رہا اور رات کے وقت بھی اسے اچھی طرح نیند نہ آئی۔

اگلے دن علی الصباح معظم علی اپنے گھر میں گہری نیند سو رہا تھا کہ صابر نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا "سرکار! مرزا صاحب باہر کھڑے ہیں۔"

"مرزا حسین بیگ؟" معظم علی نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں سرکار۔ شاید وہ کہیں جا رہے ہیں۔"

معظم علی جلدی سے اٹھا اور بھاگتا ہوا باہر نکلا۔

"آپ! اس وقت؟" اس نے حسین بیگ کو دیکھتے ہی کہا۔

"دیکھو بیٹا!" حسین بیگ نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "کل تم سے باتیں کرنے کے بعد میں نے یہ سوچا کہ جب اتنا کچھ کیا ہے تو خندق بھی کھود دی جائے۔ لیکن وہ بس اتنی گہری ہو کہ دشمن اندرونی دیوار پھاندنے کے بعد آسانی سے مکان پر حملہ نہ کر سکے۔ لیکن تم یہ وعدہ کرو کہ اس کے بعد خندق کے آگے بالنس گاڑنے کی تجویز پر زور نہیں دو گے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ مرشد آباد کے لوگ مجھے سچ مچ پاگل سمجھنے لگ جائیں۔"

معظم علی جانتا تھا کہ ایک کام ختم ہونے کے بعد وہ خود بخود دوسرا کام شروع کروا دیں گے۔ تاہم اس نے کہا۔ "چچا جان میں تو خندق کے لیے بھی آپ کو مجبور نہیں کرتا۔"

"نہیں نہیں خندق ضرور کھودی جائے گی۔ میں اس کا فیصلہ کر چکا ہوں لوگ بھونکتے رہیں مجھے ان کی پروا نہیں۔"

"بہت اچھا چچا جان۔ لیکن آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں دیہات سے آدمی بلانے کے لیے جا رہا ہوں۔ یہ شہر کے لوگ بیکار ہیں۔ یہ کام کرنے کی بجائے میرا مذاق اڑائیں گے۔ دوپہر تک میرے علاقے کے ڈیڑھ دو سو کسان یہاں پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد اگر زیادہ آدمیوں کی ضرورت پڑی تو دریا پار کی جاگیر کے کسانوں کو بھی بلوا لوں گا لیکن یہ کام چار دن کے اندر اندر ختم ہو جانا چاہیئے۔" حسین بیگ نے یہ کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

تیسرے پہر حسین بیگ کے مکان میں خندق کی کھدائی کا کام شروع ہو چکا تھا۔ اور اس کے لنگر خانے میں کوئی دو سو آدمیوں کے لیے کھانا تیار ہو رہا تھا۔

اگلے دن حسین بیگ کا ایک دوست اس کے پاس آیا اور اس نے پوچھا: "مرزا صاحب یہ کیا ہو رہا ہے؟"

مرزا صاحب سے پہلے بھی کئی آدمی یہ سوال کر چکے تھے۔ انھوں نے جھنجھلا کر کہا۔

"دیکھیے صاحب یہ میرا اپنا مکان ہے۔ اگر میں اسے کھود کر ایک تالاب بنوا دوں تو بھی آپ کو یہ پوچھنے کا حق نہیں۔"

دوست نے دوبارہ اس موضوع پر زبان کھولنے کی ضرورت محسوس نہ کی جب وہ چلا گیا تو حسین بیگ نے ایک نوکر سے کہا:

"دیکھو آئندہ جو لوگ مجھ سے ملنے آئیں انھیں لانے کی بجائے باہر کی بیٹھک میں روک لیا کرو!"

چند دن بعد خندق تیار ہو گئی اور حسین بیگ نے حویلی سے بارش کا پانی خارج کرنے والی نالیوں کا رخ اس طرف پھیر دیا۔ اس کے بعد اگلے دن محلے کے لوگوں نے دیکھا کہ حسین بیگ کی حویلی میں بالنسوں سے لدے چھکڑے چلے آ رہے ہیں وہ حیران تھے۔ لیکن کسی کو حسین بیگ کے سامنے اپنی حیرانی کے اظہار کی جرأت نہ ہوئی۔

اس دوران میں معظم علی بلاناغہ محلے کے رضاکاروں کو تربیت دیتا رہا لیکن ابتدائی

جوش وخروش رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑنے لگا تھا اور رضاکاروں کی تعداد بڑھنے کی بجائے روز بروز کم ہو رہی تھی تاہم اسے اس بات سے اطمینان تھا کہ وہ محلے کے اکثر لوگوں کو بندوق چلانا سکھا چکا ہے۔ اب وہ لوگ بھی جو بظاہر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ درپردہ اپنے اپنے گھروں کی حفاظت کے انتظامات کر رہے تھے۔ معظم علی کی تحریک کے اثرات مرشد آباد کے دوسرے محلوں میں بھی پہنچ چکے تھے اور نوجوانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد شہریوں میں مدافعانہ شعور بیدار کرنے کے لیے میدان میں آ چکی تھی۔



ایک دن معظم علی نے محلے کے تمام رضاکاروں کو حسین بیگ کے مکان میں جمع کیا اور ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "بھائیو اور بزرگو! چند ہفتے قبل مرشد آباد سے فوج کی روانگی کے بعد میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ اگر خدانخواستہ مرشد آباد کو کوئی خطرہ پیش آیا تو شہر سے باہر ہونے کی وجہ سے ہمارا محلہ انتہائی غیر محفوظ ہوگا۔ لیکن آج میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ شاہی محل کے بعد ہمارا محلہ سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ اب اگر کسی نے ہم پر حملہ کیا تو وہ ہمیں بھیڑوں کی طرح نہیں ہانک سکے گا۔ پہلے تو ہم دشمن کو گلیوں کے دروازوں سے باہر روکیں گے۔ پھر اگر وہ ہمارے ابتدائی مورچے توڑ کر اندر گھس آیا تو ہم اپنے مکانوں کی چھتوں اور دیواروں سے گولیاں برسائیں گے۔ اس کے بعد اگر ہمیں اور پیچھے ہٹنا پڑا تو یہ حویلی ہمارے لیے آخری حصار ثابت ہوگی۔ خطرے کے وقت محلے کی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو یہاں پناہ مل سکے گی اور ہم اپنے اپنے مورچوں میں بیٹھ کر ان کی حفاظت کر سکیں گے۔ آپ اس حویلی کے اندر اور باہر اپنا اپنا مورچہ دیکھ چکے ہیں۔ اب وہ لائحہ عمل سن لیں جس کے مطابق ہمیں کام کرنا ہوگا۔ خطرے کے وقت سب سے پہلے محلے کے اندر اور باہر مختلف مقامات پر پہرہ دینے والے رضاکار نقارے بجائیں گے۔ اس وقت آپ کو چاہیئے کہ آپ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے اپنے گھر کی عورتوں اور بچوں کو ابھی سے یہ سمجھا دیں کہ وہ کسی بدحواسی کا مظاہرہ نہ کریں اور نقارے کی

آواز سنتے ہی اس حویلی کے رہائشی مکان میں جمع ہو جائیں۔ یہاں اتنی جگہ ہے کہ محلے کی تمام عورتیں اور بچے سما سکیں۔ نقارے کی آواز کے تھوڑی دیر بعد حویلی کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔ آج دوپہر کے بعد ہم اس کی مشق بھی کریں گے۔

شام سے قبل کسی وقت نقارے بجائے جائیں گے اور ہم یہ دیکھیں گے کہ کسی غیر متوقع صورتِ حالات کا سامنا کرنے کے لیے ہم کس حد تک تیار ہیں۔ دن کے وقت عورتیں اور بچے اپنی اپنی جائے پناہ دیکھ لیں گے اور اس کے بعد رات کو کسی وقت یہ مشق دوبارہ کی جائے گی۔"

ایک عمر رسیدہ آدمی نے اٹھ کر سوال کیا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ رات کے وقت بھی ہمارے بال بچوں کو اٹھ کر اس طرف بھاگنا پڑے گا؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "ہاں لیکن رات کے اندھیرے میں وہ بھاگ نہیں سکیں گے انہیں تاریک گلیوں سے گزر کر یہاں پہنچنا ہوگا۔ حویلی کے اندر صرف چند منٹ کے لیے مشعلیں جلائی جائیں گی تاکہ وہ اپنی اپنی جائے پناہ دیکھ سکیں۔"

ایک اور آدمی نے اٹھ کر کہا۔ "لیکن یہ تو عجیب بات ہوگی۔ عورتیں اور بچے رات کے وقت یہاں کیسے پہنچیں گے؟"

تیسرا بولا۔ "ہم آپ کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن رات کے وقت عورتوں اور بچوں کا یہ تماشا ٹھیک نہیں ہوگا۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ دشمن صرف دن کے وقت حملہ کرے گا تو میں اپنی ماؤں اور بہنوں کو یہ تکلیف دینا گوارا نہ کرتا۔ لیکن موجودہ حالات میں میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ رات کے وقت اگر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو تو بھی ہمیں یہ مشق ضرور کرنی چاہیئے میں جانتا ہوں کہ بعض کوتاہ اندیش لوگ روزِ اول سے ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ گذشتہ چند برس میں ہندوستان کے بڑے بڑے شہر کئی بار لٹ چکے ہیں اور عافیت پسند لوگوں نے وہ مصائب اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں جو ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔

"مرہٹے بھاگ گئے" کے نعروں میں دب کر رہ گئی۔

اس نے ایک رضاکار کو گردن سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا: "تمھیں فصیل سے اترنے کی اجازت کس نے دی۔ جاؤ اپنے مورچے میں!"

نوجوان مرعوب سا ہو کر دوبارہ لکڑی کی سیڑھی سے فصیل پر چڑھ گیا۔ دوسرے رضاکار تذبذب کی حالت میں کھڑے تھے۔ معظم علی غضب ناک ہو کر چلایا: "تم کیا دیکھ رہے ہو۔ جاؤ اپنے مورچوں میں!"

وہ بادل ناخواستہ دوبارہ اپنے مورچوں میں چلے گئے۔ لیکن ان کے آگے باقی ساری فصیل کے مورچے خالی ہو چکے تھے اور دروازے کی سمت لوگوں کے نعرے ہر آن بلند ہو رہے تھے۔ معظم علی بھاگتا ہوا ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔ ڈیوڑھی کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا۔ معظم علی کو دیکھ کر ایک رضاکار نے بلند آواز میں کہا: "ہماری فوج کو فتح ہوئی ہے۔ مرہٹے اب اس طرف نہیں آئیں گے۔ اب آپ کو اس محلے کی فکر نہیں کرنی چاہیئے۔"

معظم علی نے کہا: "اگر فتح کی خبر سننے کے بعد تمھاری افراتفری کی یہ حالت ہے تو مجھے اب زیادہ فکر مند ہونا چاہیئے۔ فتح کی خبر کون لایا ہے؟"

رضاکار نے جواب دیا۔ "اشرف خاں شاہی محل سے یہ اطلاع لے کر آیا تھا۔ ہم گلی کا دروازہ بند کر چکے تھے، وہ آ پہنچا۔"

"اور تم نے دروازہ کھول دیا؟"

"ہاں۔"

"لیکن میری ہدایت تھی کہ جب تک دوسرا نقارہ نہ بجایا جائے۔ گلیوں کے دروازے نہ کھولے جائیں۔"

"لیکن وہ فتح کی خبر لے کر آیا تھا۔"

معظم علی نے کہا: "تم جیسے احمق کبھی کبھی بڑی سے بڑی فتح کو شکست میں بدل دیتے

ہیں۔ اگر مجھے وہ اختیارات ہوتے جو فوج کے ایک افسر کو اپنے ماتحت سپاہی پر ہوتے تو میں تمھیں بدترین سزا دیتا۔"

دوسرے رضاکار نے کہا: "لیکن جناب اب تو کوئی بھی اپنے مورچے پر نہیں۔ گلیوں کے تمام پہریدار ڈیوڑھی سے باہر کھڑے ہیں۔"

معظم علی لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتا ہوا آگے بڑھا۔ چند بچے اور عورتیں جن کے لیے اندر یا باہر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا ڈیوڑھی کی دیواروں کے ساتھ سمٹی ہوئی تھیں۔ باہر اشرف خاں کے گرد لوگوں کا ہجوم تھا اور وہ ان کے سامنے جنگ کی ایسی تفصیلات بیان کر رہا تھا جن کا واقعات سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ شاہی محل کے ایک سپاہی نے صرف یہ سنا تھا کہ مرہٹے پسپا ہو رہے ہیں۔ لیکن وہ لوگوں کو یہ بتا رہا تھا کہ بنگال کی افواج میدان میں دشمن کی لاشوں کے ڈھیر لگانے کے بعد سرحد کے پار ان کا تعاقب کر رہی ہیں۔

چند عورتیں یہاں بھی ہجوم کے درمیان پھنسی ہوئی تھیں اور بچے بلبلا رہے تھے۔ معظم علی نے لوگوں کو ملامت کی اور وہ ایک طرف ہٹ گئے۔

اشرف خاں، معظم علی کو دیکھ کر گھوڑے سے اتر پڑا اور اس نے کہا: "جناب آپ فتح کی خبر سن چکے ہیں؟"

"میں سن چکا ہوں۔ اور اب میں آپ لوگوں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ یہاں سے ہٹ جایئے چند خواتین ڈیوڑھی کے اندر پھنسی ہوئی ہیں۔"

معظم علی یہ کہہ کر واپس مڑا اور اس نے حسین بیگ کے ایک نوکر کو جو ابھی تک ڈیوڑھی کی چھت پر اپنے مورچے میں بیٹھا ہوا تھا۔ نقارہ بجانے کے لیے کہا۔ ایک عمر رسیدہ آدمی نے ہنستے ہوئے کہا: "اب نقارہ بجانے کی کیا ضرورت ہے۔ اب تو یوں بھی سب لوگ چھٹی کر چکے ہیں۔"

معظم علی نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اندرونی صحن کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے سامنے عورتوں اور بچوں کا ہجوم تھا۔ معظم علی

انھیں دیکھ کر بوٹ آیا اور دروازے کے پاس ہی چھپر کے نیچے پڑی ہوئی ایک کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد حسین بیگ کا ایک نوکر باہر نکلا اور معظم علی نے اس سے پوچھا: "مرزا صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ اس وقت کتب خانے میں ہیں:"

"اچھا اب تم خواتین سے کہو کہ ان کے لیے راستہ خالی ہو چکا ہے:"

"بہت اچھا۔ لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جو بندوقیں اسلحہ خانے سے تقسیم کی گئی تھیں ان کے متعلق کیا ہدایت ہے؟"

معظم علی نے کہا "ابھی انھیں رضاکاروں کے پاس رہنے دو۔"



تھوڑی دیر بعد محلے کے ہر گھر میں مرزا حسین بیگ کے متعلق اس قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔

"مرزا حسین بیگ کو کسی نجومی نے بتایا تھا کہ مرہٹے تمھارے محل پر حملہ کریں گے"۔۔۔

"اس نے خواب دیکھا تھا کہ ڈاکو اس کے گھر میں گھس آئے ہیں۔" حسین بیگ ایک سیدھا سادہ آدمی ہے۔ اور محمود علی کے لڑکے نے اسے بیوقوف بنا لیا ہے۔"

رات کے وقت فتح کی خوشی میں محلے کی ہر گلی میں چراغ جلائے جا رہے تھے۔ جگت سیٹھ کے محل میں آتش بازی چلائی جا رہی تھی۔ حسین بیگ کے محل میں بھی چراغاں ہو رہا تھا۔ بازاروں اور گلیوں میں چہل پہل تھی۔ معظم علی عشا کی نماز کے بعد اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا گزشتہ چند دن کے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ جمال خاں نیچے صحن میں اپنی کھاٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک معظم علی کو گلی میں شور سنائی دیا اور اس نے اوپر سے آواز دی:

"صابر! صابر!"

جمال خاں نے جواب دیا: "جی صابر ابھی باہر گیا ہے۔"

معظم علی نے کہا "اچھا تم جا کر دیکھو باہر کیا ہو رہا ہے۔"

جمال خاں بھاگ کر باہر نکلا۔ لیکن چند منٹ تک وہ واپس نہ آیا تو معظم علی نیچے اتر آیا جب وہ باہر نکلا تو جمال خاں اور صابر واپس آتے دکھائی دیے۔

معظم علی نے کہا: "بہت دیر لگائی تم نے کیا بات تھی؟"

جمال خاں نے جواب دیا۔ "جی کچھ نہیں محلے کے چند لڑکے صابر کے ساتھ لڑ رہے تھے، میں پہنچا تو وہ بھاگ گئے۔"

"کیا بات تھی صابر؟"

صابر نے جواب دیا۔ "جی وہ آپ کا مذاق اڑا رہے تھے۔ انھوں نے مرزا صاحب کے متعلق بھی بہت واہیات باتیں کیں۔ وہ کہتے تھے کہ آپ نے لوگوں کو بیوقوف بنایا تھا اور مرزا صاحب کے ساتھ کسی نجومی نے مذاق کیا تھا۔ ان باتوں پر مجھے غصہ آ گیا۔"

"میں جانتا ہوں جو کچھ انھوں نے کہا ہوگا۔ تمھیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"جی نہیں ذرا نکسیر پھوٹ گئی ہے۔ لیکن میں نے دو لڑکوں کو خوب پیٹا ہے۔"

"بہت برا کیا تم نے۔ بڑوں کو بچوں کے ساتھ نہیں لڑنا چاہیئے!"

"جناب وہ بچے کہاں تھے، ایک تو مجھ سے بھی آدھ بالشت اونچا تھا۔"

"اچھا اب آرام کرو اور آئندہ اگر کوئی مجھے کچھ کہے تو تمھیں لڑنے کی ضرورت نہیں۔"

تیسرا باب

اگلے دن آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ معظم علی صبح کا ناشتہ کھا کر ایک کتاب پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔ دس بجے کے قریب حسین بیگ کا نوکر آیا اور اس نے اطلاع دی کہ مرزا صاحب آپ کو یاد کرتے ہیں۔

معظم علی محل میں پہنچا، حسین بیگ دیوان خانے کے برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے معظم علی کو دیکھتے ہی کہا: "آؤ بیٹا میں ابھی شاہی محل کے ناظم اور مرشدآباد کے فوجدار سے مل کر آیا ہوں۔ فتح کی خبر درست ہے۔ ہماری افواج نے کٹوے پر دوبارہ قبضہ کرلیا ہے۔ مرہٹوں نے شہر خالی کرنے سے پہلے کٹوے اور آس پاس کی بستیوں میں خوراک کے تمام ذخیرے تباہ کر دیئے تھے۔ لوگ بھوکوں مر رہے ہیں۔ اور فوج کا سامان رسد بھی ختم ہوچکا ہے۔ آج مرشدآباد سے اناج بھیجا جا رہا ہے۔ مرہٹے بھاری نقصان اٹھانے کے بعد کٹوے سے چند میل پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ لیکن ابھی یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ واپس چلے جائیں گے یا کوئی اور محاذ تلاش کریں گے۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ مرشدآباد کو اب کوئی خطرہ نہیں۔ تمھیں محلے کے طرزِ عمل سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ گھروں میں بیٹھ کر ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ لیکن ہم نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ لوگ بکتے رہیں مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں فوج کے واپس آجانے پر بھی اپنی حویلی کے دفاعی انتظامات بہتر بنانے کا کام جاری رکھوں گا۔ برسات کے بعد بیرونی فصیل کی مرمت کی جائے گی اور اندرونی دیوار کو گرا کر از سر نو تعمیر کیا جائے گا۔ اور یہ سارا کام تمھاری مرضی کے مطابق

ہوگا۔"

معظم علی نے کہا: "چچا جان میں لوگوں کے طرزِ عمل سے پریشان نہیں ہوں اور میرے نزدیک مرشدآباد کا خطرہ کم نہیں ہوا۔ کٹوے سے فرار ہونے کے بعد مرہٹے یہ سوچ رہے ہوں گے کہ بنگال کا کونسا شہر ایسا ہے جس پر وہ آسانی سے قبضہ کر سکتے ہیں اور جہاں سے انھیں زیادہ سے زیادہ مال غنیمت مل سکتا ہے۔ اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اب ان کا ہدف میدنا پور یا کٹک ہوگا۔ یا وہ مرشدآباد کا رخ کریں گے۔ ان کے لیے مرشدآباد پہنچنا نسبتاً مشکل ہوگا۔ لیکن اگر انھوں نے مرشدآباد کی دولت کا دوسرے شہروں سے مقابلہ کیا تو وہ مشکلات کی پروا نہیں کریں گے۔"

حسین بیگ نے کہا۔ "مرشدآباد کی دفاعی حالت اتنی کمزور نہیں۔ فوج اگرچہ یہاں کافی نہیں لیکن اتنی کم بھی نہیں کہ بیرونی حملہ آور کو ایک دو دن بھی روک نہ سکے۔ پھر علی وردی خاں اتنا نادان نہیں کہ وہ مرشدآباد کو خطرے میں دیکھ کر کٹوے میں بیٹھا رہے۔ اگر مرہٹوں نے اس طرف کا رخ کیا تو علی وردی خاں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر یہاں پہنچ جائے گا۔"

معظم علی نے کہا: "اور یہی بات ہے جس سے میں ڈرتا ہوں۔ دشمن کو اگر مرشدآباد کا رخ کرنے میں کسی فائدے کی امید نہ ہو تو بھی وہ صرف علی وردی خاں کی توجہ دوسرے محاذ پر مبذول کرنے کے لیے چند دستے مرشدآباد کی طرف روانہ کرسکتا ہے۔ دارالحکومت کو خطرے میں دیکھ کر علی وردی خاں ایک لمحہ کے لیے بھی کٹوے میں ٹھہرنا گوارا نہیں کریں گے ــ بیشک ان کے یہاں پہنچ جانے سے مرہٹوں کا بھاگ جانا یقینی ہے۔ لیکن مرہٹوں کی باقی فوج کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر میدنا پور پر قبضہ کرلے گی اور اس کے بعد بردوان کا سارا علاقہ خطرے میں پڑ جائے گا۔"

حسین بیگ نے دل برداشتہ ہوکر کہا: "تو پھر علی وردی خاں کو کیا کرنا چاہیئے؟ تمھارا خیال ہے کہ اگر مرہٹوں کا کوئی لشکر مرشدآباد پہنچ جائے تو اسے ان کا پیچھا نہیں کرنا چاہیئے؟"

"نہیں چچا جان۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ علی وردی خاں کے سالاروں نے اسے صحیح مشو...

دیا تو اس فتح کے بعد مرہٹوں کو کسی اور محاذ کا رخ کرنے کا موقع نہیں مل سکتا۔ میرے خیال میں یہی چند دن ایسے ہیں جب مرہٹوں پر ضرب کاری لگائی جا سکتی ہے۔"

حسین بیگ نے کہا: "اچھا بتاؤ اگر تم علی وردی خان کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟"

معظم علی مسکرایا اور اس نے قدرے توقف کے بعد کہا: "میں اگر ان کی جگہ ہوتا۔ تو اس فتح کے بعد ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ان کا تعاقب جاری رکھتا ـــ میں کٹوے میں پڑاؤ ڈال کر مرشد آباد اور دوسرے شہروں سے سامانِ رسد کا انتظار کرنے کی بجائے اپنے بھوکے سپاہیوں سے یہ کہتا کہ ہمارے پاس رسد کی کمی ہے۔ لیکن ہم مرہٹوں سے اناج کے وہ ذخیرے چھین سکتے ہیں جو انھوں نے اس علاقے کو لوٹ کر جمع کیے ہیں۔ اس صورت میں مرہٹوں کے سامنے صرف اپنی جانیں بچانے کا مسئلہ ہوتا۔ مرہٹے کسی منظم فوج کے سپاہی نہیں صرف لیٹرے ہیں۔ ان کی گذشتہ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ ایک محاذ سے نقصان اٹھانے کے بعد جوابی حملہ کے لیے ہمیشہ کوئی نیا محاذ تلاش کرتے ہیں۔ اور اگر ان کا مدمقابل چوکس ہو تو وہ تیاری کا موقع حاصل کرنے کے لیے صلح کی بات چیت شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ان پر یلغار کا وقت ہے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اس وقت کٹوے میں فتح کا جشن منایا جا رہا ہو گا۔ انعامات اور خلعتیں تقسیم ہو رہی ہوں گی۔ اور مرہٹے چند میل دور اپنے پڑاؤ میں کسی نئے محاذ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہوں گے۔ پھر رسد کا سامان پہنچے گا۔ سپاہی اور افسر چند دن خوشیاں منائیں گے۔ پھر جنگ کی تیاری ہو گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پنڈت بھاسکر نے صلح کی بات چیت شروع کر دی ہو اور جس دن یہ بات چیت ختم ہو ـــ علی وردی خاں کو یہ اطلاع ملے کہ مرہٹوں کی فوج کا ایک حصہ کٹوے سے پچاس یا سو کوس دور ہمارے کسی اور علاقے یا شہر میں لوٹ مار شروع کر چکا ہے۔ مجھے علی وردی خان کی سپاہیانہ صلاحیتوں کا اعتراف ہے۔ لیکن میں ایک حکمران کی سیاسی مصلحتوں سے ڈرتا ہوں۔ اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو آج بنگال کی فوجیں کٹوے سے کوسوں دور مرہٹوں کا تعاقب کر رہی ہوتیں۔ ان کے رسد اور بارود کے چھکڑے اور ان کی توپیں ہمارے قبضے میں ہوتیں، پنڈت بھاسکر اگر صلح کے لیے ایلچی بھیجتا تو میں

یہ جواب دیتا کہ صلح کی بات چیت صرف بنگال کی سرحدوں سے باہر ہو سکتی ہے۔"

حسین بیگ نے کہا: "لیکن میر مدن، علی وردی خان کے ساتھ ہے اور تم ہمیشہ یہ کہا کرتے ہو کہ وہ ایک حقیقت پسند سپاہی ہے!"

معظم علی نے جواب دیا: "وہ یقیناً ہماری فوج کے تمام جرنیلوں سے زیادہ دوراندیش ہیں لیکن میدان جنگ سے باہر علی وردی کے نزدیک ایسے لوگوں کی اہمیت عام طور پر کم ہو جاتی ہے۔ دربار میں وہ میر جعفر اور دلب رام جیسے خوشامدیوں اور جی حضوریوں کی باتیں زیادہ غور سے سنتے ہیں۔"

حسین بیگ نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا: "ہاں معظم آج صبح چند آدمی بندوقیں واپس کرنے آئے تھے۔ لیکن میں نے انھیں یہ کہا کہ جب تک فوج واپس نہیں آتی یہ تمھارے پاس امانت رہیں گی۔ تم بھی یہی چاہتے تھے نا؟"

"جی ہاں۔"

"لیکن اب تمھارے رضاکار پریڈ کے لیے آنا تو شاید پسند نہ کریں!"

"پریڈ کی اب ضرورت نہیں وہ ابتدائی تربیت حاصل کر چکے ہیں۔ اب صرف رات کے وقت محلے میں پہرہ دینے کی ضرورت ہے۔ فتح کی خبر سننے کے بعد ایسی باتوں سے لوگوں کی دلچسپی ذرا کم ہو گئی ہے۔ لیکن دو چار دنوں کے بعد وہ پھر سنجیدگی کے ساتھ میری باتیں سننے لگ جائیں گے۔"



شام کے وقت بارش ہو رہی تھی۔ مرشد آباد کے قائم مقام فوجدار کے ہاں شہر کے چند روسا اور سرکاری عہدہ داروں کی دعوت تھی۔ جب مہمان ایک کشادہ کمرے میں دسترخوان پر بیٹھ گئے تو کسی نے فوجدار سے مرزا حسین بیگ کی غیر حاضری کی وجہ دریافت کی۔

فوجدار نے جواب دیا: "ان کا پیغام آیا ہے کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔"

ایک شخص نے کہا "جناب مرزا صاحب آجکل یوں بھی اپنی حویلی سے باہر نہیں نکلتے۔"

دوسرا بولا: "بھئی جب گھر میں کام ہو تو باہر نکلنے کی کیا ضرورت ہے۔ مرزا صاحب آجکل بہت مصروف ہیں۔ آپ ان کی حویلی کے اندر جاکر دیکھیں تو حیران رہ جائیں۔"

ایک اور آدمی فوجدار سے مخاطب ہوکر بولا۔ "جناب اگر آپ مرزا صاحب کو یقین دلاتے کہ اب مرشدآباد کو کوئی خطرہ نہیں تو وہ ضرور تشریف لاتے!"

فوجدار نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اس کے مہمان اپنی اپنی بساط کے مطابق مرزا حسین بیگ پر پھبتیاں کس رہے تھے۔

شہر کے ایک تاجر نے کہا: "میں نے سنا ہے کہ وہ اپنے محلے کے لوگوں کو رات بھر سونے نہیں دیتے۔"

مرشدآباد کا کوتوال بولا: "مرزا صاحب ایک سیدھے سادے بزرگ ہیں۔ لیکن ان کے محلے کا ایک نوجوان ان کے ساتھ دل لگی کر رہا ہے۔ پچھلے دنوں میں ان کے محلے سے گزر رہا تھا۔ بانس سے بھرے ہوئے کئی چھکڑے ان کی حویلی کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں نے ایک آدمی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ مرزا صاحب اندر مورچے بنوا رہے ہیں۔"

"بانس کے مورچے؟" ایک امیرزادے نے کہا۔ "آپ کے ساتھ کسی نے مذاق کیا ہوگا؟"

"جی نہیں، آپ مرزا صاحب کی حویلی دیکھیں تو حیران رہ جائیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد حسین بیگ اس محفل کی گفتگو کا واحد موضوع بن چکا تھا۔ اور قریباً ہر شخص اس گفتگو میں دلچسپی لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ فوجدار ایک سنجیدہ آدمی تھا اور اسے یہ باتیں ناگوار محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ لیکن جب مہمان زیادہ بے تکلف ہوکر حسین بیگ کا مذاق اڑانے لگے تو اس نے کہا۔ "مرزا صاحب ہمارے بزرگ ہیں اور میں یہ پسند نہیں کرتا کہ اس محفل میں انھیں موضوع بحث بنایا جائے۔"

ایک عمر رسیدہ آدمی نے کہا: "جناب مرزا صاحب کا ہم سب احترام کرتے ہیں لیکن بانس

سے مورچے تعمیر کرنے کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بھلا بانس گولی روک سکتے ہیں؟"

فوجدار نے جواب دیا۔ "بانس گولی نہیں روک سکتے لیکن گولی چلانے والوں کو آگے بڑھنے سے روک سکتے ہیں۔ میں نے خود مرزا صاحب کی حویلی کے دفاعی انتظامات دیکھے ہیں۔ اور وہاں مجھے کوئی بات مضحکہ خیز نظر نہیں آئی۔ ان کا محلہ شہر سے باہر ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ خطرے کے وقت اس محلے کے لوگ شہر کے لوگوں کی نسبت کم محفوظ نہیں ہوں گے۔"

ایک نوکر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا فوجدار کے قریب پہنچا اور اس نے جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا۔

فوجدار نے دسترخوان سے اٹھتے ہوئے مہمانوں کی طرف دیکھا اور کہا!

"آپ اطمینان سے کھانا کھائیں، میں ابھی آتا ہوں۔"

فوجدار کمرے سے باہر نکلا تو برآمدے میں ایک فوجی افسر کھڑا تھا۔ اس نے سلام کے بعد کہا "جناب معاف کیجیے میں نے آپ کو بے وقت تکلیف دی ہے لیکن خبر بہت تشویشناک ہے۔ مرہٹوں کی ایک فوج یلغار کرتی ہوئی مرشدآباد کی طرف بڑھ رہی ہے!"

فوجدار نے اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے کہا "یہ خبر کون لایا ہے؟"

"ابھی راستے کی ایک چوکی کا کماندار یہاں پہنچا ہے اور وہ یہ کہتا ہے پچھلی چوکیوں کے سپاہیوں نے ڈاک گھوڑوں پر یہ خبر اس تک پہنچائی تھی۔ میں نے تصدیق کے لیے سپاہیوں کا ایک دستہ روانہ کر دیا ہے۔"

"اور خبر لانے والا کہاں ہے؟"

"جی میں اسے محل کے ناظم کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔ وہ تھکاوٹ سے نڈھال تھا۔ اس نے صبح سے لے کر شام تک لگاتار سفر کیا ہے اور راستے میں کئی گھوڑے تبدیل کیے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جب میں اپنی چوکی سے روانہ ہوا تھا۔ تو مرہٹے صرف ایک منزل پیچھے تھے۔ اور اب یہاں سے شاید دو یا تین منزل دور ہوں گے۔"

"اچھا میں ابھی آتا ہوں۔ تم جاکر شہر میں منادی کرا دو!"

افسر نے سلام کیا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

فوجدار دوبارہ مہمانوں کے کمرے میں داخل ہوا۔

کسی نے سوال کیا "جناب کیا بات تھی؟"

فوجدار نے دسترخوان پر بیٹھتے ہوئے کہا: "کچھ نہیں۔ ایک سرکاری کام تھا۔ آپ اطمینان سے کھانا کھائیں۔"

لیکن مہمان کھانے سے زیادہ فوجدار کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا مطالعہ کر رہے تھے۔

کھانے سے فارغ ہوکر فوجدار دسترخوان سے اٹھا اور اس نے کہا: "حضرات مجھے کچھ کام ہے اس لیے میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ لیکن آپ آرام سے باتیں کریں۔ باہر بارش ہو رہی ہے۔"

ایک امیرزادے نے سوال کیا: "آپ اس بارش میں کہاں جا رہے ہیں؟"

فوجدار نے جواب دیا: "ایک سپاہی کو بارش میں چلنے کا عادی بننا پڑتا ہے۔ مجھے ابھی خبر ملی ہے کہ مرہٹوں کا لشکر مرشدآباد کا رخ کر رہا ہے۔"

مجلس پر سناٹا چھا گیا اور حاضرین بدحواس ہوکر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

فوجدار نے کہا: "لیکن پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ وہ ابھی یہاں سے کئی منزل دور ہیں۔ اگر انھوں نے انتہائی کوشش کی تو بھی کل صبح یا دوپہر سے پہلے یہاں نہیں پہنچیں گے۔"

فوجدار باہر نکل گیا۔

چند ثانیے بعد معزز مہمانوں کی افراتفری کا یہ عالم تھا کہ ان کے لیے اپنے جوتے پہچاننا بھی مشکل تھا۔ کوئی اپنے جوتوں کی بجائے کسی اور کے جوتے پہننے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی بدحواسی کی حالت میں دائیں پاؤں کے جوتے میں بایاں اور بائیں پاؤں کے جوتے دایاں پاؤں ڈال رہا تھا، پھر مکان سے نکلنے کے بعد ان میں سے اکثر برسوں کے بعد پہلی بار بھاگنے کی مشق کر رہے تھے۔



تھوڑی دیر بعد مُرشدآباد کے ہر گلی کوچے میں مرہٹوں کی پیشقدمی کی خبر مشہور ہو چکی تھی۔ مرزا حسین بیگ کے محلے کی عورتیں بچے بوڑھے اور جوان موسلا دھار بارش میں اس کی حویلی کا رخ کر رہے تھے۔ ایک ساعت کے اندر اندر رہائشی مکان کی نچلی منزل اور دیوان خانے کے کمروں اور برآمدوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ بعض لوگ افراتفری کے عالم میں بارش سے بچنے کے لیے چاردیواری سے باہر نکلے اور چارے کے گوداموں، نوکروں کی کوٹھڑیوں اور گھوڑوں کے اصطبل میں پناہ لے رہے تھے۔

معظم علی محلے کی گلیوں کے ناکے دیکھنے اور پہرہ داروں کو ضروری ہدایات دینے کے بعد پانی اور کیچڑ سے لت پت حویلی میں داخل ہوا۔ ڈیوڑھی کے اندر دو مشعلیں جل رہی تھیں اور حسین بیگ چند آدمیوں کے درمیان کھڑا تھا۔

معظم علی نے حسین بیگ کی طرف متوجہ ہوکر سوال کیا: "فوجدار کی طرف سے کوئی جواب آیا ہے؟"

"ہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ صبح سے پہلے مُرشدآباد پر حملے کا کوئی خطرہ نہیں اور اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو اہلِ شہر کو خبردار کرنے کے لیے توپیں چلا دی جائیں گی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ مرہٹہ دستوں کی قیادت میر حبیب کر رہا ہے۔"

معظم علی نے کہا: "آپ اندر جاکر آرام کریں۔ میں گلیوں کے تمام ناکے دیکھ آیا ہوں۔ ہمارے انتظامات بہت تسلی بخش ہیں۔"

حسین بیگ نے کہا: "اگر آج رات اس گھر کی چاردیواری کے اندر کوئی آرام کر سکے تو میں یہ کہوں گا کہ وہ محشر کے دن بھی اطمینان کی نیند سو سکے گا۔ ذرا جاکر دیکھو، تمھیں یقین نہیں آئے گا کہ انسان اتنا شور مچا سکتے ہیں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ روئے زمین کے تمام ہنگامے میرے گھر کی چاردیواری کے اندر جمع ہو گئے ہیں۔ ہر شخص اپنے پورے خاندان کو

ایک ہی کمرے کے اندر دیکھنا چاہتا ہے۔ میں نے مردوں کو عورتوں سے الگ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ ایک دروازے سے نکلتے ہیں اور دوسرے دروازے سے پھر وہیں پہنچ جاتے ہیں۔"

معظم علی نے کہا: "چچا جان میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آدھ گھنٹے کے بعد آپ کسی کی آواز نہیں سنیں گے۔ آیئے میرے ساتھ!"

حسین بیگ نے کہا: "نہیں میں آدھ گھنٹے کے لیے اندر جانے کی بجائے ساری رات یہاں کھڑا رہنا آسان سمجھتا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ میں اندر جا کر کسی کا گلا گھونٹ دوں گا۔"

معظم علی نے ڈیوڑھی میں جمع ہونے والے مسلح رضا کاروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا:۔

"تم دروازہ بند کر دو اور میرے ساتھ آؤ!"

رضا کاروں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ معظم علی موسلا دھار بارش میں حویلی کے اندرونی صحن کی طرف بڑھا۔ حسین بیگ کچھ دیر تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا۔ پھر بھاگتا ہوا ان کے ساتھ جا ملا۔ رہائشی مکان کے برآمدوں اور کمروں میں ایک طوفان حشر بپا تھا۔ حسین بیگ کے نوکر جگہ جگہ مشعلیں لیے کھڑے تھے۔

معظم علی برآمدے میں داخل ہوا اور دونوں ہاتھ بلند کر کے چلایا۔ "خاموش! خاموش!!"

برآمدے میں اس کے پاس چند لوگ خاموش ہو گئے لیکن مکان کے باقی حصوں میں چیختے چلاتے انسانوں کے ہجوم کو اس کی آواز متاثر نہ کر سکی۔

معظم علی نے حسین بیگ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "آپ اوپر جا کر دیکھیں اگر بالائی منزل میں جگہ ہے تو عورتوں اور بچوں کو وہاں بھیج دیا جائے۔"

حسین بیگ نے جواب دیا۔ "بالائی منزل پر عورتوں اور بچوں کے لیے کافی جگہ ہے لیکن مردوں کی بدتمیزی دیکھ کر میں نے سیڑھی کے دروازے پر تالا لگا دیا تھا۔ وہ عورتوں اور بچوں سے پہلے وہاں پہنچنا چاہتے تھے۔"

"آپ تالا کھول دیں۔ میں انھیں سمجھاؤں گا۔"

"تم پہلے تسلی کر لو ورنہ یہ دروازہ کھلتے ہی بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح اوپر بھاگنے کی کوشش کریں گے۔ خدا کے لیے انھیں خاموش کرو۔ ورنہ میں واقعی کسی کا سر پھوڑ ڈالوں گا۔"

"یہ ابھی خاموش ہو جائیں گے۔"

معظم علی نے ایک رضا کار کے ہاتھ سے بندوق لی اور صحن کی طرف منہ کر کے ہوا میں فائر کر دیا۔

ایک ثانیہ کے اندر اندر کے ہر گوشے میں سناٹا چھا گیا۔ معظم علی نے لوگوں کی بدحواسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بلند آواز میں کہا:۔

"بھائیو اور بہنو! ابھی دشمن کئی میل دور ہے اور صبح تک مرشدآباد پر حملے کا کوئی خطرہ نہیں۔ ہم نے تمھاری حفاظت کا پورا انتظام کر رکھا ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر تمھاری افراتفری کا یہی عالم رہا تو تمھارے محافظوں کے لیے یہ چیخ پکار اور یہ بدنظمی دشمن کی گولیوں کی نسبت زیادہ خطرناک ثابت ہوگی۔ میں تمھیں چند ضروری ہدایات دینا چاہتا ہوں اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر کسی نے میری ہدایات کی خلاف ورزی کی تو اسکی حفاظت ہمارے ذمے نہیں ہوگی۔ ہم اسے اس حویلی سے باہر نکال دیں گے۔

میری ہدایات یہ ہیں:۔ وہ تمام آدمی جن کی عمر پچاس سال سے کم ہے۔ فوراً باہر نکل آئیں انھیں بیرونی صحن کی کوٹھریوں میں جگہ دی جائے گی۔ خواتین جن کے ساتھ کم سن بچے ہیں بالائی منزل کے کمروں میں چلی جائیں۔ بڑی عمر کے لڑکے اور عمر رسیدہ یا بیمار لوگ دیوان خانے کے کمروں اور برآمدوں میں پناہ لے سکتے ہیں۔ جن خواتین کو بالائی منزل کے کمروں میں جگہ نہ مل سکے وہ نچلی منزل کے باقی کمروں میں رہیں۔

حملے کے وقت جو لوگ لڑنے کے قابل ہوں اور جن کے پاس کوئی ہتھیار ہو وہ رضا کاروں کیساتھ شامل ہو جائیں اور باقی یہاں آجائیں۔ اگر بارش تھم گئی تو وہ اندرونی صحن کے مورچوں میں پناہ لے سکیں گے۔ ورنہ برآمدوں اور نچلی منزل کے کمروں میں ان کے لیے کافی جگہ ہوگی۔ دس منٹ کے بعد میں مکان کے تمام کمروں کا معائنہ کروں گا۔ اگر مجھے معلوم ہوا کہ کسی نے جان بوجھ کر

میری ہدایات پر عمل نہیں کیا تو اسے کسی اچھے سلوک کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا۔ آدھ گھنٹے کے بعد تمام مشعلیں بجھا دی جائیں گی۔ میں آپ کی تسلی کے لیے پھر ایک بار یہ اعلان کرتا ہوں کہ صبح تک حملے کا کوئی خطرہ نہیں۔ آپ اپنی جگہ آرام سے لیٹے رہیں۔ اس وقت ہماری ساری توجہ حویلی کے دفاعی انتظامات پر صرف ہونی چاہیئے۔ اور میں یہ امید رکھتا ہوں کہ آپ بلاوجہ ہمیں پریشان نہیں کریں گے۔"

قریباً پون گھنٹہ کے بعد حویلی میں مکمل سکون تھا اور معظم علی حسین بیگ سے کہہ رہا تھا
"چچا جان! اب آپ اوپر جا کر اپنے کمرے میں آرام کریں۔"

حسین بیگ نے جواب دیا: "بیٹا میں صرف شور سے گھبراتا تھا۔ اب مجھے آرام کی ضرورت نہیں۔ میں رضاکاروں کے ساتھ باہر کی فصیل پر پہرہ دینا چاہتا ہوں۔"



اگلے دن دس بجے کے قریب میر حبیب کی قیادت میں مرہٹوں کا لشکر مرشد آباد کے مضافات میں لوٹ مار کر رہا تھا۔ حملہ آور فوج کے ایک دستے نے حسین بیگ کے محلے میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن گلی کے مورچوں سے گولیوں کی بوچھاڑ نے انھیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد چند اور دستے آگئے اور انھوں نے ایک گلی کے ناکے کے آس پاس چند مکانات کی چھتوں پر قبضہ کر کے رضاکاروں کو پیچھے ہٹا دیا اور محلے کے اندر داخل ہوگئے۔ محلے کی گلیاں اور مکانات خالی دیکھنے کے بعد انھوں نے حسین بیگ کی حویلی کی طرف توجہ کی اور ڈیوڑھی کے دروازے پر حملہ کر دیا۔ اچانک ڈیوڑھی کی چھت اور فصیل کے مورچوں سے گولیاں برسنے لگیں اور وہ گلی میں چند لاشیں چھوڑ کر آس پاس کے مکانات میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ اس عرصہ میں مرہٹوں کے ایک اور دستے نے دوسری طرف سے فصیل کے ایک حصہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن حویلی کے محافظوں نے اسے بھی مار کر پیچھے ہٹا دیا۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ وہ آس پاس کے مکانات کی چھتوں پر لیٹ کر گولیاں چلاتے رہے۔

اتنی دیر میں ان کے کئی اور ساتھی اس محلے میں جمع ہو چکے تھے۔ مرہٹوں نے اچانک مشرقی سمت میں حویلی کے قریب ایک دو منزلہ مکان کی چھت سے فائر شروع کیے تو اس طرف فصیل کے محافظ ان کی گولیوں کی زد میں تھے۔ چند رضاکار زخمی ہوئے اور باقی بلندی سے آنے والی گولیوں کی زد سے بچنے کے لیے اپنے مورچوں میں دبک گئے۔ مرہٹوں کے چند دستوں نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھایا اور اچانک گلیوں اور مکانوں سے نکل کر فصیل کے اس حصے پر دھاوا بول دیا۔ ان کے چند آدمیوں نے فصیل کے ساتھ بانس کی سیڑھیاں کھڑی کر دیں اور آن کی آن میں کوئی پچاس آدمی فصیل پر پہنچ گئے۔ فصیل کے محافظ آس پاس کے مورچوں سے نکل کر اس طرف بڑھے۔ لیکن مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے سامنے ان کی پیش نہ گئی۔ چند منٹ دست بدست لڑائی کے بعد مرہٹے فصیل کے مشرقی حصہ پر قابض ہو چکے تھے اور حویلی کے محافظ صحن میں جمع ہو کر انھیں نیچے اترنے سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

معظم علی ڈیوڑھی کی چھت پر کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے ایک رضاکار سے کہا
"پسپائی کے لیے نقارہ بجا دو۔"

رضاکار نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور بیرونی فصیل کے محافظ نقارے کی آواز سنتے ہی اپنے اپنے مورچے چھوڑ کر اندرونی صحن کے دروازے کی طرف بھاگنے لگے۔ مشرقی دیوار کے نیچے لڑنے والے رضاکاروں کو پیچھے ہٹتا دیکھ کر مرہٹے انھیں گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ معظم علی جلدی سے نیچے اترا اور آٹھ دس نوجوانوں کے ساتھ مرہٹوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس حملے کی شدت نے مرہٹوں کو چند قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا اور رضاکار ایک منظم طریقے سے پسپا ہونے لگے۔

مرہٹوں نے اپنی فتح یقینی سمجھ کر چند آدمیوں کے بچ نکلنے کو زیادہ اہمیت نہ دی اور انھوں نے آگے بڑھ کر ڈیوڑھی کا دروازہ کھول دیا۔ قریباً آٹھ سو مرہٹے سیلاب کے ریلے کی طرح بیرونی صحن میں داخل ہوئے۔ لیکن اس عرصہ میں اندرونی اور بیرونی چار دیواری کے درمیان کا وسیع

احاطہ حویلی کے محافظوں سے خالی ہوچکا تھا۔ مرہٹہ لشکر کا ایک سردار چلایا: "بہادرو! ہمارے پاس بہت تھوڑا وقت ہے۔ دیوار پھاند کر اندر داخل ہوجاؤ!"

سپاہیوں نے کسی توقف کے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کی۔ لیکن چند ثانیے بعد وہ اپنے ساتھیوں کو خندق میں گرتا دیکھ کر انتہائی بدحواسی کی حالت میں چلا رہا تھا: "یہ مکان نہیں قلعہ ہے۔ ہم نے مفت میں اتنی جانیں گنوائی ہیں۔ دروازے کی طرف بڑھو!"

اندرونی صحن کا دروازہ مرہٹوں کے بے پناہ ہجوم نے ایک ہی دھکے میں توڑ دیا — وہ فتح کے نعرے لگاتے ہوئے ایک میلے کی بھیڑ کی طرح آگے بڑھے۔ اندرونی دروازے اور رہائشی مکان کے درمیان کشادہ صحن کے وسط میں نصف دائرے کی شکل میں ایک کھائی تھی۔ جس کے دونوں سرے خندق سے ملے ہوئے تھے۔ اس کھائی کے اندر ساٹھ رضاکار اپنے تو عمر سالار کی آواز کے منتظر تھے۔ کھائی کے پیچھے دو چھوٹے چھوٹے خیموں کے اندر توپیں نصب تھیں جن کا رُخ دروازے کی طرف تھا۔

حملہ آور لشکر کا سردار کھائی سے چند قدم کے فاصلے پر دونوں ہاتھ بلند کر کے چلایا "ٹھہرو!" اور مرہٹوں کا ہجوم رک گیا۔

مرہٹہ سردار نے قدرے توقف کے بعد کہا: "اب مقابلے سے کوئی فائدہ نہیں تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ ہتھیار پھینک کر موروچوں سے باہر نکل آؤ، ورنہ ہم ایک آدمی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس محلے کے تمام لوگ اس مکان میں جمع ہیں۔ اگر تم اپنی عورتوں کی عزت اور بچوں کی جانیں بچانا چاہتے ہو تو ہتھیار ڈال دو۔ ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

سالار اپنا فقرہ پورا نہ کرسکا۔ مکان کی چھت سے بندوق چلنے کی آواز آئی اور وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی صحن اور برآمدوں کے موروچوں، مکان کی چھت اور کھڑکیوں سے گولیوں کی بارش شروع ہوگئی۔ مرہٹے طیش میں آکر چند قدم آگے بڑھے اور پھر الٹے پاؤں دروازے کی طرف بھاگنے لگے۔ اچانک یکے بعد دیگرے توپوں کے دو خوفناک دھماکے سنائی دیئے اور

لوہے کے بیشمار ٹکڑوں نے دروازے کے سامنے کئی گز تک لاشوں کے ڈھیر لگا دیئے۔

اس کے بعد حملہ آور ایک ٹوٹے ہوئے دروازے کو ہزاروں خندقوں اور کھائیوں سے زیادہ خطرناک سمجھ کر درمیانی دیوار کی اوٹ میں پناہ لے رہے تھے۔ ان کے سو سے زیادہ آدمی ہلاک اور زخمی ہوچکے تھے۔ قریباً دو گھنٹے اور گزر گئے اور حویلی کے محافظوں کو یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اس کے بعد ٹوٹے ہوئے دروازے کے قریب دیوار کے عقب سے سفید جھنڈا نمودار ہوا۔ اور کسی نے بلند آواز میں کہا:

"ہم صلح کی بات چیت کے لیے ایک آدمی اندر بھیجنا چاہتے ہیں۔"

جب چند ثانیے اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو کسی نے دوبارہ کہا: "ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ صلح کی بات چیت کے لیے ہمارا ایک آدمی اندر آسکتا ہے یا نہیں؟"

معظم علی صحن کے مورچے سے نکل کر چند قدم آگے بڑھا اور اس نے جواب دیا: "تم ایک آدمی اندر بھیج سکتے ہو۔"

مرہٹہ فوج کا ایک افسر سفید جھنڈا اٹھائے دروازے کے سامنے نمودار ہوا اور راستے میں بکھری ہوئی لاشوں سے بچ بچ کر قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ معظم علی سے چند قدم کے فاصلے پر رکا اور بولا: "ہمیں تمھاری تیاری کا علم نہ تھا اور ہم نے اپنی غلطی سے اتنا نقصان اٹھایا ہے لیکن تمھیں یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ ہم اتنا نقصان اٹھانے کے بعد خالی ہاتھ واپس چلے جائیں گے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "ہمیں اس سے زیادہ کسی بات کی خواہش نہیں کہ تم میں سے کوئی واپس نہ جاسکے۔"

مرہٹہ افسر نے کہا: "میں اس حویلی کے مالک کے ساتھ بات کرنا چاہتا ہوں!"

معظم علی نے جواب دیا: "اس حویلی کا مالک ڈاکوؤں کے ساتھ بات کرنے کا عادی نہیں تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم ایک لاکھ روپے کے عوض اپنی جانیں بچا سکتے ہو۔"

"تم نے ہماری جانوں کی قیمت بہت کم لگائی ہے۔ اور ہمارے پاس روپوں کی بجائے گولیاں ہیں۔"

"اچھی طرح سوچ لو!"

"تم جا سکتے ہو۔"

مرہٹہ افسر نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "تم نے ہماری طاقت کا غلط اندازہ لگایا ہے۔ ہمارا لشکر شہر کے دوسرے محلوں میں مصروف ہے۔ لیکن اگر ضرورت پڑی تو ہم ان سب کو یہاں لے آئیں گے۔"

"یہ جگہ کافی کشادہ ہے اور یہاں تمھارے تمام لشکر کی لاشیں سما سکتی ہیں۔ اور شاید تمھیں یہ معلوم نہیں کہ ہماری فوج تمھارے پیچھے آرہی ہے۔"

"ہمیں معلوم ہے لیکن جب وہ یہاں پہنچیں گے تو ان کے سامنے صرف تمھاری قبریں کھودنے کا کام ہوگا۔ ہم تمھیں آخری بار سوچنے کا موقع دیتے ہیں۔ اس کے بعد تم مرشد آباد کے تمام خزانے ہمارے قدموں میں ڈھیر کر دو گے تو بھی تمھاری بات نہیں سنی جائے گی۔"

"تم ایک لاکھ روپیہ مانگتے ہو۔ لیکن ہمارے پاس تمھارے لیے صرف گولیاں ہیں۔ تم جا سکتے ہو۔ ہم تمھارے حملے کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"اچھا تمھیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔"

مرہٹہ افسر یہ کہہ کر مڑا اور سفید جھنڈا زمین پر پھینک کر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر میں مرہٹوں نے آس پاس کے چند اونچے مکانات کی چھتوں سے فائرنگ شروع کر دی اور معظم علی کے ساتھی اس کے جواب میں حویلی کے رہائشی مکان کی چھت سے گولیاں برسانے لگے۔ غروب آفتاب تک بندوقوں کی یہ لڑائی جاری رہی۔ اس کے بعد مرہٹوں نے فائرنگ بند کر دی۔ ان کے بیشتر آدمی ابھی تک حویلی کے بیرونی احاطے میں جمع تھے۔ شام

ہوتے ہی ان کے ساتھ چند اور دستے آملے۔ معظم علی کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ نئے حملے کے لیے رات کی تاریکی کا انتظار کر رہے ہیں۔ اندرونی دیوار کے پیچھے مرہٹوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لیے اس نے خندق کے ساتھ ساتھ ایک چکر لگایا۔ شمالی دیوار کے قریب پہنچ کر اسے کچھ آہٹ سنائی دی اور اس نے محسوس کیا کہ مرہٹے دیوار کے پیچھے زمین کھودنے میں مصروف ہیں۔ مشرقی دیوار کے قریب پہنچ کر بھی اس نے یہ محسوس کیا کہ دیوار کے ساتھ ساتھ زمین کھودی جا رہی ہے۔ شام کے دھندلکے میں وہ شمالی اور مشرقی دیوار کے ایک کونے میں آم کے ایک بلند درخت پر چڑھا۔ چوٹی پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ سینکڑوں آدمی دیوار کے ساتھ ساتھ زمین کھودنے میں مصروف ہیں۔ اس نے جلدی سے نیچے اتر کر تمام مورچوں کا چکر لگایا اور رضاکاروں کو خبردار کیا کہ دشمن شمال اور مشرق کی دیواریں گرانے کے بعد ایک فیصلہ کن حملہ کرنا چاہتا ہے، پھر وہ نچلی منزل میں جمع ہونے والے لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اور انھیں ہدایت کی کہ اب یہاں کسی عورت، بچے یا بیکار آدمی کو نہیں رہنا چاہیئے۔ وہ جن کے لیے بالائی منزل کے کمروں میں جگہ نہیں، چھت پر چلے جائیں۔ اگر مرہٹے یہاں تک آگئے تو تم میں سے ہر ایک کو اپنی بہنوں کے ناموس کی خاطر لڑنا پڑے گا۔ تھوڑی دیر بعد رضاکار مشرقی اور شمالی دیوار کے سامنے ریت کی بوریوں کے نئے مورچے بنا رہے تھے۔

کوئی دس بجے کے قریب مرہٹوں نے جنوب اور مغرب کی سمت باہر کے مکانات کی چھتوں سے دوبارہ فائرنگ شروع کی۔ معظم علی نے بھاگ کر میدان کے اندر اور باہر تمام مورچوں کا چکر لگایا اور رضاکاروں کو یہ حکم دیا کہ دشمن شمال اور مشرق کی طرف سے حملہ کرنے سے پہلے تمھاری توجہ دوسری طرف مبذول کرنا چاہتا ہے تم اس فائرنگ کی پروا نہ کرو۔ مکان کی چھت سے چند آدمی دشمن کی گولیوں کا جواب دیتے رہیں گے لیکن باقی سب کی توجہ اس طرف رہنی چاہیئے۔

رات کے گیارہ بجے کے قریب یکے بعد دیگرے چند دھماکے سنائی دیئے۔ اور شمال اور مشرق کی دیواریں جن کی بنیادیں کھودی جا چکی تھیں۔ کئی جگہ سے گر پڑیں۔ دیواروں میں شگاف

پڑنے کی دیر تھی کہ مرہٹوں نے پوری شدت کے ساتھ حملہ کر دیا۔ اندر سے بھی گولیوں کی بارش شروع ہو چکی تھی۔ لیکن حملہ آور تاریکی سے فائدہ اٹھا کر خندق عبور کرنے کے بعد بانس کی باڑ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ شدید نقصان اٹھانے کے بعد صحن کے اندر ادھر اُدھر پھیل گئے اور زمین پر رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اس دوران میں مرہٹوں کی فوج کے ایک حصّہ نے براہ راست دروازے سے صحن پر یلغار کرنے کی کوشش کی لیکن رضاکاروں نے انھیں صحن کے درمیانی مورچوں کے قریب نہ آنے دیا۔ توپوں سے پھر ایک بار کام لیا گیا اور مرہٹے بھاری نقصان اٹھانے کے بعد پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے بعد لڑائی کا سارا زور شمال اور مشرق کی طرف تھا۔ حملہ آوروں کے لیے رات کی تاریکی جس قدر فائدہ مند تھی اسی قدر نقصان دہ بھی تھی۔ وہ دیواریں توڑنے کے بعد اچانک حملہ کر کے حویلی کے محافظوں کی سراسیمگی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ لیکن رضاکاروں کی غیر متوقع مدافعت نے ان کے حوصلے پست کر دیئے۔ تاریکی میں انھیں اپنے زخمی اور ہلاک ہونے والے ساتھیوں کی صحیح تعداد کا علم نہ تھا۔ تاہم گولیوں کی بوچھاڑ میں زخمی ہونے والوں کی چیخیں ہر آن اُن کی سراسیمگی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ چند آدمی راستے کے مورچے توڑنے کے بعد مکان کے قریب پہنچ گئے لیکن تلواروں، خنجروں اور لاٹھیوں سے مسلح آدمیوں کا ہجوم کمروں اور برآمدوں سے نکل کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ چند مرہٹے مارے گئے اور باقی پیچھے ہٹ گئے۔

تھوڑی دیر بعد چند حملہ آور مکان پر یلغار کرنے کی بجائے صحن کے درختوں کی آڑ لے کر اور باقی گری ہوئی دیواروں کے پیچھے چھپ کر فائر کرنے پر اکتفا کر رہے تھے۔



آدھی رات کو جب چاند نمودار ہو رہا تھا۔ شہر کے مختلف گوشوں سے نقاروں کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور مرہٹے ایک دوسرے کو آوازیں دیتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف سمٹنے لگے۔ حویلی کے محافظ بندوقوں کے دھماکوں کی بجائے بھاگتے ہوئے دشمن کے پاؤں کی آہٹ سن رہے تھے۔

معظم علی نے برآمدے کے سامنے ایک مورچے سے باہر نکل کر بلند آواز میں کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ دشمن شہر خالی کر رہا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ ایک چال ہو۔ تم اپنے مورچوں میں چوکس رہو اور میری ہدایات کا انتظار کرو۔ میں اوپر جا کر دیکھتا ہوں"۔

معظم علی تاریکی میں احتیاط سے پاؤں اٹھاتا ہوا زینے کی طرف بڑھا۔ زینے پر پاؤں رکھتے ہی اسے کسی کی آواز سنائی دی: "کون ہے؟"

"میں ہوں چچا جان!" معظم علی نے حسین بیگ کی آواز پہچان کر جواب دیا۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ مرہٹوں نے اچانک گولہ باری کیوں بند کر دی ہے؟"

"میرے خیال میں وہ واپس جا رہے ہیں۔ اور اب حملے کا کوئی خطرہ نہیں لیکن میں ذرا چھت پر جا کر تسلی کروں۔ میں ابھی آتا ہوں"۔

معظم علی کسی توقف کے بغیر زینے پر چڑھنے لگا۔ چھت پر پاؤں رکھتے ہی اسے ایک کونے سے بندوق چلنے کی آواز سنائی دی۔ چھت پر حسین بیگ کے اپنے نوکروں کا پہرا تھا اور وہ معظم علی کی ہدایات کے مطابق منڈیر کی آڑ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن ان میں سے ایک چھت کے کونے میں کھڑا اطمینان سے اپنی بندوق بھر رہا تھا۔ معظم علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے غضبناک ہو کر کہا: "بیوقوف! اپنا سر نیچے رکھو!"

لیکن اس نے معظم علی کی طرف توجہ نہ دی۔ اس کے ہاتھ بندوق بھرنے میں مصروف تھے اور نگاہیں صحن میں آم کے ایک درخت پر لگی ہوئی تھیں۔ معظم علی کو کسی رضاکار یا حسین بیگ کے نوکر سے حکم عدولی کی توقع نہ تھی۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ بندوق کا دھماکہ سنائی دیا اور گولی سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ معظم علی جلدی سے دبک کر منڈیر کی آڑ میں بیٹھ گیا۔

چند ثانیے اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ پھر اسے ایک سہمی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی۔ "آپ ٹھیک ہیں نا؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ لیکن خودکشی کا آسان طریقہ یہ ہے کہ تم گولی کا انتظار کرنے کی بجائے آنکھیں بند کرکے نیچے چھلانگ لگادو۔" یہ کہہ کر معظم علی نے جلدی سے گھٹنوں کے بل آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑلیا اور اسے کھینچ کر نیچے بٹھا دیا۔

"یہ گولی سامنے کسی درخت سے آئی تھی؟" معظم علی نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"تم کون ہو؟"

اپنے سوال کا کوئی جواب نہ پاکر معظم علی نے کہا۔ "تم فوراً نیچے چلی جاؤ۔ لڑکیوں کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں۔"

اس نے پھر کوئی جواب نہ دیا اور گھٹنوں کے بل ہوکر صحن کی طرف جھانکنے کے بعد اچانک ایک فائر کردیا۔

معظم علی نے گردن اوپر کرکے صحن کی طرف دیکھنے کے بعد کہا: "تم ہوا میں فائر کررہی ہو اور دیکھو گردن نیچے رکھو!"

لڑکی نے کہا: "اگر آپ مداخلت نہ کرتے تو میرا نشانہ خالی نہ جاتا۔ اب وہ دوسری شاخ پر جاچکا ہے۔ یہ میری بندوق بھر دیجئے اور مجھے اپنی بندوق دیجئے۔ جلدی کیجیے وہ نیچے اترنے کی کوشش کررہا ہے۔"

"یہ لو۔" معظم علی نے اپنی بندوق آگے بڑھاتے کہا۔ "تم اسے دیکھ سکتی ہو؟"

"ہاں۔" لڑکی نے اٹھ کر نشانہ باندھتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لیے اپنا سر نیچے رکھو۔" معظم علی نے جھنجھلا کر کہا۔

"میں آخری بار آپ کی حکم عدولی کررہی ہوں۔" لڑکی نے یہ کہہ کر بندوق چلادی۔ صحن میں آم کے درخت سے کسی بھاری شے کے گرنے کی آواز آئی۔

معظم علی نے کہا۔ "اب تمھاری ضد پوری ہوچکی ہے۔ لیکن ایک مرہٹے کے لیے تمھیں اپنی

جان خطرے میں نہیں ڈالنی چاہیے تھی۔"

"وہاں ایک نہیں تھا۔ میں نے اپنے کمرے کے دریچے سے چار آدمی درخت پر چڑھتے دیکھے تھے۔ ایک کو میں نے وہیں سے فائر کرکے گرالیا تھا۔ دو بھاگ گئے تھے۔ اور یہ چوتھا کمرے کے دریچے سے میرے نشانے کی زد میں نہیں آتا تھا۔ اس لیے مجھے اوپر آنا پڑا۔"

معظم علی نے چاند کی روشنی میں پہلی بار غور سے لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے سر پر سفید پگڑی تھی اور گلے میں بارود کا تھیلا لٹک رہا تھا۔ معظم علی کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا۔

معظم علی نے اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرتے ہوئے کہا: "تم فرحت ہو؟"

لڑکی نے شکایت کے لہجے میں کہا: "آپ نے مجھے گالیاں دی ہیں۔"

"مجھے کسی سپاہی سے حکم عدولی کی توقع نہ تھی۔ اور تمھیں بلاوجہ جان خطرہ میں ڈالنے سے منع کرنا میرا فرض تھا۔ لیکن اگر تم خفا ہو تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

"میں آپ سے خفا نہیں ہوں۔"

معظم علی نے کہا: "اب تم اطمینان سے نیچے جاکر سوجاؤ، اب حملے کا کوئی خطرہ نہیں، مرہٹے پسپا ہورہے ہیں۔ گلی سے ان کے بھاگنے کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔"

چھت کے پہریدار اٹھ اٹھ کر صحن کی طرف جھانکنے اور ایک دوسرے کو یہ خوشخبری سنانے لگے: "مرہٹے بھاگ رہے ہیں۔ مرہٹے بھاگ رہے ہیں!"

معظم علی نے بھری ہوئی بندوق فرحت کی طرف بڑھاتے ہوئے اپنی بندوق واپس لے لی اور کہا۔ "اب شاید آپ کو اس کی ضرورت پیش نہ آئے۔"

فرحت کچھ کہے بغیر زینے کی طرف چل دی اور معظم علی نے رضاکاروں کی طرف متوجہ ہوکر کہا: "تم بہت غیر ذمہ دار ہو۔ اگر مرزا صاحب کی صاحبزادی اپنی بے احتیاطی کے باعث زخمی ہوجاتیں تو ہم انھیں کیا منہ دکھاتے؟"

حسین بیگ کے ایک نوکر نے کہا: "جناب ان کے لباس سے دھوکا ہوا تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ کوئی رضاکار ہے۔"

"لیکن کسی رضاکار کو بھی چھت پر کھڑا ہونے کی اجازت نہ تھی۔ تمھارا فرض تھا کہ تم انھیں بے احتیاطی سے منع کرتے!"

حسین بیگ کے نوکر نے جواب دیا: "ہم نے انھیں منع کیا تھا۔ لیکن انھوں نے ہماری طرف توجہ دینے کی بجائے اچانک بندوق چلا دی۔ اتنی دیر میں آپ پہنچ گئے۔"

معظم علی نے اٹھ کر چھت کی چاروں طرف متوجہ ہو کر کہا: "میرے خیال میں اب میدان خالی ہو چکا ہے۔ لیکن جب تک مجھے حویلی کے باہر کے حالات کے متعلق تسلّی نہیں ہوتی تمھیں چوکس رہنا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی تک چند آدمی درختوں کی آڑ میں چھپے ہوئے ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی پندرہ رضاکاروں کے ساتھ اندرونی صحن کے طول وعرض میں چکّر لگانے کے بعد باہر کے احاطے میں پہنچا۔ حملہ آور رفو چکر ہو چکے تھے۔ حویلی کے مختلف گوشوں میں دشمن کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اور جگہ جگہ زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں، مرہٹے حسین بیگ کے اصطبل سے بیس گھوڑے اپنے ساتھ لے جا چکے تھے۔

معظم علی رضاکاروں کے ساتھ حویلی سے باہر نکلا۔ قریباً ایک گھنٹہ محلے کی گلیوں میں چکر لگانے کے بعد اس نے واپس آ کر اعلان کیا: "مرہٹے جا چکے ہیں۔ خدا نے ہماری مدد کی ہے اب اس کی بارگاہ میں سجدوں کا وقت ہے۔"

عورتیں، بچے، بوڑھے اور جوان خوشی کے نعروں اور مسرت کے آنسوؤں سے اس کے اعلان کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ مکان کے اندر خواتین معظم علی کی ماں کے گرد جمع ہو کر تشکر اور احسان مندی کے جذبات کا اظہار کر رہی تھیں اور مکان سے باہر مردوں کا ہجوم معظم علی کو گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔ وہ ان کے لیے ایک قابل فخر بیٹا، ایک قابل عزت بھائی اور ایک قابل اعتماد دوست بن چکا تھا۔

معظم علی نے رضاکاروں کو مشعلیں جلانے کا حکم دیا اور برآمدے کی سیڑھی پر کھڑا ہو کر بلند آواز میں کہا: "بھائیو! کمروں کے اندر خواتین اور بچے گرمی کے باعث سخت تکلیف میں ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اب تمام مرد حویلی کے بیرونی احاطے میں چلے جائیں تاکہ ہماری بہنیں باقی رات کھلی ہوا میں سانس لے سکیں۔ مسلح رضاکاروں کے لیے میرا یہ حکم ہے کہ وہ صبح تک بیرونی فصیل کے مورچوں میں پہرہ دیں۔ بظاہر اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ مرہٹے دوبارہ حملہ کریں گے تاہم میں نے احتیاط کے طور پر چند آدمیوں کو باہر کے راستوں پر پہرہ دینے کے لیے بھیج دیا ہے۔ آپ کو رات کا کھانا نہیں ملا۔ مرزا صاحب نے اس بات کا ذمّہ لیا ہے کہ دو گھنٹوں کے اندر اندر آپ سب کے لیے دسترخوان بچھا دیئے جائیں گے۔"

چوتھا باب

صبح کی نماز کے بعد محلے کے لوگ اپنے اپنے گھروں کا رخ کر رہے تھے۔ معظم علی تھکاوٹ سے نڈھال ہو کر دیوان خانے کے برآمدے میں ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ چند منٹ بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ دس بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی تو محمود علی، یوسف، حسین بیگ، آصف اور افضل اس کی چارپائی کے گرد کھڑے مسکرا رہے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر یکے بعد دیگرے اپنے باپ، بھائی، اور دوستوں سے بغل گیر ہوا۔

افضل نے کہا: "معظم تم نے تو ہمارے گھر کا نقشہ ہی بدل دیا ہے!"

حسین بیگ بولا: "بیٹا اگر مرہٹے ہمیں ایک دو ماہ اور مہلت دیتے تو معظم اس محلے کے ہر مکان کا نقشہ بدل دیتا!"

محمود علی نے کہا: "ہم راستے میں بہت پریشان تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ ورنہ یہ محلہ بہت غیر محفوظ تھا!"

حسین بیگ نے کہا: "خدا کا شکر ہے کہ اب محلے کے لوگ میرا مذاق نہیں اڑائیں گے۔ ورنہ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر معظم کا قیاس غلط ثابت ہوا تو مجھے اس شہر سے ہجرت کرنا پڑے گی۔ سلطان خان نے میرا مذاق اڑانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ لیکن جب مرہٹوں کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ سارے شہر سے اپنی برادری کے لوگوں کو جمع کر کے یہاں آ گیا تھا۔ رات کے وقت وہ میرے کتب خانے میں فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ لوگ تاریکی میں اسے ٹھوکریں مارتے

تھے۔ لیکن وہ اُف تک نہیں کرتا تھا۔"

معظم علی نے سوال کیا: "چچا جان! آپ نے شہر کے حالات معلوم کیے ہیں؟"

حسین بیگ نے جواب دیا: "شہر میں مرہٹوں نے کافی لوٹ مار کی ہے۔ جگت سیٹھ کے محل سے وہ بیس لاکھ روپیہ نکال کر لے گئے ہیں۔ اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم شہیدوں کے جنازے کے ساتھ جا رہے ہیں۔ اس کے بعد شام کے چار بجے تمھیں میر مدن کے پاس جانا ہے!"

"میر مدن کے پاس؟"

"ہاں تم سو رہے تھے انھوں نے تمھیں جگانے کی اجازت نہیں دی!"

"وہ یہاں آئے تھے؟"

"ہاں وہ آئے تھے اور حویلی کا معائنہ کرنے کے بعد واپس چلے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ فوج کے چند اور افسر بھی تھے۔ وہ تمھاری کارگزاری پر بہت خوش تھے!"

معظم علی نے سوال کیا: "انھیں آپ نے یہاں بلایا تھا؟"

حسین بیگ نے جواب دیا: "بیٹا انھیں یہاں آنے کے لیے کسی کے بلانے کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے لیے یہ خبر کافی تھی کہ اس حویلی میں دو سو مرہٹوں کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں!"

محمود علی نے کہا: "راستے میں ہماری طرح میر مدن بھی اس محلے کے متعلق بہت پریشان تھے۔ وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ مرزا صاحب کی حویلی بہت غیر محفوظ ہے۔ لیکن شہر میں داخل ہوتے ہی جب ہمیں مرہٹوں کے نقصانات کی اطلاع ملی تو انھوں نے کہا کہ میں سب سے پہلے مرزا صاحب کی حویلی دیکھنا چاہتا ہوں!"



شام کے چار بجے معظم علی شاہی محل کی چار دیواری کے اندر میر مدن کے مکان میں داخل ہوا۔ ایک سپاہی اسے ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کمرے میں ایک نوجوان افسر کے پاس لے گیا۔

"تشریف رکھیے۔" افسر نے اپنے سامنے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔"

معظم علی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "میرا نام معظم علی ہے اور مجھے میر صاحب نے بلایا ہے۔"

افسر چونک کر کرسی سے اٹھا اور آگے بڑھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "آپ محمود علی کے صاحبزادے ہیں؟ معاف کیجیے۔ میں آپ کو بڑی عمر کا آدمی سمجھتا تھا۔ میر صاحب چند افسروں سے بات کر رہے ہیں۔ آپ کو تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔"

معظم علی افسر سے مصافحہ کرنے کے بعد دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند ثانیے خاموشی سے معظم علی کی طرف دیکھنے کے بعد افسر نے کہا:

"میرا نام گوہر خان ہے۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

تھوڑی دیر بعد فوج کے چند افسروں کو دیوان خانے کے ایک کمرے سے باہر نکلتے دیکھ کر گوہر خان نے کہا:

"چلیے اب وہ فارغ ہوگئے ہیں۔"

معظم علی گوہر خان کے پیچھے ہولیا۔ صحن عبور کرنے کے بعد وہ دیوان خانے کے برآمدے میں داخل ہوئے اور گوہر خاں معظم علی کو رکنے کا اشارہ کرکے اندر داخل ہوا۔ چند ثانیے بعد اس نے باہر نکل کر معظم علی کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔

سطوت و جبروت کا ایک پیکرِ مجسم کرسی سے اٹھ کر دو تین قدم آگے بڑھا اور معظم علی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمھیں انتظار کرنا پڑا۔ میں بہت مصروف تھا۔"

"مجھے آپ کی مصروفیت کا احساس ہے۔"

"بیٹھ جاؤ!"

معظم علی میر مدن کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

میر مدن نے کہا: "میں تمھاری کارگزاری دیکھ چکا ہوں اور مجھے تم پر فخر ہے۔"

"میں آپ کا شکرگزار ہوں۔" معظم علی نے احسان مندی سے آنکھیں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نے تمھیں اس لیے بلایا ہے کہ بنگال کی فوج کو تم جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ مرزا حسین بیگ کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ تمھیں فوج کی ملازمت پسند نہیں۔ میں سیاستدان ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ میں صرف ایک سپاہی ہوں اور ایک سپاہی کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ میں تمام کارآمد نوجوانوں کو اپنے گرد جمع کروں۔ محلے کی حفاظت کے سلسلہ میں تمھاری کارگزاری دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تمھارے سیاسی نظریات خواہ کچھ ہوں۔ موجودہ حالات میں تم بنگال کی فوج کے لیے اپنی خدمات کی ضرورت سے انکار نہیں کرسکو گے۔ مرہٹوں کے ساتھ گزشتہ لڑائیوں میں میرے چند بہترین سالار شہید ہوچکے ہیں اور میری دلی خواہش ہے کہ ان میں سے ایک کی جگہ اسی وقت پُر کردی جائے۔ آج تک میں نے عہدوں کی تقسیم کے لیے کسی کی سفارش قبول نہیں کی۔ لیکن تمھارا معاملہ مختلف ہے۔"

معظم علی نے پریشان ہوکر کہا: "اگر مرزا صاحب نے میری سفارش کی ہے تو مجھے بہت افسوس ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے سمجھنے میں غلطی نہیں کریں گے۔"

میر مدن نے مسکراتے ہوئے کہا: "برخوردار! مرزا حسین بیگ نے نہیں بلکہ ان کی حویلی میں پڑی ہوئی دو سو مرہٹوں کی لاشوں نے تمھاری سفارش کی تھی۔ پھر جب میں تمھارے محلے کی گلیوں سے گزر رہا تھا تو بچوں اور بوڑھوں کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو مجھے یہ پیغام دے رہے تھے کہ اس محلے میں ایک نوجوان ایسا ہے جس کی جرأت، ہمت اور ذہانت پر تم اعتماد کرسکتے ہو۔"

معظم علی نے کہا: "لیکن میں نے صرف ایک ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کوئی قابلِ فخر کارنامہ نہیں۔"

"تم نے ایک چھوٹی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اب میں تمھیں ایک بڑی ضرورت کو پورا کرنے

کی دعوت دے رہا ہوں۔"

معظم علی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا: "اگر یہ دعوت کسی اور کی طرف سے ہوتی تو میں سوچے بغیر انکار کر دیتا لیکن آپ کے سامنے بات کرنا بھی میرے نزدیک گستاخی ہے۔"

"تمھیں بات کرنے کی ضرورت نہیں۔" میر مدن نے یہ کہہ کر قلم اٹھایا اور کاغذ پر کچھ لکھنے میں مصروف ہوگیا۔ جب وہ فارغ ہوا تو معظم علی نے کہا: "میں آپ کے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں کروں گا۔ میرے تذبذب اور پریشانی کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں اس قیادت سے مطمئن نہیں ہوسکتا جو قوم کے اجتماعی تقاضوں کی بجائے اپنی ضروریات کے مطابق دوستوں اور دشمنوں کے متعلق اپنا زاویۂ نگاہ بدلتی رہتی ہے۔"

میر مدن نے لکھا ہوا کاغذ معظم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "سپاہی ہمیشہ سیاستدانوں کی غلطیوں کا کفارہ ادا کرتے ہیں۔ اور تم ایک سپاہی ہو۔ میں بنگال کی فوج کو ان عناصر سے پاک کرنا چاہتا ہوں جو قوم کے مستقبل کے متعلق ہمیشہ موقع پرست سیاستدانوں کے ذہن سے سوچتے ہیں اور تمھارے جیسے حقیقت پسند اور فرض شناس نوجوانوں کے تعاون کے بغیر یہ کام نہیں ہوسکتا۔ مجھے یقین ہے کہ تم کسی دن فوج کے سپاہیوں میں وہ اجتماعی ضمیر بیدار کرسکو گے۔ جو سیاسی طالع آزماؤں کی کوتاہیاں برداشت نہیں کرے گا۔ یہ تمھاری تقرری کا حکم نامہ ہے۔ میں تمھیں دو دن سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔ اگر تم نے دو دن کے بعد فوج میں حاضری نہ دی تو یہ حکم نامہ خود بخود منسوخ ہوجائے گا۔ اور مجھے اس بات کا افسوس ہوگا کہ میں ایک مضبوط پتھر کو قوم کے دفاعی حصار کی تعمیر کے لیے کام میں نہ لاسکا۔ مرشد آباد میں اب کچھ عرصہ حملے کا کوئی خطرہ نہیں لیکن جنوب مغربی اضلاع کے لیے خطرہ زیادہ بڑھ گیا ہے۔ میر حبیب سے زیادہ ہماری کمزوریوں سے کوئی واقف نہیں۔ وہ مرشد آباد میں اپنی ناکامی کا بدلہ لینے میں تاخیر نہیں کرے گا۔"

معظم علی نے کہا: "میں جانتا ہوں کہ اس وقت، بردوان، میدناپور اور ہگلی کے علاقے خطرے میں ہیں اور اگر میں ایک سپاہی ہوں تو مجھے سوچنے کے لیے دو دن کی ضرورت نہیں

میں ابھی فیصلہ کرتا ہوں۔ میں کل ہی اپنے دستے کی کمان سنبھال لوں گا۔"



علی وردی خاں مرشد آباد میں اپنی افواج کو از سر نو منظم کر رہا تھا کہ مرہٹہ افواج نے میر حبیب کی قیادت میں اچانک ہگلی کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ برسات کی وجہ سے مرشد آباد سے رسد و کمک کے راستے بند ہو چکے تھے اور مرہٹے کسی موثر مزاحمت کا سامنا کیے بغیر بردوان، میدناپور اور بامر کے علاقوں میں لوٹ مار کر رہے تھے۔ اور چند ہفتوں میں حالت یہ ہوگئی کہ مرشد آباد کے جنوب مغرب میں کوئی علاقہ مرہٹوں کے حملوں کی زد سے محفوظ نہ تھا۔

برسات کی شدت کم ہوتے ہی علی وردی خاں نے پوری تیاری کے ساتھ مرشد آباد سے پیشقدمی کی اور کٹوے کے قریب دریائے بھاگرتی کے کنارے ڈیرے ڈال دیئے۔ مرہٹہ افواج نے چاروں طرف سے سمٹ کر بھاگرتی کے دوسرے کنارے پڑاؤ ڈال دیا۔ قریباً تیس دن فریقین اپنے کیمپوں سے ایک دوسرے پر گولہ باری کرتے رہے۔ اس عرصہ میں مرہٹوں کو یہ اطلاع ملی کہ اودھ کا صوبہ دار اپنے لشکر کے ساتھ علی وردی خاں کی مدد کے لیے آرہا ہے چنانچہ انھوں نے ایک گھمسان کی جنگ کے بعد پسپائی اختیار کی۔ چند دنوں میں علی وردی خاں کی افواج نے مرہٹوں کو بردوان، ہگلی اور میدناپور کے علاقوں سے نکال دیا۔ ہر محاذ سے مرہٹوں کی عام پسپائی شروع ہو چکی تھی اور بنگالی فوج کے تیز رفتار ہراول دستے ان کی افراتفری سے پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔

معظم علی ہراول دستوں کے ان چند افسروں میں سے ایک تھا جو پورے لشکر کی توجہ کا مرکز بن چکے تھے۔ دشمن کے تعاقب میں یہ لوگ باقی فوج سے ہمیشہ ایک منزل آگے رہتے تھے۔ مرہٹہ فوج کئی کئی کوس بھاگنے کے بعد کسی محفوظ مقام پر پڑاؤ ڈالتی۔ لیکن یہ لوگ اچانک حملہ کرکے ان کو دوبارہ بھاگنے پر مجبور کر دیتے۔ معظم علی کی کمان میں پانچ سو سوار تھے اور وہ چند دنوں میں دشمن کی پچیس توپوں اور سامانِ رسد کی ستر گاڑیوں پر قبضہ کر چکا تھا۔

علی وردی خاں نے اڑیسہ کی سرحد تک، مرہٹوں کا تعاقب کیا۔ ایک شام بنگال کی افواج نے چھیل چھلکا۔ کے کنارے پڑاؤ ڈالا اور علی وردی خان نے افسروں کے سامنے یہ اعلان کیا کہ یہ ہماری آخری منزل ہے۔ اب اس سے آگے جانا بے سود ہے۔"

رات کے وقت جب فوج فتح کا جشن منا رہی تھی۔ میر مدن، علی وردی خاں کے خیمے میں داخل ہوا اور اس نے کہا: "عالیجاہ! مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ہراول فوج کے ایک سالار نے واپس آنے کی بجائے یہاں سے کوئی چودہ میل دور دشمن کے ایک قلعے پر حملہ کر دیا ہے۔"

علی وردی خاں نے برہم ہو کر کہا: "یہ میرے حکم کی خلاف ورزی ہے۔ میں نے تمام فوج کو یہاں جمع ہونے کا حکم دیا تھا۔ وہ سالار کون ہے؟"

"عالیجاہ وہ معظم علی ہے۔"

"لیکن ہراول فوج کو سرحد عبور کرنے کی اجازت نہیں تھی!!"

"عالیجاہ اس نے سرحد عبور نہیں کی۔ یہ قلعہ ہمارا تھا اور مرہٹے چند سال سے اس پر قابض چلے آتے ہیں۔"

"اور وہ احمق یہ سمجھتا ہے کہ اس کے پانچ سو سپاہی مرہٹوں کے تمام لشکر کو موت کے گھاٹ اتار کر قلعے پر قابض ہو جائیں گے؟"

"عالیجاہ! میرے خیال میں وہ اب تک قلعے پر قابض ہو چکا ہوگا۔ جو اطلاع مجھے ملی ہے اس کے مطابق وہ ہراول کے باقی دستوں سے کٹ کر مرہٹوں کے لشکر سے آگے نکل گیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مرہٹوں کے وہاں پہنچنے سے پہلے قلعے پر قبضہ کر لیا جائے۔ اب مجھے یہ اندیشہ ہے کہ اگر اسے کمک نہ بھیجی گئی تو مرہٹوں کا لشکر وہاں پہنچتے ہی قلعہ کا محاصرہ کر لے گا اور ہماری فوج کے پانچ سو بہترین سپاہی مارے جائیں گے۔"

علی وردی خاں نے کہا۔ "اگر صورت یہ تھی تو تمہیں کمک بھیج کر میرے پاس آنا چاہیئے تھا۔"

میر مدن مسکرایا: "عالیجاہ میں فوج کو تیاری کا حکم دے آیا ہوں۔ صرف آپ سے اجازت لینا چاہتا ہوں۔"

"کتنے سپاہی لے جا رہے ہو؟"

"پانچ ہزار"

"جاؤ!"

جب میر مدن خیمے سے باہر نکل رہا تھا تو علی وردی خاں نے کہا:

"انشاء اللہ کل ہم وہ قلعہ دیکھنے آئیں گے۔"



میر مدن کا قیاس درست تھا۔ معظم علی غروب آفتاب سے دو گھنٹے بعد سرحدی قلعے پر قبضہ کر چکا تھا۔ قلعے کی حفاظت کرنے والے پچاس سپاہیوں میں سے چوبیس ہلاک اور زخمی ہو چکے تھے۔ پندرہ گرفتار اور باقی ایک چور دروازے سے فرار ہو گئے تھے۔

معظم علی نے قلعے کے برج پر بنگال کا جھنڈا نصب کرنے کے بعد اپنے سپاہیوں سے کہا: "بہادرو! مجھے معلوم ہے کہ تم بہت تھکے ہوئے ہو۔ لیکن آج رات شاید تمہیں آرام نصیب نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تھوڑی دیر تک مرہٹوں کا لشکر یہاں پہنچ جائے گا۔ لیکن اگر ہم صبح تک قلعے پر قبضہ رکھ سکیں تو انشاء اللہ ہماری فوج پہنچ جائے گی اور ہمارے مقدر میں ایک اور شاندار فتح ہوگی۔ لیکن اگر ہم نے ہمت ہار دی اور مرہٹے دوبارہ قلعے پر قابض ہو گئے تو ہمارے لیے بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ قلعے میں اتنا بارود ہے کہ ہم چند گھنٹے دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ رات کے وقت ہمیں فصیل کے ہر حصے پر چوکس رہنا چاہیئے۔"

مرہٹہ فوج کے سرداروں کو اس بات کا یقین تھا کہ علی وردی خاں کا لشکر ان کا مزید تعاقب نہیں کرے گا اور وہ سرحدی قلعہ میں پناہ لے کر اپنے مستقبل کے متعلق اطمینان سے سوچ سکیں گے۔ لیکن کوئی دو کوس کے فاصلے پر قلعے سے فرار ہونے والے سپاہیوں نے انھیں یہ خبر دی کہ

بنگال کے مٹھی بھر سپاہی قلعے پر قابض ہو چکے ہیں۔ مرہٹہ سردار قلعہ کے محافظوں کو بزدلی اور بے غیرتی کا طعنہ دیتے ہوئے آگے بڑھے اور آدھی رات کے قریب انھوں نے قلعے سے کوئی آدھ میل دور شمال کی جانب پڑاؤ ڈال دیا۔ اس کے بعد میر حبیب اپنے پانچ ہزار آزمودہ کار سپاہی لے کر آگے بڑھا اور اس نے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔

پچھلے پہر شدید گولہ باری کے بعد مرہٹوں کا لشکر چاروں طرف سے قلعے پر یلغار کر رہا تھا اور معظم علی کے ساتھی کمک پہنچنے کی امید پر اپنے مورچوں میں ڈٹے ہوئے تھے۔ اچانک جنوب مشرق کی سمت سے گولیوں کی بارش ہونے لگی اور مرہٹہ فوج میں افراتفری پھیل گئی۔ وہ مغرب کی طرف سمٹنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد مغرب کی طرف بھی درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ سے مرہٹوں پر گولیاں برسنے لگیں اور کوئی آدھ گھنٹے بعد مرہٹے انتہائی انتشار کی حالت میں شمال کی طرف بھاگ رہے تھے۔

میر مدن نے اپنے سواروں کو عام حملے کا حکم دیا اور آن کی آن میں میدان خالی ہو گیا۔ بنگال کی فوج پڑاؤ تک مرہٹوں کا تعاقب کرنے کے بعد واپس آگئی۔

صبح کے دھندلکے میں معظم علی اور اس کے ساتھی قلعے سے باہر نکل کر میر مدن کا خیر مقدم کر رہے تھے۔

میر مدن کے دائیں بائیں محمود علی، یوسف، آصف اور افضل بیگ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار تھے۔ میر مدن ۔۔۔ کے قریب پہنچ کر اپنا گھوڑا روکا اور معظم علی سے مخاطب ہو کر کہا: "تمھیں اس قلعے پر حملہ کرنے کا حکم کس نے دیا تھا؟"

یہ سوال اور یہ لب و لہجہ معظم علی کے لیے غیر متوقع تھا۔ وہ ایک ثانیہ کے لیے تذبذب اور پریشانی کی حالت میں میر مدن کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے باپ، بھائی اور دوستوں کی طرف دیکھا۔ وہ سب مسکرا رہے تھے۔ معظم علی نے اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں۔

"بولتے کیوں نہیں؟" میر مدن نے ذرا سخت لہجے میں سوال کیا۔

معظم علی نے جواب دیا: "اس قلعے پر حملہ کرنے کے لیے مجھے کسی نئے حکم کی ضرورت نہ تھی۔

میرا یہ اقدام آپ کی منشا کے عین مطابق تھا۔"

میر مدن نے مڑ کر محمود علی کی طرف دیکھا اور اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "لیکن تمھارے سپاہی تھکے ہوئے تھے۔ انھیں آرام کی ضرورت تھی!"

ایسے حالات میں سپاہی کے لیے گھوڑے کی زین بستر سے زیادہ آرام دہ ہوتی ہے۔ پھر انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ یہ قلعہ ان کے سفر کی آخری منزل ہے اور اس پر قبضہ کرنے کے بعد وہ جی بھر کر آرام کر سکیں گے۔"

میر مدن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے کہا: "معظم علی تمھارا یہ کارنامہ میری توقع کے عین مطابق تھا لیکن تم نے ہمیں آرام کی دعوت نہیں دی؟"

معظم علی نے جواب دیا: "اندر چلیے، میں نے آپ سب کے لیے آرام کا انتظار کر رکھا ہے۔"



دوپہر کے وقت قلعے سے باہر ایک کشادہ خیمے کے اندر علی وردی خاں کا دربار لگا ہوا تھا اور فوج کے بڑے بڑے افسر اس کے سامنے کھڑے تھے۔ معظم علی خیمے کے اندر داخل ہوا اور وہ بنگال کے حکمران کو سلام کرنے کے بعد ادب سے کھڑا ہو گیا۔

علی وردی خاں نے گاؤ تکیے کا سہارا چھوڑ کر سیدھے بیٹھتے ہوئے کہا:

"نوجوان! ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا؟"

معظم علی نے جواب دیا: "عالی جاہ! مجھے یقین تھا کہ میں چند گھنٹے اس قلعے پر قبضہ رکھ سکتا ہوں اور اتنی دیر میں سپہ سالار کمک بھیج دیں گے۔"

"لیکن کمک پہنچنے میں دیر ہو جاتی تو کیا ہوتا؟"

"عالی جاہ! میں نے یکے بعد دیگرے آٹھ سوار پڑاؤ کی طرف روانہ کر دیے تھے اور میر مدن کی موجودگی میں کمک کے دیر سے پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔"

"رات کے وقت اس قلعے کی طرف تمھاری رہنمائی کرنے والا کون تھا؟"

مجھے کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہ تھی۔ میں اس علاقے کا ہر نشیب و فراز اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح جانتا ہوں۔"

علی وردی خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "نوجوان! میں تمھیں اس قلعے کا محافظ مقرر کرتا ہوں۔ اگر تمھارے متعلق میر مدن کے خیالات صحیح ہیں تو مجھے یقین ہے کہ تم اپنے آپ کو اس ذمہ داری کا اہل ثابت کرو گے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "عالی جاہ! میں میر مدن کی توقعات پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔"

چوتھے روز معظم علی اس قلعے کے کماندار کی حیثیت میں بنگال کے لشکر کو الوداع کہہ رہا تھا۔ قلعے کے قریب ایک بلند ٹیلے سے بنگال کی افواج کی آخری جھلک دیکھنے کے بعد اس نے اپنے پانچ سو سپاہیوں کو قلعے کی چار دیواری کے اندر جمع ہونے کا حکم دیا اور ان کے سامنے تقریر کی:-

"میرے ساتھیو! تم مجھے مغموم نظر آتے ہو۔ ہم اپنے گھروں سے سینکڑوں میل دور پھینک دیے گئے ہیں۔ لیکن ہمیں اس بات پر فخر کرنا چاہیئے کہ ہمیں ایک بہت بڑی ذمہ داری کا اہل سمجھا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ قلعہ بنگال کی ایک دور افتادہ چوکی نہیں بلکہ مرشد آباد کے ایک دروازے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم اس ویرانے میں رہ کر ان گھروں کی حفاظت کریں گے جو یہاں سے سینکڑوں کوس دور ہیں اور ہمیں یہ تسکین ہوگی کہ ہماری وجہ سے ہماری قوم کے لاکھوں افراد آرام کی نیند سوتے ہیں۔

میر مدن نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اس قلعے کو مستحکم بنانے کے لیے وہ میری ہر ممکن مدد کریں گے اور میں ان کے ساتھ یہ وعدہ کر چکا ہوں کہ جب تک ہم میں سے ایک آدمی بھی زندہ ہے، اس قلعے پر بنگال کا پرچم لہراتا رہے گا۔ یہ قلعہ بہت اہم ہے اور ہمیں اسے ناقابلِ تسخیر بنانا ہے۔"

اگلے دن معظم علی کے سپاہی اس قلعے کی ٹوٹی ہوئی دیواروں کی مرمت کا کام شروع کر چکے تھے۔

ایک سال بعد کٹک کا فوجدار اس قلعے کے معائنے کے لیے آیا تو اس نے علی وردی خاں کو یہ خط لکھا:-

"ایک سال بعد یہ قلعہ دیکھ کر میں نے یہ محسوس کیا کہ میں غلطی سے کسی اور جگہ آ گیا ہوں۔ معظم علی نے اس کا نقشہ بدل دیا ہے۔ ٹوٹی ہوئی فصیل کی جگہ ایک نئی فصیل تعمیر ہو چکی ہے۔ قلعے کے اندر سپاہیوں کی رہائش کے لیے نئی کوٹھڑیاں تعمیر کی جا رہی ہیں۔ اور فصیل سے باہر خندق کھودنے کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اس قلعے کی تعمیرِ نو کے لیے جو رقم منظور کی گئی تھی وہ بہت قلیل تھی اور معظم علی نے اخراجات بچانے کے لیے تعمیر اور مرمت کا بیشتر کام اپنے سپاہیوں سے لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر معظم علی کچھ عرصہ اور یہاں رہا تو دفاعی لحاظ سے ہمارا یہ سرحدی قلعہ بہت مضبوط بن جائے گا۔

اس قلعے کے دفاعی انتظامات بہتر بنانے کے علاوہ معظم علی نے اردگرد کے جنگلات مرہٹہ ڈاکوؤں سے پاک کر دیئے ہیں اور سرحد کی اجڑی ہوئی بستیاں دوبارہ آباد ہو رہی ہیں۔ ان بستیوں کی حفاظت کے لیے مقامی رضاکاروں کی فوج منظم کی جا رہی ہے اور اب تک معظم علی کے سپاہی قریباً ایک ہزار آدمیوں کو فوجی تربیت دے چکے ہیں۔ میں نے آپ کے حکم کے مطابق معظم علی سے یہ کہا تھا کہ اگر تم چاہو تو تمھیں مرشد آباد تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ یہ بات سن کر خوشی سے اچھل پڑے گا۔ لیکن اس نے مجھے یہ جواب دیا کہ ابھی اس علاقے میں میرا کام ختم نہیں ہوا ہے، ابھی اس علاقے میں از سرِ نو آباد ہونے والے لوگوں کو میری ضرورت ہے اور یہ جذبہ صرف معظم علی میں ہی نہیں بلکہ اس کا ہر سپاہی یہ محسوس کرتا ہے کہ اسے کوئی اہم ذمہ داری سونپی گئی ہے۔"

پانچواں باب

دن مہینوں اور مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ سرحدی قلعے کے کمان دار کی حیثیت میں معظم علی کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب وہ مرشدآباد کے متعلق نہیں سوچتا تھا۔ کبھی وہ بچپن کے ان ایام کا تصور کرتا جب وہ یوسف، افضل اور آصف بیگ کے ساتھ اپنے محلے کی گلیوں میں کھیلا کرتا تھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ کبھی اسے اپنے والدین کا خیال آتا اور اسے قلعے کی فضائیں اداس محسوس ہونے لگتیں۔ بچپن اور جوانی کے ساتھیوں کی تصویریں ایک ایک کرکے اس کے سامنے آتیں۔ اور بالآخر مرشدآباد کے متعلق اس کے تمام تصورات ایک مرکزی نقطے پر مرکوز ہوکر رہ جاتے۔ ایک ایسی صورت اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتی جس کے کوئی مستقل خط وخال اس کے ذہن پر نقش نہ تھے اور اس کی دنیا قوس قزح کی رنگینیوں سے لبریز ہوجاتی۔ وہ رات کے وقت کھلی فضا میں لیٹے لیٹے کبھی بلند آواز میں اور کبھی دبی زبان سے فرحت کا نام پکارتا اور کائنات کی وسعتیں ستاروں کے نغموں سے لبریز ہوجائیں۔ لیکن پھر اچانک تصورات کے یہ سنہرے تار ٹوٹ جاتے اور وہ گہری نیند سوجاتا۔

ایک حقیقت پسند انسان کی طرح اس نے کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی کوشش نہیں کی تھی کہ زندگی کی کسی منزل میں فرحت اور اس کا راستہ ایک ہوسکتا ہے۔ تاہم فرحت کے متعلق موہوم، دلکش اور دلفریب تصورات اس کے خیالوں اور سپنوں کی دنیا پر حاوی

ہوتے جارہے تھے۔ مرزا حسین بیگ، آصف اور افضل بیگ کے نام اس کے ہر خط کی آخری سطر "پسندگانِ حال کو سلام" کے الفاظ پر ختم ہوتی تھی اور یہی ایک جملہ اس کے نزدیک تمام خط سے زیادہ اہم ہوتا تھا۔ آصف کو خط کا جواب لکھنے کی عادت نہ تھی لیکن افضل اور حسین بیگ نہایت باقاعدگی کے ساتھ اس کے خطوط کا جواب دیا کرتے تھے۔ حسین بیگ کے خطوط میں ایک پدرانہ شفقت کا اظہار ہوتا۔ افضل کے خطوط بنگال کی سیاسی صورت حالات کے تذکروں سے لبریز ہوتے۔ کبھی کبھی وہ ایک آدھ فقرہ اپنی بہن کے متعلق بھی لکھ دیتا اور معظم علی اسے پڑھ کر اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگتا۔ "فرحت اچھی ہے تمہیں سلام کہتی ہے۔ آج فرحت کہتی تھی کہ تمہاری امی جان بہت مغموم رہتی ہیں، اس لیے تمہیں چند دن کے لیے گھر ضرور آنا چاہیئے" اور معظم علی کا جی چاہتا کہ وہ اڑکر مرشدآباد پہنچ جائے۔

اپنی والدہ کے نام خطوط لکھتے وقت ہمیشہ اس کے ذہن میں یہ احساس کارفرما ہوتا کہ وہ اس کی وساطت سے فرحت کے ساتھ باتیں کررہا ہے۔ معظم علی کی ماں اپنے خطوط میں فرحت کے متعلق بڑی تفصیل سے لکھا کرتی تھی۔ اگر کسی خط میں فرحت کا ذکر نہ ہوتا تو اسے ایک قسم کی تکلیف محسوس ہوتی اور وہ جواب میں شکایت کرتا۔ "امی جان آپ نے مرزا حسین بیگ اور ان کے بال بچوں کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی!" اور ماں کی طرف سے اس قسم کا جواب آتا۔ "بیٹا! میں تمہارا خط ملتے ہی ان کے ہاں گئی تھی۔ وہ سب بخریت ہیں۔ فرحت بہت خوش ہے، وہ تمہارے متعلق پوچھتی تھی۔ وہ جب بھی ہمارے یہاں آتی ہے تمہارے متعلق پوچھا کرتی ہے۔ پچھلے دنوں میں علیل تھی اور وہ ہر روز میری تیمارداری کے لیے آیا کرتی تھی۔ بڑی نیک لڑکی ہے، وہ پوچھتی تھی کہ تم چند دن کے لیے چھٹی لے کر گھر کیوں نہیں آجاتے؟"

○

علی وردی خان ایک بیدار مغز حکمران تھا۔ لیکن اس کے عہد حکومت میں سلطنت

بنگال ایسے سیاسی شاطروں کی آماجگاہ بن چکی تھی جو قوم کی عزت و آزادی کو ہر وقت داؤں پر لگانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ مسند اقتدار کے یہ بے حیا دعویدار کبھی کسی صوبہ دار یا فوجدار کے ساتھ ساز باز کرتے، اسے علی وردی خان کے مقابلے میں لے آتے اور کبھی مرہٹوں کو بنگال پر حملہ کرنے کے لیے اکساتے۔ علی وردی خاں کے عزیزوں اور رشتہ داروں میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی۔ جو بنگال کی حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے موقع کے انتظار میں رہتے تھے۔ بنگال کے اندر حکومت کے بڑے بڑے عہدیدار اور فوجی افسر اور بنگال سے باہر مرہٹہ لیڈروں کے لشکر ایسے لوگوں کے سب سے بڑے مددگار ثابت ہوتے۔

یہ وہ دور تھا جب بنگال کی سیاست رائے عامہ کے محاسبہ سے قطعاً آزاد تھی۔ علی وردی خاں کبھی اپنے گھر کے غداروں سے لڑتا اور کبھی بیرونی حملہ آوروں سے مقابلہ کرتا، جب اندرونی بغاوت کا خطرہ پیش آتا تو وہ مرہٹوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہوتا اور جب مرہٹے دوستی کے تمام معاہدے توڑ کر بنگال کے حدود میں آ گھستے تو وہ شکست خوردہ غداروں کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی بجائے اٹھا کر گلے لگانے کی ضرورت محسوس کرتا۔

علی وردی خان کو اس لحاظ سے کامیاب سیاست دان کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں اپنے حریفوں کے درمیان ایسا توازن قائم رکھا کہ وہ ایک متحدہ محاذ بنا کر اس کے اقتدار پر فیصلہ کن ضرب نہ لگا سکے۔ لیکن اپنے تدبر، ذہانت اور موقع شناسی کے باوجود وہ ان فتنوں کا سدباب نہ کر سکا جو بالآخر اس کے جانشین نواب سراج الدولہ کی شکست اور بنگال کی تباہی کا باعث ہوئے۔ اس کی سب سے بڑی ناکامی یہ تھی کہ وہ بیرونی خطرات کے مقابلے کے لیے ملک کے عوام کا مدافعانہ شعور اور اندرونی غداروں کے خلاف قوم کی قوت محاسبہ بیدار نہ کر سکا۔

علی وردی خاں کے دربار میں میر جعفر کے عروج کے ساتھ بنگال کی تباہی کے اسباب مکمل ہو چکے تھے۔ وہ ان قسمت آزماؤں سے کہیں زیادہ دوراندیش تھا۔ جو سلطنت کے عہدیداروں

کے گٹھ جوڑ یا مرہٹوں کے تعاون سے بنگال کے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، اور اس کی دوراندیشی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنا مستقبل ان انگریز تاجروں کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا۔ جو فورٹ ولیم میں بیٹھ کر نہ صرف بنگال بلکہ پورے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے منصوبے تیار کر رہے تھے۔

میر جعفر کا طریق کار ان طالع آزماؤں سے مختلف تھا جو کھلے بندوں علی وردی خاں کے ساتھ قوت آزمائی کر کے اپنی شکست یا تباہی کا خطرہ مول لیتے تھے۔ وہ درپردہ ان تمام بغاوتوں اور سازشوں میں شریک تھا جو بتدریج بنگال کی قوتِ مدافعت کو مفلوج کر کے انگریزوں کے لیے راستہ صاف کر رہی تھیں۔

یکے بعد دیگرے بنگال کے امراء کی بغاوتوں نے اس کی کامیابی کے راستے صاف کر دیئے۔ علی وردی خاں جو عام حالات میں میر جعفر کو اپنا ایک حقیر ساتھی سمجھتا تھا، یہاں تک مجبور ہو گیا کہ اسے قابل اعتماد دوست سمجھنے لگا اور یہ ایک حقیقت پسند انسان کی مجبوری نہ تھی بلکہ اس سیاست دان کی مجبوری تھی جو برائیوں کو ختم کرنے سے ناامید ہو کر ان سے اچھے نتائج پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میر جعفر، اڑیسہ کا نائب صوبیدار مقرر ہوا تو مرشد آباد کے امراء جو اسے ہمیشہ قابل نفرت سمجھتے تھے، چونک اٹھے۔ لیکن اس نے جلد ہی ایک اور کامیابی حاصل کی یعنی ہگلی اور میدناپور کی فوجداری بھی حاصل کر لی۔ ہو سکتا ہے کہ دربار میں اپنے ایک رشتہ دار کی سازشوں سے تنگ آ کر علی وردی خان نے اسے مرشد آباد سے دور بھیجنا مناسب خیال کیا ہو۔ لیکن بنگال کے سن رسیدہ حکمران کو کیا معلوم تھا کہ ہگلی میں ایک فوجدار کی حیثیت سے میر جعفر کا اثر و رسوخ بنگال کے لیے بالآخر تباہ کن ثابت ہوگا۔ ہگلی اور میدناپور میں علی وردی خاں کی نگاہوں سے دور رہ کر وہ زیادہ آزادی کے ساتھ انگریزوں کی سازشوں میں شریک ہو سکتا تھا۔



اڑلیسہ پر مرہٹوں اور افغانوں کے متحدہ حملے کی خبریں مشہور رہی تھیں۔ ایک دن مرشدآباد کے پریشان حال لوگوں نے یہ سنا کہ ہگلی سے میرجعفر کی کمان میں سات ہزار سوار اور بارہ ہزار پیادہ فوج کٹک کا رخ کر رہی ہے۔ پھر کوئی ایک ہفتہ بعد یہ اطلاع آئی کہ میرجعفر دشمن کو شکست دینے کے بعد ان کا تعاقب کر رہا ہے۔

پھر جب مرشدآباد میں فتح کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں، یہ خبر آئی کہ حملہ آوروں کی مدد کے لیے راگھوجی کا بیٹا جانوجی ایک ٹڈی دل لشکر کے ساتھ پیش قدمی کر رہا ہے اور میرجعفر اس کا سامنا کرنے کی بجائے الٹے پاؤں بردوان کی طرف بھاگ رہا ہے۔ اس کے بعد کئی دن تک اڑلیسہ کے طول وعرض میں مرہٹوں اور افغانوں کی لوٹ مار کی خبریں آتی رہیں۔

معظم علی کے دوست اور عزیز ان خبروں سے بہت پریشان تھے۔ کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ دور افتادہ سرحدی قلعے کا یہ محافظ کس حال میں ہے۔ مرزا حسین بیگ ہر روز سپہ سالار کے پاس جاتا اور معظم علی کے متعلق پوچھتا لیکن کئی دن تک وہ اسے کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ فرحت اور اس کی والدہ صبح شام معظم علی کے گھر جاتیں اور اس کی ماں کو تسلی دینے کی کوشش کرتیں۔

چند دن بعد کسی نے یہ مشہور کر دیا کہ مرہٹوں نے سرحدی قلعہ فتح کر لیا ہے۔ معظم علی کے بیشتر ساتھی شہید ہو چکے ہیں اور باقی دشمن کی قید میں ہیں اور اس قسم کی افواہوں کے ساتھ معظم علی کی بہادرانہ موت کی فرضی داستانیں مشہور ہونے لگیں۔

ایک دن فرحت اور اس کی والدہ حسب معمول معظم علی کے گھر گئیں۔ کچھ دیر معظم علی کی ماں کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد انھوں نے رخصت چاہی۔ معظم علی کی ماں انھیں چھوڑنے کے لیے دروازے تک آئی۔ وہ زنانخانے سے نکل کر مکان کے مردانہ حصے کے صحن میں داخل ہو رہی تھیں کہ گلی کی طرف سے ایک سوار اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔

"معظم!" ماں کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئیں۔ کچھ دیر یہ تینوں سکتے کے عالم میں کھڑی رہیں۔

معظم علی گھوڑے سے اترا اور "السلام علیکم" کہہ کر چند قدم آگے بڑھا۔ اتنی دیر میں فرحت جس کے چہرے پر اب تک کئی رنگ آ چکے تھے۔ اپنی ماں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"معظم! معظم!!" ماں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور اس کی آنکھوں سے مسرت کے آنسو پھوٹ نکلے۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر معظم علی کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور کہا "بیٹا! یہ تمھاری چچی جان ہیں!"

حسین بیگ کی بیوی کی آنکھوں میں بھی آنسو جمع ہو رہے تھے۔ اس نے مڑ کر فرحت کی طرف دیکھا اور کہا۔ "بیٹی تم گھر جاؤ اور اپنے ابا سے کہو معظم علی آگیا ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

فرحت اپنا چہرہ چادر میں چھپائے ہوئے جھجکتی اور سمٹتی دروازے کی طرف بڑھی۔

معظم علی نے کہا "چچی جان آپ کے گھر میں خیریت ہے نا؟"

فرحت کی ماں نے جواب دیا "گھر میں سب خیریت ہے بیٹا، لیکن تم نے ہم کو بہت پریشان کیا۔"

"صابر! صابر!" معظم علی کی ماں نے نوکر کو آواز دی۔

صابر آنکھیں ملتا ہوا اصطبل کے قریب کے کمرے سے باہر نکلا اور خواتین کی موجودگی کا خیال کیے بغیر بھاگتا ہوا معظم علی کے ساتھ لپٹ گیا۔

معظم علی کی ماں نے مسکراتے ہوئے کہا "صابر! معظم کا گھوڑا اصطبل میں باندھ دو اور اس کے ابا جان اور یوسف کو اس کے آنے کی اطلاع کر دو۔"

معظم علی نے کہا "نہیں امی جان! گھوڑا باندھنے کی ضرورت نہیں، ابھی مجھے باہر کچھ کام ہے۔"

زحمت کی ماں نے کہا: "بیٹا کہاں جا رہے ہو؟ آرام سے گھر بیٹھو، تمھارے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کئی دن سے آرام نہیں کیا ہے۔"

معظم علی نے کہا: "چچی جان! میں میر مدن کے پاس جا رہا ہوں اور ان سے ملاقات کے بعد شاید مجھے نواب صاحب کے سامنے حاضر ہونا پڑے۔ مجھے سیدھا وہاں جانا چاہیے تھا، لیکن میں نے سوچا کہ پہلے گھر کا حال معلوم کر لوں۔"



کوئی ایک گھنٹہ بعد معظم علی، میر مدن کے مکان کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔ میر مدن نے اپنی کرسی سے اُٹھ کر اس کے ساتھ گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور اسے اپنے سامنے بٹھانے کے بعد کہا: "معظم علی! میں کسی تمہید کے بغیر تمھارے ساتھیوں کے متعلق جاننا چاہتا ہوں۔"

معظم علی نے مغموم لہجے میں جواب دیا: "میرے ساتھی میر جعفر کی بزدلی اور بے غیرتی کا کفارہ ادا کر چکے ہیں اور میں مرشد آباد کی ماؤں اور بہنوں کے لیے یہ پیغام لے کر آیا ہوں کہ حکومت کی بے حسی اور نااہلیت کے باعث ان کے تین سو بیٹے، بھائی اور شوہر ہلاک ہو چکے ہیں۔"

"اور باقی؟" میر مدن نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔

معظم علی نے جواب دیا: "چالیس سپاہی دشمن کی قید میں ہیں اور باقی ایک سو ساٹھ، جن میں سے قریباً پچاس زخمی ہیں، قلعے سے بچ کر نکل آئے تھے۔ میں انھیں بردوان کے راستے میں ایک محفوظ مقام پر چھوڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ ہم نے دشمن کے ہاتھوں شکست نہیں کھائی۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ حکومت نے ہمیں بے دست و پا بنا کر دشمن کے آگے ڈال دیا تھا۔ ہم نے پندرہ دن تک دشمن کے اس لشکر کا مقابلہ کیا جو تعداد میں ہم سے بیس گنا زیادہ تھا اور ہمیں یقین تھا کہ زیادہ سے زیادہ پانچ دن کے اندر کمک پہنچ جائے گی۔ میں ہر روز میر جعفر کے پاس پیغام بھیجتا تھا کہ ہمارا بارود ختم ہو رہا ہے اور ہم زیادہ دیر تک دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن ہمیں پندرہ دن کے بعد یہ جواب ملا کہ اس قلعے کی حفاظت بے سود ہے

تم اگر دشمن کا محاصرہ توڑ کر نکل سکتے ہو تو بردوان پہنچ جاؤ۔

اگر یہی حکم ہمیں آٹھ دس دن پہلے مل جاتا تو اتنی جانیں ضائع نہ ہوتیں۔ میر جعفر کی نااہلیت اور بزدلی کے باعث ہمارے ہاتھ سے صرف ایک قلعہ ہی نہیں نکلا بلکہ اڑلیسہ کے تمام علاقوں کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا ہے اور اگر حکومت نے کچھ عرصہ اور اس کی سپاہیانہ صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو مجھے یقین ہے کہ پورا بنگال مرہٹوں کی شکارگاہ بن جائے گا۔

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ان حالات میں بھی مجھے میر جعفر سے چند منٹ کی ملاقات کے لیے دو دن بردوان میں ٹھہرنا پڑا۔"

"تم میر جعفر سے مل کر آئے ہو؟"

"ہاں! دو دن تک اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد میں زبردستی محل کے اندر گھس گیا اور سپاہی مجھے پکڑ کر اس کے پاس لے گئے تھے۔"

میر مدن نے کہا: "جعفر اپنی تمام برائیوں کے باوجود بنگال کے حکمران کا رشتہ دار ہے۔ تم نے اس کے ساتھ کوئی گستاخی تو نہیں کی؟"

معظم علی نے جواب دیا: "اگر کسی بزدل آدمی کو بزدل کہنا گستاخی ہے تو میں اس جرم کا ارتکاب کر چکا ہوں۔ میں علی وردی خاں کے سامنے بھی یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ میر جعفر ان کا رشتہ دار ہونے کے باوجود اس قابل نہیں کہ اسے فوج میں کوئی معمولی عہدہ بھی دیا جا سکے۔"

میر مدن نے چند ثانیے سر جھکا کر سوچنے کے بعد کہا: "معظم علی! میں بھی ایک سپاہی ہوں اور موجودہ حالات میں تمھارے جذبات سمجھ سکتا ہوں۔ میر جعفر کے متعلق میرے خیالات تمھارے خیالات سے مختلف نہیں لیکن علی وردی خاں کے سامنے اس کی شکایت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جب اسے میدنا پور اور ہگلی کی فوجداری دی جا رہی تھی تو میں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ میں نے علی وردی خاں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ مرہٹوں کے خلاف فوج کی کمان کے لیے اس کا انتخاب درست نہیں۔ لیکن میری باتوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ انھیں میر جعفر کی صلاحیتوں کے متعلق

کوئی غلط فہمی نہیں لیکن بڑے بڑے امراء کی بغاوتوں نے انھیں میر جعفر جیسے خوشامدیوں کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ تم ان کے سامنے اس میر جعفر کی شکایت کرو گے جس کی نااہلیت اور بزدلی کے باعث اڑلیسہ کے عوام تباہی کا سامنا کر رہے ہیں۔ لیکن میر جعفر جب ان کے سامنے پیش ہوگا تو انتہائی غصّے کی حالت میں بھی بنگال کے حکمران کا معاملہ اس شخص کیساتھ ہوگا جو بوقتِ ضرورت اپنے آقا کے قدموں پر گرنا جانتا ہے، وہ کہے گا "عالیجاہ! میں آپ کا حقیر غلام ہوں۔ میں خطاؤں کا پتلا ہوں۔ میری تقصیر معاف کیجیے" اور علی وردی خاں اگر اس کے الفاظ سے نہیں تو اس کے آنسوؤں سے ضرور متاثر ہوگا اور جب میر جعفر دیکھے گا کہ اس کے آنسو بھی رائگاں گئے ہیں تو وہ محل کی بیگمات کے پاس جائے گا اور ان سے کہے گا کہ نواب صاحب میرے دشمنوں کی باتوں میں آگئے ہیں۔ میں مظلوم ہوں۔ میں بے گناہ ہوں۔ خدا کے لیے میری سفارش کیجیے۔ سلطنت کے دشمن یہ نہیں چاہتے کہ یہ وفادار غلام نواب صاحب کے قدموں میں رہے" اور پھر چند دن بعد نواب صاحب اسے بلا کر یہ کہیں گے "میر جعفر! ہم تمھاری سابقہ فروگذاشتیں معاف کرتے ہیں لیکن آئندہ کے لیے محتاط رہو۔ ہمیں دوبارہ شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہیئے" اور وہ یہ کہے گا "عالی جاہ! مجھے جاہ و منصب کا شوق نہیں۔ مجھے کم از کم اس وقت تک اپنی خدمت کا موقع دیجیے، جب تک سراج الدولہ سلطنت کے کاروبار میں آپ کا ہاتھ بٹانے کے قابل نہیں ہو جاتا اور ایسے امراء بنگال سے ختم نہیں ہو جاتے جو آئے دن آپ کی حکومت کے خلاف سازشیں کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ معظم علی! مجھے اندیشہ ہے کہ تم نے بردوان میں میر جعفر سے یہ ضرور کہا ہوگا کہ تم علی وردی خاں کے پاس جا کر اس کی شکایت کرو گے اور مجھے یقین ہے کہ تم سے پہلے، میر جعفر کے جاسوس، علی وردی خاں کو اس کا یہ پیغام پہنچا چکے ہوں گے کہ ایک سر پھرا نوجوان شاید آپ کے پاس پہنچ کر میری شکایت کرے لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ سنی سنائی باتوں پر یقین کرنے کی بجائے مجھے صفائی کا موقع دیں گے اور یہ نوجوان آپ کے متعلق بھی نہایت باغیانہ خیالات کا اظہار کر چکا ہے" مرشد آباد میں

شاہی محل کے اندر اور باہر اس کے جاسوس ہر وقت چوکس رہتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ تمھارے مرشد آباد پہنچنے سے پہلے تمھارے متعلق اس کی ہدایات ان کے پاس پہنچ چکی ہوں گی۔ اب میرے ساتھ ملاقات کے بعد تم اگر علی وردی خاں کے پاس جا کر میر جعفر کی شکایت کرو گے، تو ایسے لوگ انھیں فوراً خبردار کریں گے کہ تم میری طرف سے آئے ہو"۔

معظم علی نے بد دل ہو کر کہا "مجھے معلوم نہ تھا کہ میر جعفر کے سامنے آپ بھی بے بس ہو چکے ہیں۔"

میر مدن نے جواب دیا "معظم علی! ہم نے بُرے حالات میں جنم لیا ہے۔ لیکن کاش ہم تمام برائیوں کے خلاف لڑ سکتے۔ موجودہ حالات میں نواب علی وردی خاں بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ بیک وقت ہر برائی کے خلاف نہیں لڑ سکتے۔ وہ ایک بڑے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے خطرات کو نظر انداز کر دینے پر مجبور ہیں۔ اس وقت ان کی ساری توجہ مرہٹوں پر مرکوز ہے۔ میرے مشورہ پر اب انھوں نے اڑلیسہ کی مہم میر جعفر کی جگہ عطاء اللہ خاں کو سونپ دی ہے، وہ دو دن تک یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ آج تیسرے پہر علی وردی خاں نے فوج کے چند افسروں کا اجلاس طلب کیا ہے۔ اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم میر جعفر کے خلاف اپنے جذبات پر قابو رکھو گے تو میں یہ کوشش کروں گا کہ اس اجلاس میں تمھیں بھی بلا لیا جائے۔ تم تمام حالات سے واقف ہو اور اس اجلاس میں میر جعفر کی ذات کے متعلق کچھ کہے بغیر تمھیں پوری آزادی سے ان غلطیوں پر نکتہ چینی کرنے کی اجازت ہوگی جن کے باعث یہ حالات پیدا ہوتے ہیں۔ میر جعفر کی احمقانہ پسپائی کے متعلق ایک ہفتہ قبل بھرے دربار میں کافی لے دے ہو چکی ہے اور تم اس کی ذات کو ہدفِ ملامت بنا کر علی وردی خاں کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کر سکو گے۔ لیکن اگر تم گذشتہ کوتاہیوں کی تلافی کے لیے کوئی مفید تجویز پیش کر سکو تو ممکن ہے کہ اڑلیسہ کے حالات کے روبہ اصلاح ہوتے ہی وہ وقت بہت جلد آ جائے جب ہم اطمینان سے میر جعفر کے قماش کے لوگوں پر توجہ دے سکیں"۔

معظم علی نے کہا "میری پہلی تجویز یہ ہوگی کہ مرہٹوں سے جنگ کے دوران میں میر جعفر

جیسے لوگوں کو فوجی معاملات میں مداخلت سے باز رکھا جائے"

میر مدن مسکرایا۔ "تمھیں یہ تجویز پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ میر جعفر کو یہ ہدایات بھیجی جا چکی ہیں کہ وہ عطاء اللہ خاں کے ساتھ پورا تعاون کرے اور عطاء اللہ خاں کو یہ اختیار دیا جا چکا ہے کہ اگر وہ کسی افسر سے مطمئن نہ ہو تو اسے سبکدوش کر دے۔"

معظم علی نے کہا۔ "جب مرہٹے ہمارے قلعے کا محاصرہ کیے ہوتے تھے اور مجھے کئی دن تک میر جعفر کی طرف سے اپنے پیغامات کا کوئی جواب نہیں ملا تھا تو میں نے یہ عہد کیا تھا کہ جنگ ختم ہوتے ہی میں فوج کی ملازمت سے مستعفی ہو جاؤں گا۔ لیکن جب میں اپنے ساتھیوں کی بے گور و کفن لاشیں چھوڑ کر وہاں سے نکلنے لگا تو میں نے یہ عہد کیا کہ میں کم از کم ایک بار اور یہاں ضرور آؤں گا۔ میں عطاء اللہ خاں کے متعلق زیادہ نہیں جانتا، لیکن اگر آپ کو اس کی صلاحیتوں پر اعتماد ہے تو میں یہ درخواست کروں گا کہ مجھے اس کے ساتھ بھیج دیا جائے۔"

میر مدن نے کہا: "لیکن میرا خیال تھا تم اتنی مدت کے بعد چند دن مرشد آباد رہنا چاہو گے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "وہ قلعہ جہاں میرے ساتھیوں کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں مجھے مرشد آباد سے زیادہ عزیز ہے۔"



میر مدن سے ملاقات کے بعد معظم علی واپس گھر پہنچا تو اس کا باپ، بھائی اور حسین بیگ دیوان خانے میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ محلے کے پندرہ بیس آدمی اور بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سب باری باری اٹھ کر اس سے بغل گیر ہوئے۔

مرزا حسین بیگ نے معظم علی کو اپنے قریب بٹھا لیا اور کہا۔ "بیٹا! ہم بڑی دیر سے تمھارا انتظار کر رہے ہیں اور تمھاری زبان سے اڑلیسہ کے حالات سننے کے لیے بے چین ہیں۔ چند دنوں سے سرحدی علاقوں کے متعلق بہت بری خبریں آ رہی تھیں اور ہم تمھارے متعلق بہت پریشان تھے۔ ہمیں تمام واقعات سناؤ۔"

معظم علی نے اس کے جواب میں میر جعفر کی نااہلیت، مرہٹوں کے مظالم اور سرحدی قلعے کی تباہی کی داستان مختصراً بیان کر دی۔

اتنی دیر میں محلے کے بوڑھے، بچے اور جوان جوق در جوق مکان کے اندر داخل ہو رہے تھے اور صابر بلند آواز سے چلا رہا تھا۔ "بھئی ٹھہرو! اندر جگہ نہیں ہے۔ خدا کے لیے شور نہ مچاؤ، اندر مرزا صاحب بیٹھے ہوتے ہیں۔"

معظم علی جلدی سے اٹھ کر باہر نکلا اور لوگ دیوانہ وار آگے بڑھ بڑھ کر اس کے ساتھ بغلگیر ہونے اور مصافحہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ محمود علی، حسین بیگ اور محلے کے باقی معززین بھی کمرے سے نکل کر باہر آ گئے اور برآمدے میں کھڑے ہو کر یہ تماشا دیکھنے لگے۔

جب معظم علی صحن میں جمع ہونے والے لوگوں سے ملنے کے بعد ڈیوڑھی میں پہنچا تو باہر گلی میں ایک اور ہجوم دکھائی دیا۔ کوئی ایک گھنٹہ تک وہ ان لوگوں سے ملنے میں مصروف رہا۔ اتنی دیر میں آصف بیگ اور افضل بیگ بھی آ گئے، وہ معظم علی کو دیکھتے ہی ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے اور اس کے ساتھ لپٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد محلے کے باقی لوگ رخصت ہو چکے تھے اور معظم علی دیوان خانے کی بجائے بالائی منزل کے ایک کمرے میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

اگلے دن سارے محلے میں یہ خبر مشہور ہو چکی تھی کہ معظم علی، عطاء اللہ خاں کے ساتھ اڑلیسہ کی مہم پر جا رہا ہے۔ اس کے بھائی اور حسین بیگ کے دونوں بیٹوں نے بھی اس مہم کے لیے اپنے نام پیش کیے تھے۔ لیکن مرشد آباد کے فوجدار نے صرف آصف بیگ کو معظم علی کا ساتھ دینے کی اجازت دی ہے۔

تیسرے دن مرزا حسین بیگ کے ہاں معظم علی کی دعوت تھی، جس میں مرشد آباد کے قریباً ساٹھ امراء اور بڑے بڑے افسر مدعو تھے۔ گیارہ بجے کے قریب مرزا حسین بیگ محلے کے چند معززین کے ساتھ ڈیوڑھی سے باہر کھڑا تھا اور اس کے محل کے اندر وسیع سائبان کے نیچے جمع

ہونے والے مہمانوں کی نگاہیں اندرونی صحن کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ اچانک ایک نوعمر لڑکا، جس کے دائیں بائیں میر مدن، راجہ رام موہن لال، عطا اللہ خاں اور مرشد آباد کے فوجدار تھے۔ دروازے سے نمودار ہوا۔ ان کے پیچھے مرزا حسین بیگ اور محلّے کے چند اور معززین تھے۔ نوعمر خوش وضع لڑکا، جس کی قبا ہیروں سے مرصّع تھی، ایک شاہانہ تمکنت کے ساتھ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور سائبان کے نیچے براجمان ہونے والے مہمان اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ یہ کمسن لڑکا سلطنتِ بنگال کا ولی عہد سراج الدولہ تھا۔ وہ کسی کے ساتھ بے تکلفی سے مصافحہ کرتا اور کسی کو ہاتھ کے اشارے یا مسکراہٹ کے ساتھ سلام کا جواب دیتا ہوا آگے بڑھا اور دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ کھانے کے دوران میں مہمان سراج الدولہ کے بعد جس شخص کی طرف سب سے زیادہ دیکھ رہے تھے وہ معظم علی تھا جو اس کے بائیں ہاتھ عطاء اللہ خاں اور حسین بیگ کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد حسین بیگ اٹھا اور اس نے ایک مختصر سی تقریر میں سراج الدولہ، میر مدن اور دوسرے معزز مہمانوں کا تشکریہ ادا کیا۔

سراج الدولہ نے اس کی تقریر کے جواب میں کہا: "اس وقت ہم سب کو معظم علی کا شکر گزار ہونا چاہیئے جس کی خاطر اس شاندار دعوت کا اہتمام کیا گیا ہے، ہمارے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہوسکتی ہے کہ ہمیں اس نوجوان کی عزت افزائی کا موقع ملا ہے جس نے بنگال کی فوج کے لیے جرأت، ہمت، بہادری اور وفاداری کی قابلِ فخر مثال قائم کی ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ جب اڑلیسہ کی مہم سے مرشد آباد کی فوج واپس آئے تو مرزا صاحب اس طرح کی کئی اور دعوتوں کی ضرورت محسوس کریں"۔

○

بنگال کی فوج اڑلیسہ میں مرہٹوں کو پے در پے شکستیں دینے کے بعد انھیں مغرب کی طرف دھکیل رہی تھی۔ سرحد سے پچاس میل کے فاصلے پر عطاء اللہ خاں کی فوجیں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ ایک شام معظم علی ایک ہزار سواروں کے ساتھ پڑاؤ میں داخل ہوا اور گھوڑے سے

اترتے ہی سیدھا سپہ سالار کے خیمے میں پہنچا۔

عطاء اللہ خاں اپنے کاتب سے کوئی مراسلہ لکھوا رہا تھا۔ اس نے معظم علی کی طرف دیکھتے ہی کہا: "میں دو دن سے تمھارا انتظار کر رہا تھا۔ تم نے بہت دیر لگائی!"

معظم علی نے جواب دیا: "میں مرہٹوں کے تعاقب میں بہت دور نکل گیا تھا۔ اب شمال کے تمام جنگلات ان کے وجود سے پاک ہو چکے ہیں۔ پھر بھی اگر پانچ سو قیدیوں کو ساتھ لانے کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں دو دن قبل یہاں پہنچ جاتا۔ قیدیوں کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ سرحدی قلعے میں اس وقت مرہٹوں کے صرف ایک ہزار سپاہی موجود ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ کسی تاخیر کے بغیر قلعے پر حملہ کر دیا جائے!"

عطاء اللہ خاں نے جواب دیا: "قلعے پر حملہ کرنے کے لیے تمھیں چند دن اور انتظار کرنا پڑے گا۔ کل مجھے یہ اطلاع ملی تھی کہ یہاں سے چالیس میل دور شمال مغرب کی طرف مرہٹوں کا ایک لشکر جنگل میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے اور میں آج علی الصباح میر جعفر کی قیادت میں پانچ ہزار سواروں کو اس طرف روانہ کر چکا ہوں"۔

معظم علی نے ذرا تلخ ہو کر کہا: "میر جعفر کو ایسی مہم پر بھیجنے سے پہلے اگر آپ دشمن کو غیر مسلح کر کے درختوں کے ساتھ باندھ دیتے تو شاید یہ مہم کامیاب رہتی"۔

عطاء اللہ خاں نے جواب دیا: "میر جعفر اس مہم پر جانے کے لیے مصر تھا اور میں اسے گزشتہ بدنامی کا داغ دھونے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ تمھارا دوست آصف بیگ میر جعفر کے ساتھ جا چکا ہے اور مجھے میر جعفر سے زیادہ اس کی سپاہیانہ صلاحیتوں پر اعتماد ہے۔ میں اس مہم پر تمھیں بھیجنا چاہتا تھا لیکن تم دیر سے پہنچے ہو"۔

معظم علی نے کہا: "میر جعفر کی رفاقت کے لیے آصف بیگ جیسے جری نوجوان کا انتخاب صحیح نہیں تھا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اس مہم پر جانے کی اجازت دی جائے اور میرا ارادہ ہے کہ اس مہم سے فارغ ہو کر واپس آنے کی بجائے سرحدی قلعے پر حملہ کر دیا جائے"۔

عطاء اللہ خاں نے جواب دیا: "اگر تمھیں میر جعفر کی کمان میں لڑنے پر کوئی اعتراض نہیں تو میں خوشی سے تمھاری درخواست منظور کرتا ہوں"

معظم علی نے کہا: "میں ایک سپاہی ہوں اور اگر میر جعفر نے کوئی بہت بڑی حماقت نہ کی تو ہمارے درمیان کسی اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا"

عطاء اللہ خاں نے ایک نقشہ اٹھا کر کھولتے ہوئے کہا: "بیٹھ جاؤ!"

معظم علی اس کے سامنے بیٹھ گیا اور عطاء اللہ خاں نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا: "یہ مرہٹوں کا پڑاؤ ہے۔ اور میں نے میر جعفر کو یہ راستہ اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے۔ کل طلوع آفتاب سے پہلے وہ دشمن پر حملہ کردے گا۔ میرے خیال میں تمھیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ تمھیں تازہ دم سپاہیوں کی ضرورت ہے۔ میں تمھارے لیے پانچ سو سواروں کو تیاری کا حکم دیتا ہوں۔ اتنی دیر میں تم اپنی رہنمائی کے لیے اس نقشے کی نقل تیار کرلو۔"

معظم علی نے جواب دیا: "یہ نقشہ مجھے اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح یاد ہے۔ یہ دیکھیے مرہٹوں کے پڑاؤ سے صرف تیس میل دور وہ قلعہ ہے۔ جہاں میں کئی برس گزار چکا ہوں۔ ان جنگلوں میں میں نے بارہا مرہٹوں کا تعاقب کیا ہے۔ مرہٹوں کے پڑاؤ کے آس پاس کے ٹیلے وادیاں اور ندیاں اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ مجھے صرف اس بات کا اندیشہ ہے کہ میں شاید حملے سے پہلے نہ پہنچ سکوں۔"

عطاء اللہ خاں نے کہا: "مجھے یقین ہے کہ تم وقت پر پہنچ جاؤ گے۔"

معظم علی سپہ سالار کے ساتھ خیمے سے باہر نکلا اور تقریباً نصف گھنٹہ بعد اس کی قیادت میں پانچ سو سوار شمال مغرب کا رُخ کررہے تھے۔



اگلی صبح چند ٹیلے عبور کرنے کے بعد معظم علی کو اپنے سامنے ایک ندی کے کنارے خیموں کی ایک قطار دکھائی دی۔ مسلح سپاہیوں کی چند ٹولیاں ان خیموں کے درمیان اِدھر اُدھر گشت

کررہی تھیں۔ وہ گھوڑا بھگاتا ہوا سپاہیوں کی ایک ٹولی کے قریب پہنچا۔ ایک نوجوان افسر نے آگے بڑھ کر اسے سلام کیا۔ معظم علی نے کسی توقف کے بغیر سوال کیا: "تم نے رات کے وقت یہاں پڑاؤ ڈالا تھا؟"

"جی ہاں!"

"فوج کو یہاں سے روانہ ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے؟"

"کوئی ڈیڑھ گھنٹہ۔"

"رات کے وقت دشمن کی نقل و حرکت کے متعلق کوئی اطلاع ملی تھی؟"

"جی ہاں! رات کے وقت ہمیں پتہ چلا تھا کہ دشمن یہاں سے کوئی تین کوس کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوتے ہے۔"

"اور وہ سب گھوڑوں پر سوار ہوکر گئے ہیں؟"

"جی ہاں! اس مسئلے پر کافی بحث ہوئی تھی کہ جنگل میں فوج کو اس سے آگے پیدل پیشقدمی کرنی چاہیے یا گھوڑوں پر۔ آصف بیگ کا خیال تھا کہ فوج کو اس سے آگے پیدل جانا چاہیے لیکن میر جعفر یہ کہتے تھے کہ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

معظم علی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا: "میر جعفر یہ سمجھتے ہیں کہ بھاگنے کے لیے پاؤں کی بجائے گھوڑے زیادہ کام دیتے ہیں" پھر وہ اپنے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہوا: "تم میں سے پچاس آدمی میرے ساتھ پیدل چلیں اور دو سو اس ندی کے کنارے درختوں اور پتھروں کی آڑ میں مورچے بنا لیں۔ باقی تمام گھوڑوں کو لے کر ان ٹیلوں کے پیچھے چھپ جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ میر جعفر دشمن کو بہت جلد یہاں لے آئیں گے۔"

پھر وہ پڑاؤ کے محافظ کی طرف متوجہ ہوا: "میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ تم یہاں سے یہ خیمے اکھاڑ لو اور رسد کا فالتو سامان ان ٹیلوں کے پیچھے لے جاؤ۔"

نوجوان افسر نے گھبرا کر کہا: "لیکن جناب! میر جعفر کے حکم کے بغیر...؟"

معظم علی نے جھنجلا کر کہا: "اگر تم نے رات کے وقت اس جگہ پڑاؤ ڈالا تو مجھے یقین ہے کہ تھوڑی دیر بعد میر جعفر کو حکم دینے کا ہوش نہیں ہوگا اور میں اس کے سامنے تمھیں حکم عدولی کی سزا دے سکوں گا۔"

"لیکن جناب میں نے کوئی حکم عدولی نہیں کی۔ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ میر جعفر..!"

معظم علی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "تمھیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں دس منٹ کے بعد اس جگہ پڑاؤ کا کوئی نشان نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"بہت اچھا جناب!"

اچانک جنگل میں دور سے بندوقوں کے دھماکے سنائی دیئے اور معظم علی نے گھوڑے سے کود کر اپنی بندوق سنبھالتے ہوئے کہا "بہادرو! جلدی کرو، میر جعفر میری توقع سے پہلے واپس تشریف لا رہے ہیں۔"

پچاس سپاہی گھوڑوں سے اتر کر معظم علی کے پیچھے ندی میں گھس پڑے اور گھٹنے گھٹنے پانی میں سے گزرنے کے بعد جنگل میں غائب ہو گئے۔ کوئی ایک میل جنگل میں چلنے کے بعد انھیں گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ معظم علی نے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور وہ اس کے دائیں بائیں بکھر کر درختوں کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ چند منٹ بعد بنگال کی فوج کے چند سوار دکھائی دیئے جن میں سے ایک میر جعفر تھا۔

"ٹھہریئے! ٹھہریئے!!" معظم علی نے دونوں ہاتھ بلند کر کے انھیں روکنے کی کوشش کی لیکن وہ درختوں اور جھاڑیوں سے بچتے ہوئے نکل گئے۔ پھر چند دستے نمودار ہوئے۔ ایک افسر نے معظم علی کو دیکھ کر اپنا گھوڑا روکا اور معظم علی نے بھاگ کر اس کے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے سوال: "کیا ہوا۔ تم کیوں بھاگ رہے ہو؟"

مرہٹوں نے ہم پر راستے میں حملہ کر دیا تھا۔ ہماری بیشتر فوج ان کے گھیرے میں آچکی ہے۔"

معظم علی نے چلا کر کہا: "لیکن تم بھاگ کیوں رہے ہو؟"

"یہ میر جعفر کا حکم ہے۔"

"مرزا آصف بیگ کہاں ہے؟"

"وہ حملے کے وقت اپنی ایک ہزار فوج کے ساتھ گھوڑوں سے اتر کر جنگل میں گھس گیا تھا اور اب معلوم نہیں اس کا انجام کیا ہوگا؟ میر جعفر اس سے بہت خفا ہیں۔"

معظم علی نے کہا: "اگر آصف کے ایک ہزار جانباز ابھی تک جنگل میں ہیں تو مرہٹے کھلے میدان میں تم سے لڑنے کے لیے نہیں آئیں گے۔ تم تمام سواروں کو اس جگہ روکنے کی کوشش کرو، میں جوابی حملہ کرنا چاہتا ہوں!"

افسر نے جواب دیا: "لیکن میر جعفر اسے حکم عدولی سمجھیں گے۔"

معظم علی نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا: "میر جعفر مرشد آباد پہنچنے سے پہلے دم نہیں لیں گے اور تم اس وقت میری کمان میں ہو۔ اگر کسی سوار نے آگے جانے کی کوشش کی تو میں اپنے سپاہیوں کو حکم دوں گا کہ وہ اسے بلا توقف گولی مار دیں۔"

افسر نے کہا: "اگر آپ یہ ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں تو میں بھاگنے کی بجائے آپ کی رفاقت میں جان دینا اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتا ہوں۔"

اتنی دیر میں کوئی سات سو سوار وہاں جمع ہو چکے تھے۔ افسر نے انھیں حکم دیا اور وہ جنگل میں پھیل کر پیچھے آنے والے ساتھیوں کو روکنے لگے اور تھوڑی دیر میں چار ہزار سپاہی وہاں جمع ہو گئے۔ معظم علی نے آٹھ سو سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ ان کے گھوڑے ندی کے پار لے جائیں اور باقی فوج کو چھوٹے چھوٹے دستوں میں تقسیم کر کے جنگل میں پیشقدمی شروع کر دی۔ راستے میں سپاہیوں کے چند اور منتشر دستے ان کے ساتھ ملتے گئے۔ جنگل میں چند مقامات پر مرہٹوں کے اکا دکا دستوں کے ساتھ ان کا تصادم ہوا لیکن وہ معمولی مزاحمت کے بعد بھاگ نکلے۔

کوئی دو گھنٹے بعد انھیں ایک طرف بندوقوں کے دھماکے اور لڑنے والوں کی چیخ پکار سنائی دی۔ وہ گھنی جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لیتے ہوئے ایک نصف دائرہ میں آگے بڑھے۔

معظم علی کو سامنے ایک چھوٹا سا ٹیلہ دکھائی دیا۔ وہ چند آدمیوں کے ساتھ بھاگتا ہوا ٹیلے کے جنوب کی طرف ایک چھوٹی سی جھیل دکھائی دی جس کے کناروں پر آصف بیگ کے سپاہیوں اور مرہٹوں کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ آن کی آن میں وہ ٹیلے سے نیچے اتر کر اپنی فوج کو نئی ہدایات دے رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بنگال کا لشکر دائیں اور بائیں طرف سے درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لے کر جھیل کے گرد گھیرا ڈالنے کے بعد مرہٹوں پر حملہ کر چکا تھا۔ مرہٹوں کی تعداد پانچ ہزار سے زائد تھی۔ لیکن ان کے لیے یہ حملہ جس قدر شدید تھا۔ اسی قدر غیر متوقع تھا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد معظم علی کے سپاہی جھیل کے اردگرد دشمن کی لاشوں کے انبار لگا چکے تھے اور مرہٹے انتہائی سراسیمگی کی حالت میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے

قریباً چالیس منٹ کے بعد میدان صاف ہو چکا تھا۔ شکست خوردہ دشمن کے کوئی ڈیڑھ سو آدمی جو بدحواسی کی حالت میں جھیل میں کودنے کے بعد ایک چھوٹے سے ٹاپو پر جمع ہو گئے ہتھیار ڈال چکے تھے۔ بنگال کے ڈیڑھ سو سپاہی زخمی اور اسی شہید ہوئے۔ آصف بیگ جس کا جسم زخموں سے چھلنی تھا۔ جھیل کے کنارے ایک درخت کے نیچے پڑا کراہ رہا تھا۔ چند سپاہی اور افسر اس کے گرد کھڑے تھے۔ معظم علی بھاگتا ہوا پہنچا اور آصف کے قریب بیٹھ گیا۔

آصف نے اس کی طرف دیکھا اور اپنے ہونٹوں پر ایک مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

"دوست تم ذرا دیر سے آئے"

معظم علی نے اردگرد کھڑے ہونے والے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "جراح کو بلاؤ۔ جلدی کرو!"

آصف بیگ نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا: "جراح کی ضرورت نہیں! تم اطمینان سے میرے ساتھ باتیں کرتے رہو۔ میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مجھے تمہارے یہاں آنے کی توقع نہ تھی۔ اور میں تھوڑی دیر پہلے یہ سوچ رہا تھا کہ کئی باتیں ایسی تھیں جو میں تم سے نہیں کہہ

سکا" پھر اس نے اردگرد جمع ہونے والوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔

"معظم علی!" آصف نے قدرے توقف کے بعد کہا: "مجھے اسی جگہ دفن کر دینا اور ابا جان سے یہ کہنا کہ میں نے تمام زخم سینے پر کھائے تھے۔ افضل کو میری طرف سے نصیحت کرنا کہ وہ کبھی کسی بزدل آدمی کی قیادت میں لڑنے کی غلطی نہ کرے۔ میں اپنی فوج کے سپاہی تمہیں سونپتا ہوں۔ اور میرے جو ساتھی شہید ہو گئے ہیں۔ ان کے لواحقین کے لیے حکومت سے اعانت حاصل کرنا تمہارا فرض ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم کسی دن اڑلیسہ کے گورنر ہو اور پھر میری قبر پر آکر یہ کہو: "آصف! میں تمہیں بھولا نہیں ــــ ابا جان کی یہ خواہش تھی کہ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد میری شادی کر دی جائے۔ رخصت ہونے سے پہلے انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ آج ہی ڈھاکہ کے کسی اونچے گھرانے سے میرے لیے پیغام آیا ہے۔ تمہارے متعلق میرے دل میں ایک خواہش تھی، لیکن کاش میں یہاں آنے سے پہلے ابا جان کو کچھ بتا سکتا۔ معظم علی! تمہیں ایک بھائی کے منہ سے ایسی باتیں عجیب معلوم ہوں گی۔ لیکن اب تمہیں شاید یہ بتا دینے میں کوئی حرج نہ ہو۔ کہ میں اپنے دل میں فرحت کا مستقبل تمہارے ساتھ وابستہ کر چکا تھا۔ معظم! وہ مجھے بہت عزیز ہے۔ امی جان کسی اور جگہ اس کا رشتہ کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن مجھے اس کے دل کا حال معلوم تھا اور میں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ ابا جان کے متعلق مجھے معلوم نہیں کہ وہ اس کے مستقبل کے متعلق کیا فیصلہ کریں گے۔ لیکن اگر ان کا ارادہ کچھ اور ہو تو انھیں اتنا ضرور بتا دینا کہ فرحت کے متعلق میری خواہش یہ تھی۔ یہ باتیں میں نے اس لیے کہی ہیں کہ فرحت کے دل کا حال مجھے معلوم ہے۔ وہ تمہیں چاہتی ہے جب تم اڑلیسہ کے محاذ پر جا رہے تھے اس کے آنسو مجھے سمجھانے کے لیے کافی تھے۔ اس سے پہلے میں نے اپنی ننھی بہن کو کبھی روتے نہیں دیکھا تھا۔"

آصف نے یہاں تک کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔

معظم علی نے ایک سپاہی کو پانی لانے کے لیے کہا اور اس نے اپنی چھاگل کھول کر آگے

کر دی ۔معظم علی نے آصف کی گردن کو سہارا دے کر اٹھایا اور پانی کے چند گھونٹ پلانے کے بعد اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

آصف بیگ نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور نحیف آواز میں کہا۔" میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنی زندگی کا آخری فرض پورا کر چکا ہوں "۔

کوئی ایک گھنٹہ تک آصف کی یہ حالت رہی کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے ہوش میں آتا اور معظم علی سے چند باتیں کرنے کے بعد پھر آنکھیں بند کر لیتا۔

معظم علی میں بات کرنے یا ہلنے کی طاقت نہ تھی وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فوج کے سپاہی ان کے گرد سر جھکائے کھڑے تھے۔ آصف بیگ نے آخری بار آنکھیں کھولیں اور آسمان کی نیلگوں فضاؤں کی طرف دیکھتے ہوئے ڈوبتی آواز میں "ابا جان"۔"امی جان" "افضل" "اور فرحت" کے الفاظ چند بار دہرائے اور پھر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

معظم علی نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ پھر کچھ دیر اس کے سینے کے ساتھ کان لگانے کے بعد" انا للہ وانا الیہ راجعون" کہہ کر اس کا سر زمین پر رکھ دیا۔ اپنی آنکھوں سے ابلتے ہوئے آنسو پونچھنے کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ان سب کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اور جنگل کی خاموش فضا میں ہلکی ہلکی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

معظم نے شہیدوں کو دفن کرنے کا حکم دیا اور میر جعفر کو لڑائی کے واقعات کی اطلاع دینے کے لیے ایک افسر اور چند سپاہی روانہ کر دیئے ۔



ندی کے کنارے میر جعفر بڑی بے چینی کے ساتھ فوج کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ معظم علی کو دیکھتے ہی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور بولا۔" نوجوان تمھارا یہ اقدام میری خواہش کے مطابق نہ تھا۔ میری خواہش یہ تھی کہ مرہٹوں کے ساتھ کھلے میدان میں جنگ کی جائے ۔لیکن میں

تمھیں مبارک باد کا مستحق سمجھتا ہوں"۔

معظم علی نے جواب دیا۔" مرہٹوں کو آپ کے تعاقب کے لیے کھلے میدان میں آنے کی ضرورت نہ تھی۔ بالخصوص اس حالت میں جب کہ وہ آصف بیگ کے ایک ہزار سپاہیوں پر اپنی تلواروں کی تیزی آزما سکتے تھے"۔

میر جعفر نے کہا۔" مجھے آصف بیگ کی موت کا افسوس ہے ۔لیکن اگر وہ میری حکم عدولی نہ کرتا تو یہ صورت حالات پیدا نہ ہوتی"۔

" لیکن اگر آپ بھی اس کی طرح جان دینا پسند کرتے تو یہ صورت حالات پیدا نہ ہوتی"۔

میر جعفر کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ لیکن اس نے اس موضوع پر مزید گفتگو کی ضرورت محسوس نہ کی ۔

معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔" میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے کسی تاخیر کے بغیر یہاں سے چند کوس دور ایک قلعے پر حملے کی اجازت دی جائے"۔

"کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم پہلے پڑاؤ میں جا کر اس مہم کے لیے عطاء اللہ کی اجازت حاصل کر لو!"

"میں عطاء اللہ خاں سے اجازت لے چکا ہوں۔ مجھے صرف آپ کے سپاہیوں کی ضرورت ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس جنگل سے شکست کھا کر بھاگنے کے بعد مرہٹے اس قلعے کا رخ کریں گے ۔ اس لیے میں کسی تاخیر کے بغیر پیشقدمی کرنا چاہتا ہوں"۔

میر جعفر نے کہا۔" میں اس مہم میں تمھارا ساتھ دوں گا"۔

"لیکن اس چھوٹی سی مہم کے لیے آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ۔میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اپنی فوج کے ڈیڑھ ہزار سپاہی ساتھ لے جانے کی اجازت دیں"۔

" نہیں ، میں خود بھی چلوں گا"۔

" بہت اچھا! لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مرزا حسین بیگ کو آصف کی موت کی اطلاع

دینے کے لیے کوئی ایلچی روانہ کردیں"

"اس کا انتظام ہوجائے گا۔ اب بتاؤ ہمیں کب یہاں سے روانہ ہونا چاہیئے"

"ابھی اسی وقت!" معظم علی نے جواب دیا۔

○

اگلے دن غروب آفتاب سے قبل بنگال کی فوج کسی شدید مزاحمت کا سامنا کیے بغیر سرحدی قلعے پر قبضہ کرچکی تھی۔ میر جعفر کی حیثیت اس مہم میں ایک خاموش تماشائی سے زیادہ نہ تھی۔ اور فوج کی کمان عملاً معظم علی کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن فتح کے بعد وہ عطاء اللہ خاں اڑلیسہ کے صوبیدار، میر مدن اور علی وردی خاں کے نام اس قسم کے خطوط لکھ رہا تھا۔

"خدا نے ہمیں بہت بڑی فتح دی ہے۔ ہم نے اڑلیسہ کی سرحد پر مرہٹوں کا سب سے بڑا مستقر چھین لیا ہے۔ اب مجھے امید ہے کہ دشمن ایک مدت تک اپنے زخم چاٹتا رہے گا۔"

علی وردی خاں کے نام اس کے خط کے آخری فقرے یہ تھے: "اس حقیر غلام نے اپنی بساط کے مطابق حضور پُرنور کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ اب میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ مرشدآباد پہنچ کر حضور کی قدم بوسی کا شرف حاصل کروں اور حضور کو یہ خوشخبری سناؤں کہ اڑلیسہ کی سرزمین دشمن کے [illegible] ہوچکی ہے۔"

تیسرے دن عطاء اللہ خاں باقی فوج کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور اس نے [illegible] ہفتے قلعے میں قیام کیا۔ اس عرصے میں اسے شمال مغرب کے سرحدی علاقوں پر مرہٹوں کے تازہ حملوں کی خبر ملی اور اس نے معظم علی کو دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ کوچ کا حکم دیا۔

دس دن بعد معظم علی واپس آیا اور اس نے اطلاع دی کہ شمال مغرب کے سرحدی علاقے مرہٹوں کے وجود سے پاک ہوچکے ہیں۔ عطاء اللہ خاں نے معظم علی کو قلعے کی حفاظت پر متعین کرکے کٹک کی طرف کوچ کیا۔

تین ماہ کے بعد معظم علی نے دو مہینے کی چھٹی لی اور مرشدآباد روانہ ہوا۔

○

ایک روز دوپہر کے وقت مرزا حسین بیگ بخار کی حالت میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا اس کی بیوی، افضل اور فرحت اس کے بستر کے قریب بیٹھے ہوتے تھے۔ ایک خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے معظم علی کی آمد کی اطلاع دی۔ افضل جلدی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکلا۔ فرحت برابر کے کمرے میں چلی گئی اور نیم وا دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی، افضل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ حسین بیگ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ افضل کی والدہ بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

معظم علی کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے کرب انگیز لہجے میں کہا "چچا جان! مجھے افسوس ہے کہ میں آخری منزل تک آصف کا ساتھ نہ دے سکا۔"

"بیٹھ جاؤ بیٹا!" حسین بیگ نے اس کی طرف پدرانہ شفقت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ بالآخر حسین بیگ نے مہر سکوت توڑی "معظم! میں اس کی قبر دیکھنے کے لیے وہاں جانا چاہتا تھا، لیکن بیماری کے باعث سفر کرنے کے قابل نہ رہا۔ مجھے تمہارا خط ملا تھا۔ لیکن میری یہ خواہش تھی کہ اس کی شہادت کے تمام واقعات تمہاری زبانی سنوں"

معظم علی نے شروع سے لے کر آخر تک تمام واقعات بیان کردیئے۔ جب وہ آصف کی موت کی تفصیلات سنا رہا تھا تو اس کی آواز اس کے قابو میں نہ تھی۔ فرحت کے متعلق وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا کہ آخری لمحات میں آصف بار بار اپنی بہن کو یاد کرتا تھا۔

اس کے بعد معظم علی صبح شام حسین بیگ کی تیمارداری کے لیے جاتا اور کئی کئی گھنٹے

اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ مرشدآباد میں اس نے ابھی کوئی بیس دن گذارے تھے کہ اسے میرمدن نے اپنے پاس بلایا اور کہا: "معظم علی! سرحد کے حالات ٹھیک نہیں۔ مرہٹوں نے پھر سر اٹھایا ہے اور جاسوسوں نے علی وردی خاں کو اطلاع دی ہے کہ عطاء اللہ خاں اور میر جعفر کٹک میں بیٹھ کر حکومت کے خلاف کوئی خطرناک سازش کر رہے ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم فوراً سرحدی قلعے میں پہنچ جاؤ۔ اور اس بات کا خیال رکھو کہ یہ لوگ مرہٹوں کے ساتھ کوئی ساز باز نہ کر سکیں۔"

"اگر حالات ایسے ہیں تو میں آج ہی روانہ ہو جاؤں گا۔"

میرمدن نے میز سے ایک کاغذ اٹھایا اور معظم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "یہ تمھارے نئے عہدہ کے متعلق علی وردی خاں کا حکم نامہ ہے۔ تمھیں اڑلیسہ کے نائب فوجدار کی حیثیت میں سرحدی اضلاع کا محافظ مقرر کیا گیا ہے۔ تمھاری کمان میں مستقل طور پر دو ہزار سپاہی دیئے گئے ہیں اور کٹک کے صوبیدار کو یہ ہدایت کر دی گئی ہے کہ سرحد پر دفاعی چوکیاں تعمیر کرنے کے لیے سرکاری خزانہ سے مطلوبہ رقم ادا کر دی جائے۔ آج تمھارے لیے کوچ کی تیاری کرنا مشکل ہوگا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم کل صبح تڑکے روانہ ہو جاؤ۔ عطاء اللہ خاں کو یہ حکم بھیج دیا جائے گا، کہ وہ مزید ایک ہزار سپاہی تمھاری کمان میں دے دے۔"

میرمدن سے ملاقات کے بعد معظم علی اپنے گھر پہنچا تو اس کی والدہ بالا خانے کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔

معظم علی نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا: "امی جان! میری چھٹی منسوخ کر دی گئی ہے اور میں کل صبح یہاں سے جا رہا ہوں۔"

ماں نے پریشان ہو کر کہا: "بیٹا تمھیں کسی خطرناک مہم پر تو نہیں بھیجا جا رہا ہے؟"

"نہیں امی جان! مجھے اڑلیسہ کے سرحدی اضلاع کا نائب فوجدار مقرر کیا گیا ہے۔"

"نائب فوجدار؟" ماں نے چونک کر سوال کیا۔

"ہاں امی جان! کیا آپ کے خیال میں نائب فوجدار بہت بڑا ہوتا ہے؟"

"نہیں بیٹا! میں تو دعا کیا کرتی ہوں کہ تم کسی دن بنگال کی فوج کے سپہ سالار بنو — تمھارے ابا جان یہ خبر سن کر بہت خوش ہوں گے۔ ہاں میں تمھیں ایک بات بتانا بھول گئی تھی —— آصف کی موت کی خبر آنے سے چند دن پہلے ڈھاکہ کا کوئی بہت بڑا رئیس، جو مرزا حسین بیگ کا رشتہ دار ہے۔ اپنی بیوی کے ساتھ ان کے یہاں آیا تھا۔ وہ اپنے لڑکے کے لیے فرحت کا رشتہ مانگتے تھے۔ حسین بیگ کی بیوی کی یہی خواہش تھی کہ فرحت کی منگنی وہاں کر دی جائے لیکن مرزا صاحب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ جب آصف واپس آئے گا تو میں اس کے ساتھ ڈھاکہ جاؤں گا، اور لڑکے کو دیکھ کر فیصلہ کروں گا۔ بیٹا! میں کبھی کبھی یہ سوچا کرتی تھی کہ فرحت میری بہو بنے گی لیکن ایک دن میں نے تمھارے ابا سے ذکر کیا تو وہ مجھ پر برس پڑے کہنے لگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم یہاں سے نکلوانا چاہتی ہو۔ مرزا صاحب کا یہ احسان تھوڑا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ اس قدر مہربانی سے پیش آتے ہیں تمھیں معلوم نہیں کہ وہ خاندان جس نے فرحت کا رشتہ مانگا ہے، کوئی ڈیڑھ دو سو گاؤں کا مالک ہے، پھر ہماری اگر کوئی حیثیت ہوتی بھی تو مرزا حسین بیگ سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی برادری سے باہر لڑکی کا رشتہ کریں گے۔ اگر تمھارے ابا جان منع نہ کرتے تو میں شاید فرحت کی ماں سے اس کے متعلق پوچھ بیٹھتی۔ فرحت بہت اچھی لڑکی ہے، اور میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ وہ میری بہو بنے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں تمھاری ترقی کے لیے بہت دعا کیا کرتی ہوں۔ کبھی کبھی میں یہ سوچتی ہوں کہ مرزا صاحب تم سے بلاوجہ اس قدر محبت نہیں کرتے۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے فرحت کے متعلق اپنے دل میں کوئی فیصلہ کر رکھا ہو اور وہ اس دن کا انتظار کر رہے ہوں، جب تم اپنی ذاتی قابلیت کے بل بوتے پر اونچے خاندان کے لڑکوں کی ہمسری کا دعویٰ کر سکو۔ ورنہ فرحت کے لیے لکھنؤ کے ایک بہت بڑے گھرانے کا رشتہ بھی آیا تھا اور مرزا صاحب نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔"

"امی جان!"

"کیا ہے بیٹا؟"

"کچھ نہیں امی جان — میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ مجھ سے پہلے آپ کو بھائی یوسف کے متعلق سوچنا چاہیے تھا۔"

ماں نے جواب دیا: "یوسف کے لیے تین رشتے آئے ہیں۔ لیکن وہ تینوں لڑکیاں مجھے پسند نہیں۔ عبداللہ خاں کی لڑکی مجھے پسند تھی۔ لیکن وہ یہاں سے کلکتہ جا چکے ہیں۔ تمھارے اباجان نے کئی بار وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ مگر انھیں فرصت نہیں ملی۔ پچھلے مہینے ان کا خط آیا تھا کہ وہ اس سال حج کے لیے جا رہے ہیں۔ جب وہ حج سے واپس آئیں گے تو میں تمھارے اباجان کو ضرور بھیجوں گی۔"

معظم علی کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ اور پھر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" ماں نے پوچھا۔

"مرزا صاحب کے پاس۔"

دروازے کے قریب پہنچ کر معظم علی نے مڑ کر ماں کی طرف دیکھا اور کہا:

"امی جان! سچ بتائیے آپ کو فرحت بہت پسند ہے؟"

"ہاں بیٹا!"

"لیکن امی جان میں اسے بالکل پسند نہیں کرتا۔"

"جھوٹا کہیں کا۔" ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور معظم علی ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

چھٹا باب

عطاء اللہ خاں کٹک کے قلعے کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ معظم علی کمرے میں داخل ہوا اور اس کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

عطاء اللہ خاں نے کہا: "مجھے کل ہی تمھارے متعلق حکم ملا تھا۔ میں تمھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تمھارا نیا عہدہ اڑیسہ کے لیے خیر و برکت کا باعث ہوگا۔ تم کب جانا چاہتے ہو؟"

"اگر فوج تیار ہے تو میں کل صبح یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔"

"فوج کے لیے چند دن تمھیں انتظار کرنا پڑے گا۔ میں جو دستے تمھاری کمان میں دینا چاہتا ہوں۔ وہ بردوان اور میدنا پور کے درمیان پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ میں آج ہی انھیں حکم بھیجتا ہوں۔"

معظم علی نے کہا: "سرحدی علاقوں پر مرہٹوں کی تازہ سرگرمیوں کے پیش نظر میرا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ سپاہیوں کو وہاں سے سیدھا سرحدی قلعے میں پہنچنے کا حکم بھیج دیں۔ میں کل علی الصبح یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔"

"بہت اچھا۔ میں ابھی انھیں حکم بھیج دیتا ہوں۔ آج آپ میرے مہمان ہیں۔ میں نے میر جعفر سے آپ کی ترقی کا ذکر کیا تھا۔ وہ سن کر بہت خوش ہوئے تھے۔"

"میر جعفر یہاں ہیں؟ میرا تو خیال تھا کہ وہ بردوان میں ہوں گے۔"

عطاء اللہ خاں نے جواب دیا: "وہ ایک ضروری مشورے کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ان سے خوش نہیں۔ کہیے آپ مرشدآباد میں حضور نواب صاحب سے ملے تھے؟"

"نہیں!" معظم علی نے جواب دیا: "میں وہاں صرف میرمدن سے ملا تھا۔"

"اچھا یہ بتائیے آپ نے میرمدن سے میرجعفر کے متعلق کوئی بات کی تھی؟"

"نہیں ان کے ساتھ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔"

عطاء اللہ خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا: "میرجعفر کا خیال ہے کہ دربار میں بعض امراء ان کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں، اور کئی مرتبہ انھوں نے مجھے بھی خبردار کیا ہے کہ مرشدآباد میں تمھارے خلاف بھی طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی ہیں۔"

"میرا تو یہ خیال ہے کہ حکومت مرہٹوں کے خلاف آپ کی کارگزاری پر بہت خوش ہے تاہم اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔"

"مجھے آپ جیسے مخلص دوستوں کے نیک مشوروں کی ضرورت ہے۔ کہیے!"

"میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ میرجعفر کے متعلق محتاط رہیں۔ میرجعفر اگر کوئی غلطی کریں تو ان کا سب سے بڑا تحفظ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بنگال کے حکمران کے رشتہ دار ہیں۔"

عطاء اللہ خاں نے کہا: "آپ کو معلوم ہے کہ میں ذاتی طور پر میرجعفر کو پسند نہیں کرتا۔"

"یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو محتاط رہنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔"

"میں آپ کا شکرگزار ہوں۔ لیکن آپ کے دل میں یہ خیال کیسے پیدا ہوا کہ میرجعفر مجھے بہکا سکتا ہے؟"

معظم علی نے پریشان ہو کر جواب دیا: "میں نے یہ نہیں کہا کہ میرجعفر آپ کو بہکا سکتا ہے۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ آپ محتاط رہیں۔"

عطاء اللہ چند ثانیے غور سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد بولا: "معظم علی! میں تمھیں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو۔ اگر مرشدآباد میں میرے دشمن میرے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں تو مجھے آگاہ کرنا تمھارا فرض ہے۔"

"مجھے آپ کے خلاف کسی سازش کا علم نہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اس قدر پریشان ہوں گے تو میں آپ سے ایسی باتیں نہ کرتا۔ میرجعفر کے متعلق یہ بات عام ہو چکی ہے کہ بنگال میں ہر سازش سب سے پہلے ان کے دماغ میں جنم لیتی ہے۔ وہ چند جاہ پسندوں کو پہلے حکومت کے خلاف بغاوت پر اکساتے ہیں اور پھر اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے علی وردی خاں کو باخبر کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بغاوت کچل دی جاتی ہے۔ چند مجرم اور ان کے ساتھ چند بے گناہ مارے جاتے ہیں اور میرجعفر کو یہ ثابت کرنے کا موقع مل جاتا ہے کہ اپنی انتہائی نااہلی کے باوجود وہ حکومت کے لیے ایک کارآمد آدمی ہیں۔ میں تو یہاں تک محسوس کرتا ہوں کہ ایک دن ایسا آئے گا جب علی وردی خاں کو امراء کی آئے دن کی بغاوتیں اسی قدر بددل کر دیں گی کہ انھیں میرجعفر کے سوا اپنا کوئی خیرخواہ نظر نہ آئے گا اور یہ دن بنگال کی تاریخ کا بدترین دن ہوگا۔"

عطاء اللہ خاں نے کہا: "میں ایک سپاہی ہوں۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ میرجعفر کیا کرنا چاہتا ہے اور علی وردی خاں اس کے متعلق کیا سوچتے ہیں۔"

ایک سپاہی اندر داخل ہوا اور اس نے عطاء اللہ خاں سے کہا: "میرجعفر تشریف لائے ہیں۔"

معظم علی نے اٹھ کر کہا: "اب مجھے اجازت دیجیے!"

"بہت اچھا" عطاء اللہ خاں نے اٹھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "آپ میرے مکان پر جا کر آرام کریں۔"

میرجعفر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے عطاء اللہ خاں کے ساتھ مصافحہ کرنے کے

بعد معظم علی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔"آپ کب آئے؟"

"میں ابھی یہاں پہنچا ہوں۔"

"تشریف رکھیے!" میر جعفر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، مجھے اب اجازت دیجیے!"

عطاء اللہ خاں نے کہا "میر صاحب! یہ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ انھیں آرام کی ضرورت ہے۔ انشاءاللہ ہم شام کے وقت باتیں کریں گے۔"

پھر وہ سپاہی کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "تم انھیں میرے مکان پر چھوڑ آؤ۔"

معظم علی سپاہی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ میر جعفر اور عطاء اللہ خاں کچھ دیر خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ بالآخر میر جعفر نے کہا۔"اس نوجوان کے متعلق آپ کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔ یہ میر مدن کا خاص آدمی ہے۔"

عطاء اللہ خاں نے کہا۔"میں اسے جانتا ہوں اور آپ نے کل جن خدشات کا اظہار کیا تھا۔ وہ کسی حد تک درست ثابت ہو رہے ہیں۔ معظم علی کی باتوں سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ حکومت کے جاسوس ہمارے متعلق کافی چوکس ہیں۔ معظم علی آپ کو میرا دشمن سمجھتا ہے اور اس نے مجھے آپ کے متعلق خبردار رہنے کا مشورہ دیا ہے۔"

میر جعفر کا چہرہ اچانک زرد پڑ گیا۔ "آپ نے کہیں اسے اعتماد میں لینے کی کوشش تو نہیں کی؟"

نہیں میر صاحب! میں اتنا بیوقوف تو نہیں ہوں۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ حکومت ہمارے عزائم کے متعلق کس حد تک باخبر ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مرشدآباد میں میرے متعلق کوئی خطرناک اطلاع نہیں پہنچی۔ تاہم یہ آپ کی بدقسمتی ہے کہ آپ کو ہر جگہ شک کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ ہمیں اب تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے۔ فوج کے افسر میرے ساتھ ہیں۔ صوبیدار نے اگر ہمارے ساتھ تعاون نہ کیا۔ تو وقت آنے پر اس کے گھر

کا محاصرہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اِس نوجوان سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر اسے بروقت ہمارے ارادوں کا علم ہو گیا تو ہمارے تمام منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ میرے نزدیک ہر آدمی کے ضمیر کی ایک قیمت ہے لیکن معظم علی اس سے مستثنیٰ ہے، وہ پوری قوت کے ساتھ ہماری مخالفت کرے گا اور سرحدی اضلاع کی چوکیوں کے کماندار کی حیثیت سے اس کی مخالفت ہمارے لیے کافی مشکلات پیدا کر دے گی۔"

میر جعفر نے کہا۔"لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ اسے سرحد تک پہنچنے کا موقع دیا جائے؟"

"نہیں، یہ ضروری نہیں۔"

میر جعفر نے کہا۔"لیکن موجودہ حالات میں اس پر ہاتھ ڈالنا ہمارے لیے خطرناک ہوگا!"

"ہم اس پر ہاتھ ڈالے بغیر اسے سرحد تک پہنچنے سے روک سکتے ہیں۔ میر حبیب کا ایلچی اگر واپس نہیں چلا گیا تو اسے یہ پیغام دے کر روانہ کر دیجیے کہ معظم علی کل صبح یہاں سے روانہ ہوگا اور یہ وہی نوجوان ہے جس نے مرزا حسین بیگ کی حویلی کی حفاظت کی تھی۔ آپ اسے یہ بھی بتا دیں کہ وہ فوج کے بغیر یہاں سے روانہ ہوگا۔ مرشدآباد سے صرف آٹھ سپاہی اس کے ہمراہ آئے ہیں اور یہی اس کے ساتھ یہاں سے جائیں گے۔ کٹک اور سرحدی علاقے کے درمیان کئی مقامات ایسے ہیں۔ جہاں میر حبیب کے آدمی اس کو آسانی کے ساتھ گرفتار کر سکتے ہیں۔ اگر یہ تجویز کامیاب ہو گئی تو ہمارے راستے سے ایک پتھر ہٹ جائے گا اور ہم پر کوئی الزام بھی نہیں آئے گا۔"

میر جعفر نے کہا۔"لیکن وہ فوج کے بغیر یہاں سے روانہ ہونے کے لیے تیار ہوگا؟"

عطاء اللہ خاں نے جواب دیا۔"میں اُسے بتا چکا ہوں کہ اس کے حصے کی فوج بردوان اور میدناپور کے درمیان پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔"

میر جعفر نے کہا۔"آپ میری توقع سے زیادہ دوراندیش ہیں۔"

عطاء اللہ خاں نے مسکرا کر کہا۔"میر صاحب! یہ سب آپ کی صحبت کا اثر ہے۔"

اگلے روز صبح کی نماز کے بعد معظم علی اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعے سے باہر

نکل رہے تھے کہ میر جعفر دروازے کے قریب ان کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔

"معظم علی ٹھہرو!" اس نے اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔

معظم علی نے گھوڑا روکا۔ میر جعفر نے کہا "مجھے تمھاری فرض شناسی کا اعتراف ہے لیکن میرے خیال میں یہ بہتر ہوتا کہ تم فوج کو ساتھ لے کر جاتے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر راستے میں تمھیں کوئی خطرہ پیش آیا تو یہ آٹھ آدمی تمھاری حفاظت کے لیے کافی نہیں ہوں گے۔"

معظم علی نے جواب دیا "میری حفاظت کا مسئلہ اس قدر اہم نہیں اور میں فوج کے انتظار میں یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھتا۔"

"بہرحال تمھیں راستے میں بہت محتاط رہنا چاہیے۔ گزشتہ چند دنوں میں مرہٹے یہاں سے تیس چالیس میل کے فاصلے پر کئی بستیاں لوٹ چکے ہیں۔" یہ کہہ کر میر جعفر، معظم علی کے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ "معظم علی بنگال کی فوج کا بہترین سپاہی ہے اور اس کی جان بہت قیمتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس کی حفاظت کا خیال رکھو!"

معظم علی نے کہا "آپ میری فکر نہ کریں۔"



دن بھر سفر کرنے کے بعد معظم علی اور اس کے ساتھیوں نے رات کے وقت ایک گاؤں کے زمیندار کے ہاں قیام کیا۔ اگلے دن دوپہر کے وقت وہ ایک ندی کے قریب تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے رکے۔ ندی کے دونوں کناروں پر گھنے درخت تھے۔ کچھ دیر ستانے کے بعد وہ ظہر کی نماز کے لیے کھڑے ہوگئے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ درختوں کے ساتھ بندھے ہوئے گھوڑے کھول رہے تھے کہ اچانک چاروں طرف درختوں کی آڑ سے تقریباً پچاس مسلح مرہٹے نمودار ہوئے۔ معظم علی کے ساتھیوں کے لیے گھوڑوں پر سوار ہونے یا بندوقیں سنبھالنے کا موقع نہ تھا۔ پچاس آدمی بندوقیں سیدھی کیے ان کے گرد گھیرا ڈال رہے تھے۔

ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کہا "اب مقابلے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تمھارے لیے یہی بہتر

ہے کہ تم ہتھیار پھینک دو!"

معظم علی چند ثانیے تذبذب اور پریشانی کی حالت میں کھڑا رہا۔ بالآخر اس نے اپنی بندوق اور تلوار پھینک دی اور اس کے ساتھیوں نے اس کی تقلید کی۔

ایک ادھیڑ عمر کا آدمی جو اپنے لباس سے اس جتھے کا سردار معلوم ہوتا تھا آگے بڑھا اور اس نے معظم علی سے مخاطب ہو کر سوال کیا۔ "تم کہاں سے آئے ہو؟"

معظم علی نے جواب میں کہا "تمھیں ہم سے سوالات پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟"

مرہٹہ سردار بولا "ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ چلو۔"

"کہاں"؟

مرہٹہ سردار نے جواب دیا "قیدیوں کو ایسے سوالات کرنے کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ میں تمھاری جان کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔ لیکن اگر کسی نے راستے میں بھاگنے کی کوشش کی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔"

مرہٹہ سردار کے اشارے سے چند آدمیوں نے آگے بڑھ کر ان کے گھوڑوں اور اسلحہ پر قبضہ کر لیا اور ان کے ہاتھ رسّوں سے جکڑ دیئے۔ تھوڑی دیر بعد معظم علی اور اس کے ساتھی قیدیوں کی حیثیت میں کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ ایک ہفتہ جنگلوں اور پہاڑوں میں سفر کرنے کے بعد انھیں سرحد کے پار ایک گاؤں کے قریب مرہٹہ فوج کا پڑاؤ دکھائی دیا۔ معظم علی اور اس کے ساتھی مرہٹہ سپاہیوں کی بندوقوں کے پہرے میں پڑاؤ عبور کرنے کے بعد گاؤں میں پہنچے اور پھر ایک تنگ گلی سے گزر کر ایک قلعہ نما حویلی کے اندر داخل ہوئے۔ مرہٹہ فوج کے چند سپاہی انھیں دیکھتے ہی جمع ہو گئے۔

معظم علی کو گرفتار کرنے والے دستے کے سردار نے ان کے افسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "سپہ سالار کا حکم ہے کہ ان قیدیوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے۔ انھیں کوئی تکلیف

نہ دی جائے۔ لیکن اگر کوئی بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے کسی توقف کے بغیر پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ سپہ سالار کچھ عرصہ یہاں نہیں آسکیں گے۔ پھر اس نے معظم علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" یہ بنگال کی فوج کے ایک بڑے افسر ہیں اور سپہ سالار کی ہدایت ہے کہ ان کا خاص خیال رکھا جائے"۔

افسر نے اپنے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا" انھیں لے جاؤ اور کوٹھریوں کے اندر بند کر دو۔ فی الحال ایک کوٹھری میں دو قیدی بند کیے جائیں۔"

معظم علی نے آگے بڑھ کر افسر سے سوال کیا" میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ہم کس کی قید میں ہیں؟"

اس نے بے رخی سے جواب دیا" ایک قیدی کو ایسے سوالات پوچھنے کا حق نہیں"۔

پھر وہ سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا" انھیں اکبر خاں کے ساتھ بڑی کوٹھری میں رکھو"۔

پہریدار، قیدیوں کو حویلی کے ایک طرف لے گئے۔ معظم علی کے آٹھ ساتھیوں کو چار کوٹھریوں میں بند کر دیا اور اس کے بعد انھوں نے ایک کشادہ کوٹھری کا دروازہ کھولا اور معظم علی کو اندر داخل ہونے کے لیے کہا۔

معظم علی کوٹھری کے اندر داخل ہوا اور پہریداروں نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ کچھ دیر کوٹھری کے درمیان بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ کواڑ کے دراڑ سے سہ پہر کے سورج کی کرنیں اندر آرہی تھیں۔ فرش پر کھجور کی چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ معظم علی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ معاً اسے کوٹھری کے ایک تاریک کونے میں ایک اور قیدی دکھائی دیا جو بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔

معظم علی نے کہا" بھائی معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے کچھ عرصہ کے لیے ہمیں ایک دوسرے کا ساتھی بنا دیا ہے۔ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ ہم ایک دوسرے سے متعارف ہو جائیں!"

قیدی جلدی سے اٹھ کر آگے بڑھا اور معظم علی کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا:

"میرا نام اکبر خاں ہے۔ مجھے مرہٹوں کی قید میں تقریباً تین مہینے گزر چکے ہیں۔ پہلے مجھے

اس حویلی کے اندر گھومنے پھرنے کی اجازت تھی، لیکن کوئی بیس دن ہوتے میں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی، جب سے مجھے یہاں بند کر دیا گیا ہے"۔

معظم علی حیرانی کے عالم میں قیدی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کوئی بارہ چودہ سال کا لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں اور سرخ و سپید چہرے کے تیکھے نقوش میں غایت درجے کی جاذبیت تھی۔

"تمھیں کس جرم میں قید کیا گیا ہے؟" معظم علی نے سوال کیا۔

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا" کمسن لڑکے نے قدرے برہم ہو کر جواب دیا۔

معظم علی نے کہا" تمھاری صورت بتا رہی ہے کہ تم کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو اور یہاں کیسے پہنچے ہو؟"

لڑکے نے اس سوال کے جواب میں مختصراً اپنی سرگزشت شروع کر دی:

"میرا گاؤں روہیلکھنڈ میں ہے۔ عظیم خاں میرے ابا جان تھے اور وہ اپنے علاقے کے سردار تھے۔ انھیں گھوڑوں کی تجارت کا شوق تھا۔ وہ راجپوتانہ سے گھوڑے خرید کر کبھی لکھنؤ اور کبھی حیدرآباد میں فروخت کیا کرتے تھے۔ میرا بڑا بھائی عام طور پر ان کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ اس سال میں نے ضد کی اور وہ اس کی بجائے مجھے اپنے ساتھ لے آئے۔ ہمارے ساتھ چالیس مسلح نوکر تھے اور ہم راجپوتانہ سے ڈیڑھ سو گھوڑے خرید کر لکھنؤ کی طرف آرہے تھے۔ راستے میں اودھ کی سرحد سے تھوڑی دور مرہٹوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ ابا جان اللہ کے ساتھ پندرہ اور آدمی لڑائی میں شہید ہوگئے۔ سات آدمی مرہٹوں نے گرفتار کر لیے اور باقی بھاگ گئے۔ مرہٹوں کے سردار نے باقی آدمیوں کو تلاشی لے کر چھوڑ دیا، لیکن مجھے اپنے پاس رکھا اور چند دن بعد میر حبیب کے پاس بھیج دیا۔ میر حبیب نے مجھے یہاں پہنچا دیا۔ وہ کبھی کبھی چند دن کے لیے یہاں آتا ہے اور ہمیشہ مجھ سے یہ پوچھتا ہے۔ تمھیں میرے سپاہیوں نے کوئی تکلیف تو نہیں دی؟ اگر میں کسی کی شکایت کرتا ہوں تو اس کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتا ہے۔ لیکن جب میں اس سے یہ کہتا ہوں کہ مجھے میرے گھر پہنچا

دیا جائے تو وہ یہ جواب دیتا ہے کہ جب میں روہیلکھنڈ پر حملہ کروں گا۔ تو تمھیں ساتھ لے جاؤں گا۔ تمھارے باپ نے اپنے گھر میں بےشمار دولت جمع کر رکھی ہے اور جب تم مجھے اپنے گھر کا خزانہ تلاش کرنے میں مدد دو گے تو تمھیں رہا کر دیا جائے گا۔ جب میں اس سے یہ کہتا ہوں کہ ہمارے گھر میں کوئی خزانہ نہیں تو وہ کہتا ہے کہ اگر تمھیں خزانے کا علم نہیں تو ہم تمھارے بھائی سے پوچھ لیں گے۔ میر حبیب کو یہ یقین تھا کہ میں بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ اس لیے مجھے اس حویلی کے اندر گھومنے پھرنے کی اجازت تھی۔ ایک شام میں یہاں سے بھاگ گیا اور ساری رات جنگلوں اور پہاڑوں میں گھومتا رہا۔ لیکن صبح کے وقت چند سوار مجھے دوبارہ گرفتار کر کے یہاں لے آئے۔ خوش قسمتی سے میر حبیب یہاں نہیں تھا اور اس کے سپاہیوں نے مجھے اس کوٹھڑی میں بند کرنے کے علاوہ کوئی اور سزا نہ دی۔ جب میر حبیب آیا تو اس نے مجھے دو دن بھوکا رکھنے کی سزا دی۔ اب پہریدار مجھے صبح شام تھوڑی دیر کے لیے اس کوٹھڑی سے باہر نکالتے ہیں۔ لیکن ان کا پہرہ اس قدر سخت ہوتا ہے کہ اب میرے لیے دوبارہ بھاگ نکلنا ممکن نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ بھی ان کی قید میں ہیں۔ بتائیے آپ یہاں کیسے پہنچے؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں کٹک سے اڑیسہ کے ایک سرحدی قلعے کی طرف آ رہا تھا۔ راستے میں مرہٹوں نے اچانک حملہ کیا اور مجھے گرفتار کر لیا۔ تم سے باتیں کرنے سے پہلے مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں میر حبیب کی قید میں ہوں۔"



چھ ماہ بعد ایک صبح چار مسلح سپاہیوں نے معظم علی کو کوٹھڑی سے نکالا اور اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ معظم علی کوئی سوال کیے بغیر ان کے ساتھ چل دیا۔ سپاہی ایک کمرے کے دروازے پر رُکے اور معظم علی ان کے اشارے پر کمرے کے اندر داخل ہوا۔

یہ کشادہ کمرہ بیش قیمت ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ اور دو آدمی قالین پر بیٹھے

شطرنج کھیل رہے تھے۔ یہ دونوں اپنے لباس سے مسلمان معلوم ہوتے تھے۔ ایک دبلا پتلا نوجوان تھا اور دوسرا جس کی عمر چالیس سال سے اوپر معلوم ہوتی تھی دوہرے جسم کا ایک بارعب آدمی تھا۔

"تمھارا نام معظم علی ہے؟" قوی ہیکل آدمی نے سوال کیا۔

"ہاں!" معظم علی نے جواب دیا۔

"میں نے اپنے سپاہیوں کو ہدایت کر رکھی ہے کہ کسی قیدی کو بلاوجہ تکلیف نہ دی جائے۔ تمھیں میرے آدمیوں سے کوئی شکایت تو نہیں؟"

معظم علی نے جواب دیا: "ایک قیدی کو کیا شکایت ہو سکتی ہے؟"

"ہم کوشش کریں گے کہ تم اپنی قید کو بہت زیادہ محسوس نہ کرو۔ میں بہادروں کی عزت کرتا ہوں اور تم مرزا حسین بیگ کے گھر کی حفاظت میں اپنی جرأت و ہمت کا ثبوت دے چکے ہو۔"

معظم علی نے کہا: "آپ کی معلومات قابلِ داد ہیں۔"

"تمھارے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے مجھے کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہ تھی۔ اب یہ بات مشہور ہو چکی ہے کہ سرحد کا نائب فوجدار اور اس کے آٹھ ساتھی کہیں روپوش ہو گئے ہیں اور میرے لیے یہ معلوم کرنا مشکل نہ تھا، کہ یہ نائب فوجدار کون ہے۔"

"میں اپنی ذات کے لیے آپ سے کسی نیکی کی توقع نہیں رکھتا۔ لیکن اگر آپ میر حبیب ہیں تو میں بنگال سے آپ کی دشمنی کی وجوہات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

میر حبیب نے جواب دیا: "میں کسی کا دوست ہوں نہ دشمن۔ میری دلچسپی صرف بنگال کے حکمران اور امراء کی دولت سے ہے۔"

"لیکن آپ مرہٹوں کے لیے راستہ صاف کر رہے ہیں؟"

"مرہٹے مجھے دولت حاصل کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ تم کسی دولتمند

آدمی کے بیٹے نہیں ہو۔ لیکن اگر تم مجھے کسی دولت مند آدمی کے گھر کا پتہ بتا سکو تو مجھے تمہارا تعاون حاصل کرنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا"۔

معظم علی نے غصے سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا "میں تمہیں ایک ہی گھر کا راستہ بتا سکتا ہوں اور وہ مرشد آباد کا قیدخانہ ہے"۔

میر حبیب نے بے پروائی سے جواب دیا "قیدخانے میں وہ جاتے ہیں جن کی کسی کو بھی ضرورت نہ ہو اور میں بدترین حالات میں بھی بنگال کے حکمران کو یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ اسے میری ضرورت ہے۔ تم ایک ذہین آدمی ہو لیکن میں حیران ہوں کہ تم نے یہ کیوں فرض کر لیا ہے کہ تم بڑے بڑے امراء کی تجوریوں پر پہرہ دے کر بنگال کی کوئی خدمت کر رہے ہو؟"

"اگر تمہیں اس بات کا افسوس ہے کہ تمہارے سپاہی حسین بیگ کے گھر سے نامراد واپس آئے تھے تو میں تمہاری غلط فہمی دور کر دینا چاہتا ہوں۔ مرزا حسین بیگ کے گھر میں روپیہ نہیں بلکہ عزت تھی جس کی حفاظت ہر شریف آدمی کا فرض تھا"۔

میر حبیب نے جواب دیا "میں نے اونچے طبقے میں کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا جو عزت کے معنی سمجھتا ہو۔ وہ صرف دولت اور حکومت کے معنی سمجھتے ہیں"۔

معظم علی نے کہا "میں جب بنگال کی عزت اور آزادی کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں وہ صرف امیروں اور حکمرانوں کا بنگال نہیں ہے میرا وہ بنگال ہے جسے لاکھوں مسلمان اپنا اور اپنی آنے والی نسلوں کا وطن سمجھتے ہیں۔ یہ میرا گھر ہے اور میں اسے چوروں، راہزنوں اور انسانیت کے دشمنوں سے محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں"۔

"نوجوان! میں تمہارے خیالات کی داد دیتا ہوں۔ لیکن جس بنگال کو میں جانتا ہوں، اس کے محافظ میرے نزدیک باہر کے رہزنوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ وہ دن بہت جلد آ رہا ہے جب تم بنگال کے متعلق سوچنے کی بجائے اپنے متعلق سوچنا زیادہ بہتر سمجھو گے۔ صرف علی وردی خان کے آنکھیں بند کرنے کی دیر ہے۔ اس کے بعد تم بنگال کے متعلق سوچنا بھی حماقت سمجھو گے۔ اتنی دیر شاید تم میری قید میں رہو۔ لیکن اگر اس سے پہلے ہی تمہارے خیالات میں کوئی تبدیلی آ جائے تو میں بڑی خوشی کے ساتھ تمہارا تعاون قبول کروں گا۔ پھر ہم بنگال کے متعلق نہیں بلکہ اپنے متعلق سوچیں گے۔ بالکل مرشد آباد کے امراء کی طرح، جن میں سے ہر ایک اپنے آپ کو علی وردی خاں کا واحد جانشین سمجھتا ہے۔ ان لوگوں کے نعروں کے جواب میں ہمیں بھی یہ نعرہ لگانے کا حق ہے کہ بنگال ہمارا ہے"۔

معظم علی نے کہا "اگر آپ کی رفاقت سے مجھے دلی کا تخت ملنے کی امید ہو تو بھی میں ایک قیدی کی حیثیت میں گمنامی کی موت کو ترجیح دوں گا"۔

میر حبیب نے کہا "انسان کے خیالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ میں چند ماہ یا چند برس انتظار کر سکتا ہوں۔ اس دوران میں میری کوشش یہ ہوگی کہ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ تمہیں حویلی کے اندر گھومنے پھرنے کی پوری آزادی ہوگی، لیکن اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو میں تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا ــــ اب تم جا سکتے ہو"۔

معظم علی کمرے سے باہر نکلا اور مسلح سپاہیوں کے ساتھ جو دروازے کے باہر کھڑے تھے چل دیا۔



علی وردی خاں کی افواج، میدناپور کے قریب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ میر جعفر علی وردی خاں کے خیمے میں داخل ہوا۔ اور تین دفعہ فرشی سلام کرنے کے بعد ادب سے کھڑا ہو گیا۔ علی وردی خاں کی مسند کے پیچھے دو محافظ ننگی تلواریں لیے کھڑے تھے۔ میر جعفر چند ثانیے خوف و اضطراب کی حالت میں کھڑا رہا۔ بالآخر علی وردی خاں نے کہا "ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ عطاء اللہ خاں یہاں حاضر ہونے سے کیوں پس و پیش کر رہا ہے؟"

"عالیجاہ! مجھے معلوم نہیں"۔

علی وردی خاں نے کہا: ہمارے خلاف کوئی سازش تمھارے علم کے بغیر نہیں ہوتی۔"

"عالیجاہ! اگر مجھے اس کی سازش کا علم ہوتا تو میں اس کا سر لے کر حضور کی خدمت میں پیش ہوتا۔"

"اس کے سر کے متعلق ہم بعد میں سوچیں گے۔ فی الحال ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس کے عزائم کیا ہیں اور اسے ہماری حکم عدولی کی جرأت کیسے ہوئی اور معظم علی کا آج تک کیوں پتہ نہیں چلا؟"

"عالیجاہ! کٹک کا صوبیدار آپ کو تمام حالات سے آگاہ کر چکا ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ فوج کے تمام بڑے بڑے افسر عطاء اللہ خاں کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ اگر اس کی نیت بری ہو تو بھی وہ موجودہ حالات میں حضور کے خلاف کوئی سازش نہیں کر سکتا۔ وہ صرف اپنی جان کے خوف سے حضور کی خدمت میں حاضر ہونے سے پس و پیش کرتا ہے۔ میں نے حضور کا حکم ملتے ہی معظم علی کے متعلق تحقیقات کی تھی۔ بدقسمتی سے جس دن وہ کٹک سے روانہ ہوا تھا۔ میں وہیں تھا اور میں نے اسے یہ کہا تھا، کہ تم آٹھ آدمیوں کے ساتھ سفر کرنے کی بجائے فوج کا انتظار کرلو اور میرے اس مشورے کی وجہ یہ تھی کہ مجھے سرحد کے آس پاس مرہٹوں کی سرگرمیوں کی اطلاع مل چکی تھی۔ لیکن معظم علی ایسے مشورے سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ مارا گیا ہے یا قید ہو گیا ہے۔ بہرحال وہ کٹک سے میرے سامنے روانہ ہوا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ عطاء اللہ خاں نے اس کے خلاف کوئی سازش کی ہو لیکن یہ ثابت کرنا آسان نہیں۔"

علی وردی خاں نے قدرے نرم ہو کر سوال کیا "عطاء اللہ خاں کے متعلق تمھارا کیا مشورہ ہے؟"

"عالیجاہ! میرا خیال ہے وہ ڈر کے مارے حضور کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا۔ میری یہ درخواست ہے کہ حضور کوئی قدم اٹھانے سے پہلے مجھے اس کے پاس جانے کی اجازت دیں اگر

اس کی نیت خراب ہے تو ممکن ہے میں اسے یہ سمجھا سکوں کہ تمھاری سازش طشت ازبام ہو چکی ہے اور تمھارے بچاؤ کی اب یہی ایک صورت ہے کہ تم کسی توقف کے بغیر حضور کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہو جاؤ۔"

علی وردی خاں نے کہا: "اسے میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم اسے راہ راست پر لا سکتے ہو تو اسے کہو کہ وہ استعفا دے کر سیدھا مرشد آباد چلا جائے۔"

"عالیجاہ! اگر میں اسے یہ یقین دلا سکوں کہ آپ نے اس کی جان بخشی کا وعدہ کیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ مرشد آباد جانا اپنی خوش قسمتی سمجھے گا۔"

"تمھیں غداروں کی سفارش نہیں کرنی چاہیے۔ بہرحال اگر وہ راست پر آجائے تو ہم اس کے لیے معمولی سزا کافی سمجھیں گے۔"



رات کے وقت عطاء اللہ خاں اپنی قیام گاہ میں گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے نوکر نے اسے جگایا اور کہا ——— "میر جعفر تشریف لائے ہیں اور اسی وقت آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے انھیں ملاقات کے کمرے میں بٹھا دیا ہے۔ ان کے ساتھ فوج کے دو افسر بھی ہیں۔"

عطاء اللہ خاں پریشانی کی حالت میں لباس تبدیل کیے بغیر نیچے اترا اور ملاقات کے کمرے میں داخل ہوا۔ میر جعفر نے اٹھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا!

"تم جا کر سپاہیوں کے آرام کا بندوبست کرو، میں ابھی آتا ہوں۔"

فوجی افسر اٹھ کر باہر نکل گئے اور میر جعفر نے عطاء اللہ خاں سے کہا "مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو بے وقت تکلیف دی۔ لیکن حالات کا تقاضا یہی تھا کہ آپ کو بروقت خبردار کیا جائے۔"

وہ ایک دوسرے کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ عطاء اللہ خاں کچھ دیر انتہائی پریشانی اور اضطراب کی حالت میں جعفر کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آئے ہیں۔ مجھے میدنا پور میں علی وردی خاں کی آمد کی اطلاع ملتے ہی یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ ہمارے کسی ساتھی نے انھیں ہمارے ارادوں سے خبردار کر دیا ہے۔"

میر جعفر نے کہا: "مجھے اس بات کا یقین نہیں۔ لیکن آپ سے ایک غلطی ضرور ہوئی ہے اور وہ یہ کہ آپ علی وردی خاں کی خدمت میں حاضر نہیں ہوتے۔ میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ میدنا پور میں علی وردی خاں کی غیر متوقع آمد کے بعد ہماری سازش کی کامیابی کے امکانات بہت محدود ہو چکے ہیں۔ اس کے لشکر کا مقابلہ کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ اگر وہ کٹک پہنچ گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کی فوج کے بیشتر سپاہی اپنی شکست کو یقینی سمجھ کر اس کے ساتھ ہو جائیں گے۔ آپ کے لیے اب ایک ہی راستہ باقی ہے اور وہ یہ کہ استعفا دے کر مرشد آباد روانہ ہو جائیں۔ میں نے علی وردی خاں کو آپ کی طرف سے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی اور انھوں نے یہ کہا تھا کہ اگر آپ مستعفی ہو کر مرشد آباد چلے جائیں تو آپ پر کوئی سختی نہیں کی جائے گی۔"

عطاء اللہ خاں کچھ دیر پھٹی پھٹی نگاہوں سے میر جعفر کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا:

"علی وردی خاں نے آپ سے بھی استعفے کا مطالبہ کیا ہے؟"

"نہیں اور اگر آپ بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تو شاید یہ صورت پیدا نہ ہوتی۔"

عطاء اللہ خاں نے جواب دیا: "میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی بجائے مرہٹوں کی پناہ لینا بہتر سمجھتا ہوں۔ میر صاحب آپ یوں ہی گھبرا گئے ہیں۔ اگر آپ میرا ساتھ دیں تو میں اسی وقت فوج کو کوچ کا حکم دیتا ہوں۔ میر حبیب سرحد سے زیادہ دور نہیں۔ ہمیں اس کی پناہ لے کر علی وردی خاں کے ساتھ جنگ کے لیے تیاری کا وقت مل

جائے گا۔"

میر جعفر نے جواب دیا: "میں یہ تمام باتیں سوچنے کے بعد آپ کے پاس آیا ہوں۔ میر حبیب ایک ڈاکو ہے۔ اور اس کی دوستی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بنگال کے اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھانے کی امید پر آپ کا ساتھ دے سکتا ہے اور وہ بھی اسی صورت میں جب کہ اسے آپ کی کامیابی کا یقین ہو۔ لیکن جب آپ ایک شکست خوردہ آدمی کی حیثیت میں اس کے پاس جائیں گے تو وہ آپ کو چند ٹکوں کے عوض میں علی وردی خاں کے ہاتھ فروخت کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ آپ اگر مستعفی نہ ہوئے تو بھی علی وردی خاں آپ کو سبکدوش کر دے گا۔ اس لیے میرا دوستانہ مشورہ یہی ہے کہ آپ ابھی انھیں یہ لکھیں کہ مجھے بعض ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ میں آپ کا اعتماد کھو چکا ہوں اور میرے مخالفین آپ کو بدظن کرنے کے لیے میرے متعلق اس قسم کی افواہیں پھیلا رہے ہیں کہ میں آپ کے خلاف بغاوت کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ ان حالات میں میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں مستعفی ہو جاؤں اور آپ سے یہ درخواست کروں کہ مجھے مرشد آباد میں اپنی زندگی کے باقی ایام گزارنے کی اجازت دی جائے لیکن اگر آپ کو کسی وقت میری نیک نیتی کا یقین آ جائے تو مجھے ہر وقت اپنی خدمت کے لیے تیار پائیں گے۔"

عطاء اللہ خاں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: "میر صاحب آپ کو یقین ہے کہ استعفا دینے کے بعد مرشد آباد جانا میرے لیے خودکشی کے مترادف نہیں ہوگا؟"

"نہیں! بلکہ مجھے یہ یقین ہے کہ آپ کو مرشد آباد پہنچتے ہی علی وردی خاں کا یہ پیغام ملے گا کہ ہمارے تمام شکوک دور ہو چکے ہیں اور تمھیں فلاں عہدہ پر مامور کیا جاتا ہے۔"

عطاء اللہ خاں نے کہا: "مجھے یقین نہیں آتا کہ میں اتنی جلدی بازی ہار چکا ہوں۔"

میر جعفر نے تسلی دیتے ہوئے کہا: "میرے دوست آپ نے بازی نہیں ہاری۔

علی وردی خاں اپنی عمر کی آخری منزل میں قدم رکھ چکا ہے۔ مستقبل ہمارا ہے اور ہم چند مہینے یا چند برس اور انتظار کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو اپنی شکست کا اعتراف کرنے یا ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دینے نہیں آیا بلکہ یہ مشورہ دینے کے لیے آیا ہوں کہ آپ ہتھیار اٹھانے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کریں"۔

عطاء اللہ خاں نے کہا: "میر صاحب! جب ہم اپنے مستقبل کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے تو آپ نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ مجھے ایسی صورت حالات کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ اب اگر آپ کا یہی مشورہ ہے تو میں استعفا دینے کے لیے تیار ہوں لیکن استعفے کا جواب آنے تک میرا یہاں رہنا ضروری ہوگا۔ پھر اگر علی وردی خاں نے مجھے مرشد آباد جانے سے منع کر دیا تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"آپ کو جواب کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ استعفا میرے حوالے کریں اور کسی تاخیر کے بغیر مرشد آباد روانہ ہو جائیں۔ علی وردی خاں کو مطمئن کرنا میرا کام ہوگا"۔

عطاء اللہ خاں نے اٹھ کر دروازے کے قریب جا کر نوکر کو آواز دی اور کاغذ اور قلم لانے کا حکم دیا۔ اور پھر میر جعفر کی طرف متوجہ ہو کر بولا "میر صاحب! استعفے کا مضمون لکھنے کے لیے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے"۔

"بہت اچھا! میں بولتا جاؤں گا اور آپ لکھتے جائیں"۔

دوسرے روز علی الصباح عطاء اللہ خاں مرشد آباد کا رخ کر رہا تھا اور اس کی روانگی کے چند دن بعد میر جعفر میدنا پور پہنچ کر علی وردی خاں سے یہ کہہ رہا تھا۔ "عالیجاہ! خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری باتوں میں آ کر استعفا دے دیا، ورنہ اس کے عزائم بہت خطرناک تھے، مرشد آباد میں وہ حضور کے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں ہو سکتا۔ ہمارے جاسوس ہر وقت اس کی نگرانی کے لیے موجود ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے کسی نادان دوست نے بہکایا تھا۔ اب اگر حضور کی اجازت ہو تو میں اسے یہ لکھنا چاہتا ہوں کہ حضور والا شان نے

تمہارا استعفا منظور کر لیا ہے۔ سابقہ غلطیوں کے بارے میں تم سے کوئی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ لیکن آئندہ کے لیے تمہیں بے حد محتاط رہنا چاہیے!"

اور علی وردی خاں اس کے جواب میں کہہ رہا تھا: "ہاں، اور اسے یہ بھی لکھ دو کہ اس کی سابقہ فوجی خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کے گزارے کے لیے ایک معقول وظیفہ دیا جائے"۔

ساتواں باب

میرحبیب کی قید میں معظم علی کے لیے زندگی صبح وشام کے ایک بے کیف تسلسل کا نام تھی ۔ اسے بنگال کے حالات کا کوئی علم نہ تھا۔ قید کی تنہائی میں اکبر خاں اس کے لیے ایک بہت بڑا سہارا بن چکا تھا۔ وہ اکثر اپنے اپنے خاندان، عزیزوں اور دوستوں کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ایک ذہنی کرب کے باعث معظم علی کئی کئی گھنٹے خاموش رہتا اور اکبر خاں اسے تسلی دینے کی کوشش کرتا: "بھائی جان! آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ خدا ہماری مدد کرے گا اور ہم بہت جلد ان ظالموں کی قید سے آزاد ہو جائیں گے۔ آپ کہتے تھے کہ خدا اپنے بندوں کی دعائیں ضرور سنتا ہے۔ میں ہر وقت آپ کی رہائی کے لیے دعائیں مانگا کرتا ہوں۔ آپ کہتے تھے خدا اپنے بندوں کے صبر کا امتحان لیتا ہے۔ لیکن آج آپ مغموم ہیں۔"

جب مسکرانے کی کوشش کے باوجود اکبر خاں کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتیں تو معظم علی خواب وخیال کی دنیا سے نکل کر اسے تسلی دینے کی ضرورت محسوس کرتا۔ "اکبر میں اپنے متعلق نہیں۔ بلکہ اپنی قوم اور اپنے وطن کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟"

پھر وہ آپس میں بار بار کی ہوئی باتیں دہراتے اور حال کی مایوسیوں کے اندھیروں میں مستقبل کی امیدوں کے چراغ جلانے کی کوشش کرتے۔ اکبر خاں اپنے وطن کے حسین

اور دلکش مناظر بیان کرتا اور معظم علی اسے مرشد آباد کی ان گلیوں اور مکانوں کے متعلق بتاتا جہاں وہ بچپن میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ پھر وہ قید سے آزاد ہونے کے بعد ایک دوسرے کا وطن دیکھنے کا وعدہ کرتے۔

اکبر خاں اپنی عمر کے عام بچوں کی نسبت کہیں زیادہ سنجیدہ اور ذہین تھا۔ وہ معظم علی کو اس حویلی کے اندر اور باہر مرہٹوں کے کیمپ کے تمام حالات بتا چکا تھا۔ فرار کی کوشش سے پہلے جب اسے اِدھر اُدھر گھومنے کی آزادی تھی وہ پڑاؤ کے متعلق تمام معلومات حاصل کر چکا تھا۔ وہ معظم کو بتا چکا تھا کہ مرہٹے گاؤں کے اصل باشندوں کو نکالنے کے بعد ان کے مکانات پر قبضہ کر چکے ہیں بیشتر مکانات ان کے گھوڑوں کے لیے اصطبلوں کا کام دیتے ہیں اور بعض مکانات میں انھوں نے گولہ بارود اور رسد کے ذخیرے جمع کر رکھے ہیں، پہریدار کی ٹولیاں دن رات گاؤں کی گلیوں میں گشت کرتی ہیں۔ گاؤں کے باہر چاروں طرف مرہٹہ سپاہیوں کے خیمے ہیں۔ اس حویلی کی چار دیواری کے اندر بھی بعض کوٹھڑیوں کے تہہ خانوں میں رسد اور بارود کے ذخیرے جمع ہیں۔

اکبر خاں سے متعدد سوالات پوچھنے کے بعد معظم علی کو اپنی کوٹھڑی سے باہر ہر دیوار، ہر گلی اور ہر مکان کا نقشہ حفظ ہو چکا تھا۔ صبح شام انھیں تھوڑی دیر ہوا خوری کے لیے قید خانے سے باہر نکالا جاتا۔ معظم علی حویلی کے اندر دوسرے قیدیوں کے علاوہ کبھی کبھی اپنے ساتھیوں سے ملتا لیکن مسلح پہریدار ہر وقت اس کے سر پر موجود ہوتے اور اسے کسی سے بات کرنے کا موقع نہ دیتے۔

ایک دن اکبر خاں فرار ہونے کے متعلق اسے اپنی نئی تجویز بتا رہا تھا۔ معظم علی دیر تک اس کی باتیں سنتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "اکبر خاں تمھیں معلوم ہے کہ بھاگنے کی ناکام کوشش ہمارے لیے کس قدر خطرناک ثابت ہوگی۔ پھر میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر جانا بھی نہیں چاہتا میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر تم اس کوٹھڑی سے باہر رہ کر گرد و پیش کے حالات معلوم کر سکو تو شاید

ہم بھاگنے کے متعلق کوئی بہتر تجویز سوچ سکیں۔ میں نے ایک تجویز سوچی ہے۔ اگر تم نے ہوشیاری کا ثبوت دیا تو ممکن ہے ہم بہت جلد رہا ہو جائیں۔"

اگلے دن پہریدار کھانا لے کر آیا تو معظم علی نے اس سے کہا: "میں میر حبیب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

پہریدار نے جواب دیا: "وہ یہاں نہیں ہیں جب وہ آئیں گے تو آپ کی درخواست پہنچا دی جائے گی۔"

معظم علی انتہائی بے چینی سے میر حبیب کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ روزانہ صبح اٹھتا اور پہریداروں سے پوچھتا مگر اسے نفی میں جواب ملتا۔

کوئی دس ماہ انتظار کے بعد پہرے داروں کے ایک افسر نے اس کے پاس آکر اطلاع دی کہ میر حبیب تشریف لاتے ہیں اور آپ کی درخواست ان تک پہنچا دی گئی ہے لیکن ابھی تک انھوں نے مجھے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

معظم علی نے مایوسی اور بے بسی کی حالت میں چند دن اور گزارے۔ ایک دن اچانک اس کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور میر حبیب فوج کے دو افسروں اور چار مسلح سپاہیوں کے ہمراہ کوٹھڑی کے اندر داخل ہوا۔ معظم علی اور اکبر خان اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

میر حبیب نے سوال کیا: "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں یہ سمجھتا تھا کہ اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود آپ ایک بہادر آدمی ہیں۔ لیکن بہادری اور بے رحمی میں بہت فرق ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس معصوم بچے نے کیا گناہ کیا ہے۔ اور آپ اسے کب تک قید میں رکھنا چاہتے ہیں؟"

میر حبیب نے جواب دیا: "ایک قیدی کو دوسرے قیدی کی سفارش کا حق نہیں۔ تاہم ذاتی طور پر میری یہ خواہش دیتی کہ اکبر کو کوٹھری میں بند کیا جائے۔ لیکن اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی، اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ مجھے اس کی شکل دیکھ کر رحم آگیا تھا۔"

معظم علی نے اکبر خاں کی طرف دیکھا اور اس نے آگے بڑھ کر میر حبیب کا دامن پکڑتے ہوئے کہا: "خدا کے لیے میرا قصور معاف کر دیجیے۔ اب اگر میں بھاگنے کی کوشش کروں تو مجھے گولی مار دیجیے۔"

میر حبیب نے کہا: "میرا خیال تھا کہ تم یہاں خوش ہو۔"

"نہیں! نہیں!" اکبر خاں نے جواب دیا۔ "میں کھلی ہوا میں رہنا چاہتا ہوں۔"

معظم علی نے کہا: "اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا وطن کس سمت ہے لیکن اگر یہ بھاگ بھی جائے تو آپ کے لیے کون سے خطرے کا باعث ہو سکتا ہے؟"

میر حبیب نے کہا: "دیکھو اکبر۔ میں تمھیں ایک اور موقع دیتا ہوں۔ لیکن اگر تم نے دوبارہ بھاگنے کی کوشش کی تو تمھیں باقی تمام عمر اس تہ خانے میں رکھا جائے گا۔ جہاں دوپہر کے وقت بھی روشنی نہیں پہنچتی۔"

پھر وہ پہریداروں کی طرف متوجہ ہوا۔ "اسے لے جاؤ! لیکن اس کا اچھی طرح خیال رکھو۔"

اکبر خاں ایک پہریدار کے ساتھ باہر نکل گیا۔ میر حبیب دروازے کے قریب پہنچ کر اچانک مڑا اور معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر بولا: "میرا خیال تھا کہ تم اپنے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"اپنے متعلق میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک ایسے شخص کی قید میں ہوں۔ جس سے رحم یا انصاف کی درخواست کرنا بے سود ہے اور میں اس وقت کا انتظار کر رہا ہوں جب انصاف کی تلوار میرے ہاتھ میں ہوگی۔"

میر حبیب غصے میں آنے کی بجائے مسکرایا اور اس نے سوال کیا: "جب انصاف کی تلوار تمھارے ہاتھ میں ہوگی تو تم کیا کرو گے؟"

"میں آپ کو اس سے بہتر کوٹھڑی دوں گا اور آپ کے ساتھ کوئی ایسا قیدی نہیں رکھوں گا۔ جس کی مظلومیت اور بے کسی کے احساس سے آپ اپنی تکالیف بھول جائیں۔"

"تم بیوقوف ہو۔ ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔" میر حبیب یہ کہہ کر نکل گیا۔



قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے سامنے حویلی کے صحن میں تین چھولداریاں نصب تھیں۔ درمیانی چھولداری ذرا بڑی تھی جس میں قیدیوں کے محافظوں کا جمعدار رہتا تھا اور اس کے دائیں بائیں دو چھولداریوں میں آٹھ سپاہی رہتے تھے۔ گرمی کے موسم میں قیدیوں کے محافظ دن کے وقت ان چھولداریوں میں پناہ لیتے تھے۔ لیکن رات کے وقت وہ قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے دروازوں کے سامنے کھلی فضا میں آرام کرتے تھے۔ دو دو پہریداروں کی چار ٹولیاں رات کے وقت باری باری قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے سامنے گشت کرتیں اور شام سے صبح تک ہر تین گھنٹے کے بعد پہرہ بدلتا تھا۔ اس چوکی کے دوسرے محافظ جن کی تعداد عام طور پر پچاس ساٹھ کے لگ بھگ ہوتی تھی بڑے دروازے کی طرف دیوار کے ساتھ چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں اور بانس کے چھپروں میں رہتے تھے۔

میر حبیب نے اکبر خاں کو معظم علی کی کوٹھڑی سے نکال کر قیدیوں کے محافظ سپاہیوں کے جمعدار کے سپرد کر دیا تھا اور اسے تاکید کی تھی کہ اکبر خان کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ یہ جمعدار ایک مرہٹہ تھا اور اس کا نام مرلی دت تھا۔ مرلی دت بے حد موٹا تھا۔ وہ سر سے گنجا تھا اور اس کے سیاہ چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ دو سال قبل وہ میر صبیب کی فوج کے اچھے سپاہیوں میں شمار ہوتا تھا۔ لیکن ایک لڑائی میں زخمی ہونے کے باعث اس کی بائیں ٹانگ بیکار ہو چکی تھی۔ اپنے ماتحت سپاہیوں کے ساتھ وہ بڑی سختی کے ساتھ پیش آتا تھا۔ لیکن اکبر خاں کے ساتھ اس کا برتاؤ نسبتاً بہتر تھا۔ اس نے اکبر خاں کو قید خانے کی کوٹھڑی سے نکالنے کے بعد اسے نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس سے پہلے بھی تمھیں کوئی تکلیف نہیں دی تھی۔ لیکن تم نے بھاگنے کی کوشش کی۔ میر صاحب نے تمھیں ایک موقع اور دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب بھی تمھیں کوئی تکلیف نہ دی جائے۔ لیکن اگر تم نے دوبارہ بھاگنے کی کوشش کی تو تمھارا

انجام بہت بُرا ہوگا۔"

اکبر خاں نے انتہائی معصومیت کے انداز میں جواب دیا۔ "جی میں آئندہ کوئی شرارت نہیں کروں گا۔"

"تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ تم کوئی شرارت نہ کرو!"

چند دنوں کے اندر اکبر خاں، مرلی دت کے لیے ایک کارآمد نوکر بن چکا تھا۔ وہ صبح سویرے اٹھ کر چھولداری میں جھاڑو دیتا۔ اس کا بستر درست کرتا اور کبھی کبھی اس کے کپڑے بھی دھولاتا۔ سپاہی اس پر اس لیے خوش تھے کہ پہلے اس قسم کے تمام کام انھیں کرنے پڑتے تھے۔

مرلی دت کو بانسری بجانے اور اس سے زیادہ سننے والوں سے داد حاصل کرنے کا شوق تھا۔ لیکن اس کے چند سپاہیوں کے علاوہ جو اسے ایک مجبوری سمجھ کر اس کے گرد جمع ہو جاتے، قلعے میں کسی اور کو اس کے اس فن سے دلچسپی نہ تھی بلکہ دوسرے سپاہی اور افسر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ بانسری بجانے کے علاوہ اسے گانے کا بھی شوق تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کی آواز اس کی صورت سے بھی زیادہ کریہہ تھی۔

اکبر خاں کو اس کی کمزوری کا علم تھا اور وہ جی کھول کر اسے داد دیا کرتا تھا۔ وہ کہتا "چچا مرلی دت! آپ تو کمال کرتے ہیں۔ میں نے کسی اور کو اتنی اچھی بانسری بجاتے نہیں دیکھا۔"

اور وہ جواب دیتا۔ "اسے سمجھنے کے لیے عقل کی ضرورت ہے اور تم ان سب سے زیادہ سمجھدار ہو۔"

"چچا مرلی دت! آپ کی آواز بھی بہت اچھی ہے۔ کاش میں بھی اس طرح گا سکتا!"

اور مرلی دت خوش ہو کر کہتا۔ "گانے کے لیے بڑی محنت کی ضرورت ہوتی ہے بیٹا!"

آہستہ آہستہ اکبر خاں پر مرلی دت کا اعتماد بڑھتا گیا۔ اسے حویلی کے اندر گھومنے کی آزادی

تھی۔ جب قیدیوں کو تھوڑی دیر کے لیے کوٹھڑیوں سے باہر نکالا جاتا تو وہ کسی نہ کسی بہانے ان کے پاس چلا جاتا۔ پہریداروں کی موجودگی میں اسے عام طور پر معظم علی سے باتیں کرنے کا موقع نہ ملتا۔ لیکن جب کبھی سپاہیوں کی توجہ دوسری طرف ہوتی تو وہ آہستہ سے کوئی بات کہہ کر نکل جاتا۔

جب سپاہی قیدیوں کے لیے کھانا لے کر آتے تو وہ آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے کبھی روٹیوں کی ٹوکری اور کبھی پانی کا مٹکا پکڑ لیتا۔ آہستہ آہستہ پہریدار اس سے اس قسم کے کام لینے کے عادی ہوتے گئے۔ پانچ چھ ہفتوں کے بعد یہ حالت تھی کہ جب قیدیوں کو کھانا پہنچانے کا وقت آتا تو سپاہی اسے کبھی کنویں سے پانی اور کبھی لنگر خانے سے کھانا لانے کے لیے کہتے۔

کوٹھڑیوں کے تالوں کی چابیاں مرلی دت ہمیشہ اپنے قبضے میں رکھتا تھا۔ رات کے وقت قیدیوں کو کھانا دینے کے بعد وہ چابیوں کا گچھا چھولداری کے اندر ایک لکڑی کے صندوق میں بند کر دیتا تھا۔ اور صندوق کے تالے کی چابی جو ایک دھاگے میں بندھی ہوئی تھی۔ اپنے گلے میں ڈال لیتا تھا۔ پہریدار ہر صبح قیدیوں کو باہر نکالنے کے لیے مرلی دت سے چابیاں لینے آتے تھے۔ ایک دن اس کی طبیعت ذرا خراب تھی۔ اس نے لیٹے لیٹے اکبر خاں کو صندوق کی چابی دیتے ہوئے کہا۔ "جاؤ تم نکال دو!"

یہ ابتدا تھی اور اس کے بعد اکبر خاں مستقل طور پر یہ کام اپنے ذمے لے چکا تھا۔

ایک رات ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ مرلی دت کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر بانسری بجاتا رہا اور اس کے بعد اپنی موٹی اور بھدی آواز میں اکبر خاں کو چند گیت سنانے کے بعد لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد گہری نیند میں اس کے خراٹے جو حویلی کے تقریباً ہر سپاہی اور افسر کے لیے موضوعِ بحث بن چکے تھے۔ اکبر خاں کو پریشان کر رہے تھے۔ پچھلے پہر جب بارش تھم گئی تو اکبر خاں نے اپنی کھاٹ چھولداری سے باہر نکال لی۔

دو پہریدار گشت کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے پوچھا۔ "کیوں اکبر خاں کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں! چچا مرلی دت بین بجا رہا ہے اور مجھے نیند نہیں آتی۔"

پہریدار نے اس کے قریب آ کر کہا: "میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ توپ کی آواز بھی اس سے زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو مرلی دت کے ساتھ چھولداری میں رہنے کی بجائے تہ خانے میں رہنا زیادہ پسند کرتا۔ لیکن دیکھو یہ بات کہیں اس سے نہ کہہ دینا!"

دوسرے سپاہی نے کہا۔ "بھئی اکبر خاں! سچ بتاؤ تمھیں واقعی ان کا گانا پسند ہے؟ آدھی رات تک وہ بانسری بجاتے رہے اور پھر جب ہم یہ سوچ رہے تھے کہ اب تھوڑی دیر سونے کے لیے وقت مل جائے گا تو تم گانے کے لیے اصرار کرنے لگے۔"

"ان کا گانا مجھے بہت پسند ہے۔" اکبر خاں نے کھاٹ پر لیٹتے ہوئے جواب دیا۔

صبح کے وقت پہریدار نے اکبر خاں کو جگایا اور کہا۔ "جاؤ چابیاں لے آؤ!"

اکبر خاں آنکھیں ملتا ہوا چھولداری میں داخل ہوا تو مرلی دت بدستور خراٹے لے رہا تھا، اس نے مرلی دت کو جگانے کی بجائے آگے بڑھ کر اطمینان سے دھاگے کی گرہ کھولی اور اس کے گلے سے چابی اتار لی۔ پھر اس نے صندوق کا تالا کھولا اور قید خانے کی چابیوں کا گچھا لے کر باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنی کھاٹ چھولداری کے اندر لے آیا۔ اور اس پر لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا۔

اچانک اسے مرلی دت کی آواز سنائی دی "اکبر خاں! اکبر خاں!! بہت دیر ہو گئی۔ جاؤ پہریداروں کو چابیاں دے آؤ۔ مجھے رات نیند نہیں آئی۔"

اکبر خاں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

مرلی دت نے اپنے گلے اور سینے پر ہاتھ پھیرنے کے بعد بدحواس ہو کر کہا۔ "ارے میری بی کہاں گئی؟"

اکبر خاں نے اپنے گلے سے چابی اتار کر اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "لیجیے، میں نے

پہریداروں کو چابیاں نکال دی ہیں۔ آپ گہری نیند سو رہے تھے۔ اس لیے میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔"

"تم بہت شریر ہو!" مرلی دت نے چابی کا دھاگا اپنے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ لیکن مجھے بہت دیر سے نیند آئی تھی۔ تم نے اچھا کیا کہ مجھے جگایا نہیں۔"

"اب مجھے نیند آرہی ہے۔" اکبرخاں نے کھاٹ پر لیٹ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

اس واقعہ سے چند ہفتے بعد صبح کے وقت قیدیوں کو کوٹھریوں سے باہر نکالا گیا تو اکبرخاں نے موقع پاکر معظم علی سے کہا: "میر حبیب کل کہیں چلے گئے ہیں۔ ان کی غیر حاضری میں پہرہ سخت نہیں ہوتا۔ بادل آرہے ہیں اگر آج رات بارش شروع ہو گئی تو آپ تیار رہیں۔"



شام کے وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، مرلی دت چھولداری کے باہر کھاٹ پر بیٹھا اطمینان سے بانسری بجا رہا تھا۔ اکبرخان پہریداروں کے ساتھ قیدیوں کو کھانا تقسیم کرنے کے بعد اس کے پاس آیا اور اس نے چابیوں کا گچھا اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا: "چچا مرلی دت آج بہت گرمی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ بعض راگنیاں بارش لے آتی ہیں۔ آپ کو کوئی ایسا راگ آتا ہے؟"

مرلی دت نے بے پروائی سے جواب دیا: "راگ آدمی کے لیے ہوتے ہیں۔ بادلوں کے لیے نہیں۔" اور پھر بانسری بجانے میں مصروف ہو گیا۔

اکبرخاں نے قدرے توقف کے بعد کہا: "چچا مرلی دت چابیاں اندر رکھ آؤں؟"

مرلی دت نے جواب دینے کی بجائے اپنے گلے سے صندوق کی کنجی نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دی۔ اکبرخاں چابیوں کا گچھا لے کر اندر چلا گیا۔ اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ چند ثانیے توقف کے بعد اس نے چابیوں کا گچھا صندوق کے پیچھے رکھ دیا۔ پھر اس نے صندوق کھولا اور اس کا ڈھکنا زور سے بند کرنے کے بعد تالا کھولا اور اس کا ڈھکنا زور سے بند کرنے کے بعد تالا لگا کر باہر نکل آیا۔

"کیسے بیوقوف ہو۔" مرلی دت نے جھنجھلا کر کہا "تم میرا صندوق توڑ ڈالو گے۔"

اکبرخاں نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "چچا! اندر بہت گرمی ہے۔ دیکھو مجھے پسینہ آرہا ہے۔"

"آج بارش ضرور آئے گی۔" اس نے اکبرخاں کے ہاتھ سے چابی لے کر گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

اکبرخاں مرلی دت کے سامنے دوسری کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آس پاس لیٹے ہوئے سپاہیوں کو آواز دے کر کہا:

"بھئی یہاں آؤ! آج چچا مرلی دت کمال کر رہے ہیں۔" اور سپاہی مرلی دت کی موسیقی سے لطف اندوز ہونے کی بجائے اس کے عتاب سے بچنے کے لیے اپنی اپنی کھاٹ گھسیٹ کر اس کے اردگرد بیٹھ گئے۔

مُرلی دت نے کہا: "راگ سمجھنے کے لیے عقل کی ضرورت ہے۔ اب ذرا غور سے سنو۔" اور وہ کوئی ایک گھنٹہ انتہائی بیچارگی کی حالت میں بیٹھے رہے۔ اچانک بارش کی موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ بادل گرجا اور موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔

اکبرخاں نے کہا: "چچا مرلی دت بارش آگئی اُٹھیے، آپ کی کھاٹ اندر کر دوں؟" اور وہ بدستور بانسری بجاتا ہوا چھولداری کے اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر اکبرخاں اور مرلی دت چھولداری کے اندر اپنی اپنی کھاٹ پر لیٹے رہے مرلی دت بانسری بجانے کی بجائے ایک انتہائی ناقابل برداشت لَے میں گا رہا تھا۔ وہ گاتے گاتے سو گیا اور پھر اس کے خراٹے تاریک رات کی ہولناکی میں اضافہ کرنے لگے۔

اکبر خاں کے دل کی دھڑکنیں دوبارہ تیز ہونے لگیں۔ وہ دیر تک بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ بالآخر اٹھا اور کھاٹ سے اتر کر ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل فرش پر چلتا ہوا صندوق کے پاس پہنچا

صندوق کے پیچھے چابیوں کے گچھے کو ہاتھ لگنے سے ایک ہلکی سی آواز پیدا ہوئی اور اس کے جسم میں خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ لیکن مرلی دت کے خراٹوں کے تسلسل نے اس کے توہمات دور کر دیئے۔ وہ مڑا اور اسی طرح ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا ہوا چھولداری کے دروازے پر کھڑا ہو کر باہر جھانکنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد پانی اور کیچڑ میں دو پہریداروں کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ اکبر خاں دبے پاؤں معظم علی کو کوٹھڑی کی طرف بڑھا۔ وہ کوٹھڑی کے تالے میں یکے بعد دیگرے مختلف چابیاں لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ سپاہیوں کے قدموں کی چاپ دوبارہ سنائی دینے لگی۔ وہ دروازے کے ساتھ چمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ خوف و ہراس کے باعث اس کی یہ حالت تھی کہ اسے اپنا سانس بھی بار محسوس ہوتا تھا۔ بجلی کی ایک ہلکی سی چمک ان تمام منصوبوں کو خاک میں ملا سکتی تھی جو اس نے مہینوں کے غور و فکر کے بعد تیار کیے تھے۔

ایک پہریدار اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔ "بھئی چلیں اپنی چھولداری کے اندر۔ یہ طوفان بہت خطرناک ہے۔"

"ٹھہرو! میں ابھی آتا ہوں۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"کہاں جا رہے ہو۔"

"ذرا جمعدار صاحب کا حال دیکھ آؤں۔"

ایک پہریدار، اکبر خاں سے صرف پانچ قدم کے فاصلے پر رک گیا اور دوسرا مرلی دت کی چھولداری کی طرف بڑھا۔

چند منٹ بعد وہ ہنستا ہوا واپس آیا اور بولا "چلو بھئی! جمعدار جی کو اس وقت دنیا کی کوئی خبر نہیں ہے۔ ہم اپنی چھولداری کے اندر بیٹھتے ہیں۔ یہ کمبخت خود بھینسے کی طرح سوتا ہے اور ہمیں ایسی بارش میں بھی سر چھپانے کی اجازت نہیں دیتا۔ آخر ان کوٹھڑیوں میں کون سا خزانہ ہے

جسے کوئی لوٹنے آئے گا۔ ہم تھوڑی دیر بعد چکر لگاتے رہیں گے۔"

وہ چلے گئے۔

اکبر خاں نے اطمینان کا سانس لیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک چابی لگ گئی۔ اس نے تالا نکال کر کنڈی اتاری اور آہستہ سے کواڑ کے پٹ اندر کی طرف دھکیل دیئے۔

"بھائی جان! بھائی!!" اس نے دبی زبان میں کہا۔

"اکبر آہستہ بولو!" معظم علی نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

اکبر خاں نے کہا۔ "پہریدار چھولداری کے اندر چلے گئے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ آؤ ہمارے ساتھی انتظار کر رہے ہوں گے۔"

اکبر خاں نے چابیوں کا گچھا اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "یہ لیجئے! اگر پہریدار جلدی نہ آ گئے تو ہم تمام کوٹھڑیاں کھول سکتے ہیں۔"

معظم علی نے باہر نکل کر دروازے کو کنڈی لگا دی اور کہا۔ "اس کا تالا کہاں ہے؟"

اکبر خاں نے جواب دیا۔ "وہ میں نے چھت پر پھینک دیا ہے۔"

معظم علی جلدی سے آگے بڑھ کر دوسری کوٹھڑی کا تالا کھولنے میں لگ گیا۔ چند چابیاں آزمانے کے بعد اس نے تالا کھول لیا۔ کوٹھڑی کے اندر اس کے دو ساتھی منتظر تھے۔ اس نے چابیوں کے گچھے کی رسی کھینچ کر توڑ ڈالی اور اپنے ساتھیوں کو چابیاں تقسیم کرتے ہوئے کہا "تم ان چابیوں سے جن کوٹھڑیوں کے تالے کھول سکو وہاں سے قیدیوں کو نکال کر میری کوٹھڑی میں جمع کرو۔ اور دروازے اسی طرح بند کرتے جاؤ۔ اور دیکھو ہمیں اپنے ساتھیوں کے علاوہ دوسرے قیدیوں کو بھی یہاں سے نکالنا ہے۔"

چند منٹ میں معظم علی کے آٹھ ساتھیوں کے علاوہ بارہ اور قیدی اس کی کوٹھڑی میں جمع ہو چکے تھے۔ صرف آخری سرے پر تین کوٹھڑیاں باقی تھیں جن کے اندر پانچ پانچ قیدی بند تھے۔

معظم علی نے ایک کوٹھڑی کا تالا ابھی کھولا ہی تھا کہ اکبر خاں بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا: "پہریدار گشت کے لیے آ رہے ہیں۔"

معظم علی نے جلدی سے کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور اکبر خاں کا بازو پکڑ کر فوراً اندر داخل ہو گیا قیدی دروازے پر منتظر تھے۔ معظم علی نے دروازہ بند کرتے ہوئے اکبر خاں سے دریافت کیا۔

"پہریدار کتنے ہیں؟"

"صرف دو۔" اس نے جواب دیا۔

معظم علی نے کوٹھڑی کے قیدیوں سے مخاطب ہو کر کہا: "تم میں سے تین مضبوط آدمی میرے ساتھ آجائیں۔ ہم پہریداروں کو چیخ پکار کا موقع دیے بغیر اس کوٹھڑی میں بند کریں گے۔ لیکن یاد رکھو۔ تمھاری ذرا سی کوتاہی ہمارا تمام منصوبہ خاک میں ملا دے گی۔"

اس کے بعد معظم علی نے دروازہ کھول دیا۔ تھوڑی دیر میں پہریداروں کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ جوں ہی وہ باتیں کرتے ہوئے کوٹھڑی کے سامنے پہنچے۔ معظم علی اچانک آگے بڑھا اور دونوں ہاتھوں سے ایک کا گلا دبوچ کر کوٹھڑی کے اندر گھسیٹ لایا۔ دوسرے آدمی کے منہ سے صرف "کیا ہے" نکلنے پایا تھا کہ ایک قیدی نے بڑھ کر اس کی گردن دبائی اور باقی دو نے اسے گھونسوں اور مکّوں سے ادھ موا کر کے کوٹھڑی کے اندر ڈال دیا۔

تاریکی میں معظم علی کو یہ بتانے کی ضرورت پیش نہ آئی کہ گرفتاروں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ کوئی ان کی قمیص پھاڑ کر ان کے منہ میں ٹھونس رہا تھا تو کوئی ان کی پگڑیاں اتار کر ان کے ہاتھ پاؤں باندھنے میں مصروف تھا۔ اور کوئی لاتوں اور مکّوں سے ان کی تواضع کرنے میں لگا ہوا تھا۔

معظم علی نے کہا: "بھائی دیکھنا اندھیرے میں اپنے کسی ساتھی کو نہ مار دینا!"

پہریداروں کی بندوقوں اور تلواروں پر قبضہ کرنے کے بعد معظم علی قیدیوں کو لے کر باہر نکلا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے قفل لگا دیا۔ باقی دو کوٹھڑیوں سے قیدیوں کو نکالنے میں اسے دیر

نہ لگی جب تمام قیدی معظم علی کی کوٹھڑی میں جمع ہو گئے تو اس نے اکبر خاں سے کہا: "اکبر! تم نے ہمیں قید سے نکالا ہے۔ اب باہر نکلنے کے لیے بھی ہمیں تمھاری رہنمائی کی ضرورت ہے۔"

اکبر خاں نے جواب دیا: "حویلی کا دروازہ کھول کر باہر نکلنا ممکن نہیں۔ یہاں سے نکلنے کے صرف دو ہی راستے ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم یا تو پچھلی دیوار میں نقب لگائیں یا چھت پر چڑھ کر پچھواڑے کی طرف دوسری حویلی میں کود جائیں۔ پچھواڑے کی حویلی میں غلے کے گودام اور گھوڑوں کے اصطبل ہیں۔ وہاں اس وقت پندرہ بیس پہریدار ہوں گے۔ ہمارے پاس صرف دو بندوقیں اور دو تلواریں ہیں۔ میں مرلی دت کی بندوق، تلوار، پستول اور بارود کا تھیلا بھی لا کر آپ کو دے سکتا ہوں۔ لیکن اگر ہم اچانک ان خیموں پر حملہ کر کے پہریداروں کو مغلوب کر لیں تو ہم چند بندوقیں اور تلواریں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ساتھ والی حویلی کے پہریداروں کو مغلوب کرنا ہمارے لیے آسان ہوگا۔"

معظم علی نے جواب دیا: "نہیں! ہمارے لیے دوسری حویلی سے ہتھیار حاصل کرنا زیادہ آسان ہوگا۔ ان کوٹھڑیوں کی چھت زیادہ اونچی نہیں اور ہم بآسانی یہاں سے نکل سکتے ہیں۔ اکبر خاں! سب سے پہلے تمھاری باری ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ!"

کوٹھڑی سے باہر نکل کر معظم علی نے دیوار کے قریب جھکتے ہوئے کہا: "تم میرے کندھے پر سوار ہو کر کھڑے ہو جاؤ۔"

اکبر خان نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ لیکن اس کے ہاتھ چھت کی منڈیر تک نہ پہنچ سکے۔ معظم علی نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس کے گھٹنے پکڑ کر اپنے بازو اوپر اٹھائے اور اکبر منڈیر پکڑ کر چھت پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس کے بعد معظم علی نے اسی طرح ایک اور آدمی کو چھت پر چڑھایا اور پھر باقی تمام آدمیوں کو اسی طریقے پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ آن کی آن میں تمام آدمی چھت پر چڑھ گئے۔ نیچے آخری آدمی معظم علی تھا۔ دو آدمیوں نے اپنی پگڑیوں کا رسا بنا کر نیچے لٹکا دیا۔ معظم علی نے بڑے اطمینان

کے ساتھ کوٹھڑی کا دروازہ بند کیا اور گڑیوں کے سہارے چھت پر چڑھ گیا۔

اس چھت سے آگے دوسری حویلی کے مکانات کی چھتیں قریباً ایک گز نیچی تھیں۔ معظم علی اپنے ساتھیوں کو وہیں رُکنے کا حکم دے کر موسلا دھار بارش میں گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا آگے بڑھا۔ دوسری چھت کی منڈیر کے قریب پہنچ کر اس نے حویلی کے صحن کا جائزہ لیا۔ اس حویلی کا بیشتر حصہ تاریک تھا۔ دائیں ہاتھ کی دیوار کے درمیان ایک کشادہ ڈیوڑھی میں ایک مشعل جل رہی تھی جس کی روشنی میں ڈیوڑھی سے آگے ایک چھپر کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ چھپر کے نیچے چند آدمی کھاٹوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ معظم علی نے دبی زبان میں اپنے ساتھیوں کو آواز دی اور وہ آگے بڑھ کر ایک لمبی قطار میں منڈیر کے پیچھے لیٹ گئے۔ معظم علی نے پہلے اکبر خاں کو نیچے لٹکایا پھر خود منڈیر کے ساتھ لٹک کر اتر گیا۔ تھوڑی دیر میں اس کے تمام ساتھی کسی دقت کے بغیر دوسری حویلی کے صحن میں پہنچ گئے۔

معظم علی نے باقی آدمیوں کو وہیں ٹھہرنے کا حکم دیا اور اکبر خاں کے علاوہ تین اور ساتھیوں کے ہمراہ پانی اور کیچڑ میں احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا حویلی کے روشن حصے کی طرف بڑھا۔ چھپر کے نیچے دو چارپائیوں کے درمیان خالی جگہ میں سے گزر کر یہ لوگ ڈیوڑھی کے اندر داخل ہوئے۔ ڈیوڑھی کے اندر دو آدمی کھاٹوں پر اور سات آدمی فرش پر سو رہے تھے۔ دائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ ایک مشعل جل رہی تھی۔ اور اس کے قریب ہی تیل کی کُپّی پڑی ہوئی تھی۔ بائیں ہاتھ ایک کھاٹ کے سرہانے دیوار کے ساتھ چند بندوقیں اور بارود کی تھیلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ معظم علی نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو ان پر قبضہ کرنے کا حکم دیا۔ وہ فرش پر لیٹے ہوئے آدمیوں سے پاؤں بچاتے ہوئے آگے بڑھے اور بندوقیں اٹھا کر دبے پاؤں باہر نکل آئے۔

معظم علی نے مشعل اٹھائی اور اس پر کُپّی سے تیل ڈالنے کے بعد واپس مڑا۔ ڈیوڑھی سے چھپر میں داخل ہونے کے بعد اس نے دیکھا کہ اس کے دائیں بائیں چھ اور آدمی چارپائیوں پر سو رہے ہیں اور ان چارپائیوں سے آگے دونوں طرف چھپّر کے نیچے گھوڑوں کی کھُرلیاں ہیں۔ معظم علی نے مشعل بلند کر کے ایک ہاتھ سے اشارہ کیا اور آن کی آن میں اس کے ساتھی آگے بڑھ کر ڈیوڑھی

کے سامنے جمع ہو گئے۔ چند آدمی معظم علی کے اشارے پر ڈیوڑھی کے اندر داخل ہو گئے۔ اس عرصہ میں گھوڑے بدحواس ہو کر کھلبلی مچا رہے تھے۔ چھپر کے نیچے لیٹے ہوئے تین آدمی یکے بعد دیگرے ہڑبڑا کر اٹھے۔ لیکن معظم علی کے ساتھیوں نے انھیں بندوقوں کے کندوں سے مار مار کر ڈھیر کر دیا۔ ایک پہریدار نے چیخنے کی کوشش کی لیکن کسی نے اس کا گلا دبا دیا۔ ڈیوڑھی کے اندر اور چھپر کے نیچے باقی پہریدار انتہائی پریشانی اور خوف کی حالت میں ان غیر متوقع حملہ آوروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

معظم علی نے کہا: ”یہ گاؤں ہمارے محاصرہ میں ہے۔ تمھارے لیے اب بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں اگر کسی نے شور مچانے کی کوشش کی تو اسے گولی ماردی جائے گی۔ تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ تم بلاچون وچرا ہمارے حکم کی تعمیل کرو!“

تھوڑی دیر بعد معظم علی کے ساتھی پہریداروں کو ہانک کر غلّے کے ایک گودام میں بند کر چکے تھے۔ معظم علی گودام کا دروازہ بند کر رہا تھا کہ اکبر خاں بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا: ”بھائی جان! حویلی کے پھاٹک میں قفل لگا ہوا ہے، آپ ان سے چابی لے لیں۔“

”چابی کس کے پاس ہے؟“ معظم علی نے پہریداروں سے سوال کیا۔

جب ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو معظم علی نے دوبارہ کہا: ”میں حویلی کی چابی مانگتا ہوں۔ اگر ایک منٹ کے اندر اندر چابی ہمارے حوالہ نہ کی گئی تو اس گودام کو آگ لگا دی جائے گی۔“

ایک آدمی آگے بڑھا اور اس نے کچھ کہے بغیر ایک چابی معظم علی کے ہاتھ میں دے دی۔ معظم علی دروازے کی کنڈی لگانے کے بعد اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ”دو آدمی یہاں دروازے کے پاس کھڑے رہیں اگر یہ لوگ شور مچائیں۔ تو اس حویلی کو آگ لگا دی جائے اور باقی فوراً گھوڑوں پر سوار ہو جائیں!“

حویلی کے صحن میں تین طرف دیواروں کے ساتھ چھپروں کے نیچے کوئی ڈیڑھ سو گھوڑے

بندھے ہوئے تھے۔ گھوڑوں کی کھرلیوں کے اوپر دیوار میں لگی ہوئی کھونٹیوں کے ساتھ گھوڑوں کی لگامیں اور زینیں ٹنگی ہوتی تھیں۔ اپنی ضرورت کے مطابق گھوڑے تیار کرنے کے بعد معظم علی کے ساتھیوں نے باقی تمام گھوڑے کھول کر ڈیوڑھی کے سامنے جمع کیے پھر حویلی کا پھاٹک کھول دیا گیا اور وہ گھوڑوں کا ریوڑ ہانکتے ہوئے باہر نکل آئے۔

گھوڑوں کی ٹاپ سن کر گاؤں کے پہریدار بھاگتے ہوئے اس تنگ گلی میں داخل ہوئے لیکن وہ گھوڑوں کے سموں تلے پس کر رہ گئے۔

چند منٹ بعد جب ساتھ والی حویلی کے محافظ بندوقیں چلا کر اور نقارے بجا کر لوگوں کو خبردار کر رہے تھے۔ معظم علی اور اس کے ساتھی گاؤں سے باہر مرہٹہ فوج کا پڑاؤ عبور کر رہے تھے اور پھر جب پڑاؤ کے سپاہی اپنے خیموں سے باہر نکل کر انتہائی پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ لوگ دو تین میل آگے جا چکے تھے۔

مرلی دت حویلی میں شور سن کر گہری نیند سے بیدار ہوا اور لیٹے لیٹے اپنے سپاہیوں کو آوازیں دینے لگا۔ سپاہی بھاگ کر اس کی چھولداری میں داخل ہوئے تو اس نے پوچھا "کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں جناب!" ایک سپاہی نے جواب دیا۔ "ساتھ والی حویلی سے گھوڑے کھل کر باہر نکل گئے ہیں۔"

"گھوڑے باہر کیسے نکل گئے؟" اس نے برہم ہو کر سوال کیا۔

"پتا نہیں کیسے نکل گئے جناب! حویلی کا دروازہ کھلا ہے اور پہریدار کہیں غائب ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ گھوڑوں کو روکنے کے لیے ان کے پیچھے گئے ہیں۔"

"کتنے گھوڑے بھاگ گئے ہیں؟"

"جناب تمام نکل گئے ہیں وہاں ایک بھی نہیں رہا۔"

مرلی دت بستر سے اٹھا اور سپاہیوں کو دھکے دیتا ہوا باہر نکل کر بولا۔ "تم پاگل ہو۔ تمام گھوڑے خود بخود کیسے بھاگ سکتے ہیں۔"

پھر وہ بھاگتا ہوا حویلی کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ڈیوڑھی کے سامنے اسے مشعل کی روشنی میں چوکی کا محافظ دکھائی دیا۔

"کیا ہوا جناب؟" اس نے ہانپتے ہوئے سوال کیا۔ "گھوڑے خود بخود کیسے نکل گئے؟"

"گھوڑے ڈاکو لے گئے ہیں۔"

"لیکن پہریدار کہاں گئے تھے؟"

"پہریداروں کو ہم نے ایک کوٹھڑی سے نکالا ہے۔ تم اپنے قیدیوں کا خیال رکھو!"

"جناب قیدیوں کی آپ فکر نہ کریں۔ لیکن اتنے گھوڑوں کا نقصان!"

مرلی دت کا ایک سپاہی بھاگتا ہوا آیا اور اس نے دو سپاہیوں کے گم ہو جانے کی اطلاع دی۔

مرلی دت نے سوال کیا۔ "تم نے قیدیوں کی کوٹھڑیاں دیکھی ہیں؟"

"ہاں جناب! وہ تو بند ہیں اور ان میں تالے لگے ہوئے ہیں۔"

ایک دوسرا سپاہی بھاگتا ہوا آیا اور اس نے اطلاع دی "جناب قیدی اندر سے کوئی آواز نہیں دیتے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ پیچھے کی دیوار میں نقب لگا کر دوسری حویلی میں نہ چلے گئے ہوں۔"

مرلی دت نے برہم ہو کر کہا۔ "قیدی ناخنوں سے ڈیڑھ گز چوڑی دیوار نہیں کھود سکتے وہ صرف ہماری پریشانی میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔"

چوکی کے محافظ نے کہا۔ "میں قیدیوں کی کوٹھڑیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد مرلی دت مشعل کی روشنی میں اپنا صندوق خالی دیکھنے کے بعد چلا چلا کر اکبر خاں کو آوازیں دے رہا تھا اور چوکی کا محافظ چند افسروں اور سپاہیوں کے ساتھ اس کے سر پر کھڑا تھا۔

ایک اور پہریدار بھاگتا ہوا چھولداری میں داخل ہوا اور اس نے چلا کر کہا۔ "سرکار غضب

ہوگیا۔ معظم علی کی کوٹھری خالی ہے "۔

"تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ خالی ہے ؟" اس نے سراسیمہ ہوکر سوال کیا۔

"جناب میں نے ٹٹول کر دیکھا تو اس کا تالا غائب تھا۔ صرف کنڈی باہر سے بند تھی میں دروازہ کھول کر اندر گیا تو وہاں کوئی نہ تھا۔"

مرلی دت نے سراپا فریاد بن کر چوکی کے محافظ کی طرف دیکھا اور کہا "سرکار چابیوں کا گچھا غائب ہے۔"

چوکی کے محافظ نے کچھ کہے بغیر مرلی دت کے بستر سے اس کی بانسری اٹھائی اور اسے بے تحاشا پیٹنا شروع کردیا۔



علی وردی خاں، میدنا پور کے سرکاری محل میں مقیم تھا اور اس کی فوج شہر سے باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ ایک صبح وہ محل کے کشادہ کمرے میں بیٹھا اپنے میر منشی کو درخواستوں اور مراسلوں کے جواب لکھوا رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ ایک کرسی پر سراج الدولہ بیٹھا ہوا تھا۔ محل کا داروغہ اندر داخل ہوا اور اس نے ادب سے سلام کرنے کے بعد آگے بڑھ کر ایک مراسلہ پیش کیا۔

علی وردی خاں، میر منشی کو چند جملے لکھوانے کے بعد داروغہ کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے کہا "عالیجاہ! یہ معظم علی کی درخواست ہے اور وہ اسی وقت قدمبوسی کی اجازت چاہتا ہے۔"

"معظم علی کون ہے؟" علی وردی خاں نے مراسلہ کھولتے ہوئے سوال کیا۔

داروغہ نے جواب دیا "عالیجاہ! یہ وہی نوجوان ہے جسے حضور نے سرحدی علاقوں کا محافظ مقرر کیا تھا وہ مدت سے لاپتہ تھا اور اب مرہٹوں کی قید سے فرار ہوکر یہاں پہنچا ہے۔"

علی وردی خاں نے جلدی سے مراسلہ کھول کر پڑھا اور داروغہ کی طرف متوجہ ہوکر کہا

اسے فوراً حاضر کرو!"

داروغہ سلام کر کے باہر نکل گیا۔ اور علی وردی خاں کی نگاہیں دوبارہ مراسلے پر مرکوز ہوگئیں تھوڑی دیر بعد معظم علی کمرے میں داخل ہوا۔ علی وردی خاں نے اٹھ کر اس کے ساتھ گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور سراج الدولہ نے اس کی تقلید کی۔ علی وردی خاں نے کہا "ہم تمھارے متعلق مایوس ہوچکے تھے۔ بیٹھو، اور مجھے اپنی سرگذشت سناؤ!"

معظم علی، علی وردی خاں کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور اس نے مختصراً اپنی سرگزشت بیان کردی۔

اختتام پر علی وردی خاں نے کہا "کاش ہمیں معلوم ہوتا کہ تم میر حبیب کی قید میں ہو۔ تمھاری گرفتاری یقیناً عطاء اللہ خاں کی سازش کا نتیجہ تھی۔ وہ اپنے اعمال کی سزا بھگت رہا ہے ہم اسے ملک بدر کرچکے ہیں۔"

معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا "مجھے یقین ہے کہ میری گرفتاری تنہا عطاء اللہ خاں کی سازش کا نتیجہ نہ تھی اس کے ساتھ اور لوگ بھی شریک تھے۔"

علی وردی خاں نے جواب دیا "سازش درحقیقت ہمارے خلاف تھی اور عطاء اللہ خاں کے جن ساتھیوں پر ہمیں شبہ تھا وہ سب فوج سے نکالے جاچکے ہیں۔ میر جعفر نے ہمیں بتایا تھا کہ ان کے دل میں عطاء اللہ خاں کے متعلق کچھ شکوک پیدا ہوگئے تھے اور انھوں نے تمھیں فوج کی حفاظت کے بغیر سفر کرنے سے منع کیا تھا۔"

"عالیجاہ! انھوں نے مجھے منع ضرور کیا تھا۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ابتدا سے ہی عطاء اللہ خاں کے رازدار نہیں تھے۔"

علی وردی خاں نے قدرے آزردہ ہوکر جواب دیا "اگر وہ عطاء اللہ خاں کے رازدار بن کر ہمیں بروقت اس کے ارادوں سے باخبر نہ کرتے تو اڑیسہ میں ہمیں انتہائی خطرناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا۔ بہرحال اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمھاری گرفتاری کے صحیح اسباب معلوم

کیے جائیں تو یہ مشکل نہیں۔ ہم میر حبیب سے تمام باتیں معلوم کر سکتے ہیں۔ میر حبیب نے ہمارے ساتھ صلح کی درخواست کی ہے اور ہم صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے میر جعفر کی سرکردگی میں ایک وفد اس کے پاس بھیج رہے ہیں۔"

معظم علی نے بدحواس ہو کر سوال کیا: "آپ میر حبیب سے صلح کرنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں! ہم اڑلیسہ پر مرہٹوں کے پے درپے حملوں سے تنگ آ چکے ہیں۔ میر حبیب بعض شرائط پر اڑلیسہ کی حفاظت کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار ہے اس کے ایلچی دوبار ہمارے پاس آ چکے ہیں۔ میر جعفر کا خیال ہے کہ وہ ہماری ملازمت اختیار کرنے پر رضامند ہو جائے گا۔ اگر میر جعفر نے اسے رام کر لیا تو ہم اسے بہت بڑی کامیابی سمجھیں گے۔ مرہٹوں کے ساتھ نپٹنے کے لیے اس سے بہتر آدمی اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تم نہایت وقت پر آتے ہو اور میری خواہش ہے کہ اس کے ساتھ صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے تمھیں بھی میر جعفر کے ہمراہ بھیج دیا جائے۔"

معظم علی کچھ دیر حیرت و استعجاب کے عالم میں علی وردی خاں کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "عالیجاہ! اگر یہ گستاخی نہ ہو تو میں کچھ عرض کروں!"

"کہو!"

"میر حبیب جیسے لوگوں سے ہم کلام ہونے کے لیے ہمیں تلوار کی زبان کی ضرورت ہے۔ میں بھیڑیوں سے بھیڑوں کی حفاظت کا کام لینے کی منطق کا قائل نہیں۔ میں میر حبیب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایک غدار ہے اور ایک غدار پر دوبارہ اعتماد کرنا پرلے درجے کی خود فریبی ہوگی۔ اگر وہ صرف آپ کا دشمن ہوتا تو آپ اس کا ماضی فراموش کرنے میں حق بجانب ہوتے۔ لیکن وہ آپ کی حکومت سے زیادہ بنگال کے باشندوں کی عزت و آزادی اور بقا کا دشمن ہے اور بنگال کا کوئی محبِ وطن اس کا ماضی فراموش کرنے کی غلطی نہیں کرے گا۔

میں آپ کی فوج میں اس لیے شامل ہوا تھا کہ میں اپنے دل میں بنگال کی عزت اور آزادی

کے لیے ایک تڑپ محسوس کرتا تھا۔ میرے ساتھیوں نے آپ کا پرچم بلند رکھنے کے لیے پیش کیا تھا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ آپ کے دشمنوں کو بنگال کا دشمن اور بنگال کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ اب اگر آپ نے اپنا نظریہ بدل لیا ہے تو ایسے لوگوں کو اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑے گا جو اپنے خون کی روشنائی سے قوم کی آزادی کی تاریخ لکھنا چاہتے ہیں۔"

علی وردی خاں نے کہا: "کاش قوم میں تمھارے جیسے چند اور نوجوان ہوتے۔ میں تمھارے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن تمھیں ہماری مجبوریوں کا علم نہیں۔ میں بیک وقت ان ان گنت طالع آزماؤں کے ساتھ کیسے نمٹ سکتا ہوں جن میں سے ہر ایک اپنے آپ کو حکومت کی مسند کا واحد حقدار سمجھتا ہے۔ موجودہ حالات میں میر حبیب کی طرف مصالحت کا ہاتھ بڑھانا میرے لیے ایک مجبوری ہے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "آپ اس لیے مجبور ہیں کہ آپ حکومت کا کاروبار چلانے یا ہنگامی حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے چند طالع آزماؤں کے درمیان توازن قائم رکھنا کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن میں ان جاہ پسندوں میں سے کسی کو بھی قوم کی عزت اور آزادی کا امین نہیں سمجھتا۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ قوم کی اجتماعی قوت مدافعت ہی ہماری بقا اور آزادی کی ضمانت دے سکتی ہے۔ یہ ابن الوقت، یہ غدار اور یہ اقتدار کی مسندوں کے لیے بے حیا دعویدار، عوام کی بے حسی، بزدلی اور مایوسی کی پیداوار ہیں اور میں ان میں سے کسی ایک کے ساتھ سودا کرنے کی بجائے آپ کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ ان کے خلاف قوم کی قوتِ محاسبہ بیدار کریں۔ یہ وہ ناسور ہیں۔ جنھیں کاٹ کر جڑ سے نکالے بغیر ایک صحت مند قوم کی تخلیق ممکن نہیں۔ اور جو حکومت ایک صحت مند قوم کی تخلیق سے قاصر رہتی ہے اس کے لیے گھر کے غدار بیرونی حملہ آوروں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔"

علی وردی خاں نے قدرے تلخ ہو کر کہا: "نوجوان تم اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہو۔ میر حبیب کے خلاف تمھارے غم و غصہ کی وجہ سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں لیکن موجودہ حالات میں

ہمیں اس کی دشمنی کی بجائے اس کی دوستی کی ضرورت ہے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "میر حبیب کی دوستی حاصل کرنے کے لیے آپ کو ایک معمولی سپاہی کی ضرورت نہیں۔ اگر موجودہ حالات مجھے ایک حقیقت پسند انسان بننے سے منع کرتے ہیں تو میرے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ میں اپنی ملازمت سے مستعفی ہو جاؤں اور اس وقت کا انتظار کروں جب ہماری قسمت کے امین دوست اور دشمن میں تمیز کر سکیں۔ اب مجھے اجازت دیجیے!"

معظم علی یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

علی وردی خاں چند ثانیے غصّے — اور غصے سے زیادہ پریشانی اور اضطراب کی حالت میں معظم علی کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "معظم علی! میں اپنی تلوار کا لوہا پہچانتا ہوں، تمہارا استعفا منظور نہیں کیا جائے گا۔ ایک طویل عرصہ مرہٹوں کی قید میں رہنے کے بعد تم چھ ماہ کی رخصت کے حق دار ہو اور مجھے یقین ہے کہ تم اس عرصہ میں یہ سمجھ سکو گے کہ میرا یہ اقدام صحیح تھا۔ مرہٹوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے میر حبیب کو قابو میں لانا ضروری ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

معظم علی باہر نکل گیا اور علی وردی خاں سراج الدولہ کی طرف دیکھنے لگا۔

سراج الدولہ نے کہا: "جہاں پناہ! گستاخ ہونے کے باوجود وہ ایک اچھا سپاہی ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ چھ ماہ کے بعد بھی شاید ہماری فوج میں دوبارہ آنا پسند نہ کرے۔"

علی وردی خاں مسکرایا۔ "وہ محمود علی کا بیٹا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت بھی اگر ہمیں کسی محاذ پر جانا پڑے تو وہ گھر جانے کی بجائے ہماری اگلی صف میں لڑنا پسند کرے گا۔ تم جاؤ اور اسے عزت و احترام کے ساتھ رخصت کرو۔ کسی دن وہ تمہارے ترکش کا بہترین تیر ثابت ہو گا۔"

سراج الدولہ نے کہا: "تو آپ اس سے خفا نہیں ہوئے؟"

علی وردی خاں نے مغموم لہجے میں کہا: "خفا! ایک بوڑھا اپنی لاٹھی سے، ایک سپاہی اپنی تلوار سے، ایک مصنف اپنے قلم سے اور ایک فرمانروا اپنے عصائے حکمرانی سے کیونکر خفا ہو سکتا ہے۔ ہاں مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ جب وہ انتہائی اشتعال کی حالت میں بول رہا تھا تو میں نے آگے بڑھ کر سینے سے کیوں نہ لگا لیا۔ کاش! میرے اسلحہ خانے میں اس قسم کی تلواریں اور بھی ہوتیں اور میں ہر محاذ پر ہر دشمن کو للکار سکتا۔ لیکن جب تمہارا وقت آئے گا تو مجھے یقین ہے کہ بنگال کے حالات اس سے مختلف ہوں گے۔ معظم علی جیسے نوجوانوں کے دل کی دھڑکنوں میں ایک نئی قوم جنم لے گی۔ تم جاؤ اور بخشی سے کہو کہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو قید کے زمانے کی پوری تنخواہ ادا کر دی جائے۔ ہم ایک ہفتہ تک مرشدآباد پہنچ جائیں گے اور وہاں میں یہ کوشش کروں گا کہ اسے تمہاری محافظ فوج کا کماندار مقرر کر دیا جائے۔"

سراج الدولہ کمرے سے نکلا اور محل کے دروازے پر معظم علی سے جا ملا اور اس نے اسے آواز دے کر روکتے ہوئے کہا: "مجھے آپ سے باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا۔"

"فرمایئے!" معظم علی نے کہا۔

سراج الدولہ نے کہا: "میں یہاں سے سیدھا ہگلی جا رہا ہوں اور شاید کچھ عرصہ مرشدآباد نہ آ سکوں۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر آپ مستعفی ہونے کے متعلق اپنا ارادہ تبدیل کر سکیں تو سیدھے میرے پاس آئیں۔ مجھے وہاں اپنی فوج کے لیے قابل اعتماد افسروں کی ضرورت ہے۔"

"آپ مجھے قابل اعتماد سمجھتے ہیں؟" معظم علی نے مسکرا کر سوال کیا۔

سراج الدولہ نے جواب دیا: "اگر میں آپ کو قابل اعتماد نہ سمجھتا تو دوڑتا ہوا آپ کے پیچھے نہ آتا۔ چلیے ہم اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔"

معظم علی اس کے ساتھ محل کے ایک کمرے میں داخل ہوا اور وہ قریباً دو گھنٹے باتیں کرتے رہے۔ رخصت ہوتے وقت سراج الدولہ نے اس کے ساتھ گرمجوشی سے مصافحہ کرتے

دیے کہا: "کیا میں یہ توقع رکھوں کہ چند دنوں یا چند ہفتوں کے بعد آپ میرے پاس پہنچ جائیں گے؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں آپ سے صرف یہ وعدہ کرسکتا ہوں کہ اگر مستقبل ہونے کے متعلق میں نے اپنا ارادہ تبدیل کیا تو کسی اور کے پاس جانے کی بجائے میں سیدھا آپ کے پاس آؤں گا۔"

سراج الدولہ نے کہا: "مجھے یقین ہے کہ آپ کا ارادہ بہت جلد بدل جائے گا۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی بارہ سواروں کے ہمراہ مرشد آباد کا رخ کر رہا تھا۔ اور ان میں سے آٹھ وہ تھے جو معظم علی کے ساتھ قید ہوئے تھے۔ باقی راستے کی مختلف منازل پر اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔

میدنا پور چند گھنٹے قیام کے دوران میں معظم علی اپنے اور مرزا حسین بیگ کے گھر کی خیریت معلوم کرچکا تھا۔ اس کے محلے کا ایک سپاہی اسے یہ بتا چکا تھا کہ اس کا باپ مرشد آباد میں ہے۔ اس کا بھائی یوسف اس کے روپوش ہونے کے بعد عظیم آباد سے مرشد آباد آگیا تھا اور اب میر مدن نے ڈھاکہ کی فوجداری سنبھالنے کے بعد اسے اپنے پاس بلا لیا ہے۔ فضل بیگ مرشد آباد میں ہے۔

مرشد آباد سے میر مدن کی تبدیلی کی خبر اس کے لیے پریشان کن تھی۔ لیکن فوج کے ایک افسر سے تبادلۂ خیالات کے بعد اسے معلوم ہوا تھا کہ میر مدن نے مرشد آباد کے بعض امرا بالخصوص میر جعفر سے شدید اختلافات کے باعث، علی وردی خاں سے یہ درخواست کی تھی کہ اسے ڈھاکہ بھیج دیا جائے۔

آٹھواں باب

آمنہ بالا خانے کے ایک کمرے میں صبح کی نماز کے بعد قرآن پڑھ رہی تھی کہ صابر بھاگتا ہوا زنانہ مکان کے صحن میں داخل ہوا اور پوری طاقت کے ساتھ چلانے لگا۔ "معظم علی آگیا! معظم علی آگیا!"

آمنہ قرآن بند کرکے اٹھی، لیکن اس میں بولنے یا چلنے کی ہمت نہ تھی۔ نیچے خادمہ صابر کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑ رہی تھی۔ "کہاں ہے معظم علی؟ خدا کے لیے بتاؤ وہ کہاں ہے؟" لیکن وہ اس کی طرف توجہ دیے بغیر بالا خانے کی طرف منہ اٹھا کر بدستور چلا رہا تھا۔ "بی بی جی! بی بی جی!! معظم علی آگیا۔ معظم علی آگیا!"

معظم علی، اکبر خاں کے ساتھ صحن میں داخل ہوا اور خادمہ بھاگ کر بالا خانے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ "بی بی جی! معظم علی ... !" اس نے پوری قوت سے چلانے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز حلق میں بیٹھ گئی۔

آمنہ لڑکھڑاتی ہوئی دریچے کی طرف بڑھی۔ معظم علی نے اس کی طرف دیکھا، اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا زینے پر چڑھنے لگا۔ چند ثانیے بعد وہ اپنی ماں کے سامنے کھڑا تھا اور وہ ایک سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"امی جان میں آگیا ہوں!" معظم علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور ماں کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔

"میرا لال۔ میرا بیٹا!" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ معظم علی بے اختیار ماں کے ساتھ لپٹ گیا۔ آمنہ اب بڑی مشکل سے اپنی چیخیں ضبط کر رہی تھی۔

"میرے چاند۔ میرے لال! مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گے۔ میں ہر روز تمھیں خواب میں دیکھا کرتی تھی۔"

"ابا جان کہاں ہیں؟" معظم علی نے سوال کیا۔

"وہ مسجد میں نماز پڑھنے گئے ہیں۔ ابھی آتے ہوں گے۔" یہ کہہ کر آمنہ خادمہ کی طرف متوجہ ہوئی جو دروازے میں کھڑی اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ "تم جلدی سے ناشتہ تیار کرو اور صابر سے کہو ان کے ابا جان کو اطلاع دے دے۔"

"صابر جا چکا ہے۔" خادمہ یہ کہہ کر نیچے چلی گئی۔

ماں اور بیٹا قالین پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ ماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "تم کہاں تھے بیٹا؟"

"امی جان میں مرہٹوں کی قید میں تھا۔" معظم علی یہ کہہ کر اٹھا اور دریچے کے قریب جا کر آواز دی: "اکبر خاں! تم نیچے کیوں کھڑے ہو اوپر آ جاؤ!"

"اکبر خان کون ہے؟" ماں نے سوال کیا۔

معظم علی نے مسکرا کر جواب دیا۔ "امی جان آپ کے لیے ایک اور بیٹا لایا ہوں۔ وہ میرے ساتھ قید تھا اور میں اسی کی وجہ سے رہا ہوا ہوں۔"

اکبر خاں جھجکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اور اس نے معظم علی کی ماں کو سلام کیا۔

آمنہ نے جواب دیا۔ "جیتے رہو بیٹا۔ آؤ بیٹھ جاؤ!"

کوئی دس منٹ بعد نیچے صحن سے محمود علی کی آواز آئی۔ "کہاں ہے معظم علی؟"

معظم علی اٹھ کر بھاگتا ہوا نیچے اترا اور بے اختیار اپنے باپ کے ساتھ لپٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بالا خانے کے اسی کمرے میں بیٹھ کر آنسوؤں میں بھیگی ہوئی مسکراہٹوں کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ معظم علی، ماں اور باپ کے ان گنت سوالات کے جواب میں اپنی سرگذشت سنا رہا تھا۔

صابر نے سیڑھیوں سے آواز دی۔ "مرزا حسین بیگ آئے ہیں۔"

"انھیں اوپر لے آؤ۔" محمود علی نے کہا۔

"ان کے ساتھ اور آدمی بھی ہیں۔" صابر نے جواب دیا۔

"اچھا انھیں دیوانخانے میں بٹھاؤ، ہم آتے ہیں۔"

جب معظم علی اور اس کا باپ نیچے اترنے لگے تو اکبر خاں ان کے پیچھے ہولیا۔ آمنہ نے کہا۔ "تم کہاں جاؤ گے بیٹا! تم یہیں بیٹھو۔ میں تم سے تمام واقعات سننا چاہتی ہوں۔"

مرزا حسین بیگ اور محلے کے دوسرے لوگوں سے ملاقات کرنے کے بعد معظم علی واپس آیا تو اکبر خاں قالین پر پڑا گہری نیند سو رہا تھا۔ خادمہ ناشتا لے کر آئی تو معظم علی، اکبر خاں کو جگانے لگا۔ لیکن ماں نے کہا۔ "بیٹا اسے نہ جگاؤ۔ میں اسے ناشتا کھلا چکی ہوں۔"

محمود علی نے جلدی سے ناشتا کر کے اٹھتے ہوئے کہا: "معظم! مجھے آج دفتر میں چند ضروری کام ہیں۔ میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔ اتنی دیر تم اپنی ماں سے باتیں کرو۔ میں یوسف کو ابھی پیغام بھیجتا ہوں کہ وہ بھی ایک دو دن کی چھٹی لے کر گھر آ جائے۔"

محمود علی کے جانے کے بعد معظم دیر تک اپنی ماں کے مختلف سوالات کے جواب دیتا رہا بالآخر اس نے پوچھا۔ "امی جان! فرحت اور اس کی امی کیسی ہیں؟"

"وہ بہت خوش ہیں بیٹا!" ماں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

"کیا ہوا امی جان؟" معظم علی نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

"کچھ نہیں بیٹا!" ماں نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "تم مرزا صاحب سے مل آئے ہوتا؟"

"ہاں امی جان! لیکن افضل مجھے ابھی تک نہیں ملا۔ مرزا صاحب کہتے تھے وہ کل شکار پر چلا گیا ہے۔ میرا خیال ہے میں چچی جان کو سلام کر آؤں۔"

"ہاں بیٹا ضرور جاؤ۔"

معظم علی نے پوچھا۔ "امی جان فرحت کی امی آپ سے ملا کرتی ہیں نا؟"

"ہاں بیٹا! کبھی میں ان کے یہاں چلی جاتی ہوں اور کبھی وہ ہمارے یہاں آجایا کرتی ہیں۔ پہلے فرحت بھی ان کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ لیکن اب کچھ عرصہ سے وہ گھر سے نہیں نکلتی۔"

"امی جان! کیا بات ہے، آپ مغموم کیوں ہوگئیں؟"

"کچھ نہیں بیٹا!" ماں نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "کاش تم دو مہینے پہلے آجاتے۔"

اور معظم علی انتہائی اضطراب کی حالت میں ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

ماں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "بیٹا! فرحت کی منگنی ہوچکی ہے۔"

ایک ثانیے کے لیے معظم علی نے محسوس کیا کہ کائنات کے نظام میں یکایک ٹھہراؤ آگیا ہے اور زمانے کی ایک ٹھوکر نے اسے امیدوں، آرزوؤں، امنگوں اور ولولوں کے حسین اور سدا بہار نخلستانوں سے نکال کر ایک بے آب و گیاہ صحرا کی بھیانک وسعتوں میں پھینک دیا ہے۔

"فرحت کی منگنی ہوچکی ہے۔" یہ چند الفاظ معظم کے لیے حال اور مستقبل کی اس داستان کا عنوان تھے جو نغموں، مسکراہٹوں اور قہقہوں سے خالی تھی۔ وہ رنگین سپنوں، دلفریب نظاروں اور دلکش نغموں کی حسین وادیوں سے نکل کر ایک ایسی دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ جس کی صبحیں سورج کی ضیاء پاشیوں سے اور جس کی راتیں ستاروں کی مسکراہٹوں اور چاند کے قہقہوں سے محروم تھیں۔

اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن ماں کے لیے یہ مسکراہٹ ہزاروں آنسوؤں سے زیادہ دردناک تھی۔ معظم علی نے سنبھل کر کہا۔ "امی جان آپ فرحت کی منگنی پر خوش نہیں ہیں؟"

اور ماں نے جواب دینے کی بجائے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"بیٹا!" اس نے اس کے چہرے پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "مرزا حسین بیگ کو تمھارا بہت خیال تھا۔ لڑکے والے کئی بار ان کے یہاں آئے۔ لیکن وہ ہر بار انکار کرتے رہے پھر جب وہ تمھارے متعلق مایوس ہوگئے تو انھوں نے ہاں کردی۔ اس بات کو ایک مہینہ ہوا ہے۔ میں منگنی کے دن ان کے ہاں گئی تھی۔ شہر کے امراء کی بیویاں وہاں جمع تھیں۔ میں نے جب فرحت کی ماں کو مبارک باد دی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے کہا: بہن خدا کو منظور نہ تھا۔ ورنہ مرزا صاحب یہ فیصلہ کر چکے تھے، کہ فرحت آپ کی ہے۔ اب آپ میری بیٹی کے لیے دعا کریں۔" اس کے بعد جب میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو میں یہ محسوس کر رہی تھی کہ فرحت میری بیٹی ہے اور وہ نوجوان جس کے ساتھ اس کی منگنی ہو رہی ہے، صرف عابدہ کا ہی نہیں بلکہ میرا بھی داماد ہے۔"

جس وقت ماں بیٹے آپس میں یہ باتیں کر رہے تھے۔ فرحت اپنے مکان کے ایک کمرے میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی ایک بے تکلف سہیلی جس کا نام ناصرہ تھا، کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے دبے پاؤں فرحت کے پیچھے جا کر دونوں ہاتھوں سے اس کی آنکھیں بند کرلیں اور کہا: "بھلا بتاؤ میں کون ہوں؟"

"چھوڑو ناصرہ مجھے تنگ نہ کرو۔" فرحت نے مغموم آواز میں جواب دیا۔

"غلط! بالکل غلط!!" ناصرہ نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "میں ناصرہ نہیں ہوں میں معظم علی ہوں۔ سنتی ہو میرا نام معظم علی ہے!"

"ناصرہ خدا کے لیے مجھے تنگ نہ کرو۔" اس نے انتہائی مغموم لہجے میں کہا۔

ناصرہ قدرے نادم سی ہو کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ فرحت کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز دیکھ

کر اس نے کہا: فرحت تمھیں پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ تمھارے ابا جان اب اپنا خیال بدل دیں گے۔"

"ناصر خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کہو۔ میں ابا جان کو سارے ملک میں رسوا کرنے کی بجائے اس مکان کی چھت سے چھلانگ لگا دینا آسان سمجھتی ہوں۔"

"لیکن معظم علی آگیا ہے۔ اب حالات بدل چکے ہیں۔"

فرحت نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا "معظم علی آگیا ہے لیکن فرحت اس کے لیے مر چکی ہے۔ فرحت اس دن مر گئی تھی جس دن اس نے منگنی کا جوڑا پہنا تھا اور اب میرے والدین مجھے معظم علی کے لیے قبر سے نکالنے کی کوشش نہیں کریں گے۔"

○

معظم علی کے دل میں تنہائی اور بے کسی کا احساس بڑھتا گیا۔ گھر سے باہر مرشد آباد کی گلیاں اسے اداس نظر آتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ حسین بیگ کے پاس جاتا۔ حسین بیگ اس کے ساتھ انتہائی شفقت سے پیش آتا۔ اس کے ساتھ افضل کا برتاؤ بھی نہایت دوستانہ تھا۔ لیکن معظم علی ہر ملاقات کے بعد اپنے دل پر ایک بوجھ محسوس کرتا ہوا گھر واپس آتا۔ پانچ دن بعد یوسف علی آیا اور دو دن گھر رہ کر واپس چلا گیا۔

قید سے رہا ہونے کے بعد اس نے اکبر خان سے وعدہ کیا تھا کہ مرشد آباد پہنچتے ہی میں تمھیں روہیلکھنڈ پہنچانے کا انتظام کر دوں گا۔ اور اکبر خاں نے جب دس دن اس کے گھر ٹھہرنے کے بعد اپنے وطن جانے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے کہا: "اکبر خاں تمھیں پریشان نہیں ہونا چاہیئے میں خود تمھارے ساتھ جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔"

اکبر خاں کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور اس نے کہا: "بھائی جان! اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو میں چند ہفتے اور یہاں ٹھہر سکتا ہوں۔"

چوتھے روز علی الصباح معظم علی، اکبر خاں کے ساتھ روانہ ہوا۔ چند دن سفر کرنے کے

بعد وہ اودھ کی سرحد سے دس میل دور روہیلکھنڈ کے چرواہوں اور کسانوں کی چند بستیاں عبور کرنے کے بعد ایک ٹیلے پر گھوڑے روک کر اپنے سامنے ایک سرسبز و شاداب وادی دیکھ رہے تھے۔ اکبر خاں نے ایک طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا: "وہ میرا گاؤں ہے!"

پھر وہ ٹیلے سے اتر کر کچھ دیر ایک گھنے جنگل سے گزرنے کے بعد گندم کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں داخل ہوئے اور اکبر خاں نے کہا: "یہ ہماری زمین ہے!"

تھوڑی دیر بعد وہ گاؤں میں داخل ہوئے اور آن کی آن میں گاؤں کی خاموش گلیاں "اکبر خاں آگیا۔ اکبر خاں آگیا" کے نعروں سے گونج اٹھیں۔ بچے، بوڑھے اور جوان ان کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ گھوڑوں سے اتر پڑے۔ گاؤں کا ہر شخص اکبر خاں کو دیکھنے، اس سے بغلگیر ہونے اور اس سے باتیں کرنے کے لیے بیقرار تھا۔

تھوڑی دیر بعد یہ ہجوم ایک قلعہ نما مکان کے سامنے رکا اور اکبر خاں نے معظم علی سے کہا۔ "بھائی جان! یہ ہمارا گھر ہے۔"

ایک خوش وضع نوجوان دروازے سے نمودار ہوا اور لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتے ہوئے آگے بڑھ کر اکبر خاں سے لپٹ گیا۔ یہ اکبر خاں کا بڑا بھائی اطہر خاں تھا۔

چند دن بعد معظم علی اس علاقے کے کسی آدمی کے لیے اجنبی نہ تھا۔ اکبر خاں کے قبیلے کا ہر بچہ بوڑھا اسے اپنا محسن خیال کرتا تھا۔ اطہر خاں جو اپنے باپ کی موت کے بعد قبیلے کا سردار تھا، معظم علی کا بے تکلف دوست بن گیا تھا۔

یہ گاؤں اور اس کے اردگرد دس اور بستیاں، بنگش افغانوں کے لوگوں سے آباد تھیں اور وہ سب اکبر خاں کے خاندان کی سرداری تسلیم کرتے تھے۔ روہیلکھنڈ کے دوسرے افغانوں کی طرح یہ لوگ اچھے کاشت کار اور چرواہے ہونے کے علاوہ بہترین سپاہیانہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ بیرونی حملہ آوروں، بالخصوص مرہٹوں کی لوٹ مار سے بچنے کے لیے ہر روہیلہ نوجوان نشانہ بازی، تیغ زنی اور شہسواری میں کمال حاصل کرنا اپنا فرض خیال کرتا تھا۔ جب ہندوستان کے باقی علاقوں کو بے حیا سیاسی شاطروں اور حریص قسمت آزماؤں نے نکبت و افلاس کے

جہنم میں جھونک دیا تھا۔ یہ لوگ اپنی محنت و مشقت سے فراغت اور خوشحالی کی ایک نئی دنیا تعمیر کرنے میں مصروف تھے اور جب بڑے بڑے صوبوں کے عیش پرست حکمرانوں کی افواج اپنی رعایا کو مرہٹوں کی لوٹ مار سے بچانے سے قاصر تھیں، یہ لوگ اپنی آزادی کی حفاظت کرنے کے لیے متحد اور منظم ہو رہے تھے۔

معظم علی زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ ٹھہرنے کی نیت سے آیا تھا، لیکن اس نے تین مہینے یہاں گذار دیئے۔ ابتدا میں کبھی کبھی وہ اطہر خاں اور اکبر کے ساتھ شیر کا شکار کھیلنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ جب شکار سے اس کا جی بھر گیا تو گاؤں کے لوگوں کے ساتھ تیراندازی، نیزہ بازی اور تیغ زنی کے مقابلوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔

تین ماہ بعد جب وہ اطہر خاں اور اکبر خاں کو خدا حافظ کہہ رہا تھا تو اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے عزیز ترین دوستوں اور ساتھیوں سے جدا ہو رہا ہے۔ اطہر، اکبر اور علاقے کے چند اور آدمی اودھ کی سرحد تک اسے چھوڑنے کے لیے آئے۔ اکبر خاں کے ساتھ جب وہ مصافحہ کر رہا تھا تو اس نے آبدیدہ ہو کر کہا: "بھائی جان، آپ پھر کب آئیں گے؟"

"مجھے معلوم نہیں، اکبر خاں! ہو سکتا ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے تمھارے پاس آجاؤں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آج کے بعد ہم اس زندگی میں ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں۔"

اکبر خاں سے رخصت ہو کر معظم علی نے آگرہ اور دلی کا رخ کیا۔ دلی سے واپسی پر کچھ عرصہ لکھنؤ ٹھہرا اور بالآخر اپنے ساتھ مسلمانوں کی زبوں حالی کی دلخراش داستانیں لیے گھر پہنچا۔



گھر میں معظم علی کو سکون نصیب نہ ہوا۔ کچھ عرصہ وہ بیکاری کے لمحات کتابیں پڑھنے میں صرف کرتا رہا، لیکن چند ہفتوں کے بعد اس کی طبیعت کتابوں سے بھی اچاٹ ہو گئی۔ ایک دن اس کا بھائی یوسف علی رخصت پر گھر آیا اور ایک ہفتہ رہ کر واپس چلا گیا۔ جب معظم علی

کے رخصت کے دن ختم ہونے کے قریب آرہے تھے تو اس نے چند بار استعفا لکھنے کا ارادہ کیا لیکن جب وہ کاغذ قلم لے کر بیٹھتا تو اس کی قوتِ فیصلہ جواب دے جاتی۔

ایک دن اسے معلوم ہوا کہ سراج الدولہ مرشد آباد آیا ہوا ہے۔ وہ اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سراج الدولہ نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا: "کہیے اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں چند دنوں سے ہگلی پہنچنے کا ارادہ کر رہا تھا۔"

سراج الدولہ نے کہا: "میری یہ خواہش ہے کہ ہگلی کے قلعے کی کمان آپ کے سپرد کر دی جائے میں ایک ہفتہ تک واپس جا رہا ہوں۔ اس لیے آپ تیار رہیں۔"

معظم علی نے جواب دیا: "اگر ہگلی کے قلعے کے لیے آپ میری ضرورت محسوس کرتے ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ میں ایک ہفتہ انتظار کرنے کی بجائے کل ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔"

"بہت اچھا! شام تک آپ کے پاس میرا حکم نامہ پہنچ جائے گا۔"

اگلے دن علی الصباح معظم علی ہگلی کا رخ کر رہا تھا اور چند دن بعد ہگلی کے قلعے کے آرام طلب سپاہی اور افسر ایک دوسرے سے شکایت کر رہے تھے کہ نیا کماندار ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔

معظم علی ایک سال بعد چند دن کی رخصت لے کر گھر آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اگلے مہینے فرحت کی شادی ہونے والی ہے۔ اس کے والدین اور مرزا حسین بیگ کی یہ خواہش تھی کہ وہ شادی کی تاریخ تک واپس نہ جائے۔ چنانچہ اس نے سراج الدولہ کو لکھا کہ مجھے تین ہفتے اور مرشد آباد ٹھہرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن اس خط کا جواب آنے سے پہلے اڑیسہ میں ایک نئے انقلاب کی خبر آگئی اور وہ یہ تھی کہ مرہٹوں نے اچانک حملہ کر کے میر حبیب کو، جسے علی وردی خاں نے مرہٹوں سے مصالحت کی خاطر کٹک کا فوجدار تسلیم کیا تھا، قتل کر دیا ہے اور ان کی افواج اڑیسہ کے بیشتر اضلاع پر قابض ہو چکی ہیں۔

معظم علی کو اپنے باپ کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ علی وردی خاں نے مرشد آباد کی فوج کو کوچ کی تیاری کا حکم دیا ہے اور ڈھاکہ اور ہگلی کے فوجداروں کو یہ فرمان بھیجا ہے کہ وہ کسی تاخیر کے بغیر اپنی

افواج لے کر اڑیسہ کے محاذ پر پہنچ جائیں۔ معظم علی نے کسی توقف کے بغیر ہگلی کا رخ کیا۔

دو ہفتوں کے بعد ہگلی اور مرشد آباد کی فوج کٹک سے چند منزل دور پڑاؤ ڈال کر ڈھاکہ سے میر مدن کے لشکر کی آمد کا انتظار کر رہی تھیں۔ محمود علی اور افضل بیگ مرشد آباد کی فوج کے ساتھ آئے تھے۔ پانچ دن بعد میر مدن بھی پانچ ہزار سواروں کے ساتھ پہنچ گیا۔ جب میر مدن کی فوج پڑاؤ میں داخل ہوئی تو فوج کے بڑے بڑے افسر اس کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ میر مدن نے گھوڑے سے اتر کر یکے بعد دیگرے ان کے ساتھ مصافحہ کیا۔ جب معظم علی کی باری آئی تو اس نے کہا۔ "معظم علی! تمھیں دیکھ کر میری ساری تھکاوٹ دور ہوگئی ہے۔ میں سراج الدولہ سے ملنے کے بعد تمھارے ساتھ اطمینان سے باتیں کروں گا۔"

میر مدن ایک افسر کی رہنمائی میں سراج الدولہ کے خیمے کی طرف بڑھا اور افضل نے جو چند قدم دور کھڑا تھا معظم علی کو آواز دی۔ "معظم علی! تمھارے بھائی جان بھی آگئے ہیں۔"

"کہاں ہیں وہ؟" معظم علی نے آگے بڑھ کر سوال کیا۔

"وہ دیکھو۔" افضل نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یوسف علی کوئی تیس قدم دور لشکر کے چند آدمیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ معظم علی اور افضل تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھے۔ یوسف علی نے ان کے ساتھ یکے بعد دیگرے مصافحہ کیا۔ اچانک افضل کو معظم علی کے پیچھے ایک اور نوجوان دکھائی دیا جو اپنے گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔

افضل نے آگے بڑھ کر اس کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔ "آپ یہاں کیسے آئے؟"

"میں ڈھاکہ کی فوج کے ساتھ آیا ہوں۔" نوجوان نے جواب دیا۔

افضل نے کہا۔ "مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ آپ فوج میں شامل ہو چکے ہیں۔"

نوجوان نے قدرے آزردہ ہو کر جواب دیا۔ "اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ میں

اپنے ساتھ دو سو رضاکار بھی لایا ہوں۔"

معظم علی نے دبی زبان میں یوسف سے پوچھا۔ "بھائی جان یہ کون ہیں؟"

"یہ شوکت بیگ ہیں۔ جن کی افضل کی ہمشیرہ کے ساتھ شادی ہونے والی ہے۔"

افضل نے شوکت بیگ کو معظم علی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ معظم علی ہیں، یوسف علی کے چھوٹے بھائی۔"

شوکت بیگ نے آگے بڑھ کر معظم علی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا نام شوکت بیگ ہے۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میں آپ کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں۔"

شوکت بیگ کھلتے ہوئے رنگ کا ایک قوی الجثہ نوجوان تھا اور چہرے سے اس کی عمر کوئی پچیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی، محمود علی، یوسف، افضل اور مرزا شوکت بیگ ایک خیمے میں بیٹھے بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ اب تک معظم علی کو صرف اتنا معلوم تھا کہ شوکت بیگ ڈھاکہ کے ایک بہت بڑے زمیندار کا لڑکا ہے اور میر مدن کی فوج کے ساتھ اس کی آمد اس کے لیے ایک غیر متوقع بات تھی۔ لیکن یوسف علی سے استفسار پر اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنی ذاتی فوج کے دو سو سپاہیوں کے ساتھ ایک رضاکار کی حیثیت میں میر مدن کے ساتھ آیا ہے۔ معظم علی کے نزدیک اس کا یہ جذبہ قابل قدر تھا اور اس نے شوکت بیگ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "مرزا صاحب! آپ بنگال کے اُمراء کے لیے ایک بہت اچھی مثال پیش کر رہے ہیں۔ ورنہ اب تو حالت یہ ہے کہ بڑے بڑے لوگوں میں اجتماعی خطرات کا احساس تک باقی نہیں رہا۔"

شوکت بیگ نے جواب دیا۔ "اجتماعی خطرے کا مجھے بھی کچھ زیادہ احساس نہیں تھا۔ میں نے صرف آپ کی تقلید کی ہے۔ جب مرشد آباد پر حملہ ہوا تھا اور میں نے یہ سنا تھا کہ آپ نے اپنے محلے کے چند رضاکاروں کے ساتھ مرہٹوں کی ایک منظم فوج کے دانت کھٹے کر دیئے

تھے، تو میرے دل میں بھی اپنے مزارعین کو فوجی تربیت دینے کا خیال پیدا ہوا۔ پھر ایک دفعہ جب مرزا حسین بیگ ہمارے یہاں تشریف لائے اور انھوں نے آپ کے شاندار کارنامے کی بے حد تعریف کرنے کے بعد مجھے بھی تبلیغ کی تو میرا خیال پختہ ہوگیا۔ ہمارا گھر ڈھاکے سے پندرہ میل دور ہے۔ مرزا صاحب اپنے خطوط میں بار بار یہ تاکید کیا کرتے تھے کہ ہمارے مکان کے گرد ایک مضبوط فصیل اور ایک گہری خندق کا ہونا ضروری ہے اور میں نے اپنی سمجھ کے مطابق مرزا صاحب کی ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب میرا ارادہ ہے کہ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو چند دن کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میرے خاندان کے لوگ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

رات کے وقت جب معظم علی کو تنہائی میں اپنے بھائی یوسف کے ساتھ باتیں کرنے کا موقع ملا تو اس نے پوچھا "بھائی جان! مجھے تو مرشد آباد میں یہ معلوم ہوا تھا کہ اگلے مہینے فرحت کی شادی ہونے والی ہے؟"

یوسف نے جواب دیا "فرحت کی شادی اس مہم کے اختتام تک کے لیے ملتوی کردی گئی ہے۔ مرزا حسین بیگ نے اڑلیسہ کے حالات کی اطلاع ملتے ہی شوکت بیگ کے والد کو لکھا تھا کہ افضل فوج کے ساتھ اڑلیسہ کی مہم پر جا رہا ہے۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ جب تک ملک کے حالات ٹھیک نہیں ہو جاتے فرحت کی شادی ملتوی کردی جائے۔ شوکت بیگ غالباً مرزا صاحب کو خوش کرنے کے لیے کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دینا چاہتا ہے۔ یہ میر مدن کے ساتھ آگیا ہے۔"

معظم علی نے سوال کیا "آپ اس سے کب متعارف ہوئے؟"

"اس نے خود ہی ڈھاکہ میں تلاش کیا تھا۔ ایک دن یہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا مجھے مرزا حسین بیگ نے لکھا ہے کہ میں آپ سے ملوں۔ شوکت بیگ اچھا آدمی ہے۔ ایک دن یہ مجھے اپنے گھر بھی لے گیا تھا۔ ان کا خاندان بہت بااثر ہے اور میر مدن کے ساتھ اس

کے والد کے نہایت دوستانہ تعلقات ہیں۔"



چند ہفتے بنگال اور مرہٹہ افواج کے درمیان معمولی جھڑپیں ہوتیں رہیں، پھر مرہٹہ سپہ سالار جانوجی نے ایک شدید حملہ کے بعد بنگال کی فوج کو میدنا پور کی طرف ہٹنے پر مجبور کردیا۔ بنگال کی فوج اب میدناپور کو اپنا مستقر بنا کر اڑلیسہ کی شمالی سرحد کے آس پاس مرہٹوں کے اکا دکا حملے روکنے پر اکتفا کر رہی تھی اور اس کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے تیاریاں بھی کر رہی تھی۔ پھر اچانک ایک دن یہ اطلاع آئی کہ مرہٹوں کے ساتھ بعض افغان سرداروں کے سازباز کے باعث بہار کے لیے خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ اس لیے علی وردی خاں نے مرہٹہ سپہ سالار جانوجی کے ساتھ جنگ جاری رکھنے کا ارادہ ترک کر کے لشکر کو واپس بلالیا۔ فوج کا کوئی سپاہی یا افسر اڑلیسہ کا صوبہ اس طرح جانوجی کے حوالے کردینے پر خوش نہ تھا۔ لیکن شوکت بیگ کے لیے یہ خبر انتہائی ناقابل برداشت تھی۔ میر مدن نے اسے شروع سے چند جنگی قیدیوں کی نگرانی سونپ رکھی تھی اور اسے انتہائی کوشش کے باوجود کسی معمولی لڑائی میں بھی اپنے سپاہیانہ جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ لشکر کی واپسی کی خبر سنتے ہی انتہائی غم و غصہ کی حالت میں میر مدن کے خیمے میں داخل ہوا اور اس پر برس پڑا "میر صاحب میں یہاں مکھیاں مارنے نہیں آیا تھا۔ میرے آدمی گھر جا کر میرا مذاق اڑائیں گے۔"

میر مدن مسکرایا "میرے خیال میں تمھیں ایک اہم ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ کوئی سالار اشد ضرورت کے بغیر ناتجربہ کار رضاکار کو کسی مہم پر نہیں بھیج سکتا اور تمھیں معلوم ہے کہ مرہٹوں کے ساتھ اکا دکا جھڑپوں میں ہم نے صرف نہایت آزمودہ کار دستے بھیجے تھے۔ اگر باقاعدہ جنگ شروع ہو جاتی تو تمھیں یقیناً اپنے جوہر دکھانے کا موقع دیا جاتا۔"

معظم علی خیمے میں داخل ہوا اور اس نے کہا "آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

"ہاں۔ مجھے تازہ اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ نواب صاحب بہار کے مخدوش

حالات کے پیشِ نظر اڑلیسہ کے متعلق جانوجی کے ساتھ تصفیہ کرچکے ہیں۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ مرہٹے کسی معاہدے پر قائم نہیں رہیں گے۔ بہار کے جنوب مغربی علاقوں کو ان کی دست درازی سے محفوظ رکھنے کے لیے سراج الدولہ کی نگاہِ انتخاب تم پر پڑی ہے۔ اب اڑلیسہ کی بجائے بہار کی جنوب مغربی سرحد کا آخری قلعہ تمھارا مستقر ہوگا۔ وہاں اس وقت تک اطراف کی کئی بستیاں مرہٹہ لٹیروں کے ہاتھوں تباہ ہوچکی ہیں۔"

شوکت بیگ نے کہا۔ "میر صاحب! میں اس مہم میں معظم علی کا ساتھ دوں گا!"

میر مدن نے جواب دیا۔ "نہیں، میں ایک رضاکار کو ایسی خطرناک مہم پر نہیں بھیج سکتا۔"

شوکت بیگ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں آپ کے سامنے حلف اٹھاتا ہوں کہ جب تک معظم علی اس مہم سے فارغ ہوکر گھر نہیں جاتا میں اس کے ساتھ رہوں گا۔"

معظم علی نے کہا۔ "میں آپ کی ضد کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ اگر جانوجی کے ساتھ کوئی مصالحت ہوچکی ہے تو اس علاقے میں کسی باقاعدہ جنگ کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ جنگل میں بکھرے ہوئے لٹیروں اور رہزنوں سے نپٹنے کے لیے ہمیں انتہائی تجربہ کار سپاہیوں کی ضرورت پڑے گی۔ میں آپ کی بہادری کا اعتراف کرتا ہوں۔ لیکن اس مقصد کے لیے ہمیں ناتجربہ کار رضاکاروں کی ضرورت نہیں۔ آپ کو اب گھر جانا چاہیئے اور مجھے یقین ہے کہ آپ جنگلوں میں ہمارے ساتھ وقت ضائع کرنے کی بجائے وہاں بنگال کے لیے زیادہ کام کرسکتے ہیں۔"

شوکت بیگ نے قدرے برہم ہوکر کہا۔ "میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ میری جان کو اس قدر قیمتی سمجھتے ہیں۔ لیکن میں دشمن کے ساتھ لڑنے کی نیت سے آیا ہوں!" پھر وہ میر مدن کی طرف متوجہ ہوا۔ "میرا خیال ہے کہ ایک رضاکار کی حیثیت میں مرہٹوں سے لڑنے کے لیے مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ معظم علی مجھے اپنا ساتھی بنانے سے انکار کرسکتے ہیں، لیکن مجھے کسی جنگل میں مرہٹوں کا پیچھا کرنے سے نہیں روک سکتے۔ میں واپس نہیں جاؤں گا۔ آخر آپ میری جان ان سپاہیوں سے زیادہ قیمتی کیوں سمجھتے ہیں جو جنگ میں شہید ہوچکے ہیں؟"

میر مدن نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "اگر تمھارا یہی فیصلہ ہے تو میں منع نہیں کرتا۔ معظم علی اسے اپنے ساتھ لے جاؤ!"

معظم علی نے جواب دیا۔ "بہت اچھا۔ لیکن میں نے فوجی تربیت آپ سے حاصل کی ہے اور میرے افسر اور سپاہی اکثر شاکی رہتے ہیں کہ میں نظم و ضبط کے معاملے میں بہت سخت ہوں۔ اس لیے جب تک یہ میری کمان میں ہیں انھیں یہ امید نہیں رکھنی چاہیئے کہ انھیں کسی ترجیحی سلوک کا مستحق سمجھا جائے گا۔"

میر مدن نے شوکت بیگ کی طرف دیکھا اور وہ بولا۔ "جناب میں جانتا ہوں کہ میں سیر و سیاحت کے لیے نہیں آیا۔"

تھوڑی دیر بعد جب محمود علی، یوسف اور افضل کو شوکت بیگ کے ارادے کا علم ہوا تو انھوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے ارادے پر قائم رہا۔

اگلے روز علی الصباح دو ہزار سوار معظم علی کی قیادت میں کوچ کے لیے تیار کھڑے تھے اور محمود علی اپنے بیٹے سے کہہ رہا تھا۔ "معظم! شوکت بیگ کا خیال رکھنا۔ اگر خدانخواستہ اسے کوئی حادثہ پیش آگیا تو ہم مرزا حسین بیگ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"



چند ماہ بعد معظم علی پھر ایک دور افتادہ قلعے میں مقیم تھا۔ اس عرصہ میں دشمن کے ساتھ اس کی کئی جھڑپیں ہوچکی تھیں۔ لیکن دور دور تک پھیلے ہوئے جنگلوں اور پہاڑوں میں مرہٹے ایک جگہ سے مار کھا کر بھاگتے تو دوسری جگہ کسی دوسری بستی پر حملہ کردیتے۔ معظم علی اپنی فوج کے باقاعدہ سپاہیوں اور افسروں سے کام لینا جانتا تھا، لیکن شوکت بیگ اور اس کے رضاکار ساتھیوں کی رفاقت اس کے لیے ایک مسئلہ تھی۔ وہ انھیں قلعے کی محافظ فوج کے ساتھ رکھنا چاہتا تھا لیکن شوکت بیگ ہر خطرناک مہم میں اس کا ساتھ دینے پر اصرار کیا کرتا تھا۔

معظم علی نے کہا: "اس لڑائی میں تمھاری کارگزاری دیکھنے کے بعد اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ تم ایک اچھے سپاہی بن سکتے ہو تو میں آج ہی تمھیں واپس بھیج دیتا۔"

اس واقعہ سے چند ماہ بعد معظم علی کو قلعے کے جنوب میں تیس میل دور مرہٹوں کے ایک لشکر کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی اور اس نے اپنی دو تہائی فوج قلعے میں چھوڑ کر باقی سپاہیوں کے ساتھ پیش قدمی کی۔ آٹھ دن بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو سو قیدی تھے۔ فوج کا ایک افسر اسے قلعے کے دروازے پر ملا اور اس نے مغموم لہجے میں کہا: "جناب مرزا شوکت بیگ زخمی ہیں اور ان کی حالت بہت خراب ہے۔"

معظم علی نے گھوڑے سے اترتے ہی اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی: "کہاں ہیں وہ — وہ زخمی کیسے ہوئے — ؟ جواب کیوں نہیں دیتے — ؟ میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟"

افسر نے جواب دیا: "وہ اپنے کمرے میں پڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ہمارا کہا نہیں مانا۔ کل ہمیں شمال کی طرف چند بستیوں میں مرہٹوں کے لوٹ مار کی اطلاع ملی تھی۔ نائب کمانڈار نے اسی وقت دو سو سوار روانہ کر دیئے۔ مرزا شوکت بیگ اس مہم میں حصہ لینے پر مصر تھے۔ ہم نے انھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔"

"تم سب بیوقوف ہو۔"

معظم علی یہ کہہ کر بھاگتا ہوا قلعے کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ شوکت بیگ بستر پر لیٹا کراہ رہا تھا۔ اس کے سینے، گردن اور بازوؤں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ فوجی طبیب کے علاوہ چند افسر اس کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور چند سپاہی کھڑے تھے۔ معظم علی نے کمرے میں داخل ہو کر شوکت بیگ کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر طبیب کی طرف متوجہ ہو کر سوال کیا: "زخم زیادہ شدید تو نہیں؟"

طبیب نے جواب دیا: "بہت شدید ہیں۔"

معظم علی نے انتہائی کرب کی حالت میں اپنے سالاروں کی طرف دیکھا اور کہا: "میں

ایک روز آدھی رات کے وقت معظم علی کو قلعے سے بیس میل دور دشمن کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی اور اس نے اسی وقت پانچ سو سواروں کو تیاری کا حکم دیا۔ شوکت بیگ نے حسب معمول ساتھ جانے پر اصرار کیا اور اس دفعہ وہ انکار نہ کر سکا۔ اس مہم میں معظم علی کو یہ احساس ہوا کہ یہ سادہ دل نوجوان حماقت کی حد تک بہادر ہے۔ اس لڑائی میں شوکت بیگ یہ ثابت کر چکا تھا کہ گولیوں کی بارش میں بھی وہ سینہ تان کر کھڑا ہو سکتا ہے اور پھر جب دشمن کے سپاہی شکست کھا کر جنگل میں بھاگ رہے تھے تو وہ معظم علی کے احکام کا انتظار کیے بغیر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ جن سپاہیوں نے اسے جنگلوں اور پہاڑوں میں گھوڑا دوڑاتے دیکھا تھا وہ شام کے وقت معظم علی سے یہ کہہ رہے تھے: "یہ محض اتفاق ہے کہ یہ نوجوان زندہ واپس آگیا ہے۔"

جب شوکت بیگ کئی میل مرہٹوں کا تعاقب کرنے کے بعد واپس آیا تو اس نے معظم علی سے کہا: "میں نے سات آدمی اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتارے ہیں لیکن افسوس کہ میرا گھوڑا تھک گیا تھا۔"

معظم علی نے کہا: "دیکھو شوکت! مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ تم بہادر ہو لیکن تم بلاوجہ اپنی جان خطرے میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہو۔ آئندہ تم نے ایسی حرکت کی تو مجھے مجبوراً تمھیں قلعے میں بند رکھنا پڑے گا۔ تمھارے آٹھ آدمی بلاوجہ مارے گئے ہیں۔"

شوکت نے جواب دیا: "لیکن ان آٹھ آدمیوں میں سے ہر ایک کم از کم دو مرہٹوں کو ساتھ لے کر مرا ہے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "اگر وہ آٹھ آدمی زندہ رہتے تو یقیناً اس سے بہتر نتائج پیدا کر سکتے تھے۔"

شوکت بیگ نے کہا: "یہ میری پہلی لڑائی تھی۔ لیکن آئندہ کے لیے میں محتاط رہنے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

نے حکم دیا تھا کہ ہر قیمت پر ان کی حفاظت کی جائے اور اب میں یہ پوچھتا ہوں کہ یہ تم میں سے کس کی غفلت کا نتیجہ ہے؟"

ایک سالار نے جواب دیا۔ "ہم سب نے انھیں روکنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ پھر میں احتیاطاً ڈیڑھ سو سپاہی لے کر ان کے پیچھے گیا تھا۔ مرہٹے ہمیں دیکھتے ہی بھاگ نکلے۔ ہم نے کوئی پانچ میل ان کا تعاقب کیا اس کے بعد جنگل زیادہ گنجان تھا اور میں نے سپاہیوں کو واپسی کا حکم دیا۔ لیکن یہ مرہٹوں کا پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ میں مجبوراً ان کے پیچھے پیچھے چلتا گیا اور چیخ چیخ کر انھیں روکنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے میری طرف توجہ نہ دی۔ اچانک گھنے جنگل میں ایک ٹیلے کے پیچھے سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور آن کی آن میں ہمارے پچیس آدمی گر پڑے، اس کے بعد مرہٹے مقابلہ کرنے کی بجائے جنگل میں غائب ہوگئے۔ یہ بری طرح زخمی تھے۔ آپ ان کے آدمیوں سے پوچھ سکتے ہیں۔ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ کاش آپ کی طرف سے ہمیں یہ اجازت ہوتی کہ اگر یہ زبردستی قلعے سے باہر نکلنے کی کوشش کریں تو انھیں کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے!"

معظم علی نڈھال سا ہو کر شوکت بیگ کے بستر کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "تم نے بہت برا کیا۔ اب میں مرشد آباد واپس جا کر منہ دکھلانے کے قابل نہیں رہا۔"

شوکت بیگ نے آنکھیں کھولیں اور کراہتے ہوئے کہا۔ "آپ کے ساتھی بے قصور ہیں۔ انھوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اپنی ذمہ داری پر دشمن کا پیچھا کیا تھا۔"

معظم علی نے پُرامید ہو کر طبیب کی طرف دیکھا اور ملتجی لہجے میں کہا۔ "آپ ان کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں!"

طبیب نے جواب دیا۔ "آپ اطمینان رکھیے میری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔"

شوکت بیگ نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

شام تک شوکت بیگ پر بیہوشی کے دورے پڑتے رہے۔ عشاء کی نماز کے بعد معظم علی انتہائی اضطراب اور پریشانی کی حالت میں قلعے کے صحن میں ٹہل رہا تھا۔ وہ تصور میں کبھی مرزا حسین بیگ اور کبھی فرحت اور اس کی والدہ کو دیکھ رہا تھا اور وہ اس سے پوچھ رہے تھے "تم نے شوکت کو تنہا کیوں چھوڑ دیا؟ تم نے اس کی حفاظت کیوں نہ کی؟ جب ڈھاکہ کی فوج واپس آرہی تھی تو تم اسے اپنے ساتھ کیوں لے گئے؟" وہ ندامت کے ناقابلِ برداشت بوجھ تلے پسا جا رہا تھا اور اس کی زبان سے بار بار اس قسم کی دعائیں نکل رہی تھیں۔ "میرے مولیٰ! اگر تیری بارگاہ میں میری کوئی دعا قبول ہو سکتی ہے تو میں تجھ سے شوکت کی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں۔ میرے اللہ میں عہد کرتا ہوں کہ میں مرتے دم تک فرحت کا خیال اپنے دل میں نہیں لاؤں گا۔ تو جانتا ہے کہ میں خلوصِ دل سے یہ چاہتا ہوں کہ وہ زندہ رہے، اس میں تمام وہ خوبیاں ہیں جو فرحت کے رفیقِ حیات میں ہونی چاہئیں، وہ فرحت کو خوش رکھ سکتا ہے اور فرحت کی خوشی میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہے۔"

طبیب شوکت کے کمرے سے باہر نکلا اور اس نے معظم علی کے قریب پہنچ کر کہا۔ "وہ اب ہوش میں ہے اور آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ وہ آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔"

معظم علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور شوکت بیگ کے بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چراغ کی روشنی میں اسے شوکت بیگ کا چہرہ بے حد زرد نظر آتا تھا۔ اس نے مغموم لہجے میں کہا۔ "شوکت اب کیا حال ہے؟"

شوکت نے ایک مغموم مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میرے دوست آپ کو میرے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کی حکم عدولی کی۔ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔"

"شوکت بیگ! مجھے یقین ہے کہ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ تمھارا زندہ رہنا ضروری ہے۔"

شوکت نے کہا "آپ مجھے ہمیشہ خطرے کے سامنے جانے سے روکنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ مجھے اس بات سے چڑ ہو گئی تھی۔ میں بچپن سے بے حد ضدی ہوں۔ میں ہمیشہ یہ محسوس کیا کرتا تھا کہ آپ شاید مجھے بزدل سمجھتے ہیں۔"

"نہیں شوکت! مجھے صرف اس بات کا ڈر تھا کہ تمھاری جرأت میرے لیے کسی پریشانی کا باعث نہ بن جائے۔"

شوکت نے کہا۔ "یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ باقی آدمیوں کے مقابلے میں میری جان اس قدر قیمتی کیوں سمجھتے ہیں؟"

معظم علی نے جواب دیا "اگر تم باقاعدہ فوج کے سپاہی ہوتے تو تمھیں یہ کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ لیکن تم ایک رضاکار کی حیثیت میں آئے تھے اور میں چاہتا تھا کہ صحیح سلامت اپنے گھر واپس جاؤ۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ تمھاری شادی ہونے والی ہے اور ایک ایسے خاندان کی لڑکی سے جو مجھے بے حد عزیز ہے۔ اب میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ تم تندرست ہو کر اپنے گھر پہنچ جاؤ اور خدا مجھے مرزا حسین بیگ کے سامنے شرمسار نہ کرے۔"

شوکت بیگ نے کہا "میں شاید گھر واپس نہ جا سکوں۔ لیکن آپ جب مرزا حسین بیگ سے ملیں تو ان سے یہ ضرور کہیں کہ میری موت ایک سپاہی کی موت تھی۔ میں اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے سپاہی بننے کا شوق کبھی نہ تھا اور یہ شوق صرف تمھاری وجہ سے پیدا ہوا۔ میں بچپن میں ہی اپنے والدین سے سنا کرتا تھا کہ میری منگنی مرشد آباد کے ایک معزز خاندان کی لڑکی کے ساتھ ہو گی۔ اس کے بعد بڑا ہو کر میں نے یہ سنا کہ ایک غریب خاندان کے لڑکے نے اپنی جان پر کھیل کر مرزا حسین بیگ کے گھر کی حفاظت کی ہے اور شاید وہ اس کے ساتھ اپنی لڑکی کا رشتہ کرنے کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ پھر تمھاری قید کے زمانے میں مرزا صاحب ہمارے ہاں آئے تو وہ بات بات پر تمھارا تذکرہ کرتے تھے اور مجھے بار بار یہ احساس دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ اس زمانے میں ہر نوجوان کے لیے سپاہی بننا ضروری ہے اور میں تمھیں دیکھے بغیر ہی تمھارے متعلق اپنے دل میں ایک رقابت کا جذبہ محسوس کرتا تھا۔

ایک دن میرے ابا جان نے مرزا حسین بیگ کے سامنے میری تعریف کی تو انھوں نے کہا۔ "بنگال میں صرف ایک نوجوان پیدا ہوا تھا اور اس کا نام معظم علی تھا۔" پھر ہماری منگنی ہو گئی اور اس کے چند ہی ہفتے بعد تم واپس آ گئے۔

میری شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ لیکن جب ڈھاکہ کی فوج اڑیسہ کی طرف کوچ کی تیاری کر رہی تھی تو میرے ابا جان کو حسین بیگ کا خط ملا، جس میں انھوں نے یہ لکھا تھا کہ افضل محاذ پر جا رہا ہے۔ مرہٹے ہماری قوم کے ہر نوجوان کو اڑیسہ کے میدانوں میں للکار رہے ہیں اس لیے میری خواہش ہے کہ جنگ کے اختتام اور افضل بیگ کی واپسی تک شادی ملتوی کر دی جائے۔ انھوں نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ میرے جن دوستوں کا شادی کے موقع پر ہونا ضروری ہے وہ سب محاذ پر جا چکے ہیں۔ میں اسی وقت سیدھا میر مدن کے پاس پہنچا اور انھیں اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اب تم سمجھ گئے ہو کہ میرے یہاں آنے کی وجہ کیا تھی۔ میں مرزا حسین بیگ پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں بنگال کے کسی نوجوان سے کم نہیں ہوں۔ میری یہ خواہش تھی کہ مرزا حسین بیگ کے گھر میں کسی اور کی بجائے صرف میرے بہادرانہ کارناموں کا ذکر ہو۔ میں ہر میدان میں تم سے چند قدم آگے رہنا چاہتا تھا۔ لیکن میں کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام نہ دے سکا۔ میں کوشش کے باوجود ان لوگوں کی صف میں کھڑا نہ ہو سکا جنھیں لڑائی کے بعد داد و تحسین کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ تم ہر میدان میں مجھ سے آگے تھے اور میں یہ محسوس کرتا تھا کہ میری حیثیت ایک تماشائی سے زیادہ نہیں۔ اس وقت اگر مجھے کسی بات کا افسوس ہے تو وہ یہ ہے کہ میں اپنے ایک بہترین دوست اور ساتھی کو اپنا رقیب سمجھتا تھا۔ مرزا حسین بیگ درست کہتے تھے کہ بنگال نے صرف ایک نوجوان پیدا کیا اور وہ معظم علی ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "بنگال کے ہزاروں نوجوان مجھ سے بہتر ہیں اور تم ان میں سے ایک ہو۔"

شوکت بیگ نے کہا "معظم علی مجھے یقین ہے کہ اگر میں زندہ رہا تو ہم ایک دوسرے کے لیے بہترین دوست ثابت ہوں گے لیکن میری منزل اب قریب آ چکی ہے۔ اس وقت

اگر مرزا حسین بیگ یہاں موجود ہوتے تو میں ان سے یہ کہتا کہ میں نے معظم علی بننے کی کوشش کی تھی اور یہ میری حماقت تھی۔

انسان اپنی زندگی میں عجیب و غریب باتیں کرتا ہے۔ ایک دن وہ تھا جب تمھارا نام میرے نزدیک ایک گالی تھا۔ معظم علی بُرا نہ ماننا۔ اب مجھے یہ باتیں کہتے ہوئے جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ مجھے اس بات سے چڑ تھی کہ تم مرزا حسین بیگ کے پڑوس میں رہتے ہو اور محلے کا ہر آدمی تمھاری تعریفیں کرتا ہے۔ میں نے آج تک فرحت کو نہیں دیکھا لیکن جو کچھ اس کے متعلق میں نے اپنی ماں اور بہنوں سے سنا تھا وہ میرے دل میں یہ احساس پیدا کرنے کے لیے کافی تھا کہ ایسی لڑکی کا شریکِ حیات بننا زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ مجھے یہ بات گوارا نہ تھی، کہ وہ کسی ایسے آدمی کو جانتی ہو جو مجھ سے بہتر اوصاف کا مالک ہو۔ فرحت کے رشتے سے مرزا حسین بیگ کا انکار میری زندگی کی سب سے بڑی شکست تھی اور میرے لیے اس شکست کا سب سے زیادہ ناقابلِ برداشت پہلو یہ تھا کہ میرے مقابلے میں ایک غریب خاندان کے لڑکے کو ترجیح دی گئی ہے۔ اپنے والدین کی باتوں سے مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ فرحت کے والدین تمھاری طرف مائل ہیں۔ پھر جب تم لاپتہ ہوگئے تو میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ میرے راستے سے ایک پہاڑ ہٹ گیا ہے۔ لیکن فرحت کے ساتھ منگنی ہو جانے کے بعد بھی میری خوشی ادھوری تھی۔ مجھے کبھی کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ میں اس کے لیے معظم علی نہیں بن سکوں گا۔ پھر ہماری شادی کی تاریخ ملتوی کرنے کے متعلق مرزا صاحب نے جو خط لکھا اسے پڑھ کر میں نے یہ محسوس کیا کہ مجھے بے حسی، بزدلی اور بے غیرتی کا طعنہ دیا جا رہا ہے جب میں گھر سے روانہ ہوا تھا تو میرے عزائم یہ تھے کہ میں کسی دن فتوحات کے پرچم لہراتا ہوا واپس آؤں گا۔ اور شہرت، عزت اور ناموری کے سینکڑوں تاج فرحت کے قدموں پر ڈھیر کر دوں گا۔ تم میری حماقتوں پر ہنسو گے۔"

معظم علی نے کہا: "نہیں شوکت! میں جانتا کہ تمھارے سینے میں ایک نہایت حسین

دل ہے۔ لیکن کاش اس سے پہلے میں تمھیں یہ بتا سکتا کہ میں جس فرحت کو جانتا ہوں، وہ ان لڑکیوں سے مختلف ہے جو اپنے رفیقِ حیات کا دوسرے انسانوں سے موازنہ کرتی ہیں۔"

شوکت بیگ نے کہا: تم اسے جانتے ہو اور تم اس سے محبت کرتے ہو؟"

معظم علی کا سارا جسم کپکپا اٹھا اور اس نے کہا: "شوکت خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ وہ تمھارے لیے ہے اور میں اس کے متعلق سوچنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں تمھیں تندرست ہوتے ہی گھر بھیج دوں گا۔"

شوکت بیگ نے کہا: "میرے دوست ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں اب گھر واپس نہیں جاؤں گا۔ میں نے یہ باتیں تمھارا دل دُکھانے کے لیے نہیں کیں، صرف اس لیے کی ہیں کہ میرے دل پر یہ ایک بوجھ تھا کہ میں ایک ایسے آدمی کے خلاف اپنے دل میں نفرت اور رقابت کے جذبات رکھتا تھا جس کے ساتھ مجھے محبت کرنی چاہیے تھی۔ معظم علی! تم انسان نہیں ایک فرشتہ ہو۔ کاش اس وقت افضل کی بہن یہاں موجود ہوتی اور اسے میں یہ کہہ سکتا کہ میں تمھارا مستقبل ایک بہتر انسان کو سونپ کر جا رہا ہوں۔"

شوکت بیگ نے یہ کہہ کر معظم علی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ معظم علی کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے اور شوکت بیگ کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

معظم علی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کے ہاتھ پر شوکت بیگ کی گرفت آہستہ آہستہ ڈھیلی ہو رہی تھی۔ اس کی سانس اکھڑ چکی تھی۔ معظم علی نے طبیب کو آواز دی طبیب نے آکر شوکت بیگ کی نبض دیکھی اور اس نے مغموم لہجے میں کہا: "ان کا وقت آچکا ہے۔"

اس کے بعد وہ دیر تک جانکنی کی حالت میں پڑا رہا اور رات کے پچھلے پہر جب قلعے سے باہر کسی درخت پر کوئل کی آواز صبح کی آمد کا پیغام دے رہی تھی۔ شوکت بیگ اپنا سفرِ حیات ختم کر چکا تھا۔

○

طلوع آفتاب کے تھوڑی دیر بعد شوکت بیگ کو سپردِ خاک کیا جاچکا تھا اور اس کے ساتھی واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ معظم علی نے شوکت بیگ کے والد اور مرزا حسین بیگ کے نام خطوط لکھ کر ان کے حوالے کر دیئے۔

اگلے دن معظم علی، علی الصباح ایک ہزار سوار لے کر مرہٹوں کے تعاقب میں روانہ ہوا اور چند مہینے سرحد کے جنگلوں اور پہاڑوں میں ان کا پیچھا کرتا رہا۔ جب وہ اس مہم سے فارغ ہو کر واپس آیا تو اس کے ساتھ چار سو قیدی تھے۔ اس کے بعد قریباً ڈیڑھ سال وہ سرحد کے اہم مقامات پر دفاعی چوکیاں تعمیر کرنے اور مرہٹوں کے ستائے ہوئے لوگوں کی ویران بستیوں کو دوبارہ آباد کرنے میں مصروف رہا۔ پھر اس نے میر مدن کے نام درخواست لکھ کر ایک ماہ کی رخصت لی اور مرشد آباد کی طرف روانہ ہوا۔

مرشد آباد پہنچتے ہی اسے معلوم ہوا کہ علی وردی خاں بسترِ مرگ پر ہے اور سراج الدولہ نے میر مدن اور سلطنت کے چند اور بڑے عہدیداروں کو مرشد آباد بلا لیا ہے۔ مرزا حسین بیگ کے متعلق اسے یہ اطلاع ملی کہ وہ چند ہفتے قبل ایک جہاز پر حج اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی نیت سے روانہ ہو چکے ہیں۔

معظم علی نے گھر میں اپنی چھٹی کے پانچ دن گزارے تھے کہ علی وردی خاں راہیِ ملکِ عدم ہوا اور مرشد آباد کے باشندے یہ محسوس کر رہے تھے کہ بنگال کا وہ دفاعی حصار ٹوٹ چکا ہے جسے وہ اپنی آزادی اور بقا کی سب سے بڑی ضمانت سمجھتے تھے۔ مرشد آباد کی مساجد میں علی وردی خاں کے لیے مغفرت اور بنگال کے نئے حکمران سراج الدولہ کے لیے کامیابی اور کامرانی کی دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔

علی وردی خاں کی وفات کے تین دن بعد معظم علی نے میر مدن سے، جسے ڈھاکہ سے بلا کر بنگال کی فوج کی سپہ سالاری سپرد کی گئی تھی، ملاقات کی اور اس کے بعد گھر واپس آکر اپنی

ماں سے کہا: "امی جان! میری رخصت منسوخ کر دی گئی ہے اور میں کل صبح سویرے یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔"

ماں نے مغموم لہجے میں کہا: "میرا خیال تھا کہ سراج الدولہ اور میر مدن تمھیں مرشد آباد میں کوئی عہدہ دے دیں گے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "امی جان میرا وہاں جانا ضروری ہے۔ میں نے میر مدن سے درخواست کی تھی کہ وہ بھائی یوسف کو ڈھاکہ سے یہاں بلالیں اور انھوں نے میری یہ بات مان لی ہے۔"

ماں نے کہا: "بیٹا! میں ایک عرصہ سے سوچ رہی تھی کہ مرزا حسین بیگ کے گھر جا کر تمھارے رشتے کے متعلق کچھ کہوں۔ ابھی فرحت کی ماں مجھ سے مل کر گئی ہے اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ حج کے لیے روانہ ہونے سے پہلے مرزا صاحب فرحت کے رشتے کے متعلق ہماری طرف سے سلسلہ جنبانی کے منتظر تھے۔ میں نے کہا۔ بہن میں تو ہر روز معظم کے ابا کو مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کو کہا کرتی تھی، لیکن انھیں حوصلہ نہیں ہوا۔ اب اگر آپ تیار ہیں تو میں ابھی محلے میں مٹھائی تقسیم کرواتی ہوں۔ لیکن انھوں نے جواب دیا کہ ہمیں حج سے مرزا صاحب کی واپسی کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

معظم علی نے جھجکتے اور شرماتے ہوئے کہا: "امی جان فرحت کیسی ہے؟"

ماں نے جواب دیا: "فرحت چند ہفتوں سے کچھ بیمار تھی۔ لیکن اب بالکل ٹھیک ہے۔"

چند دن بعد معظم علی سرحدی قلعے میں پہنچ چکا تھا۔

○

علی وردی خاں کے آنکھیں بند کرتے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کے خلاف سازشوں کا جال بچھا دیا۔ انگریزوں کی تجارتی کوٹھیاں قلعوں اور اسلحہ خانوں میں تبدیل ہونے لگیں اور وہ حریص قسمت آزما جو قوم کی عزت اور آزادی کو مال تجارت سمجھتے تھے۔ انگریزوں کے

ساتھ سازباز کرنے لگے۔ سراج الدولہ کو انگریزوں کے عزائم کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ تھی اور اس نے مسندِ حکومت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف توجہ کی۔ انگریز تاجر، حکومتِ بنگال کے ساتھ اپنے سابقہ معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر قلعہ بندیوں میں مصروف تھے۔ ان کے ساتھ مصالحت کی گفتگو بے نتیجہ ثابت ہو چکی تھی اور سراج الدولہ کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ بنگال کی حکومت کے نئے دعویداروں کو صرف ایک فوجی شکست ہی راہ راست پر لا سکتی ہے۔ چنانچہ ایک دن فورٹ ولیم کے سفید فام محافظ شیر بنگال کی گرج سن رہے تھے۔

معظم علی چند ماہ سے مغربی سرحد پر اپنا مورچہ سنبھالے ہوئے تھا۔ اسے انگریزوں کے متعلق سراج الدولہ کے عزائم کا علم ہوا تو اس نے میر مدن کو ایک خط لکھا کہ اب سرحدی علاقوں کو کوئی خطرہ نہیں، اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کا موقع دیا جائے۔"

چند ہفتوں تک اس کی درخواست کا کوئی جواب نہ آیا اور وہ سخت بے چین رہا۔ پھر ایک دن اسے میدناپور کے فوجدار کی طرف سے یہ اطلاع ملی کہ نواب سراج الدولہ نے فورٹ ولیم پر قبضہ کر لیا ہے اور اس کے چار دن بعد اسے میر مدن کا خط ملا۔ جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ ہم انگریزوں کو ایک عبرتناک شکست دے چکے ہیں۔ لیکن تمھیں یہ محسوس نہیں کرنا چاہیے کہ ہماری اس کامیابی میں تمھارا کوئی حصہ نہیں۔ انگریزوں کے خلاف ہم نے ایک لڑائی جیتی ہے لیکن بنگال کو ان کی ہوس ملک گیری سے بچانے کے لیے ہمیں شاید ایسی کئی اور جنگیں لڑنی پڑیں اور ان جنگوں سے ہم اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کہ ہمارے سرحدی علاقے مرہٹوں کے حملوں سے محفوظ ہوں۔ تمھیں ایک اہم ذمہ داری سونپی گئی ہے اور تم نے ہر مرحلے پر اپنے آپ کو اس ذمہ داری کا اہل ثابت کیا ہے اس لیے میری یہ خواہش ہے کہ جب تک انگریزوں سے ہماری جنگ ختم نہیں ہوتی تم بنگال کے

مغربی دروازے پر پہرہ دیتے رہو اور میں تم جیسے سمجھدار نوجوان کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ لڑنے والے سپاہی کی نسبت خاموشی سے پہرہ دینے والے سپاہی کا کام بسا اوقات زیادہ صبر آزما ہوتا ہے۔"

چند مہینے اور گزر گئے اور معظم علی کو اس کے سوا کچھ معلوم نہ تھا کہ سراج الدولہ انگریزوں پر فیصلہ کن ضرب لگانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ایک دن اسے اپنے والد کا خط ملا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ مرزا حسین بیگ حج سے واپس آ گئے ہیں اور ان کی یہ خواہش ہے کہ تم چند دن کے لیے گھر آؤ۔ اس نے میدناپور کے فوجدار کو ایک ماہ کی رخصت کے لیے درخواست بھیجی، لیکن اس نے جواب میں لکھا کہ "موجودہ حالات میں تمھیں ایک دن کیلیے بھی چھٹی دینا ممکن نہیں۔ نواب سراج الدولہ نے مجھ سے پانچ ہزار سوار دو ہفتوں کے اندر اندر مرشدآباد بھیجنے کا مطالبہ کیا ہے۔ انھوں نے اس کی وجہ بیان نہیں کی تاہم سپہ سالار کے خط سے میں نے یہ اندازہ کیا ہے کہ عنقریب انگریزوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ ہونے والی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم کچھ مدت اور انتظار کرو۔ اگر حالات ٹھیک ہوئے تو میں تمھیں ایک ماہ کی بجائے دو ماہ کی چھٹی دے دوں گا۔ فی الحال پانچ ہزار سواروں کی تعداد پوری کرنے کیلیے تمھارے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ اس لیے میرا خط ملتے ہی اپنے تمام فالتو سپاہی سیدھے مرشدآباد روانہ کر دو اور اپنے پاس صرف اتنے آدمی رکھو جو قلعے اور سرحدی چوکیوں کی حفاظت کے لیے اشد ضروری ہوں۔"

معظم علی نے یہ خط ملتے ہی پانچ سو سپاہی قلعے کی حفاظت اور تین سو آس پاس کی چھوٹی چھوٹی چوکیوں کی نگرانی کے لیے روک لیے اور باقی فوج کو اپنے ایک تجربہ کار افسر کی کمان میں دے کر مرشدآباد کی طرف کوچ کا حکم دیا۔

○

چند ہفتے معظم علی کو مرشدآباد کے متعلق کوئی اطلاع نہ ملی اور وہ سخت بے چین رہا۔

ایک دن اسے محمود علی کا خط ملا جس میں اس نے لکھا تھا کہ: "مجھے سراج الدولہ نے اپنے محافظ دستوں کا سالارِ اعلیٰ مقرر کردیا ہے۔ یوسف اور افضل بھی محافظ فوج کے سالار بنا دیئے گئے ہیں۔ ہمیں آٹھ پہر کے اندر اندر یہاں سے کوچ کا حکم ملا ہے اور انشاء اللہ عنقریب تم یہ سنو گے کہ ہم بنگال کو ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا چکے ہیں۔"

اس کے بعد چند دن اور گزر گئے اور معظم علی کو جنگ کے حالات کے متعلق کوئی اطلاع نہ ملی۔

ایک روز رات کے تیسرے پہر معظم علی قلعے کے اندر اپنی قیام گاہ کی چھت پر گہری نیند سو رہا تھا۔ ایک پہریدار نے اسے جگایا اور یہ اطلاع دی کہ مرہٹوں نے سرحد کی ایک چوکی پر اچانک حملہ کرکے تیس سپاہی موت کے گھاٹ اتار دیئے ہیں۔ معظم علی جلدی سے نیچے اترا۔ چند سپاہی جو سرحد کی چوکی سے بھاگ کر آئے تھے قلعے کے صحن میں کھڑے تھے۔ معظم علی ان سے حملے کی تفصیلات پوچھ رہا تھا کہ دروازے کی طرف سے ایک پہریدار بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے اطلاع دی کہ دروازے کے باہر ایک آدمی کھڑا ہے اور وہ کہتا ہے کہ ہماری چوکی پر بھی مرہٹوں نے قبضہ کرلیا ہے۔

معظم علی نے تین سو سواروں کو فوراً تیار ہونے کا حکم دیا اور پھر پہریدار کی طرف متوجہ ہوکر کہا۔ "اگر تم اسے پہچانتے ہو تو اسے اندر آنے دو۔"

"جی میں اسے پہچانتا ہوں۔" پہریدار یہ کہہ کر اسی طرح بھاگتا ہوا واپس چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک آدمی لنگڑاتا ہوا قلعے کے صحن میں داخل ہوا۔

معظم علی نے چند قدم آگے بڑھ کر کہا۔ "تم زخمی ہو؟"

"جی میں قلعے سے ایک میل دور گھوڑے سے گر پڑا تھا۔"

"تم کس چوکی سے آئے ہو؟" معظم علی نے سوال کیا۔

"جی میں شمال کی تیسری چوکی سے آیا ہوں۔ مرہٹوں نے ہم پر بے خبری کی حالت

میں حملہ کرکے ہمارے بیشتر آدمی قتل کردیئے۔ میرے باقی ساتھی اِدھر اُدھر بھاگ گئے تھے۔ مجھے گھوڑے پر سوار ہونے کا موقع مل گیا تھا۔"

معظم علی نے ایک عمر رسیدہ افسر کی طرف متوجہ ہوکر کہا۔ "عبدالرحمٰن! معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹوں نے بڑے پیمانے پر پیشقدمی شروع کردی ہے۔ مجھے شاید اس مہم میں چند دن لگ جائیں۔ میری غیر حاضری میں قلعے کی حفاظت تمہارے ذمہ ہوگی۔ تم اسی وقت تمام چوکیوں کے سپاہیوں کو یہ حکم بھیج دو کہ وہ قلعے میں جمع ہوجائیں۔ اگر مرہٹوں کی تعداد زیادہ ہوئی تو میں بہت جلد واپس آجاؤں گا۔ ہمیں باہر سے کسی فوری کمک کی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔ اگر مرہٹے آگے بڑھ آئے تو یہ قلعہ ہمارا آخری سہارا ہوگا۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی تین سو سواروں کے ہمراہ قلعے سے باہر نکل گیا۔

سرحدی علاقوں پر حملہ کرنے والے مرہٹوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہ تھی، وہ اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے سرحدی علاقے کی محافظ فوج کی دفاعی طاقت کا اندازہ کرنے کی نیت سے آئے تھے۔ علی الصباح قلعے سے چند میل دور مرہٹوں کے چند دستوں کے ساتھ معظم علی کے سپاہیوں کی جھڑپ ہوئی اور وہ معمولی مقابلہ کے بعد پندرہ بیس لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس کے بعد اسے چند میل دور مرہٹوں کے ایک اور دستے کی اطلاع ملی اور اس نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال کر انھیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیا۔

مرہٹوں کے اچانک حملے سے خوفزدہ ہوکر سرحد کے لوگ اپنی بستیاں خالی کر رہے تھے لیکن معظم علی کی طرف سے بروقت جوابی کارروائی کے باعث ان کے حوصلے بندھ گئے اور وہ دوبارہ اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔

ایک شام کوئی پچاس مرہٹے ایک بستی کو لوٹنے میں مصروف تھے۔ معظم علی خبر ملتے ہی وہاں پہنچا اور اس نے تیس آدمیوں کو گرفتار کرلیا۔ اس کے پہنچنے سے پیشتر مرہٹے بستی کے چودھری کے پانچ بیٹوں کے علاوہ دس اور آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے، جن کا

جرم صرف یہ تھا کہ وہ مرہٹوں کے ہاتھوں چند لڑکیوں کی بے حرمتی خاموشی سے برداشت نہ کر سکے۔

معظم علی نے رات بھر اس بستی میں قیام کیا۔ صبح ہوئی تو اس نے آس پاس کی بستیوں کے لوگوں کو جمع کیا اور ان سے مخاطب ہو کر کہا: "چوروں اور ڈاکوؤں کے سامنے بھیڑوں کی طرح بھاگنے والوں کو بچانا کسی فوج کا کام نہیں۔ فوج کی مدد صرف ان لوگوں کے لیے سودمند ہو سکتی ہے جو بہادروں کی طرح جینا اور مرنا جانتے ہیں۔ اس لیے میں تمھیں مشورہ دیتا ہوں کہ تم ان چوروں اور ڈاکوؤں سے بچنے کے لیے اپنی بستیوں میں رضاکاروں کی فوج تیار کرو۔" پھر وہ قیدیوں کی طرف متوجہ ہوا: "تم جیسے خونخوار درندوں کے ساتھ جنگی قیدیوں کا سلوک نہیں کیا جا سکتا۔ میں تمھیں ان لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑتا ہوں جن کے جوان بیٹوں اور بھائیوں کی روحیں انتقام کے لیے پکار رہی ہیں اور میں ان سے یہ کہوں گا کہ وہ تمھیں کسی انسانی سلوک کا مستحق نہ سمجھیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمھارے دوسرے ساتھی اس طرف آئیں تو انھیں اس بستی کے باہر ہر درخت کے ساتھ تمھاری لاشیں لٹکتی نظر آئیں۔"

ایک گھنٹہ بعد جب معظم علی اس بستی سے رخصت ہوا تو مقامی لوگ گاؤں سے باہر تیس مرہٹوں کے گلوں میں پھندے ڈال کر درختوں سے لٹکا چکے تھے۔

چند دن تک مختلف مقامات پر درختوں سے لٹکی ہوئی لاشیں اس بات کا ثبوت دیتی رہیں کہ سرحد کا محافظ ان علاقوں سے گزرا ہے۔

قریباً بیس دن کے اندر سرحدی علاقوں میں مکمل امن قائم کرنے کے بعد معظم علی واپس پہنچا اور اس نے قلعے میں داخل ہوتے ہی اپنے قائم مقام سے سوال کیا۔ "مرشد آباد یا میدناپور سے کوئی اطلاع آئی ہے؟"

"جی نہیں!" قائم مقام نے جواب دیا۔



دو دن بعد میدناپور سے ایک فوجی افسر، جس کا نام ہاشم خاں تھا، تیس سواروں کے ہمراہ معظم علی کے پاس پہنچا اور اس نے میدناپور کے فوجدار کا خط پیش کیا۔ خط کا مضمون یہ تھا:

"تم خط ملتے ہی قلعے کی کمان ہاشم خان کے حوالہ کر کے میدناپور پہنچ جاؤ۔ میں چند اہم معاملات کے متعلق تم سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں!"

معظم علی نے خط پڑھنے کے بعد ہاشم خاں سے سوال کیا: "مرشد آباد سے جنگ کے متعلق کوئی اطلاع ملی ہے؟"

ہاشم خاں نے جواب دیا: "جنگ کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ لیکن مرشد آباد سے ایک خاص ایلچی میدناپور کے فوجدار کے پاس آیا تھا اور ہمارا خیال تھا کہ وہ کوئی اہم خبر لایا ہے لیکن اس کی آمد کے تھوڑی دیر بعد فوجدار نے مجھے اس طرف روانہ کر دیا اور میں یہ معلوم نہ کر سکا کہ ایلچی کیا خبر لایا تھا۔ فوجدار نے اس بات کی سخت تاکید کی تھی کہ آپ فوراً میدناپور پہنچ جائیں!"

معظم علی نے کہا: "اگر وہ تاکید نہ کرتے تو بھی میری طرف سے تاخیر نہ ہوتی۔ میں وہاں پہنچ کر مرشد آباد کے حالات معلوم کرنے کے لیے سخت بے چین ہوں۔"

قریباً آدھ گھنٹہ بعد معظم علی اپنے افسروں اور سپاہیوں کو خدا حافظ کہہ کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ چار نوجوان اس کے ساتھ تھے۔ وہ قلعے سے صرف چار کوس دور گیا تھا کہ اسے ایک سرپٹ سوار اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ جب ان کے درمیان کوئی دو سو گز کا فاصلہ رہ گیا تو معظم علی کے ایک ساتھی نے کہا: "جناب وہ عبداللہ خاں معلوم ہوتا ہے۔"

معظم علی نے تھوڑی دور آگے جا کر گھوڑا روکا اور آنے والے سوار کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ عبداللہ خاں نے قریب آ کر کسی تمہید کے بغیر سوال کیا: "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں میدناپور جا رہا ہوں۔" معظم علی نے جواب دیا: "تم گھر کے حالات سناؤ!"

عبداللہ خاں، معظم علی کی فوج کے پچاس سواروں کا سالار تھا۔ مرشد آباد میں اس کا

گھر بھی معظم علی کے پڑوس میں تھا۔ قریباً تین ماہ سے وہ رخصت پر تھا۔ وہ جواب دینے کی بجائے گھوڑے سے اتر پڑا اور گردن جھکا کر معظم علی کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

"کیا بات ہے عبداللہ؟" معظم علی نے سوال کیا۔

عبداللہ خاں نے گردن اوپر اٹھائی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

"کیا ہوا عبداللہ؟" معظم علی نے مضطرب ہوکر دوبارہ سوال کیا۔

عبداللہ خاں نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "میں بہت بُری خبر لایا ہوں آپ میدنا پور کی بجائے سیدھے گھر جائیں۔ مرشد آباد لٹ چکا ہے!"

معظم علی گھوڑے سے کود پڑا اور عبداللہ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے چلایا۔ "خدا کے لیے مجھے جلدی بتاؤ کیا ہوا ہے؟"

عبداللہ خاں نے بڑی مشکل سے اپنی چیخیں ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کے اباجان اور یوسف شہید ہو چکے ہیں۔ افضل بھی شہید ہو چکا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ کو تمام واقعات کی اطلاع مل چلی ہوگی۔ ہم جنگ ہار چکے ہیں۔ میر جعفر نے بنگال کو انگریزوں کے ہاتھ فروخت کردیا ہے۔"

معظم علی دیر تک بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ وہ اپنے باپ، اپنے بھائی اور افضل کی موت کا یقین کرسکتا تھا۔ لیکن بنگال کی افواج کی شکست اس کے لیے ناقابل یقین تھی۔ اس نے کرب انگیز آواز میں سوال کیا۔ "سراج الدولہ کہاں ہیں؟ ہمیں شکست کیسے ہوئی؟"

"سراج الدولہ کے متعلق میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ شکست کے بعد مرشد آباد آگئے تھے اور پھر راتوں رات وہاں سے نکل گئے تھے۔"

"یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ میں انگریزوں کے ہاتھوں سراج الدولہ کی شکست پر کبھی یقین نہیں کرسکتا۔"

"ہمیں انگریزوں نے شکست نہیں دی۔ ہم اپنے غداروں کے ہاتھوں مارے

گئے ہیں۔ میر جعفر انگریزوں سے بنگال کی آزادی کا سودا کرچکا ہے۔ میر مدن شہید ہو چکے ہیں۔ میر جعفر نے فوج کے افسروں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ جس وقت ہماری فتح بالکل قریب تھی وہ انگریزوں کے ساتھ مل گیا۔ میں جنگ میں شریک تھا اور غداری اور وطن فروشی کا منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ہمارا توپخانہ خاموش تھا۔ ہمارے بیشتر سوار میدان سے دور کھڑے تھے۔ سراج الدولہ کے مٹھی بھر جاں نثار سینوں پر گولیاں کھا کھا کر گر رہے تھے اور ہم آخری وقت تک یہ سمجھتے تھے کہ ہماری توپیں اچانک آگ برسائیں گی۔ ہمارے سوار اچانک فیصلہ کن حملہ کریں گے اور آن کی آن میں دشمن کو کچل کر رکھ دیا جائے گا۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ ہم پلاسی کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے جنگ ہار چکے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے یوسف اور افضل کو گر کر دم توڑتے دیکھا تھا اور آپ کے اباجان جب زخموں سے چُور ہوکر مرشد آباد پہنچے تھے تو میں ان کے ساتھ تھا۔ سراج الدولہ انھیں محل میں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ پھر رات کے وقت جب وہ مرشد آباد چھوڑ رہے تھے تو آپ کے اباجان کو گھر پہنچا دیا گیا تھا۔ آدھی رات کے وقت انھوں نے دم توڑ دیا تو محلے کے لوگوں نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کو اطلاع دوں۔"

معظم علی نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا: "اب ہمیں میدنا پور جانے کی ضرورت نہیں۔ تم واپس قلعے میں چلے جاؤ۔ میری منزل مرشد آباد ہے۔ عبداللہ تمھارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں آپ کے ساتھ ہوں!" اس نے جواب دیا۔

مرشد آباد کی طرف چند منازل طے کرنے کے بعد معظم علی نے یہ خبر سنی کہ سراج الدولہ قتل ہوچکا ہے۔ میر جعفر نے لارڈ کلایو کی سرپرستی میں بنگال کی حکومت سنبھال لی ہے اور مرشد آباد میں سراج الدولہ کے وفادار ساتھیوں کو گرفتار کیا جا رہا ہے۔

نواں باب

ایک رات جب کہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ معظم علی اور عبداللہ خان اپنے محلے کی سنسان گلی میں داخل ہوتے۔ عبداللہ خاں کا گھر پہلے آتا تھا۔ معظم علی نے اس کے مکان کے دروازے پر گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا: "عبداللہ اب تم اپنے گھر جا کر آرام کرو اور میرا گھوڑا بھی لے جاؤ۔"

عبداللہ خان نے معظم علی کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور وہ اپنے مکان کی طرف چل دیا۔

تاریک اور سنسان گلی میں اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد معظم علی نے اپنے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ پھر اس نے صابر کو پکارنے کی کوشش کی لیکن آواز اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

صحن کی دیوار زیادہ اونچی نہ تھی۔ وہ چند ثانیے توقف کے بعد دیوار پر چڑھا اور صحن میں کود پڑا۔ مردانہ حصے کا صحن تاریک تھا اور گلی کی طرح یہاں بھی ایک بالشت پانی جمع ہو چکا تھا۔ معظم علی سامنے کی دیوار کے ایک کھلے دروازے سے گزرنے کے بعد رہائشی مکان کے صحن میں داخل ہوا۔ اسے نچلی منزل میں کونے کا ایک کمرہ روشن نظر آیا۔ کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں کھلی تھیں۔ روشن کمرے کی طرف قدم اٹھاتے وقت معظم علی کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ یہ وہ گھر تھا جہاں ہر وقت مسرت کے قہقہے اس کا استقبال کیا کرتے تھے۔ بجلی چمکی

اور اسے بالائی منزل قبرستان سے زیادہ اُداس اور سنسان دکھائی دی۔ اس نے نوکر کو پکارنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ پھر وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور برآمدے سے گزرنے کے بعد کونے کے کمرے میں داخل ہوا۔ چند ثانیے وہ بے حس و حرکت کمرے کے درمیان کھڑا رہا۔ اس کی ماں آنکھیں بند کیے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ چراغ کی مدھم روشنی میں اس کا رنگ بےحد زرد معلوم ہوتا تھا۔ وہ عورت جس کی صحت پر پڑوس کی نوجوان لڑکیاں رشک کرتی تھیں، اب ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ معلوم ہوتی تھی۔ ایک سن رسیدہ عورت اس کے بستر کے قریب بید کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی، وہ معظم علی کو دیکھتے ہی کرسی سے اٹھ کر ایک طرف ہٹ گئی اور سسکیاں لینے لگی۔

"معظم! بیٹا تمہارا گھر لٹ چکا ہے۔" اس کی آہیں سسکیوں اور سسکیاں چیخوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔

آمنہ نے آنکھیں کھولیں۔ معظم علی "امی جان! امی جان!" کہتا ہوا آگے بڑھا۔ ماں نے ہاتھ پھیلا دیتے اور اس نے بستر کے قریب دوزانو ہو کر اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔ آمنہ معظم علی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی اور اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلے۔ چیخیں ضبط کرنے کی کوشش میں اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "میرے بیٹے! میرے لال تم اس طوفان میں آئے ہو۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔ میں صرف تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تمہارے ابا جان کو بھی تمہارا انتظار تھا لیکن تم نہ آسکے اور یوسف ہم میں سے کسی کا بھی انتظار نہ کر سکا۔"

معظم نے چند سسکیاں لیں اور پھر ایک بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ماں نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ہونٹوں کے ساتھ لگا لیا۔ معظم نے گردن اٹھائی اور اپنا دوسرا ہاتھ ماں کی پیشانی پر رکھتے ہوئے کہا: "امی جان آپ کو بخار ہے۔ میں طبیب کو بلاتا ہوں... صابر کہاں ہے؟"

ماں نے کہا: "صابر ابھی اٹھ کر گیا ہے۔ وہ کئی راتوں سے نہیں سویا اور طبیب کو بلانے

کی ضرورت نہیں۔ حکیم احمد خان ہر روز یہاں آتے ہیں۔ آج شام کے وقت بھی مجھے دیکھ کر گئے ہیں۔ معظم میرے ساتھ وعدہ کرو کہ تم یہاں نہیں رہو گے۔ وہ پرسوں ہمارے گھر کی تلاشی لینے آئے تھے۔ تمھارے ابّا اور یوسف کی بندوقیں اور تلواریں لے گئے ہیں۔ پڑوسی اب ہمارے گھر کے قریب آنے سے ڈرتے ہیں۔ حسین بیگ کی بیوی اور لڑکی نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔ اگر وہ حمیدہ کو یہاں نہ بھیجتیں تو میں شاید اب تک تمھارا انتظار نہ کر سکتی۔ صابر کے سوا ہمارے سب نوکر خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے ہیں۔ میری طرح حسین بیگ بھی بستر پر پڑا ہوا ہے لیکن فرحت صبح شام مجھے دیکھنے کے لیے آتی رہتی ہے۔ بیٹا! ہماری طرح ان کا گھر بھی اجڑ چکا ہے۔"

"امی جان میں سب کچھ سن چکا ہوں۔ عبداللہ خاں مجھے راستے میں ملا تھا۔"

ماں نے کہا: "یوسف اور افضل پلاسی کے میدان میں دفن ہیں۔ کاش میں موت سے پہلے وہاں جا سکتی۔ حسین بیگ وہاں جانا چاہتا تھا لیکن اسے حکم ہے کہ تم گھر سے باہر نہیں جا سکتے۔ میر جعفر نے اس کی جاگیر بھی ضبط کر لی ہے۔ وہ یہاں سے ہجرت کا ارادہ کر رہے ہیں۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ تم بھی ان کے ساتھ ہی چلے جاؤ!"

"امی جان جب آپ سفر کے قابل ہو جائیں گی تو ہم ایک لمحہ کے لیے بھی یہاں نہیں ٹھہریں گے۔"

ماں نے عمر رسیدہ عورت کی طرف دیکھا اور کہا: "حمیدہ تم نے بھی دو راتوں سے آرام نہیں کیا ہے۔ جاؤ ساتھ والے کمرے میں سو جاؤ!"

حمیدہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی لیکن باہر جھانکنے کے بعد مڑ کر بولی: "بارش تھم چکی ہے۔ میں گھر جاتی ہوں۔ ضرورت پڑے تو مجھے بلا لیں!"

حمیدہ کمرے سے نکل گئی اور معظم کی ماں نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا: "بیٹا اٹھ کر کرسی پر بیٹھ جاؤ مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے!"

معظم کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے ماں کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "امی جان آپ

کا بخار بہت تیز ہے۔ میں حکیم کو بلاتا ہوں!"

"نہیں نہیں!" ماں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "تم میرے سامنے بیٹھے رہو!"

"تو میں صابر کو بھیجتا ہوں!"

"حکیم دوا دے کر گیا ہے بیٹا! اب وہ اور کیا کرے گا۔ تم میری بات تو سن لو۔ اصطبل میں کھرلی کے دائیں سرے پر آخری کھونٹے کے بالکل ساتھ تمھاری امانت دفن ہے۔ وہ نکال لینا۔ وہ تمھارے کام آنے والی چیز ہے۔ میں آج صابر کو بتلانے کا ارادہ کر رہی تھی، لیکن خدا کا شکر ہے کہ تم آگئے۔ جب وہ تلاشی لینے آئے تھے تو میں ڈر رہی تھی لیکن تمھارے ابا جان کا خیال صحیح تھا۔ اگر میں اسے مکان کے اندر چھپانے کی کوشش کرتی تو وہ ضرور تلاش کر لیتے۔ انھوں نے ایک ایک کونے کی تلاشی لی تھی۔ شاید انھیں شک تھا کہ سراج الدولہ تمھارے ابا کو کوئی چیز دے گیا ہے۔ ظالم تمھاری کتابیں تک لے گئے ہیں۔ مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتے تھے لیکن حکیم احمد خان نے کہا یہ مر رہی ہے اسے تنگ نہ کرو۔ میر جعفر کا بیٹا، میرن ان کے ساتھ تھا۔ وہ حسین بیگ کے گھر بھی گئے تھے۔ وہ بستر پر پڑا ہوا تھا۔ فرحت کی ماں نے میرن کو برا بھلا کہا اور اس نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ فرحت آگے بڑھی تو ایک سپاہی نے اسے دھکا دے کر گرا دیا!"

معظم علی غصے کی حالت میں اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آگ کے انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔

ماں نے کہا: "بیٹا اب اس ملک میں عزت اور شرافت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ مرشد آباد پر خدا کا قہر نازل ہو چکا ہے۔ حسین بیگ کو علی وردی خاں کے وزیر سلام کرتے تھے، افضل اور آصف، سراج الدولہ کے ساتھ کھیلا کرتے تھے اور آج میر جعفر جیسے ذلیل انسان کے ہاتھوں ان کی ماں اور بہن کی عزت محفوظ نہیں۔"

معظم علی کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کرب انگیز آواز نکلی: "امی جان میں اس سے

زیادہ نہیں سن سکتا۔ میں ان سے ان تمام مظالم کا بدلہ لوں گا۔"

"نہیں معظم! تم میرے ساتھ وعدہ کرو کہ تم یہاں نہیں رہو گے۔ تمھارے باپ کو مرتے وقت یہی خوف تھا کہ تم جوش میں آ کر اپنی جان پر کھیل جاؤ گے اور پھر دنیا میں ہمارا نام لینے والا کوئی نہیں ہوگا۔ میرے بعد یہاں سے کہیں دور چلے جانا اور وہ امانت ضرور نکال لینا، تمھارے کام آئے گی اور شاید تم اس سے حسین بیگ کی بھی مدد کر سکو۔ وہ ہیرے بہت قیمتی ہیں اور میں نے اپنے زیور اور چند اشرفیاں بھی ان کے ساتھ دفن کر دی ہیں لیکن کسی کو اس بات کا علم نہیں ہونا چاہیئے!!"

معظم علی نے پوچھا: "وہ ہیرے کہاں سے آئے؟"

"بیٹا تمھارے اباجان زخمی ہو کر سراج الدولہ کے ساتھ مرشد آباد پہنچے تھے۔ محل کے ایک پہریدار نے مجھے اطلاع دی۔ میں وہاں پہنچی۔ ان کی حالت بہت خراب تھی — سراج الدولہ اور شاہی طبیب ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہی طبیب نے مجھے بتایا کہ زخم بہت خطرناک ہیں اور اس حالت میں سفر کی وجہ سے ان کا بہت سا خون ضائع ہو چکا ہے۔ سراج الدولہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ کہتا تھا کہ میں نے انھیں منع کیا تھا لیکن یہ کسی حالت میں بھی میرا ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ یوسف کی لاش کو بھی سپرد خاک ہوتے نہ دیکھ سکے۔ میں شام تک وہیں رہی لیکن ان کی حالت خراب ہوتی گئی۔ رات کے وقت جب سراج الدولہ نے مرشد آباد چھوڑنے کا ارادہ کیا تو انھوں نے پہریداروں کو حکم دیا کہ انھیں گھر پہنچا دیا جائے اور جب وہ ان کی چارپائی اٹھانے لگے تو سراج الدولہ کی ماں نے اپنا ہار اتار کر میرے گلے میں ڈالنے کی کوشش کی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا۔ "میری بہن یہ انعام نہیں خراج ہے۔ میرے نزدیک دنیا کے تمام خزانے بھی محمود علی خاں کی وفاداری کا صلہ نہیں ہو سکتے۔" لیکن میں نے اس کا تحفہ قبول نہ کیا۔ جب ہم محل سے نکلے تو خواجہ سرا ہمارے ساتھ تھا۔ سپاہی تمھارے اباجان کو گھر چھوڑ کر چلے گئے لیکن

خواجہ سرا رک گیا اور اس نے مجھے ایک چھوٹی سی تھیلی پیش کرتے ہوئے کہا: "یہ نواب صاحب نے بھیجی ہے۔" میں نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ تھیلی میرے سامنے رکھ کر چلا گیا۔

تمھارے اباجان راستے میں بیہوش ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انھیں ہوش آیا تو انھوں نے اصرار کیا کہ میں وہ تھیلی جس میں بیش قیمت ہیرے تھے اپنے پاس رکھنے کی بجائے اصطبل میں دفن کر دوں گا۔ اس وقت میرے نزدیک ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ میں نے وہ تھیلی تمھاری کتابوں کی الماری میں رکھ دی۔ آدھی رات کے قریب وہ چل بسے۔ آخری وقت وہ مجھے بار بار یہ تاکید کرتے تھے کہ ہم یہاں سے فوراً ہجرت کر جائیں۔ انھیں ڈر تھا کہ تم یہاں رہ کر کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔ صبح کے وقت حکیم احمد خاں، مرزا حسین بیگ اور پڑوس کے چند غریب لوگوں کے سوا ان کے جنازے میں کوئی نہ تھا۔ حسین بیگ کی طبیعت بہت خراب تھی، حکیم احمد خان نے انھیں روکا لیکن وہ جنازے میں شامل ہونے پر بضد تھے۔ اگلے دن مجھے پتہ چلا کہ ان کے گھر کی تلاشی لی گئی ہے اور میں نے تمھارے لیے ان ہیروں کی حفاظت کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ رات کے وقت میں نے انھیں دفن کر دیا۔ ان کے ساتھ میرے زیورات بھی دفن ہیں۔ آج شام میں سوچ رہی تھی کہ اگر تم نہ آئے تو میں صابر کو بتا دوں گی لیکن اب خدا کا شکر ہے کہ میرے دل سے ایک بوجھ اتر چکا ہے۔ جب تم کھرلی کے بائیں سرے پر آخری کھونٹے کے ساتھ زمین کھودو گے تو تمھیں ایک صندوقچی ملے گی۔ صندوقچی کے اندر ایک چمڑے کی تھیلی ہے جس میں وہ ہیرے اور میرے زیورات ہیں۔"

معظم خاموش تھا۔ اسے جواہرات اور اشرفیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تصور میں کبھی اپنے بھائی کو میدانِ جنگ میں زخمی ہو کر گرتا اور کبھی اپنے باپ کو نزع کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ کبھی وہ افضل کے متعلق سوچتا اور زندگی کی ہر شے اسے بے حقیقت اور بے معنی نظر آنے لگتی۔

ماں نے کہا۔ "بیٹا تمھاری غیر حاضری میں فرحت تمھارے متعلق پوچھا کرتی تھی۔ وہ کتنی شوخ تھی لیکن اب اس کے آنسو دیکھے نہیں جاتے۔ حسین بیگ کی بیماری کے باوجود ہر روز میرے پاس آتی رہی ہے۔ اس کی ماں نے بھی میرا بہت خیال رکھا ہے۔ اس نے حمیدہ کو میرے پاس بھیج دیا تھا۔ میں سمجھا کرتی تھی کہ وہ معذور ہیں لیکن انھوں نے مجھ پر بہت احسان کیا ہے۔ کاش تم اس احسان کا بدلہ دے سکو۔ بیٹا مجھے اپنے باپ کے پاس دفن کرنا!"

معظم نے کہا۔ "نہیں امی جان آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔"

ماں مسکرائی، لیکن اس کی مسکراہٹ اس کے آنسوؤں اور آہوں سے زیادہ کرب انگیز تھی۔ قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "بیٹا یوسف جیسے بیٹے کی موت کے بعد کوئی ماں اور تمھارے ابا جیسے شوہر کی موت کے بعد کوئی بیوی زندہ نہیں رہ سکتی — بیٹا سچ کہو، تمھیں کوئی خطرہ تو نہیں؟ تم تو یہاں سے بہت دور تھے۔ میر جعفر کو تمھارے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے!"

معظم علی نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "امی جان مجھے کوئی خطرہ نہیں۔"

ماں نے دونوں ہاتھ بڑھا کر معظم کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ "بیٹا میں خدا سے دعا کرتی تھی کہ موت سے پہلے صرف ایک لمحہ کے لیے تمھیں دیکھ لوں۔ پھر میں خوشی سے جان دے دوں گی۔ لیکن اب تمھیں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر میں کچھ دیر اور زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ کم از کم اس وقت تک جب تک کہ مجھے یہ یقین نہیں ہو جاتا ہے کہ تمھیں ان درندوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ بیٹا اگر تمھیں کوئی خطرہ ہے تو خدا کے لیے یہاں نہ ٹھہرو!"

معظم علی نے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "امی جان میری رگوں میں میرے غیور باپ کا خون ہے۔ اگر مرشد آباد بھیڑیوں سے بھر جائے تو بھی میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

ماں نے کرب کی حالت میں آنکھیں بند کر لیں اور ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرے اللہ میرے بیٹے کو دشمن سے بچانا۔ اب تیرے سوا کوئی سہارا نہیں۔" آہستہ آہستہ معظم کے ہاتھ پر اس کی گرفت ڈھیلی ہو رہی تھی۔

"امی جان! امی جان!" معظم علی نے گھبرا کر کہا۔

ماں نے آنکھیں کھولیں اور ٹکٹکی باندھ کر معظم علی کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہونے لگیں۔

"امی جان!" معظم علی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

ماں کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ پھر اس نے ایک کپکپی کے بعد دو تین گہرے سانس لیے اور اس کی آنکھوں میں جھلکتے ہوئے آنسو تکیے پر گر پڑے۔

"امی! امی!" معظم علی اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہا تھا لیکن وہ اپنی زندگی کا سفر ختم کر چکی تھی۔

معظم علی دیر تک سکتے کے عالم میں بیٹھا رہا۔ وہ چلّانا چاہتا تھا لیکن اس کے حلق میں آواز نہ تھی۔ وہ اٹھ کر بھاگنا چاہتا تھا لیکن اس میں ہلنے کی سکت نہ تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔ آمنہ کی آنکھیں کھلی تھیں اور معظم علی یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ ابھی تک اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک خواب ہے۔" "امی! امی!" وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کی نبضیں ٹٹول رہا تھا۔ اسے گہری نیند سے بیدار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے ہاتھ سے اس کی آنکھیں بند کر دیں۔



پچھلے پہر چراغ ٹمٹما رہا تھا لیکن اس نے اٹھ کر تیل ڈالنے یا نوکر کو آواز دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس کے دل میں کسی کو دیکھنے یا کسی کے ساتھ بات کرنے کی خواہش نہ تھی۔ ماضی اور حال کے واقعات کی مختلف تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہی تھیں

وہ نیم خوابی کی حالت میں اپنے والدین، اپنے بھائی اور اپنے دستوں کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی وہ مکتب کے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف تھا اور کبھی فوج کے جوانوں کے ساتھ فنون سپہ گری کی مشق کر رہا تھا۔ پھر جب وہ ماضی کے سپنوں کی دنیا سے نکل کر حال کی تلخیوں کا سامنا کرتا تو اس کا دل نفرت اور حقارت سے بھر جاتا۔ صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے اور وہ نیم خوابی کی حالت میں آنکھیں بند کیے کبھی دلکش اور کبھی بھیانک سپنے دیکھ رہا تھا۔ اچانک اسے اپنے سر پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا اور اس کے کانوں میں ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز آنے لگی تاہم وہ بدستور آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ ہاتھ کی انگلیاں اس کی پیشانی کو چھونے لگیں۔ پھر کسی نے نحیف اور سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "معظم! معظم!"

معظم نے مڑ کر دیکھا اور اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک نوجوان لڑکی گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"کون! فرحت؟"

فرحت کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اس نے جواب دینے کی بجائے سر جھکا دیا۔

معظم علی نے کہا: "امی جان اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں"۔

فرحت نے اپنی اوڑھنی کے ساتھ آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہے۔ میں انھیں دیکھ چکی ہوں۔ میں کافی دیر سے یہاں کھڑی تھی۔ آپ شاید سو رہے تھے۔ میں ڈر گئی تھی۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

معظم علی نے فرحت کی طرف دیکھا اور اسے اس ظلم، مکر اور ریا کی تاریک دنیا میں ایک روشنی دکھائی دینے لگی۔ اس نے تشکر اور احسان مندی کے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔ "فرحت میں بہت سخت جان ہوں"۔

فرحت نے کہا۔ "حمیدہ کہاں گئی؟ میں نے اسے تاکید کی تھی کہ اگر ان کی طبیعت

زیادہ خراب ہو تو ہمیں اطلاع دینا۔ میں نے صابر سے بھی کہا تھا"۔

معظم علی نے جواب دیا۔ "وہ رات کے وقت اپنے گھر چلی گئی تھی اسے امی جان نے بھیجا تھا"۔

"آپ کب آئے تھے؟"

"میں آدھی رات کے قریب یہاں پہنچا تھا۔ اس وقت امی جان کی حالت باذ تشویش ناک نہیں تھی۔ وہ دیر تک میرے ساتھ باتیں کرتی رہیں لیکن پھر اچانک ——— مجھے اب بھی ان کی موت کا یقین نہیں آتا لیکن اب دنیا بدل چکی ہے۔ چند دنوں کے اندر اندر کتنی ناقابل یقین باتیں ہو چکی ہیں۔ یوسف اور افضل کی موت پر کسے یقین آسکتا ہے۔ فرحت کاش میں تمھیں بتا سکتا کہ افضل اور یوسف مجھے کتنے عزیز تھے اور ان کی موت کے میرے لیے کیا معنی ہیں؟"

"مجھے معلوم ہے"۔

"تمھارے ابا جان اب کیسے ہیں؟"

شام کے وقت ان کی طبیعت بہت خراب تھی لیکن آدھی رات کے قریب انھیں نیند آگئی تھی اور اب ان کی حالت کچھ بہتر ہے۔ نماز کے وقت مجھے امی جان نے کہا تھا کہ میں چچی جان کا پتہ کروں۔ اب میں جاتی ہوں۔ وہ انتظار کر رہی ہوں گی"۔

معظم علی نے کہا۔ "فرحت امی جان تمھاری بہت احسان مند تھیں اور میں بھی ہمیشہ تمھارا ممنون رہوں گا"۔

"لیکن مجھے ہمیشہ اس بات کا ملال رہے گا کہ میں آخری وقت ان کے پاس نہ تھی ——" یہ کہہ کر فرحت آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی لیکن دہلیز سے باہر پاؤں رکھتے ہوئے وہ رکی اور مڑ کر معظم علی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "ابا جان کہتے تھے کہ آپ کا یہاں آنا خطرناک ہے۔ وہ ہر اچھے آدمی کو گرفتار کر

رہے ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔" آپ فکر نہ کریں۔ اب میرے لیے کوئی بات خطرناک نہیں ہوسکتی۔"

"لیکن آپ کو احتیاط ضرور کرنی چاہیئے!"

"مجھے یقین ہے کہ افضل کی بہن مجھے خطرے سے بھاگنے کا مشورہ نہیں دے گی۔"

"نہیں، میں آپ کو بھیڑیوں کا مقابلہ کرنے سے منع نہیں کرتی۔ صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ ان کے نرغے میں آنے کی کوشش نہ کریں۔"

"اب سارا بنگال بھیڑیوں کے نرغے میں آچکا ہے۔"

فرحت کچھ اور کہے بغیر باہر نکل گئی۔

ایک ستارہ جسے اس نے ہمیشہ آسمان کی بلندیوں پر دیکھا تھا اس کے ظلمت کدہ میں نور کی کرنیں بکھیرنے کے بعد روپوش ہوچکا تھا۔ معظم علی کچھ دیر دروازے میں کھڑا صحن کی طرف دیکھتا رہا۔ فرحت، مرزا حسین بیگ کی بیٹی، آصف اور افضل کی بہن اس کے گھر آئی تھی۔ وہ اسے دیکھ چکا تھا۔ اس کے ساتھ باتیں کرچکا تھا۔ لیکن سازِ حیات کے وہ تار جو کبھی اس کے تصور سے لرز اٹھتے تھے۔ اب خاموش تھے۔ آرزوؤں! امنگوں اور دلولوں کا وہ صنم کدہ جسے اس نے فرحت کی خیالی تصویروں سے آباد کیا تھا ویران ہوچکا تھا۔



برآمدے کے دوسرے کونے میں صابر اپنے بستر پر گہری نیند سو رہا تھا۔ معظم علی نے آگے بڑھ کر اسے جگایا۔ صابر بدحواسی کی حالت میں اٹھا اور بے اختیار معظم علی سے لپٹ گیا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز اس کے قابو میں نہ تھی اس کی سسکیاں چیخوں میں تبدیل ہو رہی تھیں اور پھر جب اس نے سنبھل کر اپنی تباہی کی داستان سنانے کی کوشش کی تو معظم علی نے کہا:

"صابر مجھے سب معلوم ہے۔"

صابر نے کہا۔" آپ کی امی جان بیمار ہیں۔ چلیئے وہ اس کمرے میں ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔" وہ اس دنیا سے رخصت ہوچکی ہیں۔"

صابر چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑا معظم علی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور پھر ایک بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا ہوا باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر بعد محلے کی عورتیں وہاں جمع ہو رہی تھیں اور معظم علی دیوان خانے کے برآمدے میں محلے کے آدمیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ حسین بیگ لاٹھی ٹیکتا ہوا مکان کے اندر داخل ہوا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتا تھا اور کمزوری کے باعث اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ افضل اور فرحت کے باپ کی یہ حالت معظم علی کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ وہ بے اختیار اٹھ کر آگے بڑھا اور حسین بیگ نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے سینے سے لگا لیا۔

معظم علی نے کہا۔" چچا جان آپ کو بخار ہے۔ آپ کو آرام کرنا چاہیئے تھا!"

حسین بیگ نے جواب دیا۔" بیٹا! اب مجھے قبر میں ہی آرام مل سکتا ہے۔" حسین بیگ کچھ دیر برآمدے کے فرش پر معظم علی کے پاس بیٹھا رہا لیکن محلے کے لوگوں نے اسے مجبور کرکے کمرے کے اندر بستر پر لٹا دیا۔ کچھ دیر بعد جب معظم علی کی والدہ کا جنازہ اٹھایا جارہا تھا، حسین بیگ کمرے سے باہر نکل آیا لیکن معظم علی نے کہا۔" چچا جان! اس حالت میں آپ کو جنازے کے ساتھ نہیں جانا چاہیئے۔ آپ گھر جاکر آرام کریں۔"

محلے کے ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر حسین بیگ کو سہارا دیا اور وہ بادل نخواستہ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

اپنی والدہ کو سپردِ خاک کرنے کے بعد معظم علی اپنے گھر جانے کی بجائے مرزا حسین بیگ کی حویلی میں داخل ہوا۔ مرزا حسین بیگ نچلی منزل کے ایک کمرے میں لیٹے ہوئے تھے، فرحت اور اس کی والدہ ان کے بستر کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ خادمہ نے معظم علی

کی آمد کی اطلاع دی۔ فرحت اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ معظم علی کمرے میں داخل ہوا تو فرحت کی ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ معظم علی، حسین بیگ کے اشارے سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ حسین بیگ نے قدرے توقف کے بعد کہا: "معظم علی! ہمیں ایک دوسرے کو یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ ہم پر کیا گزری ہے۔ اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ تم نوجوان ہو اور تمھاری ہمت ہمارا آخری سہارا ہے۔ تم بہت تھکے ہوئے ہو اور تمھارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم نے کئی دن سے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ میں تمھارے گھر کھانا بھیج رہا تھا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ یہیں بیٹھ کر کچھ کھا لو۔"

"چچا جان مجھے بھوک نہیں۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میری خاطر چند نوالے کھا لو۔" پھر وہ اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا۔ "عابدہ! خادمہ سے کہو ان کے لیے کھانا لے آئے۔"

"میں خود لاتی ہوں۔" حسین بیگ کی بیوی یہ کہہ کر آنسو پونچھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد عابدہ نے کھانا لا کر معظم علی کے سامنے تپائی پر رکھ دیا۔ معظم علی نے حسین بیگ کے دوبارہ اصرار کرنے پر بادل ناخواستہ ایک لقمہ اٹھا کر منہ میں ڈالا تھا کہ اچانک ایک نوکر بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا: "میر میرن آیا ہے اور اس کے ساتھ مسلح سپاہی ہیں۔"

میر میرن، میر جعفر کا بیٹا تھا اور مرزا حسین بیگ اور معظم علی کے لیے اس کی آمد کوئی معمولی بات نہ تھی۔ مرزا حسین بیگ بستر سے اٹھا اور اپنی لاٹھی پکڑ کر لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ معظم علی نے جلدی سے اٹھ کر ایک بازو پکڑ لیا۔ وہ دیوانخانے کے برآمدے میں داخل ہوئے۔ نیچے صحن میں میر میرن بیس مسلح سپاہیوں کے ساتھ دکھائی دیا۔ میر میرن اپنی عمر کے لحاظ سے کافی موٹا تھا۔ اس کے چہرے سے غرور، عیاری، بے حیائی اور سفاکی

مترشح تھی۔ وہ مرزا حسین بیگ اور معظم علی کو دیکھ کر آگے بڑھا اور برآمدے کی سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر بولا۔ "تمھارا نام معظم علی ہے؟"

معظم علی کی خاموشی پر مرزا حسین بیگ نے جواب دیا۔ "ہاں ان کا نام معظم علی ہے۔"

میر میرن نے حقارت سے حسین بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بوڑھے تم خاموش رہو!"

معظم علی نے محسوس کیا کہ اس کے دل پر انگارہ رکھ دیا گیا ہے۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

میر میرن نے آگ بگولا ہو کر کہا۔ "بدتمیز ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ تم مرشد آباد کیوں آئے ہو؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "مرشد آباد میرا گھر ہے۔"

میر میرن نے پوچھا۔ "کیا میدنا پور کے فوجدار نے تمھیں وہاں حاضر ہونے کا حکم نہیں بھیجا تھا؟"

"میدنا پور کے فوجدار نے مجھے وہاں بلایا تھا لیکن اس نے مجھے پلاسی کی جنگ کے حالات نہیں بتلائے تھے۔"

"اور اب تمھیں پلاسی کی جنگ کے حالات معلوم ہو چکے ہیں۔"

"ہاں۔"

میر میرن نے کہا۔ "ہم تم سے وفاداری کا حلف لینے آئے ہیں۔"

"وفاداری کا حلف! میر جعفر کے لیے؟" معظم علی نے تن کر کہا۔

میر میرن نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ "بیوقوف تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم کسی اور کے لئے وفاداری کا حلف لینے آئے ہیں؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "وفاداری کا حلف سنگینوں کے پہرے میں نہیں لیا جاتا۔ میں

یہ ماننے سے انکار کرتا ہوں کہ میر جعفر بنگال کا حکمران ہے۔"

"سپاہیو!" میر میرن پوری قوت سے چلایا۔ "تم کیا دیکھ رہے ہو۔ اسے گرفتار کرلو!"

"ٹھہرو!" حسین بیگ نے اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دو تین قدم آگے بڑھ کر میر میرن سے مخاطب ہوا۔ "میر میرن خدا سے ڈرو۔ معظم علی کا باپ اور بھائی اپنے خون سے تمھارے باپ کی غدّاری کی قیمت ادا کر چکے ہیں۔"

میر میرن نے انتہائی غضب کی حالت میں آگے بڑھ کر حسین بیگ کے منہ پر تھپڑ مارا اور وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر گر پڑا۔

آن کی آن میں معظم علی نے یکے بعد دیگرے میر میرن کے منہ پر دو گھونسے رسید کیے میر میرن تیورا کر پیٹھ کے بل گر پڑا۔

سپاہیوں نے تلواریں سونت لیں لیکن میر میرن چلایا۔ "خبردار! میں اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔"

چند سپاہی تلواریں پھینک کر معظم علی پر ٹوٹ پڑے لیکن اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ میر میرن کے حکم سے معظم علی کو صحن کے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ میر میرن نے اس کی قمیص نوچ کر پھینک دی اور ایک سپاہی کے ہاتھ سے کوڑا لے کر کہا۔ "تمھارے جیسے باغیوں کی سزا موت نہیں۔ تمھاری سزا یہ ہے! کہو اب وفاداری کا حلف اٹھانے پر راضی ہو یا نہیں؟"

جب معظم علی پر کوڑے برسائے جا رہے تھے تو مرزا حسین بیگ نے اٹھ کر مداخلت کی کوشش کی۔ لیکن ایک سپاہی نے اپنی تلوار کی نوک اس کے سینے پر رکھ کر اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اچانک فرحت کمرے سے نکلی اور بھاگ کر معظم علی اور میر میرن کے درمیان کھڑی ہوگئی۔ میر میرن نے کوڑا بلند کیا تو وہ آگے بڑھ کر معظم علی کے لیے ڈھال بن گئی۔ میر میرن نے اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف ہٹانے کی کوشش کی تو اس

نے دونوں ہاتھوں سے کوڑے کا ایک سرا پکڑ لیا۔ دو سپاہیوں نے فرحت کو پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا اور وہ ان کی گرفت میں بے بس ہو کر چلا رہی تھی۔ "تم کمینے ہو، تم بزدل ہو، ایک آدمی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور تم یہ سمجھتے ہو کہ تم شیر بن گئے ہو۔"

میر میرن نے پے در پے معظم علی کو چند اور کوڑے لگائے اور جب اس نے بیہوش ہو کر گردن ڈھیلی چھوڑ دی تو اس نے سپاہیوں سے کہا۔ "اسے قیدخانے لے چلو۔" پھر وہ آگے بڑھ کر حسین بیگ کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم بوڑھے ہو اور ابا جان نے مجھے حکم دیا تھا کہ تم پر سختی نہ کی جائے لیکن اب ہمارے دشمنوں کے لیے بنگال میں کوئی جگہ نہیں میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ تم ایک ہفتہ کے اندر اندر بنگال کی حدود سے نکل جاؤ۔"

معظم علی کو ہوش آیا تو وہ ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں پڑا ہوا تھا۔ دو مسلح سپاہی اس کے سر پر کھڑے تھے اور ایک تیسرا پانی کی بالٹی سے کپڑا بھگو بھگو کر اس کے زخموں پر ڈال رہا تھا۔ معظم علی نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پانی مانگا۔ ایک سپاہی نے کوٹھڑی کے کونے میں مٹی کے گھڑے سے پانی کا ایک پیالہ بھر کر اسے دیا۔ معظم علی نے پانی پینے کے بعد سپاہیوں کی طرف دیکھا اور سوال کیا۔ "میں کہاں ہوں؟"

ایک سپاہی نے جواب دیا۔ "تم مرشد آباد کے قیدخانے میں ہو۔"

معظم علی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد سپاہی جا چکے تھے اور کوٹھڑی کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ وہ انتہائی کرب کی حالت میں منہ کے بل فرش پر لیٹ گیا۔

قید و بند کی صعوبتیں اس کے لیے نئی نہ تھیں۔ وہ اس سے پہلے بھی قید رہ چکا تھا لیکن اس کا المناک پہلو یہ تھا کہ اسے اس سلطنت کا باغی قرار دیا جا چکا تھا جس کی آزادی کے لیے اس کا باپ، اس کا بھائی اور اس کے دوست شہید ہو چکے تھے۔ آٹھ

دن بعد اس کی کوٹھڑی میں تین اور قیدی دھکیل دیئے گئے۔ یہ تینوں بنگال کی فوج کے بڑے بڑے افسر تھے اور ان کی زبانی معظم علی نے ان سے حسین بیگ کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ اس کی گرفتاری کے دوسرے روز مرشدآباد سے ہجرت کر گئے تھے اور حکومت نے ان کی جائداد ضبط کر لی ہے۔ ایک افسر نے معظم علی کو بتایا کہ ان کے ساتھ تیس اور آدمی گرفتار ہوتے ہیں اور ابھی مزید گرفتاریوں کی توقع ہے۔ گذشتہ چند دنوں میں مرشدآباد کا قیدخانہ بھر چکا ہے اور اب قیدیوں کو دوسرے شہروں میں بھیجنے کی تجویز پر غور ہو رہا ہے۔ قید ہونے والوں میں صرف حکومت کے باغی ہی نہیں بلکہ وہ متمول لوگ بھی ہیں جن کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ میر جعفر کو بڑی بڑی رقومات پیش نہیں کر سکے۔ میر جعفر اپنے انگریز سرپرستوں کو خوش رکھنے کی کوشش میں مرشدآباد کا خزانہ ان کے حوالے کر چکا ہے اور اب لارڈ کلایو کے بڑھتے ہوئے مطالبات پورا کرنے کے لیے اس نے بنگال کے امرا کو بے تحاشا لوٹنا شروع کر دیا ہے۔ بڑے بڑے زمیندار اور تاجر کوڑی کوڑی کے محتاج ہو کر بنگال سے ہجرت کر رہے ہیں۔

○

معظم علی کو مرشدآباد کے قیدخانے میں اڑھائی مہینے گزر گئے۔ ایک دن قیدخانے کا داروغہ چند مسلح سپاہیوں کے ساتھ اس کی کوٹھڑی میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "معظم علی آج تمہارا مقدمہ عدالت کے سامنے پیش ہوگا۔"

معظم علی ننگی تلواروں کے پہرے میں اپنی کوٹھڑی سے باہر نکلا اور داروغہ کے ساتھ چل دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ قیدخانے کے ایک کشادہ کمرے میں کھڑا تھا اور اس کے سامنے عدالت کی کرسی پر میر جعفر کے خاندان کا ایک فوجی افسر میر ناصر رونق افروز تھا۔ اس کے دائیں بائیں چار اور فوجی افسر بیٹھے تھے۔ میر ناصر، اڑیسہ کی بعض لڑائیوں میں معظم علی کے ساتھ رہ

چکا تھا۔ اس نے معظم علی کی طرف دیکھا اور پھر اپنے سامنے میز سے ایک کاغذ اٹھا کر پڑھنے کے بعد کہا۔ "معظم علی تمہارے خلاف پہلا الزام یہ ہے کہ تم میدناپور کے فوجدار کا حکم ملنے پر وہاں حاضر ہونے کی بجائے مرشدآباد آ گئے تھے۔ تمہارے خلاف دوسرا الزام یہ ہے کہ تم نے لوگوں کو حکومت کے خلاف بغاوت پر اکسایا تھا اور تمہارے خلاف تیسرا الزام یہ ہے کہ تم نے گرفتاری کے وقت میر میرن پر حملہ کیا تھا۔ یہ تینوں الزامات بے حد سنگین ہیں۔ تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

معظم علی نے پہلے اپنے دائیں بائیں اور پیچھے ان پہریداروں کی طرف دیکھا جو ننگی تلواریں لیے کھڑے تھے اور پھر کرسیٔ عدالت کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ اس عدالت میں آپ مجھ سے زیادہ بے بس ہیں۔ اس لیے میں صفائی پیش کر کے آپ کی پریشانی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا لیکن اگر آپ سننا ہی چاہتے ہیں تو میرا جواب یہ ہے کہ مجھے سرحدی قلعے سے میدناپور روانہ ہوتے ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میں نے جس حکومت کی خدمت کا بیڑا اٹھایا تھا وہ ختم ہو چکی ہے اور اب میدناپور کا فوجدار یا تو مرشدآباد کے حالات سے بے خبر ہے یا وہ ایک ایسی حکومت کا نمائندہ ہے جس کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ اس کے بعد مرشدآباد میں ایسے لوگ مجھ سے وفاداری کا حلف لینا چاہتے تھے جن کے ہاتھ بنگال کے حریت پسندوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ مجھ پر تیسرا الزام یہ ہے کہ میں نے میر میرن پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ میر میرن میرے نزدیک بنگال کے جائز حکمران کا بیٹا نہیں تھا بلکہ ایک ایسا بدزبان اور بداخلاق آدمی تھا جس نے میری قوم کے ایک ایسے بزرگ پر ہاتھ اٹھایا تھا جس کے نوجوان بیٹے بنگال کی آزادی کے لیے اپنا خون پیش کر چکے ہیں — میرا اصلی جرم یہ ہے کہ میں نے بنگال میں جنم لیا اور پھر ایک سپاہی کی حیثیت میں اس قوم کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا، جس کے امرا اسے چند ٹکوں میں فروخت کرنے کے لیے تیار تھے۔"

میر ناصر نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تم زندگی سے بہت تنگ آ چکے ہو۔ یہ جگہ ایسی تقریروں کے لیے موزوں نہیں۔ تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے تو ہم سننے کے لیے تیار ہیں۔"

"میں ایک ایسی عدالت کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنا انسانیت کی توہین سمجھتا ہوں جو مجھ سے زیادہ بے بس ہے۔ میر جعفر کو اس تکلف کی ضرورت نہ تھی۔ میں آپ کی زبان سے اپنے متعلق ان کا حکم سننے کے لیے تیار ہوں۔"

میر ناصر کچھ دیر گردن جھکا کر سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے قلم اٹھایا اور کاغذ پر چند سطور لکھنے کے بعد معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "تمہارے جرائم نہایت سنگین ہیں لیکن تمہارے خاندان کی گذشتہ خدمات کے پیش نظر تم کو سات سال قید کی سزا دی جاتی ہے۔"

معظم علی نے ایک کرب انگیز مسکراہٹ کے ساتھ میر ناصر کی طرف دیکھا اور میر ناصر نے اپنی گردن جھکا لی۔

معظم علی نے مڑ کر قید خانے کے داروغہ کی طرف دیکھا جو اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ داروغہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور اس نے منہ پھیرتے ہوئے سپاہیوں سے کہا۔ "اسے لے چلو!"

رات کے وقت جب قید خانے کی کوٹھڑی میں معظم علی کے ساتھی گہری نیند سو رہے تھے وہ سربسجود ہو کر انتہائی انکسار کے ساتھ یہ دعا مانگ رہا تھا۔ "میرے مولیٰ مجھے ہمت دے کہ میں اس آزمائش میں پورا اتر سکوں۔"

آٹھ مہینے اور گزر گئے۔ اس عرصہ میں معظم علی کے ساتھی کسی اور جگہ منتقل ہو چکے تھے اور ہر وقت وہ قید خانے سے فرار ہونے کی تدبیریں سوچا کرتا تھا۔

دسواں باب

ایک رات اچانک معظم علی کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور ایک سپاہی نے جس کے ہاتھ میں مشعل تھی، اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ "آپ باہر آئیں!"

معظم علی باہر نکلا تو چار مسلح سپاہیوں کے علاوہ وہ قید خانے کا داروغہ اور میر ناصر دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ میر ناصر نے کہا۔ "معظم علی میں تمہیں کسی اور جگہ لے جانا چاہتا ہوں اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم بھاگنے کی کوشش نہیں کرو گے تو تمہیں بیڑیاں پہننے کی تکلیف نہ دی جائے۔"

معظم علی نے سوال کیا۔ "آپ کو میرے وعدے پر اعتبار آ جائے گا؟"

"ہاں" میر ناصر نے جواب دیا۔

"آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟"

"میں تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔"

معظم علی نے داروغہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ بے بس ہیں۔ لیکن اگر قید خانے سے باہر میر میرن میرا انتظار کر رہا ہے تو آپ کو کسی جھجک کے بغیر یہ بات کہہ دینی چاہیے۔"

داروغہ کی بجائے ناصر نے کہا۔ "میں آپ کو صرف اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نیک ارادے سے یہاں آیا ہوں۔"

معظم علی نے کہا۔ "موجودہ حالات میں اگر اس ملک میں نیکی کا تصور باقی رہ گیا ہے تو یہ ایک معجزہ ہے۔ بہرحال میں اس مجبوری کی حالت میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ چلیے!"

معظم علی، میر ناصر کے ساتھ قید خانے کے پھاٹک سے باہر نکلا تو دو سپاہی بندوقیں اٹھائے سامنے کھڑے تھے اس نے جواب طلب نگاہوں سے میر ناصر کی طرف دیکھا تو اس نے جلدی سے کہا۔ "آپ گھبرائیں نہیں۔ ذاتی طور پر مجھے آپ کے وعدے پر اعتبار ہے لیکن اگر آپ غلطی کر بیٹھیں تو آپ کی جگہ میں عمر بھر کی قید کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں۔ یہ آدمی ہمارے پیچھے آئیں گے اور آپ کی اطلاع کے لیے میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں بہترین نشانہ باز ہیں۔"

معظم علی نے میر ناصر کے ساتھ چلنے کے بعد اچانک سوال کیا۔ "میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ انھیں یہاں سے کتنی دور نشانہ بازی کا حکم دیا جائے گا؟"

میر ناصر نے جواب دیا۔ "معظم علی گھبراؤ نہیں۔ تمھیں میر قاسم نے بلایا ہے۔"

"میر قاسم کون، میر جعفر کا داماد؟"

"ہاں۔ میں اکثر ان سے تمھارا ذکر کیا کرتا تھا۔ آج انھوں نے تم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اگر تم عقلمندی کا ثبوت دو تو مجھے امید ہے کہ اس ملاقات کے نتائج تمھارے حق میں برے نہیں ہوں گے۔"

معظم علی نے کہا۔ "اگر میر قاسم یہ سمجھتا ہے کہ قید میں رہ کر میر جعفر کی حکومت کے متعلق میرے خیالات بدل گئے ہیں تو اسے مایوسی ہوگی۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ مجھے یہیں سے واپس لے چلیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ میر قاسم کو تمھارے استقلال نے متاثر کیا ہو اور بنگال اور میر جعفر کے متعلق اب اس کے خیالات بھی وہی ہوں جو تمھارے ہیں۔"

قریباً ایک گھنٹہ چلنے کے بعد معظم علی اور میر ناصر، قاسم کے عالیشان مکان میں داخل

ہوئے۔ دیوان خانے کے قریب ایک روشن کمرے کے سامنے پہنچ کر سپاہی رک گئے اور میر ناصر اور معظم علی کمرے میں داخل ہوئے۔ میر قاسم ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میر ناصر نے کہا۔ "یہ معظم علی ہے!"

میر قاسم نے معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "بیٹھ جاؤ!"

معظم علی کو کرسی پر بیٹھتے ہوئے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ وہ ایک قیدی کا بوسیدہ لباس پہنے ہوئے ہے۔ میر قاسم کچھ دیر بغور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا "معظم علی میں تمھارے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں اور میں نے قید خانہ کے داروغہ کو ہدایت کی تھی کہ تمھیں کوئی تکلیف نہ دی جائے، مجھے افسوس ہے کہ جو لوگ سونے میں تولے جانے کے قابل تھے وہ قید خانے میں سڑ رہے ہیں۔ بنگال کو مزید تباہی سے بچانے کی اب ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ اسے میر جعفر کی حکومت سے نجات دلائی جائے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اس تباہی کی ذمہ داری مجھ پر بھی عائد ہوتی ہے لیکن ہم غلط فہمی اور غلط اندیشی میں مبتلا تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ میر جعفر حکومت کی گدی پر بیٹھنے کے بعد ایک اچھا حکمران ثابت ہوگا لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس کی حکومت بنگال کے لیے ایک لعنت ہے۔ وہ ایک کولھو ہے جس سے انگریز بنگال کے عوام کا خون نچوڑنے کا کام لے رہے ہیں۔ اس نے بنگال کے بہترین اضلاع انگریزوں کے حوالے کر دیئے ہیں۔ بنگال کے امراء کوڑی کوڑی کے محتاج ہو کر یہاں سے ہجرت کر رہے ہیں۔ میں نے فوج کے محب وطن نوجوانوں سے بات چیت کی ہے۔ وہ میر جعفر کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے میرا ساتھ دینے کو تیار ہیں اور میرے ساتھ تعاون کے لیے ان کی پہلی شرط یہ ہے کہ میں تم جیسے لوگوں کو قید سے رہا کرانے کی کوشش کروں۔"

معظم علی نے چند ثانیے سوچنے کے بعد کہا۔ "میر جعفر کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے پہلے آپ کو انگریز کے ساتھ لڑنا پڑے گا اور انگریز کے ساتھ لڑنے کے لیے فوج کے

چند افسروں کا تعاون کافی نہیں۔ اس کے لیے عوام کو بیدار اور منظم کرنے کی ضرورت ہے۔"

میر قاسم مسکرایا۔" موجودہ حالات میں انگریز کے ساتھ لڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لارڈ کلائیو خود میر جعفر سے تنگ آچکا ہے۔"

معظم علی نے کہا۔" اور اب وہ میر جعفر کی جگہ آپ کو گدی پر بٹھانا چاہتا ہے؟"

میر قاسم نے جواب دیا۔" میں تمھیں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ اگر ہم میر جعفر کو گدی سے اتارنے کے لیے تیار ہو جائیں اور لارڈ کلائیو کو یہ احساس دلا سکیں کہ اُمراء، سپاہی اور عوام ہمارے ساتھ ہیں تو وہ میر جعفر کا ساتھ دینا پسند نہ کرے گا۔"

معظم علی نے کہا۔" تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کو میر جعفر کی نسبت زیادہ کارآمد سمجھتا ہے؟"

میر قاسم نے اپنی پریشانی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔" تم ایک ذہین آدمی ہو۔ تم جانتے ہو کہ موجودہ حالات میں ہم اس قابل نہیں کہ انگریز کے ساتھ ٹکرّ لے سکیں لیکن میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر مجھے حکومت کا موقع ملا اور تمھارے جیسے لوگوں نے میرا ساتھ دیا تو میں بہت جلد ایک ایسی طاقت منظم کرسکوں گا جو اس ملک کو انگریزوں کے وجود سے پاک کرسکے۔"

معظم علی مسکرایا۔" آپ انگریزوں کی سرپرستی میں اقتدار کی مسند پر بیٹھ کر ان کے خلاف لڑنے والی فوج منظم کرنا چاہتے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ لارڈ کلائیو آپ سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوگا۔ دیکھیے میں آپ سے صاف صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ نے مجھے اس لیے بلایا ہے کہ میں اس مہم میں آپ کا ساتھ دوں تو آپ کو مایوسی ہوگی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم میر جعفر کی حکومت پر مطمئن ہو؟"

"میں کسی ایسی حکومت پر مطمئن نہیں ہو سکتا جسے لارڈ کلائیو کی سرپرستی حاصل ہو۔ میں ایک سوراخ میں دوبارہ ہاتھ ڈالنے کی غلطی نہیں کروں گا۔"

میر قاسم نے مایوس ہو کر کہا۔" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم تمام عمر قید خانہ میں رہنا پسند کرتے ہو؟"

معظم علی نے جواب دیا۔" میں چھوٹے قید خانے سے نکل کر بڑے قید خانے میں نہیں آنا چاہتا۔"

میر قاسم نے کچھ سوچ کر کہا۔" فرض کرو اگر میں اپنی ذمہ داری پر تمھیں قید سے آزاد کردوں تو تم کیا کروگے؟"

"میں موقع ملتے ہی یہاں سے بھاگنے کی کوشش کروں گا۔ اب مجھے بنگال کی آب و ہوا راس نہیں آئے گی۔"

میر قاسم نے کرسی سے اٹھ کر کچھ دیر کمرے میں ٹہلنے کے بعد کہا۔" اگر اب تمھیں واپس قید خانے میں بھیج دیا جائے تو کیا میں یہ توقع رکھ سکتا ہوں کہ ہمارے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں کسی اور پر ظاہر نہیں ہوں گی؟"

"ہاں! اور اگر آپ واقعی میر جعفر کی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں تو قید خانے میں میری دعائیں آپ کے ساتھ ہوں گی پھر جس دن مجھے یہ معلوم ہوگا کہ آپ انگریزوں کے ساتھ برسرپیکار ہیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں کہ مجھے قید سے نکلنے کی اجازت دی جائے۔"

میر قاسم نے سوال کیا۔" اگر تمھیں اس وقت آزاد کردیا جائے تو تم کہاں جاؤ گے؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں لیکن میں بنگال میں نہیں رہوں گا۔"

"جاؤ تم آزاد ہو!"

معظم علی کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا اور وہ مسرت اور استعجاب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ میر قاسم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میر قاسم نے اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔" میری طرف کیا دیکھ رہے

ہو۔ میں کہتا ہوں تم آزاد ہو۔ اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ میں نے تمھیں کیوں آزاد کیا ہے تو سنو۔ پلاسی کی جنگ کے بعد میں نے تم جیسے کئی نوجوانوں کو بغاوت کی سزا پاتے دیکھا ہے اور میں ہمیشہ اپنے دل کو یہ تسلی دینے کی کوشش کرتا تھا کہ یہ ہمارے خاندان کے دشمن ہیں لیکن آج بنگال پر ہمارا خاندان نہیں بلکہ انگریز حکمران ہے۔ آج میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک معمولی کلرک میر جعفر کی نسبت زیادہ اختیارات کا مالک ہے۔ اگر آج سے چند ماہ قبل کوئی شخص تمھاری طرح میری طرف گستاخ نگاہوں سے دیکھتا تو میں اس کی آنکھیں نکال لیتا لیکن اب ہم ہر ذلت کے عادی ہو چکے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ادنیٰ ملازم ہمیں آواز دے کر بلانے کی بجائے انگلی کے اشاروں سے بلاتے ہیں۔ تم خوش قسمت ہو کہ تم ایک قیدی کے لباس میں بھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتے ہو۔ کاش میں بھی اسی طرح لارڈ کلایو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتا۔ تم جا سکتے ہو۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ ہم انگریزوں کے ساتھ نہیں لڑ سکتے لیکن یاد رکھو! جب کبھی موقع آئے گا ہم ان کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو انھوں نے ہمارے ساتھ کیا ہے۔"

پھر وہ میر ناصر کی طرف متوجہ ہوا۔ "ناصر! تم نے شرط جیت لی ہے۔ انھیں لے جاؤ اور میرے نوکروں سے کہو انھیں نیا لباس اور گھوڑا دے دیں۔ انھیں مرشدآباد کے باہر پہنچانا تمھاری ذمہ داری ہے۔"

کمرے سے باہر نکلتے وقت معظم علی، میر قاسم کی آنکھوں میں آنسو دیکھ رہا تھا۔ کمرے سے باہر نکل کر اس نے میر ناصر سے سوال کیا۔ "آپ نے میر قاسم سے کون سی شرط جیتی ہے؟"

میر ناصر نے جواب دیا۔ "میر قاسم کا خیال تھا کہ آپ قید سے رہائی کی امید پر ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے اور میری رائے اس کے خلاف تھی۔ انھوں نے مذاق میں کہا تھا کہ اگر معظم علی مجھے دیکھتے ہی میرے پاؤں پر نہ گر پڑا تو میں تمھیں دس اشرفیاں انعام دوں گا اور میں نے یہ کہا تھا کہ جس معظم علی کا مقدمہ میرے سامنے پیش ہوا تھا وہ

اور ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا سکتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی نے کہا۔ "میں اپنی رہائی کے لیے آپ کا شکرگزار ہوں۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہ آسکی کہ میر جعفر اور میرن کو جب میرے متعلق معلوم ہوگا تو آپ لوگ کیا جواب دیں گے؟"

"میر جعفر اور میرن ان دنوں انگریزوں کے لیے روپیہ جمع کرنے کے سوا کچھ نہیں سوچ سکتے اور پھر میر قاسم اتنے بے اختیار نہیں کہ اپنی مرضی سے ایک قیدی بھی رہا نہ کر سکیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ فوراً مرشدآباد سے نکل جائیں اور جلد از جلد بنگال کی سرحد عبور کر لیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں ایک دو دن بعد یہ خبر مشہور کرنی پڑے کہ ایک خطرناک قیدی کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ میر قاسم کے سپاہی آپ کو شہر کے باہر چھوڑ آئیں گے۔"

معظم علی نے کہا۔ "کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں یہاں سے تنہا جاؤں۔ میرے ساتھ سپاہی دیکھ کر لوگ خواہ مخواہ میری طرف متوجہ ہوں گے۔ میرا تنہا جانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ میں شہر چھوڑنے سے پہلے چند منٹ کے لیے اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔"

میر ناصر نے کہا۔ "جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ کا گھر نیلام ہو چکا ہے اور اب وہاں کوئی اور رہتا ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "میں اپنے نوکر کو تلاش کیے بغیر نہیں جا سکتا۔ محلے میں میرے کئی دوست ہیں شاید انھیں اس کا پتہ ہو۔ میرے لیے وہاں جانے میں کوئی خطرہ نہیں لیکن اگر میں پکڑا گیا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں یہ نہیں کہوں گا کہ مجھے آپ نے قید سے نکالا ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ میں نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔"

میر ناصر نے کہا۔ "اگر نوکر کا مسئلہ اس قدر اہم ہے تو میں آپ کو نہیں روک سکتا لیکن آپ کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم بہت سے قیدیوں کو رہا کرنے کے متعلق سوچ رہے ہیں۔"

"میں پوری احتیاط کروں گا۔ اب میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ مرزا حسین بیگ مرشدآباد سے ہجرت کرنے کے بعد کہاں گئے تھے؟"

"میں ان کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ جس قافلے کے ساتھ روانہ ہوئے تھے وہ لکھنؤ کی طرف جا رہا تھا اور قافلے میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو لکھنؤ سے آگے آگرہ، دہلی اور حیدرآباد جانا چاہتے تھے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ میر ناصر نے کہا۔ "آپ یہیں ٹھہریں۔ میں آپ کے لیے نئے لباس اور گھوڑے کا انتظام کرتا ہوں۔"

معظم علی نے کہا۔ "اگر بار خاطر نہ ہو تو مجھے ایک خنجر کی بھی ضرورت ہے۔"

میر ناصر نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے جواب دیا۔ "میں آپ کو خنجر کے علاوہ بندوق اور پستول بھی دے سکتا ہوں۔"

○

قریباً ایک گھنٹہ بعد معظم علی ایک فوجی افسر کا لباس پہنے اپنے محلے کی ایک سنسان گلی میں داخل ہوا۔ اس نے گھوڑے سے اتر کر ایک مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے؟" اندر سے آواز آئی۔

"عبداللہ خان! دروازہ کھولو۔"

مکان کا دروازہ کھلا اور معظم علی نے جلدی سے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ "عبداللہ! میں معظم علی ہوں۔"

عبداللہ خاں چند ثانیے سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ اتنی دیر میں معظم علی نے اپنا گھوڑا اندر کھینچ کر دروازہ بند کر لیا۔

عبداللہ بے اختیار اس سے لپٹ گیا اور بولا۔ "مجھے ابھی تک یقین نہیں آتا کہ میں جاگ رہا ہوں۔"

معظم علی نے کہا۔ "باتوں کا وقت نہیں، یہ بتاؤ کہ صابر کہاں ہے؟"

"صابر آپ کے مکان میں رہتا ہے۔ آپ کی گرفتاری کے بعد حکومت نے آپ کا مکان نیلام کر دیا تھا۔ اب وہاں ایک فوجی افسر مقیم ہے اور صابر اس کے پاس نوکر ہے۔ مرزا حسین بیگ ہجرت کے وقت صابر کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن اس نے کہا۔ میں مرتے دم تک اس مکان میں معظم علی کا انتظار کروں گا۔"

معظم علی نے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ مکان کے مردانہ حصے میں اس وقت صابر کے ساتھ اور کون ہوگا؟"

"وہاں اگر کوئی مہمان نہیں تو ایک اور نوکر ضرور ہوگا۔"

مکان کی چھت سے ایک عورت نے آواز دی۔ "یہ کون ہیں؟"

"ایک دوست ہیں۔" عبداللہ نے جواب دیا اور پھر معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "میں نے یہ نہیں پوچھا کہ آپ قیدخانے سے اس وقت باہر کیسے نکلے؟"

معظم علی نے کہا۔ "ان باتوں کا وقت نہیں۔ تم اسی وقت تین چار قابل اعتماد دوستوں کو بلا لاؤ۔ میں یہیں تمہارا انتظار کروں گا۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی عبداللہ کے علاوہ اپنے محلے کے چار اور نوجوانوں کے ساتھ جنہوں نے اپنے چہروں پر نقاب ڈال رکھے تھے، اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رکا۔ چاند کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھنے کے بعد وہ دیوار پھاند کر صحن میں داخل ہوا۔ صحن میں اصطبل کے سامنے دو آدمی کھاٹوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ معظم علی دبے پاؤں ڈیوڑھی کی طرف بڑھا اور اس نے باہر کا دروازہ کھول دیا۔ عبداللہ اور اس کے باقی ساتھی صحن میں داخل ہوئے اور معظم علی کے اشارے پر اصطبل کے سامنے سونے والوں کی کھاٹوں کے اردگرد کھڑے ہوگئے۔ معظم علی نے ایک کھاٹ کی طرف اشارہ کیا جس میں ایک قوی ہیکل نوجوان لیٹا ہوا تھا۔ عبداللہ نے اس کا بازو جھنجھوڑ کر جگایا اور ہاتھ سے اس کا منہ بند کرتے ہوئے

کہا ۔ "تمھاری خیر اسی میں ہے کہ تم خاموش رہو۔"

اپنے گرد مسلح آدمی دیکھ کر اس نے مزاحمت کی کوشش نہ کی اور معظم علی کے ساتھیوں نے اسے منہ میں اچھی طرح کپڑا ٹھونس کر اسے چارپائی کے ساتھ جکڑ دیا۔

اس کے بعد معظم علی نے دوسرے آدمی کو جگایا اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "صابر خاموش! ڈرو نہیں، میں معظم علی ہوں۔"

اور صابر کی حیران بے بس اور خاموش نگاہیں ایک ثانیہ کے اندر اندر ہزاروں سوالات کر چکی تھیں۔

معظم علی نے کہا: "صابر میرے ساتھ آؤ اور باقی سب یہیں ٹھہریں ہم ابھی آتے ہیں۔"

صابر کچھ کہے بغیر معظم علی کے ساتھ اصطبل میں داخل ہوا۔ کھلے دروازوں کے راستے چاند کی روشنی اصطبل کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ کھرلی پر دو گھوڑے بندھے ہوئے تھے معظم علی نے کہا۔ "صابر تم جلدی سے گھوڑوں پر زین ڈالو۔"

اس کے بعد وہ کھرلی کے دوسرے سرے کی طرف بڑھا اور آخری کھونٹے کے قریب بیٹھ گیا۔ جب صابر گھوڑوں پر زین ڈالنے کے بعد اس کے پاس آیا تو وہ خنجر سے زمین کھود رہا تھا۔

"آپ کیا کر رہے ہیں؟" صابر نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

"صابر میں چوری کر رہا ہوں۔"

"چوری! کس چیز کی چوری؟"

"میں اپنے گھر میں اپنے مال کی چوری کر رہا ہوں۔ تم گھوڑے باہر لے چلو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

صابر گھوڑے کی باگ پکڑ کر باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی اپنی بغل میں ایک چھوٹی سی تھیلی دبائے باہر نکلا تو اس کے ایک ساتھی نے سوال کیا: "یہ کیا ہے؟"

"یہ ہمارا زادِ راہ ہے۔ آؤ اب چلیں!"

کوئی آدھ گھنٹہ بعد محلے سے باہر معظم علی اور صابر گھوڑوں پر سوار ہو کر عبداللہ اور دوسرے دوستوں کو خدا حافظ کہہ رہے تھے۔

عبداللہ نے آبدیدہ ہو کر سوال کیا۔ "آپ کی منزل کہاں ہے؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں ایک ایسا مسافر ہوں جس کی کوئی منزل نہیں۔ میں مرزا حسین بیگ کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ اگر لکھنؤ میں نہ ملے تو میں دلّی جاؤں گا۔ اگر وہاں بھی نہ ملے تو مجھے حیدر آباد جانا ہو گا۔ اس کے بعد خدا معلوم مجھے کن کن شہروں اور بستیوں کی خاک چھاننی پڑے۔"

عبداللہ خاں نے کہا: "میں آپ کو ایک بات بتانا بھول گیا تھا۔ آپ کی گرفتاری کے کوئی چھ مہینے بعد اکبر خاں یہاں آیا تھا وہ دو دن میرے پاس ٹھہرا تھا اور جاتے وقت اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر خدا نے مجھے توفیق دی تو میں ایک فوج لے کر مرشد آباد آؤں گا اور معظم بھائی کو قید سے نکالوں گا۔"

معظم علی نے سوال کیا: "تم نے اس سے مرزا حسین بیگ کے متعلق پوچھا تھا؟"

"ہاں، لیکن مرزا حسین بیگ کے متعلق وہ بھی بے خبر تھا اور اس نے یہ کہا تھا کہ میں لکھنؤ جا کر انھیں تلاش کروں گا اور اگر وہ مل گئے تو انھیں اپنے گھر لے جانے کی کوشش کروں گا۔"

صابر نے کہا: "اکبر خاں مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن میں نے جواب دیا کہ میں مرتے دم تک اپنے آقا کا انتظار کروں گا"

گھوڑے پر سوار ہوتے وقت معظم علی نے عبداللہ اور اس کے ساتھیوں سے کہا: "آپ لوگ میرے فرار ہونے کے متعلق محلے کے کسی اور آدمی سے ذکر تک نہ کریں۔ میر جعفر کے آدمیوں کو اگر اس کا علم ہو گیا تو وہ یقیناً ہمارا پیچھا کریں گے۔"

علی الصباح معظم علی اور صابر نے ایک برساتی ندی کے کنارے گھوڑوں سے اتر کر فجر کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد معظم علی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑا۔ یہ آنسو ایک لٹے ہوئے مایوس اور بے بس انسان کی آخری پونجی تھے جسے وہ اپنے وطن کی خاک پر نچھاور کر رہا تھا۔ معظم علی نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا۔ "جزا اور سزا کے مالک میری بدنصیب قوم کو چند افراد کی بداعمالیوں کی سزا نہ دے۔ ہمیں ان ملت فروشوں سے نجات دلا جنھوں نے تیرے بندوں کو تیری رحمت سے مایوس کر دیا ہے!"



"آپ مرزا حسین بیگ کے متعلق کچھ جانتے ہیں؟ — وہ مرشد آباد کے بہت بڑے رئیس تھے اور وہاں سے ہجرت کر کے لکھنؤ آئے تھے۔ شاید یہاں ان کے کوئی رشتہ دار تھے — آپ کسی ایسے آدمی کا پتہ دے سکتے ہیں جو پلاسی کی جنگ کے بعد مرشد آباد سے ہجرت کر کے لکھنؤ میں آباد ہوا ہو؟" یہ وہ سوالات تھے جو معظم علی لکھنؤ میں چند دن قیام کے دوران سیکڑوں آدمیوں سے پوچھ چکا تھا لیکن کہیں سے اسے تسلی بخش جواب نہ ملا۔

لکھنؤ پہنچ کر معظم علی نے دو دن ایک سرائے میں گزارے۔ تیسرے دن اس نے اپنی تھیلی سے ایک ہیرا نکالا اور بارہ سو اشرفی کے عوض لکھنؤ کے ایک جوہری کے پاس فروخت کر دیا۔ اسی شام اس نے ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا اس کے بعد اس کا معمول یہ تھا کہ وہ صبح سویرے اٹھتا اور اپنے تکیے کے نیچے سے جواہرات کی تھیلی نکال کر اپنی کمر میں باندھ لیتا اور پھر محلے کی مسجد میں نماز ادا کرنے کے بعد حسین بیگ کی تلاش میں نکل جاتا۔ زیورات اس نے ایک صندوق میں بند کر دیئے تھے اور اس کی حفاظت صابر کے سپرد کر دی تھی۔ گھوڑوں کی دیکھ بھال اور کھانا پکانے کے لیے اس نے ایک اور نوکر رکھ لیا تھا جس کا

نام دلاور خاں تھا۔ سارا دن شہر کے محلوں اور گلیوں میں حسین بیگ کو تلاش کے بعد شام کو تھکاوٹ اور تھکاوٹ سے زیادہ مایوسی سے نڈھال ہو کر وہ گھر آتا۔ رات کو سونے سے پہلے وہ ہیروں کی تھیلی کمر سے کھول کر تکیے کے نیچے رکھ دیتا۔ صابر کے سوا کسی کو اس کی دولت کا علم نہ تھا۔ اپنے خزانے کا سب سے چھوٹا ہیرا فروخت کرنے کے بعد معظم علی کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ملک کے چند امیر ترین آدمیوں میں سے ایک ہے لیکن اس دولت کے ساتھ ماضی کی تلخ یادیں وابستہ تھیں۔

ایک امیر آدمی کے لباس میں اسے لکھنؤ کے رؤسا، حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں اور فوج کے بڑے بڑے افسروں سے متعارف ہونے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ دس دن کی پیہم جستجو کے بعد ایک دوپہر وہ لکھنؤ کے ایک بازار سے گزر رہا تھا کہ ایک عمر رسیدہ آدمی اس کے سامنے آ کر اچانک رکا اور اس کی طرف بغور دیکھنے کے بعد "معظم علی! معظم" کہتا ہوا لپٹ گیا۔

"آپ شیر علی ہیں؟" معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"ہاں" اس نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم مجھے آسانی سے نہیں پہچانو گے۔ مجھے یہاں مرشد آباد کے کئی آدمی ملے ہیں لیکن ایک دو کے سوا مجھے کوئی نہیں پہچان سکا اور تم بھی تو بہت بدل گئے ہو۔ تم قید سے کب رہا ہوئے اور یہاں کب آئے؟"

"میں کوئی دس روز سے یہاں ہوں اور مرزا حسین بیگ کو تلاش کر رہا ہوں۔ شاید آپ کو ان کے متعلق کچھ معلوم ہو؟"

شیر علی نے جواب دیا: "مرزا صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

ایک ثانیہ کے لیے معظم علی کا خون منجمد ہو کر رہ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شیر علی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

شیر علی نے کہا۔ "میں نے ان سے ایک ماہ بعد مرشد آباد سے ہجرت کی تھی۔ لکھنؤ

پہنچ کر مجھے چند ایسے آدمی ملے جو مرشد آباد سے مرزا صاحب کے ساتھ روانہ ہوئے تھے۔ مجھے ان کی زبانی پتہ چلا کہ مرزا صاحب اودھ کی سرحد میں داخل ہوتے ہی بیمار ہو گئے تھے اور ایک بستی کے زمیندار نے انھیں اپنے پاس ٹھہرا لیا تھا۔ لکھنؤ میں مرزا صاحب کے ایک ماموں زاد بھائی رہتے تھے اور میرا خیال تھا کہ مرزا صاحب ان کے پاس پہنچ گئے ہوں گے لیکن جب میں نے انھیں تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پلاسی کی جنگ سے چند ماہ قبل لکھنؤ سے ہجرت کر کے دکن جا چکے ہیں۔ پھر میں نے اس بستی کا رخ کیا جہاں مرزا صاحب کے ٹھہرنے کی اطلاع ملی تھی لیکن وہاں پہنچ کر گاؤں کے زمیندار سے یہ خبر سنی کہ وہ چار دن موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد وفات پا گئے تھے اور انھیں گاؤں کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا تھا۔ گاؤں کے زمیندار نے مجھے ان کی قبر بھی دکھائی تھی۔"

معظم علی نے کہا: "لیکن ان کے ساتھ ان کی بیوی اور لڑکی بھی تھیں؟"

"انھیں گاؤں کے زمیندار نے چند دن اپنے پاس مہمان رکھا تھا۔ اس کے بعد بنگال سے تارکان وطن کا ایک اور قافلہ اس بستی سے گزرا۔ وہ اس قافلے کے ساتھ شامل ہو گئیں اس قافلے میں بعض آدمی لکھنؤ اور فیض آباد اور بعض آگرہ اور دلی جانے والے تھے۔ میں نے لکھنؤ واپس آکر پتہ کیا لیکن ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ان کے ساتھ دو نوکر بھی تھے اور میرا خیال ہے کہ مرزا صاحب کی بیوی اور صاحبزادی لکھنؤ سے اپنے عزیزوں کا پتہ کرنے کے بعد دلی یا حیدرآباد جا چکی ہیں۔ کیونکہ ان کے خاندان کے بہت سے افراد ان دونوں شہروں میں ہیں۔"

معظم علی نے سوال کیا: "آپ کو مرزا صاحب کے ماموں زاد بھائی کا نام معلوم ہے؟"

"ہاں، ان کا نام ارشد بیگ تھا۔"

"آپ کو دلی میں ان کے کسی رشتہ دار کا نام معلوم ہے؟"

"نہیں۔"

شیر علی کا لباس اس کی مفلسی اور تنگ دستی کا آئینہ دار تھا۔

معظم علی نے پوچھا: "یہاں آپ کیا کرتے ہیں؟"

شیر علی نے جواب دیا: "کچھ نہیں۔ جب میں مرشد آباد سے آیا تھا تو میرے پاس کچھ روپیہ تھا۔ یہاں ایک ساتھی نے مجھے مشورہ دیا کہ ہم بنارس چل کر کوئی کاروبار شروع کریں بنارس جا کر میں تجارت میں نفع کمانے کی بجائے اپنی رہی سہی پونجی بھی گنوا بیٹھا اور اب کسی ملازمت کی تلاش میں ہوں لیکن یہاں ایک بوڑھے آدمی کے لیے کوئی جگہ نہیں۔"

معظم علی نے کہا: "آپ کو ملازمت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں چلیے میرے ساتھ۔"

"کہاں؟"

"میرے مکان پر۔"

"لیکن میں آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ کیا کرتے ہیں؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں نے ابھی تک فیصلہ نہیں کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ لیکن اگر آپ کو تجارت کا شوق ہے تو ممکن ہے میں آپ کے ساتھ شریک ہو جاؤں"

"لیکن تجارت کے لیے سرمائے کی ضرورت ہے؟"

"سرمائے کے متعلق آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس بہت کچھ ہے۔"

شیر علی نے کہا: "میں اپنی خاطر آپ کو تجارت کا مشورہ نہیں دوں گا۔ آپ ایک سپاہی ہیں اور اپنے تجربے اور ذہنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اودھ کی فوج میں بہترین عہدہ حاصل کر سکتے ہیں۔"

معظم علی نے کہا: "چچا شیر علی خدا کے لیے فوج کی ملازمت کا ذکر نہ کیجیے۔ میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ باقی عمر ان نام نہاد حکمرانوں کے لیے تلوار نہیں اٹھاؤں گا، جنھوں نے

قوم کو ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں دیا۔"

معظم علی نے دو ہفتے اور لکھنؤ میں قیام کیا۔ اس عرصہ میں وہ صبح سے شام تک فرحت اور اس کی ماں کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ رات کے وقت جب کبھی شیر علی کو اس کے ساتھ باتیں کرنے کا موقع ملتا تو وہ اکثر یہ کہتا۔ "معظم اگر تمھارے پاس قارون کا خزانہ ہو تو بھی ہمیں بیکار نہیں بیٹھنا چاہیئے۔ ہمیں کوئی نہ کوئی کام شروع کرنا پڑے گا۔" معظم علی جواب دیتا۔ "ہاں چچا جان میں سوچ رہا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کو بہت جلد کسی کام پر لگا دیا جائے گا۔"

ایک رات تیسرے پہر شیر علی سو رہا تھا۔ معظم علی نے اسے جگایا اور کہا۔ "چچا شیر علی میں کچھ عرصہ کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ دلاور خاں میرے ساتھ جائے گا اور صابر آپ کی خدمت میں رہے گا۔ یہ لیجیے اس تھیلی میں پانچ سو اشرفیاں ہیں۔ میری غیر حاضری میں آپ کے اخراجات کے لیے یہ کافی ہوں گی۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" شیر علی نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

"میرا مقصد فرحت اور اس کی والدہ کو تلاش کرنا ہے۔ میں پہلے فیض آباد جاؤں گا۔ اس کے بعد روہیلکھنڈ ایک دوست کے پاس جاؤں گا۔ پھر ممکن ہے مجھے آگرہ، دلی اور حیدرآباد کی خاک چھاننی پڑے۔"

شیر علی نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔"

"نہیں، اس عمر میں آپ کے لیے اتنا طویل سفر ٹھیک نہیں۔ میری واپسی تک آپ یہ فیصلہ کر لیں کہ ہمیں کون سا کاروبار شروع کرنا چاہیئے۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی اور دلاور خاں گھوڑوں پر سوار ہو چکے تھے اور شیر علی اور صابر مکان کے دروازے کے سامنے کھڑے انھیں خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ دلاور خاں کوئی چالیس برس کا ایک دراز قامت، قوی ہیکل آدمی تھا اور چند دنوں میں معظم علی کا قابل اعتماد ساتھی

بن چکا تھا۔



گھنے جنگل میں غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے ہی شام کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ اداس اور مغموم فضا میں معظم علی اور دلاور خاں اپنے تھکے ہوئے گھوڑوں پر معمولی رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے کبھی کبھی کوئی گیدڑ، خرگوش، ہرن یا بھیڑیا گھنے درختوں سے نمودار ہوتا اور پگڈنڈی عبور کر کے دوسری طرف روپوش ہو جاتا۔

ایک چھوٹی سی ندی عبور کرنے کے بعد معظم علی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "یہاں سے تھوڑی دور آگے دائیں ہاتھ ایک اور پگڈنڈی آئے گی جو اکبر خاں کے گاؤں کو جاتی ہے۔ ذرا خیال رکھنا اگر ہم اس پگڈنڈی سے آگے نکل گئے تو ساری رات جنگل میں بھٹکتے رہیں گے۔"

دلاور خاں نے جواب دیا۔ "جناب بھٹکنے کے لیے یہ جنگل موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ اس سے تو یہ بہتر تھا ہم پچھلی بستی میں رک گئے ہوتے۔"

معظم علی نے کچھ کہنے کی بجائے ایڑ لگا کر اپنے گھوڑے کی رفتار تیز کر دی۔ کوئی آدھ میل چلنے کے بعد اسے اپنے دائیں ہاتھ ایک پگڈنڈی دکھائی دی اور اس نے اپنا گھوڑا موڑتے ہوئے کہا۔ "اب ہم پہنچ گئے۔ یہاں سے تھوڑی دور پر ایک ٹیلہ ہے۔ ٹیلہ عبور کرنے کے بعد ہم ایک جھیل کے کنارے کنارے تھوڑی دور جائیں گے۔ اس کے بعد ایک بڑا ٹیلہ آئے گا جسے عبور کرنے کے بعد ہم جنگل سے نکل کر اکبر خاں کے گاؤں کے کھیتوں میں داخل ہو جائیں گے۔"

دلاور خاں کچھ کہے بغیر معظم علی کے پیچھے ہو لیا۔ تنگ پگڈنڈی پر تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک چھوٹے سے ٹیلے کے قریب پہنچتے ہی گھوڑوں نے ٹھٹھک کر کان کھڑے کر لیے اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ معظم علی اور دلاور خاں پریشانی کی حالت میں ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے کہ انھیں کسی بکرے کی ممیاہٹ سنائی دی۔ دلاور خاں نے اطمینان کا سانس

لیتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ کسی ریوڑ سے بچھڑے ہوئے بکرے کی آواز نہیں تو ہم کسی بستی کے قریب پہنچ چکے ہیں۔"

"جہاں تک مجھے معلوم ہے یہاں آس پاس کوئی بستی نہیں اور ایسے جنگل میں بکرے اپنے ریوڑ سے بچھڑنا پسند نہیں کرتے۔" معظم علی نے یہ کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ بدحواس گھوڑے نے چند چھلانگیں لگائیں لیکن ٹیلے کی چوٹی سے کوئی بیس قدم دور پہنچ کر آگے بڑھنے کی بجائے پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ معظم علی نے مڑ کر دیکھا تو دلاور خاں کا گھوڑا بھی الٹے پاؤں پیچھے ہٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ معظم علی اپنی بندوق سنبھال کر گھوڑے سے اتر پڑا اور دلاور خاں نے اس کی تقلید کی۔

معظم علی نے کہا۔ "تم گھوڑے سنبھالو۔ معلوم ہوتا ہے انھیں کسی درندے کی بو آ گئی ہے۔ میں آگے جا کر دیکھتا ہوں۔"

دلاور خان نے گھوڑوں کی باگیں پکڑ لیں۔ معظم علی نے گھنے جنگل میں اِدھر اُدھر دیکھا اور احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ ٹیلے سے آگے ایک چھوٹی سی جھیل تھی اور پگڈنڈی جھیل کے کنارے ایک نصف دائرہ بنانے کے بعد دوسری جانب درختوں میں غائب ہو جاتی تھی۔ جھیل کے کنارے درخت نسبتاً کم تھے۔ بکرے کی کرب انگیز چیخیں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔ معظم علی نے پیچھے مڑ کر دلاور خاں کو اشارہ کیا اور وہ اچھلتے کودتے بدکتے ہوئے گھوڑوں کو کھینچتا آگے بڑھا۔

معظم علی نے کہا۔ "اگر میں غلطی پر نہیں تو عنقریب ہم کسی شکاری سے ملنے والے ہیں۔ بکرا جھیل کے کنارے پگڈنڈی کے پاس ہی کسی درخت کے نیچے بندھا ہوا ہے اور شیر یا چیتا بھی کہیں آس پاس چکر کاٹ رہا ہے۔ اب شام ہو رہی ہے۔ ہمارے لیے یہاں سے جلد نکل جانا بہتر ہے۔ تم گھوڑوں کو جھیل کے ساتھ ساتھ رکھو اور میں جنگل کی طرف رہوں گا۔"

دلاور خاں نے گھوڑوں کی باگیں کھینچتے ہوئے کہا۔ "خدا کی قسم میں شیر سے نہیں ڈرتا لیکن اس بکرے کی ہر چیخ کے ساتھ میرا ایک سیر خون خشک ہوا جاتا ہے۔ اگر یہ کوئی بھوت نہیں تو آپ اسے دیکھتے ہی گولی مار دیں!"

ٹیلے سے نیچے اترتے ہی معظم علی کو اپنے دائیں ہاتھ گھنی جھاڑیوں میں پتوں کی سرسراہٹ سنائی دی اور وہ جلدی سے زمین پر بیٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اچانک درختوں کے درمیان پھیلی ہوئی گھنی جھاڑیوں میں اسے ایک شیر دکھائی دیا۔ معظم علی نے جلدی سے اپنی بندوق سیدھی کی۔ شیر ایک ثانیہ کے لیے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر ایک خوفناک گرج کے ساتھ چھلانگیں لگاتا ہوا آگے بڑھا۔ معظم علی نے گولی چلا دی۔ زخمی درندے نے دو تین پلٹیاں کھائیں اور پھر پوری قوت سے آخری جست لگا کر معظم علی سے چند قدم کے فاصلے پر ڈھیر ہو گیا۔

معظم علی ایک لمحہ کے لیے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر اپنے تھیلے سے بارود نکال کر بندوق بھرنے لگا۔ ابھی وہ اس سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ اسے اپنے پیچھے جھاڑیوں میں آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ ایک شیرنی کوئی پندرہ بیس گز کے فاصلے پر ایک درخت کی آڑ سے نمودار ہوئی اور دھاڑتی ہوئی معظم علی کی طرف بڑھی۔ معظم علی کے لیے بندوق بھرنے کا وقت نہ تھا۔ اس نے بندوق پھینک دی اور جلدی سے تلوار نکال کر ایک طرف ہٹنے کی کوشش کی لیکن اس کا پاؤں ایک درخت کی جڑ کے ساتھ ٹکرایا اور وہ گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی جنگل کی فضا بندوق کے دھماکے سے گونج اٹھی۔ معظم علی جو ایک ثانیہ قبل موت کا بھیانک چہرہ دیکھ رہا تھا، اٹھا تو اسے صرف چار قدم کے فاصلے پر شیرنی دم توڑتی دکھائی دی۔ پھر اسے ایک دلکش آواز سنائی دی۔ "آپ کو چوٹ تو نہیں آئی؟"

معظم علی جواب دینے کی بجائے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ دائیں ہاتھ ایک درخت

کی آڑ سے ایک نوجوان نمودار ہوا اور فاتحانہ انداز سے آگے بڑھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی اور اس کے سرخ و سفید چہرے پر جوانی کا خون دوڑ رہا تھا۔

"بھائی جان!" وہ قریب پہنچ کر بلند آواز میں چلایا اور اپنی بندوق پھینک کر بھاگتا ہوا معظم علی کے ساتھ لپٹ گیا۔

"اکبر — !تم .... تم اتنی جلدی جوان ہو گئے؟"

اکبر نے کہا: "بھائی جان شیر مارنے کے بعد آپ کو اس قدر بے پروا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ شیرنی آپ کے سر پر آچکی تھی۔"

معظم علی نے جواب دیا: "میں بندوق بھر رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ تم بروقت پہنچ گئے۔ میں نے بکرے کی چیخیں سن کر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ جنگل میں کوئی شکاری موجود ہے۔"

اکبر خاں نے کہا: "اس جوڑے نے ہمارے کئی مویشی ہلاک کیے ہیں۔ اس لیے میں نے آج بکرا بندھوا دیا تھا۔ جب آپ ٹیلے سے نیچے اتر رہے تھے میں نے شیر کو آپ کی تاک میں جاتے دیکھا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ کوئی مسافر راستہ بھول کر اس طرف آنکلا ہے۔ میں آپ کو خبردار کرنے کی نیت سے نیچے اترا لیکن آپ درختوں کے جھنڈ میں روپوش ہو چکے تھے۔ پھر میں بندوق کی آواز سن کر اس طرف بھاگا تو یہ شیرنی نظر آئی — میں مرشد آباد گیا تھا آپ قید سے کب رہا ہوئے؟"

معظم علی نے جواب دیا: "اکبر ہم اس جنگل سے نکل کر اطمینان کے ساتھ باتیں کریں گے۔"

"چلیے۔" اکبر خاں نے کہا۔ "یہ آپ کا ساتھی کون ہے۔ میں نے اسے جھیل کے کنارے بدحواس گھوڑوں سے زور آزمائی کرتے دیکھا ہے۔"

"وہ میرا نوکر ہے۔"

وہ اپنی اپنی بندوقیں اٹھا کر چل پڑے۔ راستے میں اکبر خان کے تین اور ساتھی ان کے

ساتھ شامل ہو گئے۔ جھیل کی طرف دلاور خاں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں سے نکل کر انھیں ایک دلچسپ منظر دکھائی دیا۔ دلاور خاں کنارے سے چند قدم دور جھیل کے اندر وحشت زدہ گھوڑوں کی باگیں پکڑے انھیں بے تحاشا گالیاں دے رہا تھا۔ ایک دیہاتی جس نے ایک ہاتھ سے بکرے کا رسّہ پکڑ رکھا تھا، کنارے پر کھڑا مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ ایک گھوڑے نے اچانک اچھل کر دلاور خاں کے ہاتھ سے باگ چھڑالی اور چند قدم دور نکل گیا۔ دلاور خاں کو اس پریشانی کی حالت میں دیہاتی کی ہنسی بے حد ناگوار محسوس ہوئی اور اس نے بلند آواز میں کہا۔ "ارے یار تم عجیب بیوقوف ہو۔ بھلا یہ ہنسنے کی کونسی بات ہے۔ خدا کے لیے اس بکرے کو یہاں سے لے جاؤ۔ یہ بیوقوف جانور اسے بھی شیر سمجھتے ہیں۔"

دیہاتی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "ایسے نہیں گھوڑے، بکرے کو شیر نہیں سمجھتے بلکہ تمھیں بھوت سمجھ کر ڈر گئے ہیں۔"

دلاور خاں کو انتہائی بے بسی کی حالت میں بھی بھوت کہلانا پسند نہ تھا۔ وہ دیہاتی کو جواب دینے کے لیے موزوں الفاظ سوچ رہا تھا کہ اس کی توجہ معظم علی اور دوسرے آدمیوں کی طرف مبذول ہو گئی اور اس کا سارا غصہ جاتا رہا۔ اس نے معظم علی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"آپ ٹھیک ہیں نا؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ہم نے دو شیر مار لیے ہیں۔ اب کوئی خطرہ نہیں۔ تم باہر آجاؤ!"

دلاور خاں نے آزردہ ہو کر کہا: "واہ جی! آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں شیر سے ڈر کر پانی میں گھس گیا تھا۔ خدا کی قسم یہ گھوڑے نہیں گدھے ہیں۔ اگر پھر کبھی ایسا وقت آیا تو میں انھیں سنبھالنے کی بجائے شیر کے سامنے کھڑا ہو جاؤں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے تیرنا آتا ہے ورنہ آپ کو میری لاش بھی نہ ملتی۔"

اکبر خاں نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا: "نہیں بھائی اس طرف جھیل کا پانی زیادہ گہرا نہیں۔ اگر تمھیں تیرنا نہ آتا تو بھی ڈوب جانے کا خطرہ نہ تھا۔"

معظم علی نے کہا۔" دلاور خاں اب تم شور مچانے کی بجائے باہر نکل آؤ تو گھوڑے خود بخود ہمارے پاس آئیں گے۔"

" نہیں جناب! جب تک یہ بکرا کنارے پر کھڑا ہے۔ یہ باہر نہیں نکلیں گے۔"

"بھئی تم باہر تو نکلو!"

دلاور خاں نے بددل ہو کر گھوڑوں کی لگامیں چھوڑ دیں اور خود پانی سے باہر نکل آیا جب وہ کنارے پر پہنچا تو گھوڑے بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے آرہے تھے۔ دلاور خاں نے کہا۔" خدا کی قسم میرا جی چاہتا ہے کہ ان دونوں کو گولی مار دوں!"

اکبر خاں کے اشارے پر دو آدمیوں نے گھوڑے پکڑ لیے اور یہ لوگ جھیل کے کنارے کنارے پگڈنڈی پر چل دیئے۔ شام کا دھندلکا رات کی تاریکی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ جنگل میں گیدڑوں، بھیڑیوں اور دوسرے وحشی جانوروں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

معظم علی، اکبر خاں کے ان گنت سوالات کے جواب میں اسے اپنی قید اور رہائی کی داستان سنا رہا تھا۔ جب اس نے اپنی سرگذشت ختم کی تو اکبر خاں نے کہا:" اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ لکھنؤ پہنچ گئے ہیں تو میں فوراً وہاں آتا۔"

"لکھنؤ میں میرا قیام بہت مختصر تھا۔ میں وہاں سے فیض آباد چلا گیا تھا اور فیض آباد سے اودھ کے چند شہروں کی خاک چھاننے کے بعد تمھارے پاس آیا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ شاید تمھیں مرزا صاحب کے متعلق کچھ معلوم ہو۔"

اکبر خاں نے مغموم لہجے میں کہا۔" کاش مجھے کچھ معلوم ہوتا۔ میں نے مرشد آباد سے واپسی پر لکھنؤ میں انھیں تلاش کیا تھا۔ اب اگر آپ دلی، آگرہ اور حیدر آباد جانا چاہتے ہیں تو میں آپ کا ساتھ دوں گا۔"

معظم علی نے سوال کیا:" تمھارے بھائی جان کا کیا حال ہے؟"

" بھائی جان کو فوت ہوتے قریباً تین مہینے ہو چکے ہیں۔ ہمارے علاقے پر مرہٹوں نے حملہ کر دیا تھا اور وہ لڑائی میں مارے گئے تھے۔"

چند ثانیے معظم علی کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ بالآخر اس نے اکبر خان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:" اکبر مجھے ان کی موت کا بہت افسوس ہے۔"

اکبر خاں نے کہا:" بھائی جان نے ایک بہادر کی طرح جان دی تھی۔ ان کے جسم پر تین گولیوں کے اور پانچ تلوار کے زخم تھے۔"

معظم علی نے پانچ دن اکبر خاں کے گھر قیام کیا۔ اس کے بعد جب اس نے آگرہ اور دہلی جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو اکبر خاں نے اس کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کی لیکن معظم علی نے کہا:" اکبر خاں تم اب اپنے علاقے کے سردار ہو۔ تمھارا گھر رہنا ضروری ہے۔ میں تمھارے جذبات کی قدر کرتا ہوں، لیکن تم میرے ساتھ جا کر میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

اکبر خاں نے کہا:" بھائی جان میں آپ کی خاطر نہیں جانا چاہتا۔ بلکہ مجھے آگرہ اور دلی دیکھنے کا شوق ہے۔ میں حیدر آباد بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہاں چچا جان کے ہوتے ہوئے میری غیر حاضری بہت زیادہ محسوس نہیں کی جائے گی۔"

معظم علی نے کچھ سوچ کر جواب دیا:" بہت اچھا اگر تمھارا یہی ارادہ ہے تو پھر تیار ہو جاؤ ہم پرسوں صبح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"

اکبر خاں نے جواب دیا:" میں بالکل تیار ہوں۔"

تیسرے روز رات کے پچھلے پہر اکبر خاں نے معظم علی کو جگایا اور کہا:" بھائی جان اٹھیے اب صبح ہونے والی ہے۔"

معظم علی تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو ڈیوڑھی کے سامنے گھوڑوں کی قطار دکھائی دی۔ اکبر خاں کا چچا چند مسلح نوجوانوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ معظم علی نے اکبر خاں سے سوال

کیا ۔"یہ سب آدمی ہمارے ساتھ جائیں گے؟"

"چچا جان تو بیس آدمی بھیجنے پر مصر تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے انھیں آٹھ آدمی لے جانے پر رضا مند کیا ہے۔"

اکبر خاں کے چچا نے مڑکر دیکھتے ہوئے کہا۔"میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ تمھیں زیادہ آدمی لے جانے چاہئیں۔"

اکبر خاں نے کہا۔"چچا جان ہم دلّی دیکھنے جا رہے ہیں، دلّی لوٹنے کے لیے تو نہیں جا رہے ہیں۔"

"برخوردار! دلّی لوٹنے کے لیے تمھیں یہاں سے آدمی لے جانے کی ضرورت نہیں۔ ان دنوں یہ حالت ہے کہ اگر تم لال قلعہ کے سامنے کھڑے ہو کر یہ اعلان کرو کہ میں دلّی لوٹنے آیا ہوں تو وہیں سے تمھیں ہزاروں مددگار مل جائیں گے۔ تمھیں راستے میں اپنی حفاظت کے لیے آدمیوں کی ضرورت پڑے گی۔" پھر وہ معظم علی کی طرف متوجہ ہوا۔"آپ اکبر خاں کا خیال رکھیں۔ یہ آٹھ آدمی جنھیں میں آپ کے ساتھ روانہ کر رہا ہوں۔ ہمارے قبیلے کے بہترین نشانہ باز ہیں۔ خطرے کے وقت آپ ان پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد گیارہ آدمیوں کا یہ قافلہ گاؤں سے باہر نکل رہا تھا۔

گیارھواں باب

دلّی تک سفر کے دوران میں معظم علی کے تمام خیالات فرحت پر مرکوز تھے۔ وہ راستے کے پُر رونق شہروں سے مایوس ہو کر نکلتا تو اپنے دل کو یہ فریب دینے کی کوشش کرتا کہ فرحت آگے کسی بستی میں اس کا انتظار کر رہی ہے۔ پھر جب اسے بستی کے لوگوں سے مل کر مایوسی ہوتی تو اس کی نگاہیں فرحت کو راستے کے جنگلوں اور بیابانوں میں تلاش کرتیں۔ کبھی کوئی قافلہ نظر پڑتا تو وہ قریب جا کر پوچھتا۔"آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ آپ کے ساتھ سرنگاپٹم کا کوئی آدمی تو نہیں؟" مسافر اس کی باتوں پر مسکراتے اور ہنستے گزر جاتے۔ پھر وہ اکبر خاں سے کہتا۔"اکبر شاید میں دیوانہ ہو گیا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس قافلے میں نہیں ہوں گی لیکن اس کے باوجود میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مجھے دلّی پہنچ کر مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ لیکن میں خود فریبی میں مبتلا رہنا چاہتا ہوں۔ اب موہوم امیدیں میری زندگی کا آخری سہارا بن چکی ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمھیں خواہ مخواہ اپنے ساتھ لا کر پریشان کیا۔"

اکبر خاں اسے تسلی دینے کی کوشش کرتا۔"بھائی جان آپ کو خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔"

ایک شام دلّی سے دو منزل ادھر وہ ایک چھوٹی سی بستی میں داخل ہوئے۔ بستی کا چودھری ایک شریف النفس راجپوت تھا۔ اس نے انھیں اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ جب معظم علی نے اسے یہ بتایا کہ میں اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں کی تلاش میں دلّی جا رہا ہوں۔ تو عمر رسیدہ

میزبان نے کہا ۔ "برخوردار مجھے اندیشہ ہے کہ اگر آپ لوگ اس شان و شوکت کے ساتھ دلّی گئے تو آپ کے باقی عزیز شاید تمام عمر آپ کو تلاش کرتے رہیں۔ دلّی پر اب مرہٹوں کا راج ہے۔ وہاں آپ کا لباس، آپ کے گھوڑے اور آپ کے ہتھیار آپ کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہوں گے۔ پھر اگر آپ مرہٹوں کی نگاہ سے بچ کر شہر میں داخل ہو جائیں تو بھی ہزاروں آدمی وہاں آپ کے لیے سردردی کا باعث ہوں گے۔ دلّی میں اگر آپ کو کوئی خطرہ پیش آیا تو آٹھ دس آدمی آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ آپ کے لیے یہی مناسب ہے کہ جب آپ شہر میں داخل ہوں تو کسی کو آپ پر شبہ نہ ہو کہ آپ بہت امیر ہیں۔"

معظم علی نے جواب دیا ۔ "میں راستے میں دلّی کے حالات سن چکا ہوں اور اتنے آدمیوں کو وہاں لے جانا میں بھی عقلمندی نہیں سمجھتا۔ میرا ارادہ ہے کہ انھیں اگلی منزل سے واپس کر دوں گا یا راستے کی کسی بستی میں چھوڑ دوں گا اور اگر آپ ان لوگوں کو اپنے پاس ٹھہرا سکیں تو بہت نوازش ہوگی۔"

میزبان نے جواب دیا ۔ "میرے پاس آپ کے ساتھیوں کے لیے بہت جگہ ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ بھی اپنا گھوڑا یہیں چھوڑ دیں۔ میرے گاؤں سے کل اناج کے چند چھکڑے دلّی جا رہے ہیں اور اگر آپ ایک عام دیہاتی کا لباس پہننا پسند کریں تو میں آپ کو ان کے ساتھ بھیج سکتا ہوں۔"

معظم علی نے کہا ۔ "مجھے ننگے پاؤں چلنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں صرف ایک آدمی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور میرے باقی ساتھی میری واپسی تک یہاں رہیں گے۔" پھر وہ اکبر خاں کی طرف متوجہ ہوا ۔ "اکبر خاں تم اگر واپس نہیں جانا چاہتے تو تمھیں چند دن یہاں رہنا پڑے گا۔ میں صرف دلاور خاں کو ساتھ لے جاؤں گا۔"

اکبر خاں نے بضد ہو کر کہا ۔ "نہیں بھائی جان میں آپ کے ساتھ ضرور جاؤں گا۔

آپ دلاور خاں کو میرے نوکروں کے ساتھ چھوڑ دیں۔"

معظم علی نے جواب دیا ۔ "نہیں اکبر تمھارا یہاں ٹھہرنا ضروری ہے۔"

اکبر خاں نے میزبان کی موجودگی میں معظم علی کے ساتھ بحث کرنا پسند نہ کیا لیکن تھوڑی دیر بعد جب یہ لوگ ایک چھوٹی سی حویلی کے صحن میں سو رہے تھے۔ اکبر خاں نے آواز دی — "بھائی جان!"

"کیا ہے اکبر؟ تمھیں نیند نہیں آتی؟" معظم علی نے اپنی چارپائی پر کروٹ بدلتے ہوئے کہا!

"نہیں بھائی جان! میں سوچ رہا ہوں کہ آپ مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جانا چاہتے۔"

"اکبر اگر دلّی کے حالات ٹھیک ہوتے تو میں یقیناً تمھیں بھی ساتھ لے جاتا۔"

"دلّی کے حالات تو کبھی ٹھیک نہیں ہوتے۔ پھر وہاں جانے میں اگر آپ کوئی خطرہ محسوس کرتے ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں آپ کا ساتھ نہ دوں۔"

معظم علی نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا ۔ "اکبر تمھیں یہاں ٹھہرانے کی ایک خاص وجہ ہے۔ سنو میرے پاس ایک ایسی چیز ہے جسے دلّی لے جانا خطرناک ہے اور یہ چیز میں تمھارے حوالے کر کے جا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس کی حفاظت کر

اکبر خاں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور سرگوشی کے انداز میں کہا ۔ "وہ کیا چیز ہے بھائی جان؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر معظم علی نے اپنی قمیص کے نیچے کمر کے ساتھ بندھی ہوئی تھیلی اتاری اور اکبر خاں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ۔ "یہ لو!"

اکبر خاں نے اپنی چارپائی پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ آگے بڑھا کر تھیلی پکڑ لی اور پوچھا "اس میں کیا ہے؟"

"ہیرے" معظم علی نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "اس تھیلی کو اپنی کمر کے ساتھ باندھ لو اور کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔"

اکبر خاں نے کہا۔ "اگر یہ سچ مچ ہیرے ہیں تو یقین رکھیے کہ اب آپ کی واپسی تک مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی نیند نہیں آئے گی۔"

اکبر یہ تمھاری نیند سے زیادہ قیمتی نہیں۔ اب آرام سے سو جاؤ اور دیکھو اگر مجھے زیادہ دلّی ٹھہرنا پڑا تو میں دلاور خاں کو واپس بھیج دوں گا۔ پھر تمھارے لیے یہ بہتر ہوگا کہ تم یہاں ٹھہرنے کی بجائے گھر چلے جاؤ اور میں اگر زندہ رہا تو وہاں پہنچ جاؤں گا۔"



تیسرے دن معظم علی اور دلاور خاں گاڑی بانوں کے لباس میں دلّی پہنچے۔ شہر کے ناکوں پر مرہٹہ سپاہی باہر سے آنے والے ہر سفید پوش کی تلاشی لیتے تھے اور اس کی جیب سے جو کچھ نکلتا تھا وہ بحق مرہٹہ سرکار ضبط کر لیا جاتا تھا۔ بسا اوقات شہر میں داخل ہونے والوں کو اپنے اجلے کپڑوں کے بدلے کسی مرہٹہ سپاہی کا بوسیدہ لباس زیب تن کرنا پڑتا تھا لیکن شہر میں غلہ، سبزی اور ایندھن پہنچانے کے لیے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ معظم علی نے جامع مسجد سے تھوڑی دور ایک سرائے میں قیام کیا اور تھوڑی دیر بعد بازاروں، گلیوں اور خانقاہوں میں فرحت اور اس کی ماں کی تلاش شروع کر دی۔ اس نے سرائے کے مالک کے توسط سے چند منادی کرنے والوں کو بلایا اور انھیں مرشد آباد سے مرزا حسین بیگ کے کسی شناسا کا سراغ لگانے کے کام پر لگا دیا۔

دلّی میں قیام کے دوران میں معظم علی نے مسلمانوں کی زبوں حالی کے جو مناظر دیکھے وہ انتہائی دلخراش تھے۔ نام نہاد شہنشاہ کی حکومت لال قلعہ کی چار دیواری تک محدود تھی۔ امرا ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔ لال قلعہ سے باہر لٹیروں اور رہزنوں کی بادشاہت تھی۔ گلیوں اور بازاروں میں مرہٹہ سپاہیوں کے گھوڑے دوڑتے

تھے۔ شہنشاہ کے تمام احکامات مرہٹہ فوج کے سردار کی خواہشات کے مطابق ہوتے تھے۔ دلّی سے آگے مرہٹوں کی جارحیت کا سیلاب لاہور، ملتان اور سرہند کا رخ کر رہا تھا غرض شمال مغربی ہندوستان، بھیڑیا خصلت انسانوں کے لیے ایک وسیع شکارگاہ بن گیا تھا۔ مسلمانوں کے وہ دفاعی قلعے جو اورنگ زیب عالمگیر نے تعمیر کیے تھے، ایک ایک کر کے ٹوٹ رہے تھے۔ دور دراز شہروں اور بستیوں کے لوگ اپنے شہنشاہ اور اس کے وزیروں اور امیروں کے پاس فریادیں لے کر آتے لیکن دلّی پہنچ کر انھیں یہ معلوم ہوتا کہ لال قلعہ کے مکین ان سے زیادہ مجبور، ان سے زیادہ بے بس اور مظلوم ہیں۔ ستم رسیدہ انسانیت کسی نجات دہندہ کی منتظر تھی۔ انسانیت اور شرافت کے لیے سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ مسلمان چھپ چھپ کر مسجدوں اور بزرگان دین کی خانقاہوں میں دعائیں کرتے تھے علمائے دین احمد شاہ ابدالی کو اس قسم کے پیغامات بھیج رہے تھے: "مرہٹوں کے مظالم اپنی انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔ اب آپ اس ملک کے مظلوم انسانوں کا آخری سہارا ہیں۔"

معظم علی آٹھ دن دلّی میں سرگرداں رہا۔ اس عرصہ میں اسے مرشد آباد کے کئی آدمی ملے جنھوں نے مرزا حسین بیگ کے ساتھ ہجرت کی تھی لیکن اس سے زیادہ کوئی نہ بتا سکا کہ وہ علالت کے باعث راستے کی ایک بستی میں رک گئے تھے۔

ایک شام معظم علی دن بھر کی جستجو کے بعد سرائے میں پہنچا تو اس کے کمرے میں ایک عمر رسیدہ آدمی دلاور خاں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ دلاور خاں نے اٹھ کر کہا۔ "جناب یہ مرزا حسین بیگ کے رشتہ دار ہیں۔" معظم علی کا دل دھڑکنے لگا۔

عمر رسیدہ آدمی نے کہا: "مرزا حسین بیگ ہمارے دور کے رشتہ دار تھے۔ آج میں نے جامع مسجد میں یہ اعلان سنا کہ آپ انھیں تلاش کر رہے ہیں۔"

معظم علی کا دل بیٹھ گیا اور اس نے کہا: "مرزا صاحب وفات پا چکے ہیں۔ میں ان کے بال بچوں کو تلاش کر رہا ہوں۔ آپ کو ان کے متعلق کچھ معلوم ہے؟"

عمر رسیدہ آدمی نے جواب دیا۔ "مجھے کچھ معلوم نہیں۔ آپ کے نوکر نے ابھی مجھے ان کے گھر کی تباہی کے واقعات سنائے ہیں۔ اگر ان کے بال بچے آپ کو لکھنؤ میں نہیں ملے تو آپ کو حیدرآباد جانا چاہیئے۔"

معظم علی نے کہا۔ "مرزا صاحب کے ماموں زاد بھائی لکھنؤ سے ہجرت کر کے حیدرآباد جا چکے ہیں۔ ممکن ہے کہ مرزا صاحب کی بیوی اور صاحبزادی لکھنؤ میں ان کا پتہ کرنے کے بعد حیدرآباد چلی گئی ہوں لیکن میں نے سنا تھا کہ مرزا صاحب کے کئی عزیز دلی میں بھی ہیں۔ آپ کسی ایسے آدمی کو نہیں جانتے جو زیادہ قریبی ہو ممکن ہے وہ یہاں آئے ہوں۔"

عمر رسیدہ آدمی نے جواب دیا۔ "یہاں مرزا صاحب کے خالو کے دو لڑکے رہتے تھے۔ بڑے کا نام عبدالجبار تھا اور چھوٹے کا نام عبدالکریم تھا۔ عبدالجبار کوئی چار سال قبل فوت ہو گیا تھا اور عبدالکریم اور اس کے خاندان کے باقی افراد ہجرت کر کے دکن چلے گئے تھے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ دکن میں وہ کہاں رہتے ہیں۔ بہرحال حیدرآباد سے یقیناً آپ کو ان کا سراغ مل جائے گا۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ جب تک آپ یہاں ہیں اس سرائے کی بجائے میرے پاس ٹھہریں۔"

معظم علی نے کہا۔ "میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں لیکن اب میرے یہاں ٹھہرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں انشاء اللہ کل یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔"

اگلی صبح دلی سے روانہ ہوتے وقت معظم علی نے لال قلعے کی طرف دیکھا اور پھر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر دعا کی۔ "مولائے کریم! میری قوم کی بے بسی تیری رحمت کو پکار رہی ہے۔ ہمیں ان افراد کی بداعمالیوں کی سزا نہ دے جن کی چیرہ دستیوں کے باعث ہماری عزت و آزادی کے پرچم ایک ایک کر کے سرنگوں ہو رہے ہیں۔ لال قلعہ کی دیواریں اس رجل عظیم کی راہ دیکھ رہی ہیں۔ جو ہماری عزت اور بقا کے دشمنوں سے لڑنے کی ہمت رکھتا ہو۔ یہ مایوسی اور بے بسی ہماری میراث ہے اور آج ہمیں ایک ایسے رہنما کی ضرورت ہے

جو وقت کی آندھیوں اور طوفانوں سے لڑ سکتا ہو۔ ہم تاریک رات کے مسافر ہیں اور ہمیں روشنی کے ایک مینار کی ضرورت ہے۔"



دو دن پیدل سفر کرنے کے بعد معظم علی دوبارہ اپنے ساتھیوں سے جا ملا اور چوتھے روز یہ لوگ حیدرآباد دکن کا رخ کر رہے تھے۔ کوئی چھ منزلیں طے کرنے کے بعد گیارہ آدمیوں کے اس قافلے کے ساتھ چھ سوار اور شامل ہو گئے اور انھوں نے یہ بتایا کہ ہم دلی چھوڑ کر نظام کی فوج میں ملازمت حاصل کرنے کے ارادے سے دکن جا رہے ہیں۔ راستے کی بستیوں سے معظم علی کو یہ اطلاع ملی کہ قریباً اڑھائی سو مسافروں کا ایک قافلہ ایک ہفتہ قبل اس راستے سے گزرا ہے۔ راستے میں معظم علی کے نئے ساتھی اس سے کافی مانوس ہو چکے تھے۔ اکبر خاں انھیں مرعوب کرنے کے لیے یہ بتا چکا تھا کہ معظم علی بنگال کی فوج کا ایک بہت بڑا افسر رہ چکا ہے۔

کئی دن کے سفر کے بعد معظم علی اور اس کے ساتھی ایک دوپہر ایک پہاڑی ندی کے کنارے سستانے کے لیے رکے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ درختوں کی چھاؤں میں آرام کرنے کے بعد وہ کوچ کی تیاری کر رہے تھے کہ انھیں سامنے پہاڑی کے عقب سے کہیں دور بندوقوں کے دھماکے سنائی دیئے۔ وہ جلدی سے گھوڑوں پر سوار ہو کر آگے بڑھے۔ پہاڑی کی چوٹی سے تھوڑی دور ادھر معظم علی نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو رکنے کے لیے کہا اور خود گھوڑے سے اتر کر جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھا۔ اب اسے بندوقوں کی آواز کے علاوہ عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار بھی سنائی دے رہی تھی۔ چوٹی پر پہنچ کر اسے ایک تنگ وادی دکھائی دی۔ وادی کے دائیں طرف ایک پہاڑی کے دامن میں قریباً اڑھائی سو آدمیوں کا ایک قافلہ مرہٹوں کے گھیرے میں آ چکا تھا۔ قافلے کے محافظ اور حملہ آور پتھروں اور درختوں کی آڑ سے ایک دوسرے پر گولیاں برسا رہے تھے۔ معظم علی نے

زین پر بیٹ کر صورتِ حالات کا جائزہ لیا۔ حملہ آوروں کی تعداد ایک سو سے زیادہ نہ تھی لیکن قافلے کی طرف سے لڑنے والے بہت کم معلوم ہوتے تھے۔ معظم علی مڑ کر بھاگتا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا اور اس نے کہا۔ "اس پہاڑی کے نیچے وادی میں ایک قافلہ گھرا ہوا ہے، تم میں سے دو آدمی گھوڑوں کے پاس رہیں۔ اکبر خاں تم آٹھ آدمیوں کے ساتھ اس چوٹی سے ذرا نیچے پتھروں اور جھاڑیوں کی آڑ میں چھپے رہو۔ میں باقی آدمیوں کے ساتھ دائیں طرف سے چکر کاٹ کر دوسری پہاڑی پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بلندی سے ہماری گولیاں حملہ آوروں کے لیے کافی پریشان کن ثابت ہوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ مرہٹے بدحواسی کی حالت میں پیچھے ہٹیں گے لیکن تمھاری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ اس پہاڑی کی طرف نہ آ سکیں۔ تمھاری گولیوں سے پریشان ہو کر اگر وہ وادی کی بائیں طرف پسپا ہونے کی کوشش کریں تو سمجھ لینا کہ ہم نے جنگ جیت لی ہے۔ اگر تم نے انھیں یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ہماری تعداد بہت کم ہے تو ممکن ہے کہ وہ چند منٹ کے اندر اندر پسپا ہو جائیں اور یہی میں چاہتا ہوں۔"

قریباً ایک گھنٹے کے بعد قافلے کے ساٹھ آدمی ہلاک اور گیارہ زخمی ہو چکے تھے اور مرہٹے ان پر ایک فیصلہ کن حملے کی تیاری کر رہے تھے، اچانک ان کے عقب میں پہاڑی کی چوٹی سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور سات آدمی گر پڑے۔ مرہٹے بدحواس ہو کر پیچھے ہٹنے لگے۔ پھر دوسری پہاڑی کے دامن سے اکبر خاں اور اس کے ساتھیوں نے گولیاں چلائیں اور چھ آدمی اور ڈھیر ہو گئے۔ مرہٹے اپنے دونوں طرف پہاڑیوں کو خطرناک سمجھ کر وادی کے درمیان سمٹنے لگے۔ قافلے کے محافظ حیران ہو کر اپنے دائیں اور بائیں دونوں پہاڑیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ معظم علی بھاگتا ہوا نیچے اترا اور بلند آواز میں چلایا۔ "تم کیا دیکھ رہے ہو، اب حملے کا وقت ہے۔ دشمن پسپا ہو رہا ہے۔ قافلے کے محافظوں نے "اللہ اکبر" کا نعرہ لگایا اور دشمن پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ پھر چند آدمیوں نے

بندوقیں پھینک کر تلواریں نکال لیں اور ان کا پیچھا کرنے لگے۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر میدان خالی ہو چکا تھا اور مرہٹے وادی کے نشیب کے گھنے جنگل میں روپوش ہو چکے تھے۔ اکبر خاں اپنے ساتھیوں کو گھوڑے لانے کا حکم دے کر بھاگتا ہوا معظم علی کے پاس پہنچا۔ قافلے کے محافظ اب اس کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ معظم علی کچھ دیر ان کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد قافلے کے پڑاؤ کی طرف بڑھا۔ چند قدم پر سرخ و سفید رنگ کا ایک ادھیڑ عمر آدمی ایک پتھر کی آڑ سے نمودار ہوا اور اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی دیر پہلے میں یہی سوچ رہا تھا کہ خدا اگر ہمیں ان ظالموں سے بچانا چاہتا ہے تو وہ ہماری مدد کے لیے آسمان سے فرشتے بھیج سکتا ہے، اگر آپ فرشتے نہیں تو میں آپ سے متعارف ہونا چاہتا ہوں۔ میرا نام فخرالدین ہے اور میں اس قافلے کے ساتھ حیدرآباد جا رہا تھا۔"

معظم علی نے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا نام معظم علی ہے اور یہ میرے دوست اکبر خاں ہیں اور ہماری منزل بھی حیدرآباد ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم وقت پر نہ پہنچ سکے ورنہ اتنی جانیں ضائع نہ ہوتیں۔"

فخرالدین نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تم شہیدوں کی قبریں کھودنے کا انتظام کرو اور زخمیوں کو ایک جگہ جمع کرو۔" پھر وہ معظم علی کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ کے باقی آدمی کہاں ہیں؟"

"وہ اس پہاڑی کے پیچھے اپنے گھوڑے لینے گئے ہیں۔"

قافلے کی عورتیں اور بچے گھنے درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے تھے، دو لڑکیاں جھاڑیوں سے باہر نکلیں اور بھاگتی ہوئی فخرالدین کی طرف بڑھیں۔ بڑی لڑکی جس کے ہاتھ میں بندوق تھی فخرالدین کے ساتھ دو اجنبی دیکھ کر چند قدم کے فاصلے پر رک گئی اور دوسری جس کی عمر بارہ سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی "ماموں جان!

ماموں جان !! کہتی ہوئی آگے بڑھی اور بے اختیار فخرالدین کے ساتھ لپٹ کر سسکیاں لینے لگی معظم علی نے بڑی لڑکی کی طرف دیکھا اور وہ بدحواس ہو کر اپنا نقاب درست کرنے لگی معظم علی نے دوبارہ اس کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت نہ کی تاہم چند ثانیے ایک حسین اور دلکش تصویر اس کی نظروں کے سامنے پھرتی رہی۔

فخرالدین نے چھوٹی لڑکی سے کہا۔ "بلقیس! بیٹی جاؤ اپنی ماں کے پاس بیٹھو اور عطیہ کو بھی تسلی دو کہ اب کوئی خطرہ نہیں۔ خدا نے ہمارے مدد کے لیے فرشتے بھیج دیئے ہیں۔"

"فرشتے؟" بلقیس نے حیران سی ہو کر کہا۔ "فرشتے کہاں ہیں؟"

فخرالدین نے مسکرا کر معظم علی اور اکبر خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ فرشتے نہیں تو اور کیا ہیں؟"

بلقیس نے حیرانی اور تشکر کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ان کی طرف دیکھا اور اس کی نگاہیں اکبر خاں کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ اکبر خاں اسے سچ مچ ایک فرشتہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی اپنی بہن کی طرف بڑھی اور فخرالدین نے معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "یہ میری بھانجیاں ہیں۔ ان کا باپ فوت ہو چکا ہے۔ انہیں میں دلی سے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ ان دنوں دلی میں داخل ہونا معمولی بات نہیں لیکن خوش قسمتی سے پونا کے ایک ہندو تاجر کے ساتھ میرے کاروباری تعلقات تھے اور اس نے مرہٹہ حکومت سے میرے لیے پروانۂ راہ داری حاصل کر کے میرے پاس بھیج دیا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ دلی سے واپسی پر راستے میں ہمیں یہ قافلہ مل گیا۔ یہ لوگ شمال کے شہروں سے تلاش روزگار کے لیے حیدرآباد جا رہے تھے۔ چلیے زخمیوں کو دیکھیں!"

معظم علی شام سے پہلے ایک منزل اور طے کرنا چاہتا تھا لیکن قافلے کی حفاظت کے خیال سے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

○

رات قدرے خنک تھی۔ عشاء کی نماز کے بعد قافلے کے پڑاؤ میں جگہ جگہ الاؤ جل رہے تھے۔ مرد، عورتیں اور بچے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں ان کے گرد جمع تھے۔ چند مسلح آدمی پڑاؤ کے گرد پہرہ دے رہے تھے۔ عطیہ، بلقیس اور ان کی ماں ایک چھوٹے سے خیمے کے اندر بیٹھی ہوئی تھیں اور خیمے سے چند قدم دور فخرالدین، معظم علی، اکبر خاں اور چند اور آدمی ایک الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔

ایک آدمی نے کہا۔ "حیدرآباد پہنچ کر ان یتیموں اور بیواؤں کا کیا بنے گا جن کے سرپرست لڑائی میں مارے جا چکے ہیں؟ ہم سب کو مل کر ان کا بوجھ اٹھانا چاہیئے!"

فخرالدین نے کہا۔ "آپ میں سے کسی کو ان کا بوجھ اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ حیدرآباد میں ان کی دیکھ بھال میرے ذمہ ہوگی۔"

فخرالدین سے چند سوالات پوچھنے پر معظم علی کو معلوم ہوا کہ وہ ایرانی تاجروں کے ایک بااثر اور متمول گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور چند سال قبل دلی سے ہجرت کر کے حیدرآباد دکن میں آباد ہو چکا ہے اور اس کا تجارتی کاروبار دکن سے میسور اور کرناٹک تک پھیلا ہوا ہے۔

جب معظم علی نے فخرالدین کے سوالات کے جواب میں مختصراً اپنی سرگذشت بیان کی تو وہ بے حد متاثر ہوا اور اس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ اگر آپ کے عزیز حیدرآباد میں ہیں تو میں وہاں پہنچتے ہی ان کا پتہ کر دوں گا۔ حیدرآباد میں آپ میرے مہمان ہوں گے۔"

تھوڑی دیر بعد چند آدمی اٹھ کر اپنے دوسرے ساتھیوں کے پاس چلے گئے اور باقی وہیں الاؤ کے قریب سو گئے۔ فخرالدین دیر تک معظم علی سے باتیں کرتا رہا۔ جب بنگال کے حالات زیر بحث آئے اور معظم علی نے میر جعفر کی کٹھ پتلی حکومت کے

متعلق اپنے تاثرات بیان کیے۔ اس کے بعد اودھ، روہیلکھنڈ اور دلی کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ بالآخر دکن کا ذکر آیا اور فخرالدین نے کہا:" دکن ان دنوں شمال اور مشرق سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی آخری جائے پناہ ہے۔ دلی کی قدیم شان و شوکت اب آپ کو حیدرآباد میں دکھائی دے گی لیکن میں دکن کے مستقبل کے متعلق زیادہ پُرامید نہیں۔ کرناٹک کی طرح انگریزوں اور فرانسیسیوں کا اثرورسوخ اب دکن کے دربار میں بھی پہنچ چکا ہے۔ دوسری طرف مرہٹے بڑی تیزی سے منظم ہو رہے ہیں اور وہ صرف دکن پر ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان پر قبضہ جمانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ بیرونی خطرات کا سامنا کرنے کے لیے دکن کے پاس وسائل کی کمی نہیں لیکن نظام الملک آصف جاہ کی وفات کے بعد گذشتہ چند سال میں اس کے بیٹوں کی خانہ جنگی نے مسلمانوں کے اس عظیم دفاعی حصار کی بنیادیں کھوکھلی کردی ہیں۔ اس وقت یہ کہنا مشکل ہے کہ دکن کی محلاتی سازشوں کا بالآخر نتیجہ کیا ہوگا لیکن میں جس شخص کی کامیابی سے ڈرتا ہوں وہ میر نظام علی ہے۔ اس نے اپنے ایک بھائی کو دوسرے کے ساتھ لڑایا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ جس دن دکن کی حکومت اس کے ہاتھ میں آئے گی وہ قوم کے لیے بنگال کے میر جعفر اور کرناٹک کے محمد علی والاجاہ سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوگا۔ وہ انگریزوں کی طرف بہت زیادہ مائل ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں جنوب کے مسلمانوں کے مستقبل سے بالکل مایوس بھی نہیں ہوں۔ ہمارے پڑوس میں ایک نئی طاقت ابھر رہی ہے۔ اگر میرے اندازے غلط نہیں تو ہم بہت جلد گیدڑوں اور بھیڑیوں کی شکارگاہوں میں ایک شیر کی گرج سنیں گے۔ میں ایک ایسے آدمی سے مل چکا ہوں جو ایک بیدار مغز سیاستدان بھی ہے اور ایک اولوالعزم سپاہی بھی!"

اکبر خاں، جو معظم علی کے قریب بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اچانک چونک اٹھا "جی وہ کون ہے؟"

"آپ اسے نہیں جانتے لیکن اگر وہ چند برس زندہ رہا اور قدرت نے اس کی مدد کی تو وہ جنوب کے مسلمانوں کا آخری محافظ ثابت ہوگا۔ اس کا نام حیدر علی ہے اور اس وقت وہ میسور کی فوج کا ایک افسر ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب انگریز اور مرہٹے اسے اپنا ایک طاقتور اور خطرناک حریف سمجھیں گے۔ ابھی جب آپ مجھے بنگال میں اپنی سپاہیانہ زندگی کے واقعات سنا رہے تھے تو میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ کسی دن آپ کی آخری منزل میسور ہوگی۔ میں اس سے دوبارہ مل چکا ہوں اور یقین کیجیے کہ میں اپنی زندگی میں کسی اور شخصیت سے اتنا متاثر نہیں ہوا۔ آپ کی طرح وہ ان طالع آزماؤں کو ملک کا بدترین سمجھتا ہے جو انگریزوں کے ساتھ اپنا سیاسی مستقبل وابستہ کر چکے ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔"اگر اس کے عزائم اس قدر بلند ہیں تو ہمیں دعا کرنی چاہیے کہ خدا اسے ان لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے جو اپنے ہر محسن کا سر کاٹ کر دشمن کے سامنے پیش کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔"

پاس ہی خیمے کے اندر عطیہ، بلقیس اور ان کی ماں دن بھر کے واقعات پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ عطیہ نے کہا۔"امی جان! ماموں جان ساری رات باہر بیٹھے رہیں گے؟"

"وہ آجائیں گے بیٹی۔ تم اب سو جاؤ!"

بلقیس نے ذرا آگے سرک کر عطیہ کے کان میں کہا:"آپا جان آپ نے فرشتے دیکھے ہیں؟"

"نہیں۔ لیکن تمھیں اس وقت بیٹھے بیٹھے فرشتوں کا خیال کیسے آیا؟"

"اس لیے کہ میں نے آج فرشتے دیکھے ہیں ۔۔ دو فرشتے ۔۔ ایک بڑا تھا اور ایک چھوٹا اور اس وقت وہ ماموں جان کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں ۔۔ دیکھیے اُدھر!" یہ کہتے ہوئے بلقیس نے خیمے کے دروازے کا پردہ اٹھا دیا۔

ماں نے کہا:"بیگی اب آرام سے سو جاؤ۔ انھوں نے ہماری جان بچائی ہے اور

تم ان کا مذاق اڑا رہی ہو۔"

"میں مذاق نہیں کرتی امّی جان! ماموں جان کہتے تھے وہ فرشتے ہیں۔"

"انھوں نے بالکل درست کہا۔ اگر یہ لوگ خدا کی رحمت کے فرشتے بن کر نہ آتے تو اس وقت ہماری لاشیں اٹھانے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔"



اگلی صبح یہ قافلہ وہاں سے روانہ ہوا۔ کوئی چار کوس چلنے کے بعد یہ لوگ ایک چھوٹی سی بستی میں داخل ہوئے۔ چند زخمی گھوڑوں پر سفر کرنے کے قابل نہ تھے۔ فخر الدین کی درخواست پر گاؤں کے زمیندار نے معقول کرائے پر سات بیل گاڑیاں مہیا کر دیں۔ زخمیوں کے علاوہ قافلے کی چند عورتیں اور بچے جو گھوڑوں پر طویل سفر کرنے سے تنگ آ چکے تھے بیل گاڑیوں میں سوار ہو گئے۔ ایک گاڑی میں فخر الدین کی بہن اور بھانجیاں بیٹھ گئیں۔

گاؤں کے لوگوں سے استفسار پر معظم علی کو یہ معلوم ہوا کہ مرہٹہ ڈاکوؤں کے اس گروہ کا اس علاقے سے کوئی تعلق نہیں یہ لوگ کہیں باہر سے آئے ہیں اور دو دن قبل اس گاؤں سے دس کوس شمال کی طرف ایک چھوٹے سے شہر کو لوٹ چکے ہیں۔

اگلے منزل پر ایک زخمی نے جس کی حالت بہت نازک تھی دم توڑ دیا۔ اس کے دو دن بعد ایک اور زخمی چل بسا۔

حیدر آباد پہنچتے پہنچتے معظم علی قافلے کے ہر بچے اور بوڑھے کی نگاہ میں ایک ہیرو بن چکا تھا۔ مسلح آدمی اسے اپنا کمانڈر تصور کرتے تھے۔ بوڑھے مردوں اور عورتوں کے لیے وہ ایک سعادت مند بیٹا اور نوجوانوں اور کمسن بچوں کے لیے وہ ایک شفیق بھائی بن چکا تھا۔ بلقیس کبھی کبھی گاڑی کا پردہ سرکا کر اکبر کی طرف دیکھتی اور عطیہ کے کان میں کہتی "اباجان وہ یقیناً کسی شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔" کبھی کبھی وہ پیدل چلنے کے بہانے گاڑی سے کود پڑتی اور پھر تھوڑی دور بھاگنے کے بعد فخر الدین سے کہتی "ماموں جان

میں گھوڑے پر سواری کروں گی" اور فخر الدین کے نوکر اسے گھوڑے پر سوار کرا دیتے۔ پھر وہ اکبر خاں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کوئی بات کرتی۔ "حیدر آباد ابھی یہاں سے کتنی دور ہے؟ آپ نے ہمایوں کا مزار دیکھا ہے؟ لال قلعہ اور جامع مسجد دیکھی ہے؟ ماموں جان کہتے تھے کہ آپ شیر کا شکار کھیلا کرتے ہیں۔ کبھی آپ نے ہاتھی بھی مارا ہے؟"

ایک دن اس نے بڑے بھولے پن سے کہا۔ "بھلا یہ درست ہے کہ آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟"

اکبر خاں اس سوال پر ہنس پڑا اور بلقیس کا معصوم چہرہ حیا سے تمتما اٹھا۔

"کیا بات ہے اکبر؟" معظم علی نے اپنا گھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ پوچھتی ہے میں شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔"

معظم علی نے کہا۔ "اس میں اس کا قصور نہیں۔ آجکل دلّی کا ہر تیسرا آدمی یہ دعوے کرتا ہے کہ وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔"

بلقیس کو اکبر خاں کی ہنسی اور اس سے زیادہ معظم علی کی مداخلت پسند نہ آئی اور اس نے مڑ کر ایک نوکر کو آواز دی۔ "یہ گھوڑا سنبھالو میں گاڑی پر جاتی ہوں۔"

جب وہ گھوڑے سے اتر کر گاڑی پر سوار ہو رہی تھی تو عطیہ نے بگڑ کر کہا۔ "بس گھوڑے کی سواری کا شوق پورا ہو گیا؟"

بلقیس کچھ دیر منہ بسور کر بیٹھی رہی۔ بالآخر اس نے کہا۔ "اباجان وہ دونوں گنوار ہیں!"

عطیہ ہنس پڑی لیکن ماں نے ڈانٹ کر کہا۔ "بڑی بدزبان ہو تم!"

تھوڑی دیر بعد عطیہ نے اس کے کان میں کہا۔ "چڑیل سچ بتاؤ کیا کہا تھا تم نے اس سے؟"

"میں نے اسے کیا کہا تھا!"

"اچھا تمھارے بادشاہ سلامت کو بلا کر یہ کہوں کہ ملکۂ عالیہ خفا ہو کر بیل گاڑی پر

سوار ہو گئی ہیں۔"

"امی جان!" بلقیس نے احتجاج کے لہجے میں کہا۔ "آپا جان مجھے گالیاں دیتی ہیں۔"

ماں نے کہا۔ "عطیہ چھوڑو اسے تنگ نہ کرو۔"



حیدر آباد پہنچ کر معظم علی نے فخرالدین کی جو شان و شوکت دیکھی وہ اس کی توقعات سے کہیں زیادہ تھی۔ دو منزلہ رہائشی مکان کے ساتھ اس کا مہمان خانہ اس قدر وسیع تھا کہ وہاں بیک وقت سو مہمان ٹھہر سکتے تھے۔ مہمان خانے کے ساتھ اس کا وسیع دفتر تھا جہاں آٹھ دس منشی کام کرتے تھے۔ وہ گھوڑوں اور ہاتھیوں کے علاوہ اسلحہ، بارود، ریشم، صندل اور گرم مسالے کی تجارت کرتا تھا۔ گلی کی دوسری طرف ایک وسیع حویلی میں اصطبل اور گودام تھے۔ جب یہ قافلہ حیدر آباد پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔ فخرالدین کا ایک نوکر چند گھنٹے پہلے گھر پہنچ کر اس کی آمد کی اطلاع دے چکا تھا۔ اس کے نوکر مہمان خانے کی نچلی منزل میں قافلے کے لاوارث بچوں، عورتوں اور بے سہارا آدمیوں کو ٹھہرانے کا انتظام کر چکے تھے۔ معظم علی اور اکبر خاں کو بالائی منزل میں جگہ دی گئی اور ان کے نوکر فخرالدین کے نوکروں کے ساتھ دوسری حویلی میں چلے گئے۔ قافلے کے باقی لوگ حیدر آباد میں اپنے اپنے ٹھکانوں کو رخصت ہو چکے تھے۔

رات کے وقت اپنے مہمانوں کو کھانا کھلانے کے بعد فخرالدین نے معظم علی سے کہا۔ "اب آپ آرام سے سو جائیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ علی الصباح آپ میرے علاوہ جس دوسرے آدمی کو پہلے دیکھیں گے، وہ مرزا حسین بیگ کا کوئی رشتہ دار ہوگا۔"

معظم علی نے کہا۔ "لیکن حیدر آباد بہت بڑا شہر ہے۔ آپ اتنی جلدی کیسے پتہ لگا لیں گے؟"

فخرالدین نے جواب دیا۔ "آپ اطمینان رکھیں۔ میرے پاس ڈیڑھ سو نوکر ہیں! اس

کے علاوہ میں ابھی شہر کے کوتوال اور فوج کے چیدہ چیدہ افسروں کے پاس جاتا ہوں، اگر مرزا حسین بیگ کے رشتہ دار حیدر آباد میں ہیں تو انھیں تلاش کرنے کے لیے ایک رات کافی ہے۔"

تھکاوٹ سے چور ہونے کے باوجود معظم علی کو دیر تک نیند نہ آئی۔ پھر صبح جب اس کی نیند کھلی تو سورج کافی اوپر آ چکا تھا۔ کمرے میں دوسرے بستر پر اکبر خاں ابھی تک گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ لباس تبدیل کر کے کمرے سے باہر نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ فخرالدین کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "مرزا حسین بیگ کے رشتہ دار مل گئے ہیں وہ صبح ہوتے ہی یہاں پہنچ گئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے لڑکے بھی ہیں۔ آپ گہری نیند سو رہے تھے میں نے جگانا مناسب نہ خیال کیا۔ اب چلیے وہ نیچے بیٹھک میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"میری نیند اس قدر اہم نہ تھی۔" معظم علی نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ "انھوں نے آپ کو کیا بتایا ہے؟"

فخرالدین نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ "انھیں مرزا حسین بیگ کے بچوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔"

معظم علی ایک ثانیے کے لیے لٹے ہوئے مسافر کی طرح فخرالدین کی طرف دیکھتا رہا۔

"مجھے افسوس ہے۔" فخرالدین نے کہا۔ "چلیے!"

معظم علی، فخرالدین کے ساتھ نیچے اتر کر ایک وسیع کمرے میں داخل ہوا۔ تین عمر رسیدہ آدمی اور پانچ نوجوان قالین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ معظم علی کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ معظم علی نے یکے بعد دیگرے ان کے ساتھ مصافحہ کیا اور ان کے سامنے قالین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ مرزا حسین بیگ کے بچے حیدر آباد پہنچ گئے ہوں گے۔ مرشد آباد چھوڑنے کے بعد وہ لکھنؤ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ میں ان کی تلاش میں لکھنؤ پہنچا تو وہاں سے ان کے رشتہ دار ہجرت کر چکے تھے۔ مرزا صاحب کے متعلق مجھے کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ میں

فیض آباد، آگرہ اور دلّی کے علاوہ کئی اور شہروں میں انھیں تلاش کرچکا ہوں۔"

ایک عمر رسیدہ آدمی نے کہا۔ "لکھنؤ میں ان کا رشتہ دار میرے سوا اور کون ہوسکتا تھا۔ میں مرزا صاحب کا ماموں زاد بھائی ہوں لیکن بدقسمتی سے میں پلاسی کی جنگ سے پہلے لکھنؤ چھوڑ کر یہاں آچکا تھا۔"

معظم علی نے پوچھا۔ "آپ ارشد بیگ ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"آپ میں سے عبدالکریم کون ہیں؟"

دوسرے آدمی نے جواب دیا۔ "میں ہوں لیکن مجھے بھی مرزا حسین بیگ کی بیوی اور لڑکی کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملی۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ یہاں آتے اور ہمیں نہ ملتے۔"

تیسرے آدمی نے معظم علی سے سوال کیا۔ "آپ محمود علی خاں کے بیٹے ہیں؟"

"جی ہاں۔" معظم علی نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔

اس نے کہا۔ "میں شوکت بیگ کا باپ ہوں۔"

معظم علی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور سوال کیا۔ "آپ یہاں کب آئے؟"

"مجھے پلاسی کی جنگ سے چند ہفتے بعد ملک بدر کردیا گیا تھا۔ میں نے بنگال چھوڑتے وقت مرشد آباد میں مرزا حسین بیگ کا پتہ کیا تھا لیکن وہ مجھ سے پہلے ہجرت کر چکے تھے۔ میرا بھی یہی خیال تھا کہ وہ لکھنؤ پہنچ گئے ہوں گے اور وہاں جاکر بھی میں نے انھیں تلاش کیا تھا۔"

معظم علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اور میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ یہاں سے ڈھاکہ جاکر ان کا پتہ کروں گا۔"

○

مرزا حسین بیگ کے رشتہ داروں سے ملنے کے بعد معظم علی کی حالت اس مسافر کی

سی تھی جس کے سامنے کوئی منزل یا راستہ نہ ہو۔ اسے حیدرآباد کی پررونق گلیاں اور بازار سنسان نظر آتے تھے۔ فخرالدین، مرزا حسین بیگ کی بیوی اور صاحبزادی کا پتہ دینے والے کو پانچ سو اشرفیاں انعام دینے کا اعلان کرچکا تھا اور شہر میں منادی کرنے والے گلی گلی گھوم رہے تھے لیکن فرحت اور اس کی ماں کا کوئی سراغ نہ ملا۔

اکبر خاں کے لیے حیدرآباد کا پررونق شہر ایک بہت بڑا عجائب گھر تھا، وہ صبح سویرے اٹھتا اور کسی نوکر کو ساتھ لے کر باہر نکل جاتا۔ اسے حیدرآباد کی فوجی تربیت گاہ میں نوجوان افسروں کی نیزہ بازی، شہسواری اور چوگان کے کھیل بہت پسند تھے۔ کبھی وہ فخرالدین کے اصطبل میں جاتا اور کسی شوخ اور تند گھوڑے پر سوار ہوکر سیر کے لیے چلا جاتا۔ اسے معظم علی کے رنج و کرب کا بڑی شدت کے ساتھ احساس تھا اور وہ اسے تسلی دینے کی کوشش کیا کرتا تھا لیکن معظم علی کے ساتھ بیکار بیٹھنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ اکثر یہ کہتا۔ "بھائی جان! آج فلاں جگہ نیزہ بازی ہو رہی ہے۔ آج فلاں میدان میں فوج کے افسر چوگان کھیل رہے ہیں۔ آج فخرالدین کے اصطبل میں چند نئے گھوڑے آئے ہیں، چلیے آپ کو دکھاتا ہوں!"

معظم علی کبھی کبھی دل پر جبر کرکے اس کا ساتھ دیتا لیکن عام طور پر اس کا یہی جواب ہوتا۔ "اکبر تم جاؤ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"



ایک دن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اکبر خاں کہیں باہر گیا ہوا تھا اور معظم علی اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے کمرے کے سامنے طویل برآمدے کا ایک سرا رہائشی مکان سے ملا ہوا تھا، اچانک موسلا دھار بارش شروع ہوئی اور معظم علی کمرے سے ایک کرسی نکال کر برآمدے میں بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد دائیں ہاتھ برآمدے کے کونے پر ایک دروازہ کھلا اور بلقیس جھجکتی شرماتی ہوئی آگے بڑھی۔

"آؤ بلقیس!" معظم علی نے اس کی طرف دیکھ کر پیار سے کہا۔ "میں نے تمھیں کل سے نہیں دیکھا۔ کہاں غائب تھیں تم؟"

بلقیس نے جواب دیا۔ "کل ابّا جان کو بخار تھا اور میں ان کے پاس تھی۔"

"اب کیسی ہیں وہ؟"

"اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ امی جان پوچھتی ہیں، آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"ماموں جان کہتے تھے کہ آپ یہاں سے بہت جلد چلے جائیں گے؟"

"ہاں! میرا ارادہ ہے کہ میں اگلے ہفتے یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔"

"نہیں آپ نہ جائیں!" بلقیس نے منہ بسور کر کہا۔ "اگر آپ یہاں ٹھہریں تو آپ کے رشتہ دار ضرور مل جائیں گے۔ میں ہر روز یہ دعا کیا کرتی ہوں کہ آپ کے رشتہ دار آپ کو مل جائیں۔ امی جان اور ابّا جان بھی آپ کے لیے دعا کیا کرتی ہیں اور میں یہ بھی دعا کیا کرتی ہوں کہ آپ یہیں رہیں۔"

معظم علی مسکرایا۔ "بلقیس تم بہت اچھی لڑکی ہو لیکن میرے لیے حیدرآباد ٹھہرنے کی دعا نہ کیا کرو۔"

"کیوں آپ کو حیدرآباد پسند نہیں؟"

"حیدرآباد بہت اچھا شہر ہے لیکن میں یہاں ایک مسافر ہوں۔"

بلقیس نے مایوس ہو کر کہا۔ "آپ کو گھر یاد آتا ہو گا؟"

"میرا کوئی گھر نہیں۔" معظم علی نے جواب دیا۔

"تو پھر آپ یہاں کیوں نہیں رہتے؟"

"میں لکھنؤ جانا چاہتا ہوں۔"

"لکھنؤ میں آپ کے رشتہ دار ہوں گے؟" بلقیس نے کہا۔

"نہیں۔"

بلقیس نے صحن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ماموں جان آگئے!"

معظم علی نے صحن کی طرف دیکھا۔ فخرالدین ایک چھتری اٹھائے سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ معظم علی اٹھ کر کمرے سے دوسری کرسی نکال لایا۔ فخرالدین اوپر پہنچا تو بلقیس وہاں سے چلی گئی۔

فخرالدین نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "اکبر خاں کہاں ہے؟"

"جی وہ بارش سے تھوڑی دیر پہلے باہر نکل گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ آپ کے اصطبل میں گھوڑے دیکھ رہا ہو گا۔"

"اسے گھوڑوں کا بہت شوق ہے۔ میں اسے عربی نسل کا ایک بہترین جوڑا دینا چاہتا ہوں۔ بڑا ہونہار لڑکا ہے۔ اگر آپ اسے میرے پاس چھوڑ دیں تو میں اسے چند برس میں ایک کامیاب تاجر بنا سکتا ہوں۔ اسے گھوڑوں کی تجارت کا شوق بھی ہے۔"

"یہ شوق اسے اپنے باپ سے ملا ہے۔"

فخرالدین نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "میں آپ سے ایک اہم مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

"فرمائیے۔"

فخرالدین نے تھوڑی دیر گردن جھکا کر سوچنے کے بعد کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں حیدرآباد میں آپ کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ آپ کا چہرہ یہ بتا رہا ہے کہ آپ کسی غم میں گھلے جا رہے ہیں۔ آپ ان نوجوانوں میں سے ہیں جنھیں قدرت نے پہاڑوں کے سینے چیرنے کی ہمت عطا کی ہے۔ زندگی سے آپ کی یہ بیزاری بڑی افسوسناک ہے۔ میں ابھی سپہ سالار سے مل کر آ رہا ہوں۔ میں نے ان سے آپ کا ذکر کیا تھا اور انھوں نے آپ کی سرگزشت

سننے کے بعد یہ کہا تھا کہ اگر ایسا نوجوان حیدرآباد کی فوج میں شامل ہونا پسند کرے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔ وہ آپ کو بہترین عہدہ دینے کے لیے تیار ہیں اور مجھے یقین ہے کہ یہاں آپ کا مستقبل بہت روشن ہوگا اور آپ اپنی اداس اور مغموم زندگی میں نئی دلچسپیاں تلاش کرسکیں گے۔"

معظم علی نے جواب دیا "زندگی کے ساتھ میری دلچسپیاں ابھی ختم نہیں ہوئی ہیں لیکن یہ میں فیصلہ کرچکا ہوں کہ میں آئندہ فوج کی ملازمت نہیں کروں گا۔ میرے لیے اپنے ان عزیزوں اور دوستوں کی بے مقصد قربانیوں کی یاد کافی ہے جن کا خون بنگال کی خاک میں جذب ہوچکا ہے۔"

فخرالدین نے پھر تھوڑی دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد کہا "یہ بات مجھے عجیب معلوم ہوتی ہے اور شاید آپ کو بھی عجیب معلوم ہو لیکن ہم جس دور سے گزر رہے ہیں۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ ہمارے قدیم رسم و رواج کی دیواریں توڑ رہا ہے۔ میری اور مجھ سے زیادہ میری ہمشیرہ کی یہ خواہش ہے کہ آپ کو ان کی بڑی لڑکی کا شریکِ حیات بنا دیا جائے اور یہ اس لیے نہیں کہ آپ نے ہماری جانیں بچائی ہیں بلکہ اس لیے کہ میں اپنی یتیم بھانجی کے لیے آپ جیسا نیک اور قابلِ اعتماد رفیقِ حیات تلاش کرلینا قدرت کا ایک انعام سمجھتا ہوں اور اپنی بھانجی کے متعلق اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایک نیک ماں اور شریف باپ کی بیٹی ہے اور وہ اس قابل ہے کہ میں اس کے لیے کسی ریاست کے مالک کا دروازہ کھٹکھٹا سکوں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر اسے اپنے مستقبل کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے تو وہ آپ جیسے سلیم الفطرت انسان کے ساتھ ایک جھونپڑے میں زندگی بسر کرنے کو ترجیح دے گی۔"

معظم علی دیر تک سر جھکا کر سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے فخرالدین کی طرف دیکھا اور آبدیدہ ہوکر کہا "میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ نے روئے زمین کے تمام پہاڑ اٹھا کر

میری گردن پر رکھ دیئے ہیں۔ میں آپ کا شکرگزار ہوں۔ آپ نے مجھ پر یہ حقیقت واضح کی ہے کہ یہ دنیا آج بھی فرشتوں کے وجود سے خالی نہیں لیکن میں اس مسئلے میں بےبس ہوں اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری زبان سے انتہائی دیانتدارانہ جواب بھی شرافت اور انسانیت کا منہ نوچنے کے مترادف ہوگا۔ میں آپ کے سامنے ایک واقعہ بیان کرتا ہوں:۔ یہ چند برس کی بات ہے۔ میرا ایک دوست جو مجھے بھائی کی طرح عزیز تھا، لڑائی میں زخمی ہونے کے بعد میری گود میں سر رکھ کر دم توڑ رہا تھا۔ اس دنیا میں اسے اپنی ایک بہن سب سے زیادہ عزیز تھی اور اس کی آخری خواہش یہ تھی کہ میں اس کے مستقبل کا امین بنوں۔ مجھے یہ بتانے میں کوئی تامل نہیں کہ میں اس لڑکی کو جانتا تھا۔ میں اسے اس وقت سے جانتا تھا جب وہ گڑیا کے ساتھ کھیلا کرتی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس کے بھائی کی آخری خواہش پوری ہوگی لیکن کچھ عرصہ بعد میں گرفتار اور پھر مرہٹوں کی قید سے نکل کر گھر پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کی منگنی ہوچکی ہے اس کے بعد دنیا میرے لیے تاریک ہوچکی تھی، پھر ایک دن ایسا ہوا جب میں اور اس لڑکی کا منگیتر ایک ہی محاذ پر مرہٹوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ وہ مجھ سے کسی بات میں کم نہ تھا اور ہم ایک دوسرے کے بہترین دوست بن چکے تھے۔ میں اس لڑکی کی خاطر اس کے ہونے والے شوہر کے لیے اپنے دل میں ایک بھائی کی شفقت محسوس کرتا تھا۔ یہ نوجوان ایک لڑائی میں مارا گیا۔ پھر ہمارے والدین ہمارے مستقبل کا فیصلہ کرنے والے ہی تھے کہ بنگال میں انقلاب آگیا۔"

فخرالدین نے متاثر ہوکر کہا "اور وہ لڑکی مرزا حسین بیگ کی بیٹی تھی؟"

"جی ہاں۔"

"میں دعا کرتا ہوں کہ آپ اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔"

تھوڑی دیر بعد فخرالدین اٹھ کر زنان خانے میں چلا گیا اور معظم علی دیر تک وہیں

بیٹھا رہا۔ معظم علی نے عطیہ کو صرف ایک بار اور وہ بھی دور سے دیکھا تھا۔ تاہم اس کی معمولی جھلک بھی کسی نوجوان کے دل کی دھڑکنیں تیز کرنے کے لیے کافی تھی لیکن معظم علی کے پہلو میں وہ دل نہ تھا۔ عطیہ بہت کچھ تھی لیکن وہ فرحت نہ تھی۔

"فرحت! فرحت!!" وہ اپنے تصور میں اسے آوازیں دیتا ہوا اٹھا اور کمرے کے اندر جا کر بستر پر گر پڑا۔ "فرحت! فرحت!! تم کہاں ہو؟ کاش میری آواز تمھارے کانوں تک پہنچ سکتی!"

اگلے روز رات کے وقت معظم علی اور اکبر خاں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، فخر الدین اندر داخل ہوا اور ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا "معظم علی! حیدر آباد کی فوج میں ملازمت کے متعلق تم میری تجویز رد کر چکے ہو لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ تمھیں بیکار بیٹھ کر چین نصیب نہیں ہوگا۔ اگر تم تجارت شروع کرنا چاہو تو میں تمھیں اور اکبر خاں کو اپنے ساتھ شریک کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ شریک ہونا پسند نہیں کرتے تو میں تمھیں بڑی خوشی سے قرض حسنہ کے طور پر ایک معقول رقم دینے کے لیے تیار ہوں۔ تم جب چاہو مجھے واپس کر دینا، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کسی کام میں تمھارا جی لگ جائے۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "تجارت کے متعلق میں بھی چند دنوں سے سوچ رہا ہوں ممکن ہے کہ میں یہیں سے ابتدا کر دوں اور لکھنؤ جاتے ہوئے اپنے ساتھ چند گھوڑے لیتا جاؤں اور سرمائے کے لیے میں آپ کو تکلیف دینا پسند نہیں کروں گا۔"

"لیکن سرمائے کے بغیر تو تجارت نہیں ہوتی!"

"سرمایہ میرے پاس کافی ہے۔" معظم علی نے یہ کہتے ہوئے اپنی قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر کمرے کے ساتھ بندھی ہوئی تھیلی نکالی اور اس میں سے ایک ہیرا نکال کر فخر الدین کے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کے خیال میں اس کی قیمت کیا ہوگی؟"

فخر الدین نے چراغ کی روشنی میں ہیرے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا۔ "اگر آپ کے پاس

اس قسم کے آٹھ دس اور ہیرے ہوں تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ لکھنؤ کے امیر ترین آدمی ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔ "اس تھیلی میں تیس ہیرے اور ہیں لیکن مجھے ان کی کوئی پہچان نہیں۔ میں نے ایک ہیرا جو اس سے ذرا چھوٹا تھا، لکھنؤ میں بارہ سو اشرفی کے عوض بیچا تھا اور اس ہیرے کو فروخت کرنے کے لیے آپ کو تکلیف دینا چاہتا ہوں۔"

"لکھنؤ میں آپ کو کسی نے ٹھگ لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس ہیرے کے عوض میں آپ کو پانچ گنا زیادہ دلا سکوں گا۔"

معظم علی نے اس کے ہاتھ میں تھیلی دیتے ہوئے کہا۔ "انھیں بھی دیکھ لیجیے!"

فخر الدین نے تھیلی اپنی ہتھیلی پر الٹنے کے بعد کہا۔ "یہ ہیرے بہت قیمتی ہیں لیکن آپ نے لیے کہاں سے؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "یہ اباجان کو سراج الدولہ کا آخری انعام تھا۔"

فخر الدین نے کہا۔ "اب مجھے مہمان خانے پر پہرا لگانا پڑے گا۔ آپ نے کسی اور کو تو نہیں بتایا؟"

"نہیں۔"

"آپ کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔"

بارھواں باب

ایک صبح صابر، شیر علی کے لیے ناشتا تیار کر رہا تھا کہ باہر سے دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد کسی نے آواز دی۔ "صابر، صابر دروازہ کھولو!"

صابر نے بھاگ کر دروازہ کھولا تو اس کے سامنے دلاور خاں گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ صابر نے بدحواس ہو کر سوال کیا۔ "معظم علی خاں کہاں ہیں؟"

"وہ شام تک پہنچ جائیں گے۔" دلاور خاں نے صحن میں پاؤں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"صابر! کون ہے؟" مکان کے ایک کمرے سے شیر علی کی آواز سنائی دی۔

"جی دلاور خاں آگیا ہے۔"

شیر علی جلدی سے باہر نکل آیا۔ صابر دلاور خاں سے کئی سوالات پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اس کے ہاتھ میں گھوڑے کی باگ دے کر جلدی سے آگے بڑھا اور شیر علی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "جناب خاں صاحب آرہے ہیں۔ مجھے انھوں نے یہ اطلاع دینے کے لیے بھیجا ہے کہ وہ شام تک پہنچ جائیں گے۔ وہ اپنے ساتھ اسّی گھوڑے لا رہے ہیں۔ اس لیے آپ شہر سے باہر فوراً کوئی ایسا مکان کرائے پر حاصل کریں جہاں گھوڑوں کے علاوہ پندرہ بیس آدمیوں کے ٹھہرنے کا انتظام ہو سکے۔ خاں صاحب نے کہا ہے کہ اگر شہر کے باہر کوئی ایسی کشادہ حویلی مل جائے جس کے اندر ایک رہائشی مکان بھی ہو تو زیادہ اچھا ہوگا۔ اگر کرائے کی بجائے قیمت پر کوئی موزوں جگہ ملتی ہو تو خرید لیں وہ آتے ہی قیمت ادا کر دیں گے۔ وہ یہ

کہتے تھے کہ گھوڑوں کی تجارت کے لیے ہمیں لکھنؤ میں مستقل طور پر ایک نہایت کشادہ مکان کی ضرورت ہے۔"

شیر علی نے دلاور خاں سے چند سوالات پوچھے اور ناشتے کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گیا۔

دن کے تیسرے پہر شیر علی، دلاور خاں کے ساتھ شہر کے مغربی دروازے پر کھڑا معظم علی کا انتظار کر رہا تھا۔ عصر کی نماز کے تھوڑی دیر بعد سڑک پر ایک قافلے کی جھلک دکھائی دی اور دلاور خاں نے کہا۔ "جناب! وہ آگئے!"

تھوڑی دیر بعد قافلہ کچھ فاصلے پر سڑک سے اتر کر ایک کھیت میں رُک گیا اور شیر علی اور دلاور خاں تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھے۔

معظم علی، شیر علی کو دیکھ کر گھوڑے سے اتر پڑا اور اکبر خان نے اس کی تقلید کی۔ شیر علی نے آگے بڑھ کر گرمجوشی سے ان کے ساتھ باری باری مصافحہ کیا اور کہا۔ "آپ کو یہاں رُکنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمام انتظامات کر لیے ہیں۔ شہر کی دوسری طرف مضافات کی ایک بستی میں مجھے ایک بہت کھلی حویلی مل گئی ہے۔ حویلی کا مالک نہایت شریف آدمی ہے اور اس نے مجھے یہ کہا ہے کہ آپ پندرہ بیس دن کے لیے اپنے گھوڑے اور نوکر یہاں رکھ سکتے ہیں اور اس کے لیے میں کوئی کرایہ وصول نہیں کروں گا۔ اس کے بعد اگر مجھے مناسب قیمت مل گئی تو میں حویلی آپ کے ہاتھ فروخت کر دوں گا۔ حویلی کے اندر ایک چھوٹا سا دو منزلہ مکان بھی ہے جو بالکل نیا ہے۔ ایک طرف چند پرانی کوٹھڑیاں ہیں جو نوکروں کے کام آسکتی ہیں۔ گھوڑے ابھی ہمیں کھلے صحن میں باندھنے پڑیں گے۔ اگر حویلی کے مالک کے ساتھ ہمارا سودا ہو گیا تو گھوڑوں کے اصطبل تعمیر کرنے کے لیے اس میں کافی جگہ ہے۔"

معظم علی نے سوال کیا۔ "آپ نے اس سے قیمت کے متعلق پوچھا ہے؟"

"جی ہاں میں نے پوچھا تھا لیکن وہ براہ راست آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

وہ غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے شہر کی دوسری طرف ایک بستی میں داخل ہوئے، حویلی کا مالک دروازے پر کھڑا تھا۔ شیر علی نے معظم علی کے ساتھ اس کا تعارف کرایا تو معظم علی نے کہا۔ "میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں۔ اگر آپ اس قدر فیاضی سے کام نہ لیتے تو ہمیں بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔"

حویلی کے مالک نے کہا۔ "مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ یہ جگہ کسی کام آرہی ہے، یہ حویلی ایک سرائے تھی۔ پہلے یہاں کافی رونق رہا کرتی تھی لیکن اب شہر میں چند نئی سرائیں بن گئی ہیں اور مسافر یہاں ٹھہرنا پسند نہیں کرتے۔ پچھلے سال جب میں نے اسے خریدا تھا تو یہ نہایت شکستہ حالت میں تھی۔ میں اسے مرمت کروا چکا ہوں۔ اس کے اندر کام کا صرف ایک مکان تھا اور اس پر میں نے بالاخانہ تعمیر کرایا ہے۔ تین چار مہینے میں نے سرائے کا کاروبار چلانے کی کوشش کی تھی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کبھی باہر سے کوئی بڑا قافلہ آتا تھا تو لوگ مجبوری کی حالت میں ایک آدھ دن کے لیے یہاں اتر پڑتے تھے لیکن اس کے بعد وہ شہر میں چلے جاتے تھے۔ اس لیے میں نے سرائے کا کاروبار بند کر دیا۔ آپ کے کاروبار کے لیے یہ جگہ بہت موزوں ہوگی اور اگر آپ خریدنا چاہیں تو میں کوئی نفع لیے بغیر فروخت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ فوراً فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ اسے اندر باہر سے اچھی طرح دیکھ لیں!"

"چلیے ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" معظم علی سرائے کے مالک کے ساتھ اندر داخل ہوا اور صحن میں کھڑا ہو کر چاروں طرف نگاہ دوڑانے کے بعد بولا: "یہ جگہ ہمارے کام آسکتی ہے۔ آپ قیمت بتائیں!"

"نہیں آپ اچھی طرح دیکھ لیں۔ آیئے میں آپ کو وہ مکان دکھاتا ہوں۔"

مالک مکان کے اصرار پر معظم علی اس کے ساتھ چل پڑا۔ نچلی منزل کے پانچ کمرے دکھانے کے بعد وہ اسے بالاخانے پر لے گیا۔ وہاں تین کشادہ کمروں کے سامنے ایک برآمدہ

تھا اور برآمدے کے سامنے کھلی چھت ایک چھوٹے سے صحن کا کام دیتی تھی۔

معظم علی نے بالاخانے سے حویلی کا جائزہ لینے کے بعد مالک مکان سے کہا۔ "آپ سودے کی بات کریں!"

مالک مکان نے کہا۔ "لیکن جناب اس طرف دیوار کے ساتھ چند کوٹھڑیاں ہیں نیچے اتر کر آپ وہ بھی دیکھ لیں۔"

"انھیں دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے اس حویلی کا بہت سا حصہ دوبارہ تعمیر کرنا پڑے گا۔ آپ بلاجھجک قیمت بتائیں!"

مالک مکان نے جواب دیا۔ "جناب میں آپ کو کاغذات دکھا سکتا ہوں۔ میں نے سات ہزار میں یہ حویلی خریدی تھی اور قریباً اڑھائی ہزار روپیہ اس پر اور خرچ کر چکا ہوں۔ حویلی کا سودا چند آدمیوں کے سامنے ہوا تھا۔ صبح تک میں انھیں بھی آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو دس ہزار روپیہ دینے کے لیے تیار ہوں پانچ سو آپ کا نفع ہوگا۔"

"میں اس پانچ سو کو نفع کی بجائے ایک امیر آدمی کا انعام سمجھوں گا۔ مجھے دس ہزار منظور ہے لیکن میں آپ کی خدمت میں ایک درخواست پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جب میں نے یہ حویلی خریدی تھی تو یہاں دو غریب عورتیں رہتی تھیں۔ سرائے کے پہلے مالک نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں انھیں یہیں رہنے دوں، وہ بے سہارا ہیں اور گاؤں کے لوگوں کے کپڑے سی کر اپنا پیٹ پالتی ہیں۔ کبھی کبھی میری بیوی کچھ مدد کر دیا کرتی ہے۔ جب کبھی یہاں مسافر آیا کرتے تھے تو انھیں بہت تکلیف ہوتی تھی اور وہ سارا دن اپنی کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے پڑی رہتی تھیں۔ میں نے کونے کی ایک کوٹھڑی کے سامنے ان کے پردے کے لیے ایک چھوٹی سی دیوار بنوا دی ہے۔ وہ نہایت نیک ہیں اور آپ جیسے خدا ترس لوگوں

کی اعانت کی مستحق ہیں۔ اس لیے میں آپ سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ انھیں وہاں رہنے دیں۔"

معظم علی نے اپنی جیب سے چاندی اور سونے کے چند سکے نکال کر حویلی کے مالک کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "انھیں ہماری طرف سے پیش کر دیں اور صبح یہاں تشریف لا کر اپنی رقم وصول کر لیں۔"

اس کے بعد معظم علی، شیر علی خاں کی طرف متوجہ ہوا۔ "اب گھوڑوں کی دیکھ بھال اور نوکروں کے قیام و طعام کا انتظام آپ کے ذمہ ہے۔ میں اکبر خاں کے ساتھ شہر کے مکان میں جاتا ہوں۔ ہم بہت تھکے ہوئے ہیں۔ کل ہم یہاں آجائیں گے۔"



اگلے دن معظم علی شہر کے مکان سے اپنا مختصر سا سامان اس حویلی میں منتقل کر چکا تھا۔

بالائی منزل کے کمرے وہ اپنی رہائش کے لیے منتخب کر چکا تھا۔ شیر علی نچلی منزل کے ایک کمرے میں اپنا دفتر سجا رہا تھا۔ شہر سے گھوڑوں کے خریدار جوق در جوق وہاں جمع ہو رہے تھے اور حویلی ایک اچھی خاصی منڈی معلوم ہوتی تھی۔ آس پاس کے بہت سے لوگ صرف گھوڑے دیکھنے کے لیے وہاں جمع ہو جاتے تھے۔ صابر سارا دن کھانا پکانے اور برتن صاف کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ جب کبھی فرصت ملتی حویلی کا ایک چکر لگاتا۔ اسے وہ سفید گھوڑے جو اکبر خاں کو فخر الدین نے دیئے تھے، بے حد پسند تھے اور اس کی پسند کی وجہ یہ تھی کہ اس نے معظم علی اور اکبر خاں کو ان کی تعریف کرتے ہوئے سنا تھا۔ وہ کسی دیہاتی کو بازو سے پکڑ کر ان گھوڑوں کے پاس لے جاتا اور پوچھتا: "تمھارے خیال میں ان گھوڑوں کی کیا قیمت ہوگی؟" وہ سادگی سے کوئی رقم بتاتا تو صابر جھنجلا اٹھتا۔ "واہ کیا کہنے تمھاری پہچان کے۔ ابے اُلّو ان کی قیمت

تمھارے سارے گاؤں سے زیادہ ہے۔"

تین دن کے اندر معظم علی بیس گھوڑے فروخت کر چکا تھا۔ چوتھے روز ایک خوش پوش اجنبی اس کے پاس آیا اور اس نے تیس گھوڑے منتخب کر کے ان کی قیمت طے کرنے کے بعد کہا "میں یہ گھوڑے بنارس کے راجہ کے لیے خریدنا چاہتا ہوں لیکن گھوڑوں کو بنارس پہنچانا آپ کی ذمہ داری ہے۔ ان کی قیمت بھی آپ کو وہیں ادا کی جائے گی۔"

معظم علی نے جواب دیا "مجھے بنارس پہنچانے میں کوئی عذر نہیں لیکن اگر راجہ نے یہ گھوڑے پسند نہ کیے تو ۔ ۔ ۔ ؟"

"میں راجہ کا چچا زاد بھائی ہوں۔" اس نے جواب میں کہا۔

"آپ کب جانا چاہتے ہیں؟"

"کل۔"

معظم علی، شیر علی کی طرف متوجہ ہوا۔ "چچا! آپ بنارس جانا پسند کریں گے؟"

"کیوں نہیں۔ میں ابھی جانے کے لیے تیار ہوں۔"

"بہت اچھا آپ کل ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔"



دو دن بعد لکھنؤ میں یہ افواہ گرم تھی کہ دتاجی سندھیا کی افواج نجیب الدولہ کو مغلوب کرنے کے لیے سہارنپور کی طرف پیشقدمی کر رہی ہیں۔ روہیلکھنڈ کے مسلمانوں کے نزدیک نجیب الدولہ ایک بہت بڑے قومی ہیرو کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ اکبر خاں یہ خبر سنتے ہی اپنے ساتھیوں کو گھوڑوں پر زینیں ڈالنے کا حکم دے کر بالا خانے پر معظم علی کے کمرے میں داخل ہوا۔ معظم علی دریچے کے سامنے کرسی پر بیٹھا ایک کتاب دیکھ رہا تھا۔ اس نے کتاب بند کرتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ "اکبر

بیٹھ جاؤ!"

اکبر اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا اور معظم علی نے کہا: "ہماری ابتدا بہت اچھی ہے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ یہ گھوڑے اتنی جلدی بک جائیں گے۔ میں شیخ فخرالدین کو پیغام بھیج رہا ہوں کہ ہمارے لیے دو سو گھوڑے اور خرید لیں۔ ان کا جواب آنے پر مجھے وہاں جانا پڑے گا۔ اب مجھے زندہ رہنے کے لیے کسی دلچسپی کی ضرورت ہے۔"

اکبر خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا: "بھائی جان! مرہٹوں کی فوج نجیب الدولہ کے تعاقب میں سہارنپور کی طرف بڑھ رہی ہے۔ میں نے ابھی یہ خبر سنی ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں فوراً گھر جانا چاہتا ہوں۔"

"ان حالات میں تمھیں مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ تم کب جانا چاہتے ہو؟"

اکبر خاں نے جواب دیا: "میرے ساتھی گھوڑوں پر زینیں ڈال رہے ہیں۔"

معظم علی نے کہا: "بہت اچھا تم نیچے جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔"

اکبر خاں نے کرسی سے اٹھ کر کہا: "بھائی جان آپ خفا تو نہیں ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر حالات ٹھیک ہوئے تو میں بہت جلد واپس آجاؤں گا۔"

معظم علی نے جواب دیا: "مرہٹوں کی پیشقدمی کی خبر سننے کے بعد اگر تم فوراً گھر جانے کے لیے تیار نہ ہوتے تو مجھے یقیناً افسوس ہوتا۔ مجھ سے زیادہ اس بات کا احساس اور کسے ہو سکتا ہے کہ روہیلکھنڈ کے ایک معزز قبیلے کے سردار کی حیثیت میں تمھاری ذمہ داریاں کیا ہیں اور میں تمھیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ جس دن مجھے اس بات کا احساس ہوگا کہ تمھیں میری ضرورت ہے یا میں تمھارے کسی کام آسکتا ہوں تو میں بن بلائے تمھارے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

اکبر خاں کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی بالاخانے سے اتر کر حویلی کے صحن میں داخل ہوا تو اکبر خاں

اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر زینیں ڈال چکے تھے۔ معظم علی کے ایک ہاتھ میں روپوں کی تھیلی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر اکبر خاں کے کندھے پر دوسرا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اکبر یہ لو!"

"اس میں کیا ہے؟" اکبر خاں نے سوال کیا۔

"اس میں تمھارے حصے کی کچھ رقم ہے جب دوبارہ ملاقات ہوگی تو ہم اطمینان سے بیٹھ کر حساب کریں گے۔ اس میں ساٹھ اشرفیاں تمھارے آدمیوں کے لیے ہیں۔"

اکبر خاں نے کہا: "بھائی جان آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ نوکروں کے متعلق میں آپ کو منع نہیں کرتا لیکن اپنے لیے میں ایک کوڑی قبول نہیں کروں گا۔"

معظم علی نے کہا: "جو لوگ اپنا حق وصول نہیں کرتے وہ غاصبوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔"

"لیکن اس تجارت میں میرا کوئی حصہ نہیں۔"

"یہ سوچنا میرا کام ہے۔" معظم علی نے یہ کہتے ہوئے سکوں کی تھیلی اکبر خاں کے گھوڑے کی خرجین میں ڈال دی۔

اکبر خاں نے احتجاجاً کہا: "بھائی جان مجھے روپے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"تمھیں مجھ سے زیادہ ضرورت ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ تجارت میں جو نفع کماؤ اس کی ایک ایک کوڑی اپنے علاقے کے آدمیوں کو مسلح کرنے پر صرف کرو۔ اس ملک میں صرف روہیلکھنڈ ایک ایسا خطہ ہے جہاں کے لوگ بدطینت، خود غرض، اور مفلوج حکمرانوں کی ہوس اقتدار سے آزاد ہیں۔"

اکبر خاں نے لاجواب ہو کر کہا: "میں آپ کی حکم عدولی کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس روپے پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔"

معظم علی مسکرایا: "تمھیں یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ میں تمھیں کوئی غلط حکم نہیں دوں گا۔"

○

اسی دن گیارہ بجے کے قریب وہ تنہا بالائی منزل کے برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا کہ اسے ایک عورت جو اپنا جسم ایک میلی کچیلی چادر میں ڈھانپے ہوئے تھی، حویلی کے صحن میں داخل ہوئی۔ نوکر صحن میں بندھے ہوئے گھوڑوں کو پانی پلا رہے تھے۔ عورت ایک گھوڑے کے قریب سے گزر رہی تھی کہ گھوڑے نے اچانک بدک کر اپنے اگلے پاؤں اٹھا لیے۔ عورت گھبرا کر ایک طرف ہٹ گئی۔ ایک نوکر نے اس کی بدحواسی پر قہقہہ لگایا اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی حویلی کے کونے کی طرف چلی گئی۔

معظم علی بھاگتا ہوا نیچے اترا اور اس نے نوکر کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔ "تمھیں ایک غریب اور بے بس عورت پر ہنستے ہوئے شرم نہیں آتی اور یہ گھوڑا یہاں کس نے باندھا ہے؟ اسے یہاں سے ہٹاؤ اور راستے سے دوسرے گھوڑے بھی کھول کر ایک طرف باندھ دو۔ یہ کھونٹے بھی یہاں سے اکھاڑ دو!"

تھوڑی دیر بعد معظم علی بالاخانے پر اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ دلاور خاں ایک طشت میں کھانا لے کر آگیا۔ معظم علی نے کہا۔ "مجھے بھوک نہیں۔ تم یہ کھانا ان غریب عورتوں کو دے آؤ جو ہماری حویلی میں رہتی ہیں اور میری طرف سے انھیں یہ کہو کہ آئندہ انھیں دونوں وقت کا کھانا ہمارے لنگر خانے سے ملا کرے گا۔"

شام کے وقت معظم علی بستی کی چھوٹی سی مسجد میں نماز پڑھ کر واپس آرہا تھا کہ حویلی میں نوکروں کا شور سنائی دیا۔ معظم علی نے جلدی سے آکر وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ اس کے ایک سرکش گھوڑے نے کود کر ایک نوکر کو بری طرح زخمی کر دیا ہے۔ معظم علی نے نوکر کی ٹانگ پر اپنے ہاتھ سے پٹی باندھی اور کہا۔ "یہ گھوڑا بہت خطرناک ہوتا جا رہا ہے میں کل صبح اس پر سواری کروں گا۔"

اگلی صبح معظم علی گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکل گیا۔ جب وہ واپس آیا تو گھوڑا پسینے سے

تر تھا اور اس کی تمام شوخی ختم ہو چکی تھی لیکن جب معظم علی حویلی کی ڈیوڑھی کے قریب پہنچا تو گھوڑے نے پھر کودنا شروع کر دیا۔ اچانک چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت ڈیوڑھی سے باہر نکلی اور بے خیالی میں گھوڑے کے سامنے آگئی۔ معظم علی نے جلدی سے گھوڑے کی باگ موڑی لیکن بدحواس عورت رُکنے یا پیچھے ہٹنے کی بجائے گلی کی دوسری طرف جانے کی کوشش میں گھوڑے سے ٹکرائی اور منہ کے بل گر پڑی۔ اس کے ہاتھ سے مٹی کا پیالہ گر کر چکنا چور ہو گیا۔ معظم علی نے پوری قوت کے ساتھ باگ کھینچ کر گھوڑے کو روکا اور نیچے کود کر بھاگتا ہوا عورت کے قریب پہنچا وہ بیہوش تھی۔ چادر اس کے سر سے کھسک چکی تھی اور اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اچانک زندگی کی تمام حسیات سمٹ کر معظم علی کی آنکھوں میں آگئیں۔ وہ چلانا چاہتا تھا لیکن اس کے حلق میں آواز نہ تھی۔ سازِ ہستی کے ٹوٹے ہوئے تار دوبارہ جڑ چکے تھے اور زندگی کی اداس اور مغموم فضائیں محبت کے نغموں سے لبریز ہو رہی تھیں۔ اندھیری رات کے مسافر کے راستے کا ہر پتھر ایک چراغ بن چکا تھا۔ "فرحت! فرحت!" اس نے کہا اور پھر کسی توقف کے بغیر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر حویلی میں داخل ہوا۔ اس کے پاؤں زمین پر تھے لیکن اس کی روح مسرت کے ساتویں آسمان پر تھی۔

نچلی منزل کے ایک کمرے میں پہنچ کر اس نے فرحت کو چارپائی پر لٹا دیا۔ نوکر جو وہاں جمع ہو چکے تھے، اس کے ہاتھ کا اشارہ پا کر اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔ معظم علی کی خوشی اب پریشانی اور گھبراہٹ میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس نے صابر کو آواز دے کر پانی مانگا۔ صابر پانی کا کٹورا لے آیا اور معظم علی فرحت کے منہ پر چھینٹے مارنے لگا۔

فرحت نے آنکھیں کھولیں اور معظم علی کی کائنات مسکراہٹوں سے لبریز ہو گئی۔ وہ سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔ "فرحت فرحت میں معظم علی ہوں!"

فرحت مسکرا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے۔ بالآخر یہ آنسو

اس کی آنکھوں سے اُمڈ پڑے اور اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا: "میں پہلے بھی ایسے خواب دیکھ چکی ہوں۔"

"ہم دونوں ایسے خواب دیکھ چکے ہیں۔ فرحت! تم کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں۔ مجھے معلوم نہیں گرنے کے بعد مجھے کیا ہوگیا تھا۔ میں کب سے یہاں ہوں؟ مجھے امی جان کے پاس جانا چاہیے۔ وہ بیمار ہیں۔ میں ان کے لیے دودھ لینے جارہی تھی۔"

فرحت یہ کہتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

معظم علی نے کہا: "نہیں نہیں، تم یہیں رہو۔ میں تمھاری امی جان کو لے آتا ہوں۔"

"نہیں نہیں آپ وہاں نہ جائیں۔ وہ کوٹھڑی اس قابل نہیں کہ آپ اس میں پاؤں رکھیں۔"

معظم علی نے کہا: "فرحت کاش مجھے معلوم ہوتا کہ تم یہاں ہو! میں تم کو دلی سے لے کر حیدرآباد تک تلاش کرچکا ہوں۔"

فرحت نے کہا: "میرا خیال تھا کہ اب دنیا میں ہماری کسی کو تلاش نہیں ہوگی۔ کبھی میں یہ بھی محسوس کرتی تھی کہ اس حالت میں شاید آپ ہمیں پہچان بھی نہ سکیں۔ میں ہمیشہ یہ سوچا کرتی تھی کہ آپ کسی دن ضرور آئیں گے جب مالکِ مکان آپ کی طرف سے روپے لے کر آیا تھا تو میں نے اس سے آپ کا نام پوچھا تھا۔ اگلے دن میں دروازے کی آڑ میں کھڑی باہر جھانک رہی تھی کہ مجھے آپ کی جھلک دکھائی دی۔"

"اور اس کے باوجود تم نے مجھے اپنا پتہ دینا گوارا نہ کیا؟"

"مجھے یہ ڈر تھا کہ آپ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر منہ پھیر لیں گے۔ میں سوچتی تھی کہ جب میں یہ کہوں گی کہ میں فرحت ہوں تو میری صورت دیکھ کر آپ قہقہہ لگائیں گے اور اپنے نوکروں سے کہیں گے کہ اس پگلی کو حویلی سے باہر نکال دو۔ میں نے امی جان سے آپ کا ذکر کیا تھا اور وہ یہ کہتی تھیں کہ تم پاگل ہوگئی ہو۔ تمھیں ہر آدمی معظم علی نظر آتا ہے۔

مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ میں ہوش میں ہوں اور آپ مجھ سے اس قدر قریب ہیں۔"

فرحت بری طرح سسکیاں لے رہی تھی۔

معظم علی نے کہا: "فرحت چلو تمھاری امی جان کے پاس چلتے ہیں۔"

فرحت اپنے جسم پر چادر لپیٹنے کے بعد معظم علی کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی۔ نوکر صحن میں ایک جگہ جمع ہوکر پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ فرحت کو معظم علی کی موجودگی کے سوا اب کسی بات کا احساس نہ تھا۔ وہ خوشی کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی اور اس کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ حویلی کے کونے میں قدِ آدم اونچی دیوار کے ایک چھوٹے سے دروازے سے گزرنے کے بعد وہ تنگ صحن کے اندر داخل ہوئے۔ سامنے کوٹھڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ فرحت نے آہستہ سے کہا: "آپ یہیں ٹھہریں!"

کوٹھڑی سے ایک نحیف آواز سنائی دی۔ "فرحت تم نے اتنی دیر کہاں کردی؟"

فرحت کوٹھڑی میں داخل ہوئی۔ اس کی ماں ایک میلے کچیلے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ فرحت نے آگے بڑھ کر بے اختیار سسکیاں لیتے ہوئے اپنا سر ماں کے سینے پر رکھ دیا۔

"فرحت! فرحت! کیا ہوا بیٹی؟" ماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کرب انگیز لہجے میں کہا: "خدا کے لیے بتاؤ تمھیں کسی نے کچھ کہا تو نہیں؟"

فرحت نے کہا: "امی جان وہ مل گئے ہیں۔ انھوں نے مجھے پہچان لیا۔ انھوں نے مجھے دیکھ کر یہ نہیں کہا کہ میں پگلی ہوں۔"

"کون مل گئے ہیں؟ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"امی جان یوسف علی کے بھائی آپ کو دیکھنے آئے ہیں۔" فرحت نے گردن اٹھا کر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ماں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا اور کہا: "بیٹی تمھیں کیا ہوگیا ہے کہاں

یہیں وہ ؟"

معظم علی کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ مرزا حسین بیگ کی بیوی کی بے سروسامانی کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور اس نے کہا "چچی جان میں معظم علی ہوں"

عابدہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ فرحت نے جلدی سے دوسری چارپائی کا میلا کچیلا بستر لپیٹ کر ایک طرف پھینک دیا اور کہا "بیٹھ جائیے"۔

معظم علی نے آگے بڑھ کر عابدہ کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "چچی جان آپ کو بہت تیز بخار ہے۔ میں ابھی طبیب کو بلاتا ہوں" پھر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور عابدہ کے قریب دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ عابدہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ معظم علی نے فرحت سے سوال کیا "چچی جان کب سے بیمار ہیں ؟"

فرحت نے جواب دیا "اباجان کی وفات کے بعد سے ان کی صحت اکثر خراب رہتی تھی۔ پچھلے مہینے ان کی حالت بہت اچھی ہوگئی تھی لیکن اب کوئی دو ہفتے سے پھر بخار رہتا ہے"

معظم علی نے کہا "چچی جان یہ کوٹھڑی آپ کے لیے ٹھیک نہیں۔ آپ چل سکیں گی یا میرے نوکر آپ کی چارپائی اٹھا کر لے جائیں ؟"

عابدہ نے کہا "بیٹا مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"میں آپ کو دوسرے کمرے میں لے جانا چاہتا ہوں۔ آپ کو تازہ ہوا اور روشنی کی ضرورت ہے"

عابدہ نے جواب دیا "بیٹا تم کیوں تکلیف اٹھاتے ہو، مجھے یہیں پڑا رہنے دو"

معظم علی نے کہا "چچی جان میں آپ کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ آپ کچھ دیر بالاخانے میں قیام کریں، اس کے بعد میں شام سے پہلے شہر میں آپ کے

لیے بہترین مکان کا بندوبست کر دوں گا۔ میں نے شہر کے بہترین طبیب کے پاس آدمی بھیج دیا ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک پہنچ جائے گا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ طبیب کی آمد سے پہلے پہلے آپ کو دوسرے کمرے میں پہنچا دیا جائے۔ میں آدمیوں کو بلاتا ہوں" معظم علی اٹھ کر کھڑا ہوگیا لیکن عابدہ نے کہا "بیٹا آدمیوں کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ میں چل سکتی ہوں لیکن تم تکلیف کیوں اٹھاتے ہو"

معظم علی نے کہا "میرے لیے اس سے بڑی تکلیف اور کیا ہوسکتی ہے کہ آپ اس تنگ و تاریک کوٹھڑی میں پڑی ہوئی ہیں۔ فرحت اٹھو اور اپنی امی جان کو سہارا دے کر بالاخانے پر لے چلو!"

عابدہ نے کہا "بہت اچھا بیٹا! لیکن ہم شہر نہیں جائیں گے"

فرحت نے کہا "اگر آپ ہمیں اس لیے شہر بھیجنا چاہتے ہیں کہ ہمیں بالاخانے پر رہنے سے آپ کے دوستوں اور مہمانوں کو تکلیف ہوگی تو ہمیں یہیں پڑا رہنے دیں"

معظم علی نے جواب دیا "مجھے صرف آپ کی تکلیف کا خیال تھا لیکن اگر آپ بالاخانے میں رہنا پسند کریں تو میرا کوئی دوست یا مہمان آپ کی اجازت کے بغیر اس حویلی میں داخل نہیں ہوگا"



تھوڑی دیر بعد عابدہ بالاخانے کے ایک کشادہ کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ فرحت اس کی چارپائی پر پائنتی کی طرف بیٹھی ہوئی تھی اور معظم علی ان کے قریب ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ عابدہ کے سوالات کے جواب میں معظم علی نے مختصراً اپنی قید، رہائی اور سفر کے واقعات بیان کیے اور اس کے بعد عابدہ سے اپنی سرگزشت سنانے کو کہا۔

عابدہ نے جواب میں اپنے مصائب کی داستان شروع کرتے ہوئے کہا "بیٹا تمھاری گرفتاری کے بعد ہمارے دل میں یہ خدشہ پیدا ہوگیا تھا کہ میر مرن کسی نہ کسی بہانے ہماری

عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ محلے کے لوگوں کی بھی یہی رائے تھی کہ ہم فوراً مرشد آباد سے نکل جائیں۔ اگلے دن ہم نے قافلے کے ساتھ مرشد آباد سے ہجرت کی۔ شہر کے دروازے پر میر جعفر کے سپاہیوں نے ہماری تلاشی لی اور ہمارے پاس جو کچھ تھا وہ ہم سے چھین لیا۔ راستے میں فرحت کے اباجان بیمار ہو گئے۔ چند دن وہ بیماری کی حالت میں قافلے کا ساتھ دیتے رہے لیکن اس کے بعد ان کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ ہمارے ساتھ آگرے کا ایک نیک دل تاجر تھا۔ وہ ہمارا بہت خیال رکھتا تھا۔ جب ہمیں مجبوری کی حالت میں ایک بستی میں رکنا پڑا تو اس تاجر نے چند روپے فرحت کے اباجان کو پیش کرتے ہوئے کہا "آپ کو لکھنؤ پہنچنے کے لیے ان کی ضرورت پڑے گی اس لیے اسے قبول فرمائیں"۔ فرحت کے اباجان نے اس کے اصرار پر یہ روپے لے لیے۔ رخصت ہوتے وقت اس نے بستی کے زمیندار کو ہمارے متعلق بہت تاکید کی۔ زمیندار بھی کوئی نیک آدمی تھا اور اس نے ہمارا بہت خیال رکھا۔ فرحت کے اباجان کی وفات کے بعد جب ایک اور قافلہ اس بستی سے گزرا تو ہم اس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ دو نوکر ابھی تک ہمارے ساتھ تھے۔ ہمارا قافلہ رات کے وقت لکھنؤ کے قریب پہنچا اور بہت سے آدمیوں نے شہر میں جانے کی بجائے اس سرائے میں قیام کیا۔ ہم بھی یہیں ٹھہر گئے۔ یہاں رات گزارنے کے بعد صبح ہم نے شہر جا کر اپنے رشتہ داروں کا پتہ کیا لیکن ہمیں یہ معلوم ہوا کہ وہ حیدر آباد جا چکے ہیں۔ ہم سارا دن شہر میں گھومتے رہے لیکن کسی نے ہمارے حال پر توجہ نہ دی۔ شام کے وقت ہم پھر اسی سرائے میں واپس آ گئے۔

اگلے روز میں نے ایک نوکر کو اپنے رشتہ داروں کے نام خط دے کر حیدر آباد روانہ کیا لیکن اس کا آج تک پتہ نہیں چلا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔

ہمیں یقین تھا کہ حیدر آباد اطلاع پہنچتے ہی ہمارا کوئی نہ کوئی رشتہ دار ہماری مدد کے لیے پہنچ جائے گا لیکن آج تک ہم ان کی راہ دیکھتے رہے ایک ماہ بعد جب ہماری پونجی

تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ ہمارا دوسرا نوکر کہیں بھاگ گیا۔ ایک دن سرائے کے مالک نے ہمیں اطلاع دی کہ چند آدمی حیدر آباد جا رہے ہیں اگر آپ اپنے رشتہ داروں کو کوئی خط بھیجنا چاہیں تو وہ پہنچا دیں گے۔ میں نے خط لکھ کر ان کے حوالے کیا لیکن دو ماہ گزر گئے اور اس کا کوئی جواب نہ آیا اور میں یہ سمجھنے لگی کہ اب زمانے کی نگاہیں بدل گئی ہیں اور ہمارے رشتہ داروں نے جان بوجھ کر ہماری طرف توجہ نہیں کی۔ اس کے بعد میری غیرت نے گوارا نہ کیا کہ میں اس حالت میں ان کے پاس جاؤں۔

پھر ایک دن مجھے یہ خیال آیا کہ شاید انھیں میرا کوئی پیغام نہ ملا ہو اور میں حیدر آباد جانے کے لیے تیار ہو گئی لیکن لکھنؤ سے قافلے کی روانگی سے دو دن قبل مجھے بخار ہو گیا اور مجھے سفر کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ پھر مجھے یہ بھی خیال آتا تھا کہ اگر میرے رشتہ داروں کو میری طرف سے کوئی پیغام نہ ملا ہو تو بھی ان کا فرض تھا کہ وہ مرشد آباد جا کر ہمارا پتہ کرتے۔ اس کے بعد انھیں یقیناً یہ معلوم ہوتا کہ ہم لکھنؤ چلے گئے ہیں۔ میں یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اب میں خدا کے سوا کسی کی مدد نہیں تلاش کروں گی۔ سرائے کا مالک ہمارے حال پر بہت مہربان تھا۔ اس کی بیوی بھی بہت رحمدل تھی۔ وہ ہمارے لیے اس بستی اور کبھی کبھی شہر کی عورتوں سے بھی سلائی کا کام لے آتی تھی۔ جب وہ سرائے بیچ کر چلا گیا تو ہمیں بہت صدمہ ہوا لیکن سرائے کا نیا مالک بھی ہمارا بہت خیال رکھتا تھا۔ کئی مہینوں سے یہ سرائے بالکل ویران تھی اور ہمیں یہاں وحشت ہوتی تھی لیکن اس بستی کے لوگ بہت شریف ہیں اور ان کا سلوک دیکھ کر میں نے شہر میں اپنے لیے کوئی جگہ تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی"۔

معظم علی نے کہا "چچی جان مجھے صرف یہ شکایت ہے کہ فرحت نے جان بوجھ کر مجھے اپنا پتہ نہیں دیا۔ اسے معلوم تھا کہ میں یہاں پہنچ گیا ہوں"۔

عابدہ نے جواب دیا "بیٹا مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا تھا کہ تم یہاں ہو اور

فرحت کو اس بات کا ڈر تھا کہ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر تمھیں تکلیف ہوگی اور شاید تم ہمیں پہچان بھی نہ سکو۔"

اتنے میں صابر نے دروازے کے پاس آکر آواز دی: "جناب! حکیم صاحب تشریف لے آئے۔"

"انھیں اوپر لے آؤ!" معظم علی نے کہا۔

فرحت جلدی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ایک عمر رسیدہ طبیب کمرے میں داخل ہوا۔ معظم علی نے اس کے لیے اپنی کرسی خالی کر دی۔ طبیب نے عابدہ کی نبض دیکھی اور اس سے چند سوال پوچھنے کے بعد معظم علی کی طرف متوجہ ہوا۔ "میں جاکر ابھی دوا بھیجتا ہوں۔ امید ہے کہ کل تک بخار ٹوٹ جائے گا اور اگر کچھ افاقہ نہ ہوا تو میں انھیں کل شام دوبارہ آکر دیکھوں گا۔"

معظم علی نے کہا: "میں یہ چاہتا ہوں کہ جب تک یہ تندرست نہیں ہوتیں، آپ ہر روز کم از کم دوبارہ انھیں دیکھنے کے لیے ضرور تشریف لایا کریں۔ میں دونوں وقت آپ کے لیے گھوڑا بھیج دیا کروں گا۔"

طبیب نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا: "بہت اچھا میں شام کو پھر آؤں گا۔"

معظم علی اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا اور صابر سے جو دروازے کے باہر کھڑا تھا، مخاطب ہو کر بولا: "صابر! دلاور خاں سے کہو کہ حکیم صاحب کے ساتھ جاکر دوا لے آئے۔" پھر اس نے اپنی جیب سے چند سکے نکال کر طبیب کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ قبول فرمائیے۔"

طبیب نے جواب دیا۔ "نہیں! میں مریضہ کے تندرست ہونے سے پہلے کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔"

معظم علی نے کہا "حکیم صاحب یہ علاج کا معاوضہ نہیں۔ یہ شہر سے یہاں تک

آنے کی تکلیف کا صلہ ہے۔ لیجیے۔ جب مریضہ تندرست ہو جائے گی تو میں جی کھول کر آپ کی خدمت کروں گا۔"

معظم علی کے اصرار پر طبیب نے چند سکے اس کے ہاتھ سے لے کر دیکھے بغیر اپنی جیب میں ڈال لیے لیکن حویلی سے باہر نکل کر اس نے جیب سے چاندی اور سونے کے سکے نکال کر دیکھتے ہوئے دلاور خاں سے کہا۔ "تمھارا مالک بہت امیر آدمی معلوم ہوتا ہے!"

دلاور خاں نے فخر سے جواب دیا۔ "جناب میرا مالک بادشاہ ہے۔"

"لیکن وہ عورت تو بہت غریب معلوم ہوتی تھی۔"

دلاور خاں نے جواب دیا۔ "جناب جب آپ دوسری دفعہ تشریف لائیں گے تو وہ آپ کو غریب نہیں معلوم ہوگی۔ خاں صاحب نے بالاخانے کے کمرے انھیں دے دیے ہیں اور خود نیچے آگئے ہیں۔"

دلاور خاں کا قیاس صحیح تھا۔ جب شام کے وقت طبیب دوبارہ عابدہ کو دیکھنے آیا تو اس کا کمرہ قیمتی ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ مریضہ بوسیدہ لباس کی بجائے نیا لباس پہنے ایک خوبصورت پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ طبیب نے نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بخار بہت کم ہو چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ میری توقع سے پہلے تندرست ہو جائیں گی۔"

اگلے دن عابدہ کا بخار اتر چکا تھا اور وہ قدرے بشاش معلوم ہوتی تھی۔ تیسرے دن اسے پھر بخار آگیا لیکن شدت نسبتاً کم تھی۔ پانچویں روز طبیب نے اعلان کیا کہ اب انھیں ان شاء اللہ بخار نہیں ہوگا۔



بالاخانے کے تمام کمرے فرحت اور اس کی ماں کے لیے وقف تھے اور معظم علی نچلی منزل کے ایک کمرے میں آگیا تھا۔ جب تک عابدہ بیمار تھی وہ ہر روز متعدد بار اس کے

کمرے میں حاضری دیا کرتا تھا لیکن عابدہ کے تندرست ہونے کے بعد اس کے طرزِ عمل میں تبدیلی آگئی تھی۔ وہ کسی معقول وجہ کے بغیر بالا خانے پر جاتے ہوئے جھجک محسوس کرتا تھا۔ کبھی فرحت کی ماں بلاتی تو چلا جاتا اور اندر داخل ہونے سے پہلے دروازے پر دستک دیتا۔ فرحت جو پہلے اپنی ماں کی موجودگی میں بے تکلفی سے اس کے ساتھ باتیں کیا کرتی تھی اب اس کی آواز سنتے ہی دوسرے کمرے میں چلی جاتی۔ معظم علی کے نوکروں میں سے صابر کے سوا کسی کو اوپر آنے جانے کی اجازت نہ تھی۔

ایک شام صابر کھانا لایا تو معظم علی کو معمول سے زیادہ لذیذ معلوم ہوا۔ اس نے کہا۔ "صابر آج کیا ڈالا ہے تم نے سالن میں؟"

صابر نے بدحواس ہو کر جواب دیا۔ "جی میں بے قصور ہوں۔ میں نے کچھ نہیں ڈالا۔ یہ سالن چھوٹی بی بی نے پکایا ہے اور میں نے تو چکھا بھی نہیں۔ صبح جب میں اوپر کھانا لے کر گیا تو وہ بہت خفا ہوئیں اور کہنے لگیں۔ "آج شام ہنڈیا میں خود پکاؤں گی۔ میں نے انھیں سمجھایا تھا کہ آپ میرے سوا کسی کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں کرتے لیکن وہ کہتی تھیں — وہ کہتی۔۔۔۔"

"کیا کہتی تھیں وہ؟"

"کچھ نہیں، جی، وہ کہتی تھیں کہ تم گوشت کو دال سے بدتر بنا دیتے ہو۔"

معظم علی مسکرایا۔ "صابر وہ بالکل درست کہتی تھیں۔ میں آج کئی دنوں کے بعد پیٹ بھر کر کھا رہا ہوں لیکن انھیں تکلیف دینا ٹھیک نہیں۔"

"جی میں نے کہا تھا کہ آپ خفا ہوں گے لیکن انھوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔ اوپر باورچی خانہ نہیں ہے۔ وہ اصرار کرتی تھیں کہ آپ نیچے باورچی خانے کے سامنے پردے کے لیے دیوار بنوا دیں۔"

معظم علی نے کہا۔ "ان سے کہنا کہ میں بہت جلد دیوار بنوا دوں گا اور انھیں نیچے آنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ ہمارے لیے کھانا پکائیں۔ وہ اگر حاضر

تو باورچی خانے میں آکر تمھاری دیکھ بھال کر سکتی ہیں۔"

"میری دیکھ بھال؟" صابر نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

معظم علی نے جواب دیا۔ "میرا مطلب ہے کہ تم کھانا پکانے کے متعلق ان کی ہدایات لے سکو گے اور ہو سکتا ہے کہ تم بھی انھیں کچھ سکھا سکو۔"

صابر کو کھانا پکانے کے مسئلے میں کسی کی نکتہ چینی یا مداخلت پسند نہ تھی۔ اگر یہ مداخلت فرحت کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو وہ یقیناً شدید احتجاج کرتا۔ تاہم اس نے کہا۔

"جناب یہ کھانا واقعی لذیذ ہے یا آپ مجھے بیوقوف بنا رہے ہیں؟"

معظم علی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "صابر تم بہت ہی سادہ دل ہو۔"

صابر نے کہا۔ "جناب وہ بھی یہی کہتی تھیں۔"

"کون؟"

"چھوٹی بی بی جی۔ وہ تو یہ بھی کہتی تھیں کہ میرا دماغ بالکل خالی ہے۔"

چند دن بعد نچلی منزل کے کمروں اور باورچی خانے کے سامنے پردے کے لیے دیوار تعمیر ہو چکی تھی اور مہمانوں کے لیے حویلی کے اندر صدر دروازے کے قریب تین نئے کمروں کی بنیادیں کھودی جا رہی تھیں۔



گھوڑوں کی تجارت شروع کرنے سے پہلے معظم علی یہ محسوس کرتا تھا کہ اسے اپنے دل سے تنہائی اور بے کسی کا احساس دور کرنے کے لیے کسی مصروفیت کی ضرورت ہے لیکن فرحت کو تلاش کر لینے کے بعد وہ حوصلوں، ولولوں، امیدوں اور آرزوؤں کی ایک نئی دنیا میں آ چکا تھا۔ وہ ایک کامیاب تاجر کی حیثیت میں اپنی ذات کو دوسروں کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنانا چاہتا تھا۔

ایک شام وہ گھوڑے پر سیر کرنے کے بعد واپس آیا تو حویلی میں چند گاڑیاں کھڑی تھیں

"یہ کیا ہے ؟" اس نے گھوڑے سے اتر کر ایک نوکر سے سوال کیا۔

نوکر نے جواب دیا۔" جناب شیر علی خاں واپس آ گئے ہیں"۔

"میں پوچھتا ہوں یہ گاڑیاں کہاں سے آئی ہیں اور شیر علی کہاں ہیں ؟"

شیر علی ایک گاڑی کی آڑ سے نمودار ہوا اور اس نے بڑھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔" یہ گاڑیاں آپ کی ہیں۔ میں بنارس سے گھوڑوں کی قیمت وصول کر کے کپڑا خرید لایا ہوں۔ لکھنؤ میں بنارسی کپڑے کی بڑی مانگ ہے۔ انشاءاللہ ہمیں بہت فائدہ ہوگا۔"

معظم علی نے کہا۔" واہ جی، اب آپ گھوڑوں کے بعد مجھ سے کپڑوں کی تجارت بھی کروانا چاہتے ہیں!"

شیر علی نے جواب دیا۔" اگر بنارس سے گھوڑے مل سکتے تو میں کپڑا نہ لاتا۔"

"اور اگر کپڑا نہ ملتا تو آپ کیا لاتے ؟"

"کپڑا کیوں نہ ملتا۔ آپ دیکھیں تو سہی۔"

معظم علی نے کہا۔" میں میسور سے ہاتھی لانے کے متعلق سوچ رہا تھا اور آپ بنارس سے کپڑا اٹھا لائے ہیں!"

شیر علی نے اطمینان سے کہا۔" میں آپ کو بتاؤں میں نے کپڑا کیوں خریدا ؟"

"مجھے کیا معلوم ؟"

"مجھے یہ ڈر تھا کہ آپ کہیں کاروبار جاری رکھنے کا ارادہ نہ بدل دیں اور اس کپڑے کے متعلق آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ انشاءاللہ دو چار دن کے اندر اندر بک جائے گا اور ہمیں کافی نفع ہوگا۔"

"لیکن یہاں اسے خریدے گا کون ؟"

"آپ دیکھتے رہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ حویلی لکھنؤ کی ایک اہم منڈی بن جائے گی۔"

معظم علی نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔" مرزا صاحب کی بیوی اور صاحبزادی مل گئی ہیں!"

"مبارک ہو مبارک ہو! کہاں ملیں ؟"

"آپ کو یقین نہیں آئے گا وہ اسی حویلی کی ایک کوٹھری میں رہتی تھیں۔"

"اب وہ کہاں ہیں ؟"

"میں نے بالاخانہ انھیں دے دیا ہے۔"

اگلے روز حویلی میں شہر کے پارچہ فروشوں کا ایک ہجوم کھڑا تھا اور ایک دلال کپڑوں کے تھان نیلام کر رہا تھا۔

معظم علی نے ایک خوش رنگ ریشمی کپڑے کے دو تھان نکال کر صابر کو دیتے ہوئے کہا۔" صابر یہ اوپر دے آؤ۔" اس کے بعد اس نے چند اور تھان نکال کر دلاور خاں کو دیتے ہوئے کہا۔" دلاور خاں یہ کپڑا گاؤں کے چودھری کے گھر لے جاؤ اور ان سے کہو کہ وہ اسے بستی کے غریب اور مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیں۔"

تین دن کے اندر اندر معظم علی کا سارا مال فروخت ہو چکا تھا اور شیر علی خاں اسے حساب دکھانے کے بعد کہہ رہا تھا۔" کیوں جی کیسی رہی ہماری یہ تجارت، اگر ہم اطمینان سے یہ مال فروخت کرتے تو اس سے دوگنا نفع ہوتا۔ اب بھی دس فیصدی نفع معمولی نہیں۔ اب آپ کا کیا ارادہ ہے ؟"

معظم علی نے جواب دیا۔" میں نے فخر الدین کو لکھ دیا ہے کہ دو سو گھوڑے خرید کر یہاں روانہ کر دیں۔ اس کے بعد میرا ارادہ ہے کہ ہم میسور سے ہاتھی دانت، صندل اور گرم مصالحہ خرید کر لائیں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اکبر خاں آئے تو میں اسے آپ کے ساتھ حیدرآباد بھیجوں لیکن پھر یہ سوچا کہ اس طرح دیر ہو جائے گی۔"

شیر علی نے کہا۔" اگر آپ اجازت دیں تو میں حیدرآباد سے گھوڑوں کے آنے سے پہلے

بنارس کا ایک اور چکّر لگا آؤں؟"

معظم علی نے جواب دیا: "مجھے یقین ہے کہ یہ کپڑوں کا مسئلہ ہمیں بہت پریشان کرے گا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ چند دن آرام کریں۔ اس عمر میں آپ کے لیے زیادہ کام کرنا ٹھیک نہیں۔"

شیر علی نے جواب دیا: "مصروفیت میرے لیے سب سے بڑا آرام ہے میں صرف بیکار بیٹھ کر تھکاوٹ محسوس کرتا ہوں۔"



معظم علی کا کاروبار آئے دن پھیلتا جا رہا تھا۔ وہ سارا دن کاروبار کی دیکھ بھال میں مصروف رہتا۔ اسے پڑھنے کا بھی شوق تھا اور دفتری کاغذات کے علاوہ کتابیں بھی اس کے کمرے میں انتہائی بے ترتیبی کی حالت میں پڑی رہتی تھیں۔ کسی نوکر کو کوئی کاغذ یا کتاب ایک جگہ سے دوسری جگہ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ کبھی کبھی اسے فرصت ملتی تو وہ اپنی موجودگی میں نوکروں کو صفائی کا حکم دیتا لیکن چند دن بعد پھر وہی حالت ہو جاتی۔

ایک رات، دن بھر کے کام سے فارغ ہو کر معظم علی اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اسے کمرے کی ہر چیز اپنی توقع کے خلاف دکھائی دی۔ کتابیں الماریوں میں بند تھیں۔ کاغذات ایک ترتیب کے ساتھ میز پر رکھے ہوئے تھے۔ بستر کی چادر اور تکیے کا غلاف تبدیل ہو چکا تھا اور تمام غیر ضروری چیزیں کمرے سے غائب تھیں۔ معظم علی نے صابر کو آواز دی اور اپنے کاغذات اور کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ صابر نے سہمی ہوئی آواز میں کہا: "جناب میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے چھوٹی بی بی کو منع کیا تھا لیکن وہ کہتی تھیں تم بالکل جانور ہو۔ میری بڑی بے عزتی ہوئی۔ چھوٹی بی بی کہتی تھیں کہ تمہیں کوئی سلیقہ نہیں آتا اور تم نے کسی اصطبل میں پرورش پائی ہے۔ میں نے کہا سرکار خفا ہوں گے لیکن انھوں نے کہا تم جاؤ میں خود صفائی کروں گی اور ہم

تمھارے سرکار سے بالکل نہیں ڈرتے۔"

معظم علی نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا: "اچھا جاؤ میرا کھانا لے آؤ!"

اور جب وہ تھوڑی دیر بعد کھانا لے کر آیا تو معظم علی نے اس کی طرف شرارت آمیز تبسم کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا: "اچھا صابر کیا کہتی تھیں چھوٹی بی بی تمھیں؟"

"جی وہ کہتی تھیں کہ تم بالکل جانور ہو اور تم نے کسی اصطبل میں پرورش پائی ہے جیسے میں کوئی گھوڑا ہوں اور جناب انھوں نے آپ کے متعلق بھی بہت کچھ کہا تھا۔"

"کیا کہا تھا؟"

"میں نہیں بتاؤں گا۔ آپ خفا ہو جائیں گے۔"

"نہیں نہیں بتاؤ!"

"جی وہ کہتی تھیں یہ رہنے کا کمرہ ہے یا کسی کباڑی کی دکان ہے۔"

اگلی صبح اپنے کمرے سے نکلتے وقت معظم علی کو شرارت سوجھی اور اس نے چند کتابیں الماری سے نکال کر بستر پر پھینک دیں۔ پھر میز سے چند کاغذ اٹھائے اور اِدھر اُدھر بکھیر دیے لیکن جب وہ واپس آیا تو کمرہ اسی طرح سجا ہوا تھا۔

اس کے بعد وہ ہر روز یہ محسوس کرتا کہ فرحت اس کی غیر حاضری میں اس کے کمرے کا معائنہ کرتی ہے لیکن ایک شام وہ شہر کے کسی تاجر سے کوئی معاہدہ کرنے کے بعد واپس آیا تو اس کے کمرے میں کاغذات کے پرزے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ بستر کی چادر میں سلوٹیں تھیں اور ایک کتاب جو رات کو اس نے پڑھنے کے لیے نکالی تھی تکیے کے پاس اسی طرح پڑی ہوئی تھی۔

صابر نے آکر کہا: "جناب کھانا لاؤں؟"

معظم علی نے جواب دیا: "نہیں۔ پہلے یہ بتاؤ چھوٹی بی بی آج باورچی خانے میں آئی تھیں؟"

"نہیں۔ جی آج وہ سارا دن نیچے نہیں اتریں۔ صبح میں کھانا لے کر گیا تھا تو وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھیں۔ بڑی بی بی کہتی تھیں انھیں بخار ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "جاؤ دلاور خاں سے کہو فوراً طبیب کو لے آئے۔ نہیں ٹھہرو۔ میں خود جاتا ہوں۔"

قریباً ایک گھنٹہ بعد، معظم علی نے بالاخانے کے ایک کمرے کے پاس جا کر آواز دی۔ "چچی جان! حکیم صاحب آئے ہیں!"

اندر سے آواز آئی۔ "حکیم صاحب! اچھا انھیں لے آؤ۔"

معظم علی کے اشارے پر طبیب کمرے میں داخل ہوا اور وہ خود تذبذب کی حالت میں دروازے سے باہر کھڑا رہا۔

عابدہ نے آواز دی۔ "معظم علی! بیٹا اندر آجاؤ باہر کیوں کھڑے ہو!"

معظم علی کمرے میں داخل ہوا۔ فرحت چادر میں اپنا منہ چھپائے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ معظم علی نے ایک کرسی اٹھا کر فرحت کی چارپائی کے قریب رکھتے ہوئے طبیب کو بیٹھنے کے لیے کہا۔

طبیب نے فرحت کی نبض دیکھی اور معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ بخار بالکل معمولی ہے۔ انشاءاللہ بہت جلد اتر جائے گا۔"

پھر اس نے اپنی جیب سے چاندی کی ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی اور اس میں سے چار گولیاں نکال کر معظم علی کو دیتے ہوئے کہا۔ "ان میں سے دو گولیاں اسی وقت کھلا دیجیے اور دو آدھی رات کے وقت۔ صبح تک اگر بخار نہ اترا تو اپنا نوکر میرے پاس بھیج دیجیے گا۔"

تھوڑی دیر بعد حویلی کے دروازے پر طبیب کو رخصت کرتے ہوئے معظم علی نے کہا۔ "حکیم صاحب مریضہ کے متعلق کوئی تشویش کی بات تو نہیں۔ میں بہت پریشان ہوا۔"

طبیب نے جواب دیا۔ "تشویش کی کوئی بات نہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔"

رات کو دیر تک معظم علی کو نیند نہ آئی۔ صبح نماز کے بعد اس نے اوپر جا کر دستک دی۔ فرحت کی ماں نے دروازے پر آ کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں چچی جان! فرحت کی طبیعت کیسی ہے؟"

عابدہ نے دروازہ کھول کر مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ "بیٹا فرحت اب بالکل ٹھیک ہے۔ تم نے رات کو خواہ مخواہ تکلیف اٹھائی۔"

"چچی جان ....." معظم علی نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا!"

"میں ....."

"ہاں بیٹا کہو!"

"کچھ نہیں چچی جان۔ میں بہت پریشان تھا" معظم علی یہ کہہ کر نیچے اتر آیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے میز کے سامنے بیٹھ کر قلم اٹھایا اور کاغذ پر کچھ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ چند سطریں لکھنے کے بعد اس نے کاغذ پھاڑ کر پھینک دیا۔ پھر دوسرے کاغذ پر لکھنا شروع کیا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کاغذ لپیٹ کر اس کے اوپر ریشم کا دھاگہ باندھتے ہوئے کہا "صابر! یہ اوپر چچی جان کو دے آؤ۔ دیکھو کہیں چھوٹی بی بی کے ہاتھ میں نہ دے دینا ورنہ تمھاری خیر نہیں۔ وہ بہت گالیاں دیں گی تمھیں۔"

"نہیں جی میں کوئی بیوقوف تھوڑا ہوں۔"

"اور دیکھو جواب کے لیے دروازے کے باہر ٹھہر کر انتظار کرنا!"

"اگر یہ بات ہے تو پھر مجھے کورا کاغذ اور قلم دوات ساتھ لے کر جانا چاہیے۔"

"نہیں نہیں جاؤ۔"

صابر کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے بولا۔ "جناب اچھے بڑی بڑی بی بی آپ کو اوپر بلا رہی ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ انھیں تکلیف دینے کی ضرورت نہیں انھوں نے ابھی ناشتا نہیں کیا ہے، میں جواب لے جاتا ہوں لیکن انھوں نے الٹا مجھ پر ہنسنا شروع کر دیا۔" "چھوٹی بی بی کہہ رہی تھیں یہ بالکل جانور ہے۔"

"تم نے چھوٹی بی بی کو تو خط نہیں دے دیا؟"

"نہیں جی۔ اب آپ بھی مجھے جانور سمجھنے لگ گئے ہیں کیا؟ میں نے اپنی طرف سے بہت احتیاط کی تھی لیکن بڑی بی بی نے خط پڑھنے کے بعد انھیں دکھایا۔ میں نے بہت کہا یہ خط چھوٹی بی بی کو نہ دکھایئے لیکن آج وہ بھی مجھ پر ہنس رہی تھیں۔"

معظم علی کمرے سے نکل کر بالا خانے پر پہنچا تو فرحت کی ماں دروازے میں کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ حیا کے مارے معظم علی کے گال اور کان سرخ ہو رہے تھے۔

عابدہ نے کہا: "آؤ بیٹا اندر آ جاؤ!"

معظم علی جھجکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

عابدہ نے کہا۔ "فرحت دوسرے کمرے میں ہے۔ بیٹھ جاؤ۔" اور وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ عابدہ نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیئے اور آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! فرحت تمھاری ہے وہ ہمیشہ تمھاری تھی۔ میرے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں کئی دنوں سے تمھارے پیغام کا انتظار کر رہی تھی۔ کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا تھا کہ زمانہ ہمیں ٹھکرا چکا ہے۔ میں سوچا کرتی تھی کہ تم لکھنؤ کے بڑے سے بڑے خاندان سے رشتہ حاصل کر سکتے ہو۔"

"چچی جان!" معظم علی نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "مجھے صرف یہ ڈر تھا کہ اگر میں نے جلد بازی سے کام لیا تو آپ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ آج بھی جب میں خط لکھ رہا تھا تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔"



آٹھویں روز لکھنؤ کے بڑے بڑے گھرانوں میں یہ چرچا ہو رہا تھا کہ ایک لاکھ پتی نوجوان نے اس بے سہارا لڑکی سے شادی کر لی ہے جو اپنی بیوہ ماں کے ساتھ شہر سے باہر ایک بستی کی سرائے میں انتہائی مفلسی اور بے بسی کے دن گزار رہی تھی۔

فرحت رات کے وقت دلھن کا لباس پہنے بستی کی عورتوں کے ہجوم میں بالا خانے کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ معظم علی دعوت ولیمہ پر جمع ہونے والے مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف تھا۔ جب بستی کی عورتیں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں تو فرحت کرسی گھسیٹ کر باہر کی طرف کھلنے والے دریچے کے سامنے بیٹھ گئی۔ افق سے چاند نمودار ہو رہا تھا۔ فرحت نے اٹھ کر آہستہ سے درمیان کا دروازہ کھول کر ساتھ والے کمرے میں جھانکا۔ عابدہ کے کمرے کا چراغ بجھ چکا تھا۔ "امی جان!" اس نے آہستہ سے آواز دی لیکن جب ماں کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ چاند اب بادل کے ایک سیاہ ٹکڑے کے پیچھے روپوش ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر میں بادل گزر گیا اور چاند کی دلفریب کرنیں پھر ایک بار فضا میں نور کے خزانے بکھیر رہی تھیں۔ دروازے کی طرف سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ فرحت نے مڑ کر دیکھا۔ معظم — اس کے سپنوں کا شہزادہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ فرحت کی نگاہیں جھک گئیں۔

معظم علی نے ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "فرحت میں تصور میں تمھاری ہزاروں تصویریں دیکھ چکا ہوں لیکن تم ان سب سے زیادہ حسین ہو۔"

فرحت نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

معظم علی مسکرایا۔ "تمھارے ہاتھ بھی خوبصورت ہیں۔"

فرحت نے جلدی سے چہرے پر آنچل ڈال لیا اور اپنے ہاتھ اوڑھنی کے اندر چھپا لیے۔

معظم علی نے دریچے سے باہر جھانکتے ہوئے کہا "فرحت اِدھر دیکھو چاند پر بادل آ گیا ہے لیکن اس کی رعنائی اور دلکشی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جب میں میر حبیب کی قید میں تھا، تو اپنی کوٹھڑی کے دروازے کی دراڑوں سے کبھی کبھی چاند کی جھلک دیکھا کرتا تھا اور یہ سوچا کرتا تھا کہ شاید اس وقت تم بھی اپنے محل کے کسی دریچے میں کھڑی ہو کر چاند کی طرف دیکھ رہی ہو گی۔ پھر قید سے نکلنے کے بعد جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ اب زندگی میں ہمارے راستے ایک دوسرے سے مختلف ہو چکے ہیں تو میں نے چاند اور ستاروں کی طرف دیکھنا ترک کر دیا تھا لیکن تم میری نگاہوں سے کبھی اوجھل نہ ہو سکیں۔" معظم علی نے یہ کہہ کر اس کے چہرے سے نقاب اتار دیا۔ فرحت مسکرا رہی تھی لیکن اس کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

معظم علی نے کہا۔ "فرحت تمہیں وہ دن یاد ہے جب میں تمہارے کتب خانے میں کھڑا تھا اور تم مجھے دیکھ کر بدحواس ہو گئی تھیں اور پھر جب مرہٹوں نے تمہارے محل پر حملہ کیا تھا اور میں تم پر برس پڑا تھا لیکن تم اس وقت بہت چھوٹی تھیں۔"

فرحت نے جواب دیا۔ "یہ یادیں میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔"

معظم علی کا چہرہ اچانک مغموم ہو گیا اور وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ فرحت نے چند بار نظر بچا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔" معظم علی نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ پریشان ہیں۔" فرحت نے کہا۔

معظم علی نے جواب دیا۔ "پریشانیاں ہماری میراث ہیں۔ فرحت جب میں بنگال کی فوج میں ملازم ہوا تھا تو اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ مفلس اور نادار لوگوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ اگر تم اپنی کمائی اسی طرح لٹاتے رہو گے تو اپنی بیوی کو حق مہر میں کیا دو گے۔ میں نے جواب دیا کہ میری رفیقۂ حیات کا مہر ایک ایسا ملک ہو گا جو اندرونی اور بیرونی خطرات سے آزاد ہو۔ فرحت، وہ تلوار جو میں نے اپنے وطن کی سرحدوں کی حفاظت

کے لیے اٹھائی تھی، اب ٹوٹ چکی ہے۔ اب اس ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے باشندے اپنی آئندہ نسلوں کو یہ پیغام دینے کے قابل ہوں کہ تمہاری عزت اور آزاد ہے۔ ہم تاریک رات کے مسافر ہیں اور خدا معلوم ہماری آخری منزل کیا ہو گی۔ مجھے موقع پر تم سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں لیکن کاش میں تمہیں مستقبل کے متعلق کوئی پیغام دے سکتا۔ فرحت فرض کرو اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں اسی وقت یا چند گھنٹے تک اندر اندر مرہٹوں کے خلاف ایک بڑی جنگ میں حصہ لینے کے لیے جا رہا ہوں تو، کیا محسوس کرو گی؟"

فرحت نے جواب دیا۔ "میں ——؟ میں یہ کہوں گی کہ میں مرزا حسین بیگ کی بیٹی اور آصف اور افضل کی بہن ہوں۔ میرے شوہر کو یہ خیال کیسے آیا کہ میں اسے اپنی قوم کے دشمنوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے سے منع کروں گی۔"

معظم علی نے کہا۔ "فرحت مجھے تم پر فخر ہے۔"

فرحت مسکرا رہی تھی اور معظم علی کو اس کی مسکراہٹ کا ایک ایک لمحہ ماضی کے مہینوں اور برسوں پر حاوی معلوم ہوتا تھا۔ وہ میدانِ جنگ کی کلفتیں اور قید کی اذیتیں بھول چکا تھا۔ مستقبل کے افق پر اٹھنے والی تاریک گھٹائیں اس کی نظروں سے اوجھل تھیں۔ اس کے سامنے صرف حال تھا۔ اس کی کائنات سمٹ کر اس کے کمرے کی چار دیواری تک محدود ہو رہی تھی، جس کا ہر گوشہ فرحت کی مسکراہٹوں سے منور تھا اور اس کمرے سے باہر کی دنیا پر ماضی اور مستقبل کی تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں۔

فرحت نے کہا۔ "میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"پوچھیے۔"

"لیکن میں نہیں پوچھتی۔ آپ برا مانیں گے۔"

"خدا کے لیے ضرور پوچھیے ورنہ مجھے بہت پریشانی ہو گی۔"

"اچھا یہ بتلایئے کہ اس لڑکی کا نام کیا تھا؟"

"کونسی لڑکی؟"

"وہ جو آپ کو حیدرآباد کے راستے میں ملی تھی۔"

"شیخ فخرالدین کی بھانجی؟ اس کا نام بلقیس تھا۔"

فرحت نے اپنے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "نہیں جناب میں بڑی صاحبزادی کے متعلق پوچھتی ہوں۔"

"اس کا نام عطیہ تھا لیکن تمھیں اس وقت اس کا خیال کیسے آیا؟"

"بس یوں ہی آگیا۔ اچھا یہ بتلایئے کہ وہ واقعی بہت خوبصورت تھی؟"

"میں نے کب کہا کہ وہ خوبصورت تھی۔ میں نے تو اسے اچھی طرح دیکھا بھی نہیں۔"

"لیکن آپ نے یہ تو کہا تھا کہ چھوٹی لڑکی کی شکل بہت پیاری ہے وہ بھی تو اس کی بہن تھی۔"

"ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ وہ بھی خوبصورت ہو لیکن میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔"

فرحت کی آنکھوں میں ایک شرارت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "میں سوچ رہی تھی کہ اگر عطیہ کی جگہ میں ہوتی تو کیا کرتی۔ آپ کو حیدرآباد سے واپس آنے کے بعد کبھی اس کا خیال نہیں آیا؟"

معظم علی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "فرحت میرے دل و دماغ میں اگر خیالات کے لیے کوئی جگہ تھی تو وہ تمھارے تصور سے پُر ہوچکی تھی۔"

فرحت نے کہا۔ "یہ عجیب بات ہے۔ میں نے جس دن سے اس لڑکی کے متعلق سنا ہے، میرے دل میں باربار خیال آتا ہے کہ کسی دن حیدرآباد جاکر اسے دیکھوں۔ نہ جانے کیوں میں اپنے دل میں اس کے لیے ایک بہن کی شفقت محسوس کرتی ہوں۔"

معظم علی نے کہا۔ "ممکن ہے ہمیں کسی دن حیدرآباد جانا پڑے۔"

تیرھواں باب

معظم علی کا تجارتی کاروبار آئے دن وسیع ہوتا جارہا تھا۔ اس کی دولت اور فیاضی کے تذکرے زبانِ زدعام تھے۔ اس کے دروازے پر غریب اور نادار لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ لکھنؤ کے امراء اور فوجی افسر اس کا احترام کرتے تھے۔ حویلی کے اندر اس کا ایک شاندار رہائشی مکان اور مہمانوں اور نوکروں کے لیے کمرے تعمیر ہوچکے تھے۔ گھوڑوں کے اصطبل اور گودام پاس ہی ایک اور احاطے میں منتقل ہوچکے تھے۔ گھر میں معظم علی کو زندگی کا ہر آرام میسر تھا۔ پرانے زخم آہستہ آہستہ مندمل ہوچکے تھے۔ فرحت کی رفاقت کے باعث زندگی کا ایک بھیانک خلا پُر ہوچکا تھا۔ تاہم وہ بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کرتا تھا کہ ماضی کی تاریکیاں ابھی تک اس کا پیچھا کررہی ہیں اور یہ احساس کبھی ان تمام مسرتوں پر حاوی ہوجاتا جو اسے فرحت کی رفاقت میں حاصل تھیں۔ وہ فرحت کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھتا اور اپنے دل میں یہ کہتا۔ "میری زندگی! یہ دنیا تمھاری مسکراہٹوں کے لیے بنائی گئی ہے لیکن کاش ان مسکراہٹوں کی روشنی ان تاریک پردوں کے پار جاسکتی جو ہمارے حال اور مستقبل کے درمیان حائل ہیں۔" وہ ماضی کو بھول سکتا تھا لیکن حال اور مستقبل سے آنکھیں بند کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ جن آندھیوں اور طوفانوں کے ساتھ لڑنے میں اس نے اپنی جوانی کے بہترین دن گزارے تھے۔ وہ پھر ایک نئی شدت کے ساتھ مستقبل کے افق پر ظاہر ہورہے تھے۔

مرشدآباد کے قیدخانے سے نکلنے کے بعد اس کی ساری توجہ فرحت کی تلاش پر مرکوز

تھی اور قوم کے حال اور مستقبل کے مسائل اس کے لیے ایک ثانوی حیثیت اختیار کر چکے تھے لیکن فرحت کو پالینے کے بعد ان آندھیوں اور طوفانوں کا چہرہ اسے پہلے کی نسبت زیادہ بھیانک نظر آتا تھا وہ ایک درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر سارے باغ کی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔ وہ اودھ کی سرزمین کو ان انسانی بھیڑیوں سے بچانا چاہتا تھا جو بنگال کی طرح کرناٹک، دکن اور شمالی ہندوستان کے وسیع علاقوں کو اپنی شکارگاہیں بنا چکے تھے۔ اکبر خاں نے چھ ماہ قبل اسے جو آخری پیغام بھیجا تھا وہ یہ تھا کہ میں اپنے علاقے کے مجاہدین کے ساتھ نجیب الدولہ کی فوج میں شامل ہو چکا ہوں۔ ان دنوں ہم محاصرے کی حالت میں ہیں۔ دتاجی سندھیا ہم پر فیصلہ کن حملہ کرنے کے لیے کمک کا انتظار کر رہا ہے لیکن نجیب الدولہ کو یقین ہے کہ احمد شاہ ابدالی اب کسی تاخیر کے بغیر ہماری مدد کو پہنچ جائیں گے۔"

چند ہفتوں کے بعد احمد شاہ ابدالی کی آمد کی خبر ملک کے طول و عرض میں مشہور ہو چکی تھی۔ پھر معظم علی قریباً ہر روز لکھنؤ کے امراء کی محفلوں میں اس قسم کی خبریں سنا کرتا تھا کہ آج احمد شاہ ابدالی نے دریائے سندھ عبور کر لیا ہے ــــ لاہور کا مرہٹہ گورنر وہاں سے پسپا ہو کر دلّی بھاگ آیا ہے ــــ احمد شاہ اب لاہور سے دلّی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ راستے میں فلاں فلاں مقام پر فلاں فلاں روہیلہ سردار افغان لشکر کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں اور اب یہ لشکر مرہٹوں کو دلّی کی طرف ہانک رہا ہے ــــ دلّی کے غدار وزیر عماد الملک غازی الدین نے مرہٹوں کو خوش کرنے کے لیے دلّی کے شہنشاہ عالم گیر ثانی اور اس کے وزیراعظم انتظام الدولہ کو قتل کروا دیا ہے اور کسی اور شہزادے کو شاہ جہان ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا ہے ــــ دتاجی سندھیا نجیب الدولہ کا پیچھا چھوڑ کر احمد شاہ ابدالی کے مقابلے کے لیے روانہ ہو چکا ہے ابدالی نے تراوڑی کے قریب مرہٹہ افواج کے ہراول دستوں کو شکست دی ہے ــــ افغان لشکر نے دریائے جمنا عبور کر لیا ہے اور سہارنپور کے قریب پہنچ گیا ہے ــــ احمد شاہ ابدالی اب دلّی

کی طرف بڑھ رہے ہیں، نجیب الدولہ، حافظ رحمت خاں، سعد اللہ خاں، مولا سردار اور دوسرے روہیلہ اکابر اس کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں ــــ ابدالی نے دلّی سے چھ میل دور لونی کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا ہے ــــ دتاجی کی افواج نے افغان پڑاؤ سے دس میل کے فاصلہ پر دریائے جمنا کے دوسرے کنارے ڈیرہ ڈال دیا ہے ــــ ابدالی نے اچانک دریا عبور کر کے مرہٹہ لشکر کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ دتاجی مارا جا چکا ہے اور اس کا بھتیجا جن کوجی زخمی ہونے کے بعد رہی سہی فوج کے ساتھ کوٹ پتلی پہنچ گیا ہے ــــ راجپوتانہ سے ملہار راؤ ہلکر کی افواج جنکوجی کے ساتھ شامل ہو گئی ہیں ــــ مرہٹہ لشکر نے روہیلوں کے علاقوں میں تباہی مچا دی ہے ــــ مرہٹے بہادر گڑھ کی طرف بڑھ رہے ہیں ــــ احمد شاہ ابدالی کے مشہور جرنیل جہان خان نے چودہ گھنٹے میں ستر میل یلغار کر کے اسکندر آباد کے قریب مرہٹہ افواج کو عبرتناک شکست دی ہے اور ان شاندار فتوحات کے بعد احمد شاہ نے موسم برسات گزارنے کے لیے علی گڑھ کے قریب ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔"

ان حوصلہ افزا خبروں سے معظم علی اپنے سینے میں زندگی کی نئی دھڑکنیں محسوس کر رہا تھا لیکن یہ خبریں جس قدر حوصلہ افزا تھیں اسی قدر دکن کے حالات تشویشناک ہوتے جا رہے تھے۔ حیدر آباد کے توپخانے کا مشہور کمانڈنٹ ابراہیم گاردی جس نے فرانسیسی جرنیل سے تربیت حاصل کی تھی، نظام سے غداری کر کے مرہٹوں کے ساتھ مل گیا۔ بالاجی نے گاردی کی خدمات حاصل کرتے ہی دکن پر حملہ کر دیا اور احمد نگر کے مشہور قلعے کے محافظ کی غداری سے فائدہ اٹھا کر کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر اس پر قبضہ کر لیا۔ احمد نگر کا قلعہ چھن جانے سے نظام کی فوج ایک اہم مستقر سے محروم ہو گئی تھی۔ دوسری طرف تنخواہوں کی عدم ادائیگی کے باعث نظام کو اپنے سپاہیوں سے بغاوت کا بھی خطرہ تھا۔ تاہم ان کے لیے مقابلہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ پیشوا نے سداشیو راؤ کی قیادت میں چالیس ہزار فوج بھیجی۔ اس کے علاوہ ابراہیم گاردی کو اس کے مشہور توپخانے اور پانچ ہزار تربیت یافتہ سپاہیوں کے ساتھ روانہ

کیا۔ ۳ر فروری ۱۷۶۰ء کو پونا سے دو سو میل دور اوگیر کے مقام پر جنگ ہوئی۔ مغل بہادری سے لڑے لیکن گاردی کے توپخانے نے انھیں سخت نقصان پہنچایا۔ احمد شاہ ابدالی کی فتوحات کے بعد دکن کے متعلق یہ خبر آئی کہ نظام نے سداشیو کے ساتھ انتہائی ہتک آمیز شرائط پر صلح کرلی ہے اور بیجاپور، بیدار اور اورنگ آباد کے گرد و نواح کے علاقہ جات اور دولت آباد، اسیر گڑھ، احمد نگر اور برہان پور کے قلعہ جات پر ان کا قبضہ تسلیم کرلیا ہے ۔:



پونا میں ابھی تک اوگیر کی فتح کی خوشیاں منائی جارہی تھیں کہ پیشوا کو دتاجی کی موت اور جنکوجی اور ملہار راؤ ہلکر کی شکستوں کی خبریں ملیں۔ عام حالات میں شاید دتاجی سندھیا کی موت کو مرہٹہ تاریخ کا ایک بہت بڑا سانحہ سمجھا جاتا لیکن مرہٹے ایک طرف دکن میں نظام کی قوّت مفلوج کرچکے تھے۔ دوسری طرف چندماہ قبل ان کی فتوحات کا سیلاب پشاور کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا۔ گزشتہ کامیابیوں کے بعد مرہٹوں میں جو غرور اور خود اعتمادی پیدا ہوئی تھی اس کے باعث یہ شکستیں پوری مرہٹہ قوم کی عزت اور وقار کا مسئلہ بن گئیں اور مہاراشٹر سے وہ فوجی قوت نمودار ہوئی جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی بلونت راؤ مہین ڈھیل۔ شمشیر بہادر، باجی راؤ کا بیٹا مستانی، نارو شنکر وٹھل، شیودیو، ترمبک راؤ، پورن دھر، اناجی، مانکیشور اور بیشمار دوسرے بڑے اور چھوٹے مرہٹہ سردار اپنی اپنی افواج کے ساتھ قومی توہین کا انتقام لینے کے لیے پیشوا کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے، ان کے علاوہ ان کے ساتھ ابراہیم گاردی اپنے مشہور توپخانے اور نو ہزار تربیت یافتہ سپاہیوں کے ساتھ شامل ہوگیا۔ اس عظیم فوج کی کمان اوگیر کے فاتح سداشیو راؤ (بھاؤ جی) کو سونپی گئی اور اس کے ساتھ پیشوا نے اپنے نوجوان ولی عہد بشواش راؤ کو روانہ کردیا۔ مرہٹہ لشکر ۱۰ر مارچ ۱۷۶۰ء کو پٹ دوڑ سے روانہ ہوا اور اورنگ آباد، برہان پور اور گوالیار کے راستے سفر کرنے کے بعد ۷ر جون کو دریائے چنبل کے کنارے پہنچ گیا۔ راستے میں جوں جوں یہ فوج شمال کی طرف بڑھتی گئی،

اس کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ملہار راؤ ہلکر، جنکوجی سندھیا، داماجی، جسونت راؤ پھاوڑ اور دوسرے مرہٹہ سرداروں کے علاوہ لیٹروں اور پنڈاروں کے دستے ہر منزل پر اس کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ ہوچکی تھی۔ یہ صرف ایک فوج نہ تھی بلکہ پوری قوم کا فعال عنصر جمع ہوچکا تھا اور ان سب کا نعرہ یہ تھا کہ ہم افغانوں کو ہندوستان کی سرزمین سے نکال کر دم لیں گے:

دلّی کی طرف مرہٹہ لشکر کی رفتار بہت سست تھی۔ اس سے قبل مرہٹوں کی کامیابی کا راز ان کی سادگی اور تیز رفتاری میں تھا۔ سیواجی کے زمانے میں مرہٹہ کیمپ میں کسی عورت کا لانا لعبید از قیاس سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کوئی بھاری ساز و سامان بھی نہیں رکھتے تھے۔ ایک مرہٹہ سپاہی کے لوازمات گھوڑے، اسلحے اور ایک تو بڑے تک محدود ہوتے تھے۔ اپنے لیے کھانا اور گھوڑے کے لیے چارا وہ راستے میں لوٹتے تھے۔ لیکن بھاؤ جی کی شان و شوکت کا یہ عالم تھا کہ اس کے ساتھ سامانِ رسد کی بیشمار گاڑیاں تھیں اور خیمہ بردار تھے۔ ریشمی خیمے ہاتھیوں پر لدے ہوئے تھے۔ مرہٹہ سردار زرتار کے لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ چنبل کے مقام پر بھرت پور کا حکمران راجہ سورج مل جاٹ اپنے لشکر سمیت مرہٹوں کے ساتھ شامل ہوگیا لیکن بھاؤ کی خودسری کے باعث راستے میں ہی مرہٹوں کے ساتھ اس کے اختلافات پیدا ہوگئے۔ مرہٹے جولائی کے آخر میں دلّی کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ ۲ر اگست کو انھوں نے بغیر کسی شدید مزاحمت کے قلعے پر قبضہ کرلیا۔ بھاؤ نے اپنی افواج کو تنخواہ دینے کے لیے لال قلعہ کو لوٹا اور دیوانِ عام کی چھت اور دیواروں میں لگی ہوئی چاندی اتار لی۔ لال قلعہ سے باہر بزرگانِ دین کے مزارات کو بھی لوٹنے سے دریغ نہ کیا۔ سورج مل جاٹ مرہٹوں کی اس حرکت سے خفا ہوکر واپس چلا گیا۔

موسمِ برسات کے دوران میں مرہٹے دلّی سے باہر پڑاؤ ڈال کر شہر اور آس پاس کے علاقوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کیے ہوئے تھے۔ اس عرصہ میں ابدالی بلند شہر کے ضلع میں انوپ کے مقام

پر ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا اور دونوں فریق نواب شجاع الدولہ کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔



معظم علی بلاناغہ صبح کی نماز کے بعد گھوڑے کی سواری کیا کرتا تھا۔ ایک دن سواری کے بعد وہ اپنی حویلی میں داخل ہوا تو صحن میں ایک فوجی افسر کھڑا شیر علی سے باتیں کر رہا تھا اور معظم علی کا ایک نوکر اس کے گھوڑے کی باگ تھامے چند قدم دور کھڑا تھا۔ شیر علی نے معظم علی کی طرف دیکھ کر فوجی افسر سے کہا "لیجیے وہ آگئے"۔ معظم علی نے گھوڑے سے اتر کر نوجوان افسر کے ساتھ مصافحہ کیا۔ افسر نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "جناب مجھے محل کے داروغہ نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ کو اسی وقت محل میں طلب کیا گیا ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "میں وہاں طلب کیے جانے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"

"جناب مجھے کچھ معلوم نہیں۔ داروغہ نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں آپ کو ساتھ لے کر آؤں۔"

معظم علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور اگر میں داروغہ کے حکم کی تعمیل نہ کروں تو؟"

نوجوان افسر نے جواب دیا۔ "داروغہ نے آپ سے درخواست کی ہے حکم نہیں بھیجا۔"

"چلیے!" معظم علی نے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد معظم علی اور فوجی افسر محل کی ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ فوجی افسر نے کہا۔ "آپ یہاں تشریف رکھیے۔ میں داروغہ کو اطلاع دیتا ہوں۔"

معظم علی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور فوجی افسر باہر نکل گیا۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد محل کا داروغہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے گرمجوشی سے معظم علی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "آئیے آپ کا انتظار ہو رہا ہے!"

معظم علی نے داروغہ کے ساتھ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ بات اس محل کے

رسوم و آداب کے خلاف نہ ہو تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ میرا انتظار کرنے والے صاحب کون ہیں؟"

داروغہ نے جواب دیا۔ "آپ کو نجیب الدولہ نے بلایا ہے۔"

"نجیب الدولہ یہاں ہیں؟"

"جی ہاں، وہ کل یہاں پہنچے تھے لیکن ابھی تک ان کی آمد کو صیغۂ راز میں رکھا جا رہا ہے۔ اور میں آپ سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ آپ یہ بات اس محل سے باہر کسی پر ظاہر نہیں کریں گے۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں لیکن میں حیران ہوں کہ انھیں میرے ساتھ کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

داروغہ نے جواب دیا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ وہ آپ کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ آپ شہر سے باہر رہتے ہیں۔ انھوں نے یہاں پہنچتے ہی آپ کے متعلق پوچھا تھا۔"

معظم علی اپنے ذہن میں نجیب الدولہ کی سیماب پا شخصیت کی عجیب و غریب تصویریں لیے محل کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔ ایک قوی الجثہ آدمی جس کے چہرے سے ذہانت اور شجاعت مترشح تھی، اسے دیکھ کر اپنی کرسی سے اٹھا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "آپ شاید اس بات پر پریشان ہوں کہ میں نے آپ کو یہاں آنے کی تکلیف کیوں دی ہے اگر مجھے بعض مجبوریوں کا احساس نہ ہوتا تو میں سیدھا آپ کے ہاں آتا۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "آپ کی خدمت میں حاضر ہونا میں اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا ہوں۔"

"تشریف رکھیے۔ مجھے اکبر خاں نے آپ کا پتا دیا تھا۔"

اکبر خاں کا نام سن کر معظم علی کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں اور اس نے

نجیب الدولہ کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔"وہ کہاں ہے؟ مجھے اس نے کئی مہینوں سے کوئی اطلاع نہیں دی۔ میں اس کے متعلق بہت پریشان ہوں۔"

"وہ احمد شاہ ابدالی کے پاس ہے اور گذشتہ چند ماہ وہ مرہٹوں کے خلاف جنگوں میں بے حد مصروف رہا ہے اور میں اس کی طرف سے معذرت پیش کرتا ہوں۔"

معظم علی نے جواب دیا۔"آپ کو اس کی طرف سے معذرت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اسے جانتا ہوں اور شاید میں اس دنیا میں اس سے زیادہ کسی اور کو نہیں جانتا۔ میرے لیے اس کے متعلق صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ وہ سلامت ہے۔"

نجیب الدولہ نے کہا: "اس کا باپ میرا دوست تھا۔ میں اسے اپنا بیٹا سمجھتا ہوں۔ اس نے مرہٹوں کے خلاف جنگوں میں جرأت و ہمت کی نہایت قابل فخر روایات قائم کی ہیں اور میں جب کبھی اسے شاباش دیا کرتا تھا تو وہ ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا کہ اس نے سب کچھ آپ سے سیکھا ہے۔ آپ کے ساتھ میری ملاقات ایک مقصد کیلیے ہے اکبر خاں مجھے سپاہیانہ زندگی سے آپ کی کنارہ کشی کی وجوہات بتا چکا ہے لیکن میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ احمد شاہ ابدالی نے جس جنگ کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ وہ اس ملک میں مسلمانوں کی اجتماعی بقا کی خاطر لڑی جائے گی۔ مرہٹے اب ہمیشہ کے لیے اس ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے اپنی پوری قوت کے ساتھ دلی کی طرف بڑھ رہے ہیں اور میں آپ جیسے باشعور آدمی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ اگر ہم نے اس جنگ میں شکست کھائی تو جو امیدیں ہم نے شمالی ہندوستان کے مستقبل کے متعلق وابستہ کی ہیں وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گی۔ مرہٹے ایک ہو چکے ہیں اور ہمیں بھی ایک ہونے کی ضرورت ہے۔ میں نواب شجاع الدولہ کے پاس احمد شاہ ابدالی کا ایلچی بن کر آیا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وہ ہمارا ساتھ دینے پر رضامند ہو جائیں گے۔ روہیلکھنڈ کے تمام سردار احمد شاہ ابدالی کے ساتھ شامل ہو چکے ہیں لیکن ہمیں اپنے سپاہیوں کو فوراً تربیت دینے کے لیے آزمودہ کار افسروں کی ضرورت ہے۔"

معظم علی نے کہا۔"اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ میں کسی ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکتا ہوں تو میری رضاکارانہ خدمات حاضر ہیں اور مجھے اس بات کی ندامت ہے کہ میں اکبر خاں کی طرح بن بلائے آپ کی خدمت میں حاضر کیوں نہ ہوا۔"

محل کا داروغہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے ادب سے سلام کرنے کے بعد کہا۔"عالیجاہ حضور نواب صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

نجیب الدولہ نے جواب دیا۔"میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔"

"نہیں عالیجاہ خود تشریف لا رہے ہیں۔ داروغہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا اور معظم علی نے اٹھ کر کہا۔"تو میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں اور یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں ایک ہفتہ کے اندر اندر احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

"نہیں ٹھہریئے!"

"لیکن نواب صاحب تشریف لا رہے ہیں۔"

نجیب الدولہ نے کہا۔"بیٹھ جایئے! نواب صاحب سے آپ کا تعارف ضروری ہے۔"

نواب اودھ اپنے شاہانہ لباس میں کمرے کے اندر داخل ہوا اور نجیب الدولہ اور معظم علی اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ شجاع الدولہ اپنے مہمان کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر چند ثانیے تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا۔ نجیب الدولہ نے کہا۔"جناب یہ معظم علی خاں ہیں۔ لکھنؤ میں پناہ لینے سے پہلے یہ بنگال کی فوج میں ملازم تھے۔ ان کا ایک ہونہار شاگرد احمد شاہ ابدالی سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے اور میں ابھی ان سے یہ کہہ رہا تھا کہ ہمیں اپنے سپاہیوں کو تربیت دینے کے لیے آپ کی خدمات کی ضرورت ہے اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ انھوں نے میری درخواست قبول کر لی ہے۔"

شجاع الدولہ نے کہا۔"تشریف رکھیے۔ ایک اچھے سپاہی کے لیے میری فوج میں بھی جگہ تھی۔ لکھنؤ میں آپ کے کیا مشاغل ہیں؟"

"میں تجارت کرتا ہوں۔"

شجاع الدولہ نے نجیب الدولہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "آپ انھیں کب سے جانتے ہیں؟"

"روہیلکھنڈ کا ایک نوجوان سردار اپنی عمر کا کچھ حصہ ان کے ساتھ گزار چکا ہے اور اس کی بدولت میں غائبانہ طور پر ان سے متعارف ہو چکا تھا۔"

شجاع الدولہ چند ثانیہ خاموش رہا۔ معظم علی نے اس محفل میں اپنی موجودگی کو دخل در معقولات سمجھتے ہوئے اٹھ کر کہا۔ "اب مجھے اجازت دیجیے۔"

"بہت اچھا! اگر مجھے وقت ملا تو جانے سے پہلے آپ کے ساتھ ایک اور ملاقات کی کوشش کروں گا لیکن اگر یہ ممکن نہ ہوا تو انشاءاللہ ہماری ملاقات احمد شاہ ابدالی کے کیمپ میں ہو گی۔"

نجیب الدولہ نے اٹھ کر معظم علی کے ساتھ مصافحہ کیا لیکن شجاع الدولہ نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا دیا۔ معظم علی دروازے کی طرف بڑھا لیکن کچھ سوچ کر اچانک رک گیا پھر اس نے مڑ کر شجاع الدولہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "جناب اگر یہ گستاخی نہ ہو تو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

"کہیے۔"

"مجھے یہ معلوم نہیں کہ نجیب الدولہ اپنی مہم میں کہاں تک کامیاب ہوں گے، اور احمد شاہ ابدالی کا ساتھ دینے کے متعلق آپ کا آخری فیصلہ کیا ہو گا میں صرف یہ جانتا ہوں کہ ہندوستان کا کوئی مسلمان، اگر اس نے خودکشی کا ارادہ نہیں کر لیا ہے۔ اس جنگ میں غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ اگر خدانخواستہ اس ملک کے مسلمانوں کی اجتماعی بے حسی کے باعث احمد شاہ ابدالی کو شکست ہو گئی تو شمالی ہند میں ہمارا آخری دفاعی حصار ٹوٹ جائے گا۔ مرہٹوں نے صرف دلی پر قبضہ نہیں کیا ہے بلکہ وہ پشاور سے کابل اور غزنی تک اپنی فتوحات کے پرچم لہرانے کی نیت سے میدان میں آئے ہیں۔ اگر کسی میدان میں انھیں فیصلہ کن شکست نہ دی گئی تو وہ

دن دور نہیں جب دلی کی طرح لکھنؤ کی گلیوں اور بازاروں میں بھی ان کے گھوڑے دوڑ رہے ہوں گے۔ لکھنؤ میں اس قسم کی افواہیں گشت کر رہی ہیں کہ مرہٹوں نے آپ کو جنگ سے علیحدہ رکھنے کے لیے دلی میں اپنے کٹھ پتلی حکمران کی وزارت کی پیش کش کی ہے اور آپ ......!"

شجاع الدولہ نے سراپا احتجاج بن کر کہا۔ "یہ جھوٹ ہے اور مرہٹے مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتے۔"

معظم علی نے کہا۔ "میری معذرت قبول فرمایئے لیکن عوام کا اعتماد بحال کرنے کے لیے اس قسم کی افواہوں کی تردید کی اشد ضرورت ہے اور تردید کی بہترین صورت یہ ہو سکتی ہے کہ آپ اپنی افواج کو مرہٹوں کے خلاف کوچ کی تیاری کا حکم دیں!"

شجاع الدولہ نے جواب دیا۔ "مجھے کوئی فیصلہ کرنے کے لیے آپ کے مشوروں کی ضرورت نہیں۔"

"جناب مجھے معلوم ہے کہ میں مشورہ دینے کا اہل نہیں لیکن میں آپ کے کانوں تک اس قوم کی فریاد پہنچانا چاہتا ہوں جس کی شہ رگ تک ایک ایسے دشمن کی تلوار پہنچ چکی ہے جو عدل و انصاف اور انسانیت کے الفاظ سے نا آشنا ہے۔ میرے الفاظ بیشک تلخ ہیں لیکن آپ کو میرے خلوص پر شبہ نہیں کرنا چاہیے۔"

معظم علی یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔



تھوڑی دیر بعد معظم علی گھوڑے پر سوار اپنے گھر کا رخ کر رہا تھا۔ شہر کے پر رونق بازاروں اور گلیوں سے گزرتے ہوئے اسے اپنے گرد و پیش کا احساس تک نہ تھا۔ وہ کوسوں دور کسی میدان میں ان افواج کے میلوں تک پھیلے ہوئے پڑاؤ دیکھ رہا تھا جو ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والی تھیں۔ وہ لڑنے والوں کے نعرے، زخمیوں کی چیخ پکار، توپوں کی دھنا دھن

بندوقوں کے دھماکے اور تلواروں کی جھنکار سن رہا تھا۔ اسے حدِ نگاہ تک لاشوں کے انبار نظر آرہے تھے۔ پھر آگ اور خون کے طوفانوں سے نکل کر وہ اس مکان میں پہنچ چکا تھا، جہاں زندگی اپنی تمام رعنائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ اس کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ فرحت اس کے سامنے کھڑی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔"میری زندگی! میں آگیا ہوں۔ خدا نے ہمیں فتح دی ہے۔ ہم ان درندوں کے دانت توڑ آئے ہیں جو اس ملک میں انسانیت کے لیے ایک خطرۂ عظیم بن چکے تھے۔ میرے پیچھے وہ فوج آرہی ہے جس کے سپاہی مرہٹوں کی سطوت کے پرچم اپنے پیروں تلے روند چکے ہیں۔ اب یہ مجاہد ان فرنگی تاجروں کی چیرہ دستیوں سے ہمیں نجات دلائیں گے جنھوں نے بنگال میں ہماری عزت اور آزادی پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ اس ملک میں انسانیت دوبارہ جنم لے رہی ہے۔ اب ہماری منزل مرشدآباد ہے۔ ہم بہت جلد اس وطن کی مٹی کو آنکھوں سے لگائیں گے جہاں ہمارے شہیدوں کا خون گرا تھا۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی اپنے گھر میں داخل ہوا تو وہاں ایک کمرے میں فرحت اور اس کی ماں کے علاوہ دو اجنبی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ معظم علی جلدی سے واپس مڑا اور دوسرے کمرے میں جا بیٹھا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد فرحت اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

معظم علی نے کہا۔"فرحت مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہاں تمھاری سہیلیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ انھوں نے بُرا تو نہیں مانا!"

فرحت مسکرائی۔"وہ میری سہیلیاں نہیں تھیں۔ انھیں امی جان نے بلایا تھا اور جاتے جاتے آپ کو ایک خوشخبری دے گئی ہیں۔"

"وہ کیا؟"

"یہی کہ ہمارے گھر میں ایک مہمان تشریف لانے والے ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔"واہ یہ خوشخبری تو میں پچھلے ہفتے سن چکا ہوں۔"

فرحت مسکرائی۔"امی جان کو اصرار ہے کہ شہر کی ہر تجربہ کار عورت باری باری مجھے دیکھنے

کے لیے آتے۔ کل پڑوس کی کسی عورت نے ان عورتوں کا پتہ دے دیا تھا اور امی جان نے آج صبح کی نماز سے فارغ ہوتے ہی صابر کو ان کی تلاش میں بھیج دیا تھا۔"

معظم علی فرحت کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کے خیالات کہیں اور تھے۔ فرحت نے کہا۔"آج آپ پریشان نظر آتے ہیں خیر تو ہے! دلاور خاں کہتا تھا کہ آپ کو شجاع الدولہ نے بلایا تھا۔"

"نہیں! مجھے نجیب الدولہ نے بلایا تھا۔ وہ کل سے لکھنؤ میں ہیں، فرحت! میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ اپنے ننھے مہمان کی صورت دیکھنے سے پہلے میں گھر سے باہر نہیں جاؤں گا۔"

فرحت نے کہا۔"لیکن آپ اگر کہیں جانا چاہتے ہیں تو میں آپ کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کروں گی۔"

معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔"فرحت آج میں اس بات پر ندامت محسوس کر رہا ہوں کہ میں ان جنگوں سے غیر حاضر رہا ہوں جو ہماری قوم کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والی ہیں۔ تم سن چکی ہو کہ مرہٹوں کا سیلاب اب دلّی پہنچ چکا ہے۔ احمد شاہ ابدالی ہمارا نجات دہندہ بن کر آیا ہے اور اسے ہر اس انسان کے تعاون کی ضرورت ہے جو اس ملک کے مسلمانوں کے متعلق سوچنے کا شعور اور ان کی بقا کے لیے تلوار اٹھانے کی ہمت رکھتا ہو۔"

فرحت نے کہا۔"میں چند دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ آپ کوئی اہم فیصلہ کرنے والے ہیں اور پچھلے ہفتے جب آپ نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ آپ اب چند مہینے لکھنؤ سے باہر نہیں جائیں گے تو بھی مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ آپ کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ میں آپ کو صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اگر آپ میری خاطر اپنے ضمیر کی آواز کو دبانے کی کوشش کریں گے تو میں سمجھوں گی کہ میں آپ کی رفیقۂ حیات بننے کی اہل نہ تھی۔"

آٹھ دن بعد معظم علی ایک سپاہی کا لباس پہنے فرحت کے سامنے کھڑا تھا۔ فرحت

کے چہرے پر ایک مغموم مسکراہٹ تھی۔ معظم علی نے کہا۔ "میں اپنی زندگی میں ایسی جنگیں لڑ چکا ہوں جو اپنے نتائج کے اعتبار سے بے معنی تھیں لیکن اس دفعہ میں ایک ایسی جنگ میں حصّہ لینے کے لیے جا رہا ہوں جس کے نتائج بہت دُور رس ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں شمال مغرب کے علاقے ہندوستان کے مسلمانوں کا آخری دفاعی حصار ثابت ہوں گے۔ اگر ہم مرہٹوں کو شکست نہ دے سکے تو یہ سیلابِ عظیم کسی دن اٹک کے پار پشاور اور غزنی تک پہنچ جائے گا اور مسلمانوں کی حالت اس ملک کے شودروں سے بدتر ہوگی۔ فرحت میں اپنی شہرت اور ناموری کے لیے نہیں بلکہ قوم کی بقا کے لیے جنگ میں حصّہ لینے جا رہا ہوں۔ یہ جنگ اس ملک کی تاریخ کی عظیم ترین جنگ ہوگی اور اس میں حصہ لینے والے ہزاروں سپاہی ایسے ہوں گے جن کی لاشیں دشمن کے گھوڑوں کے پیروں تلے روندی جائیں گی۔ اگر میں واپس نہ آیا تو یہ سمجھنا کہ میرا مقصد میری ذات سے بلند تھا اور جو بچہ ہمارے ہاں پیدا ہوگا تم کسی دن اسے یہ بتا سکو گی کہ تمھارا باپ ان ہزاروں گمنام سپاہیوں میں سے ایک تھا جنھوں نے اپنی آنے والی نسلوں کی عزت اور آزادی کی قیمت اپنی جانیں دے کر ادا کی تھی۔"

فرحت کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے، اس کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے معظم علی نے اس کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں "خدا حافظ" کہہ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا تو فرحت اور اس کی ماں بالائی منزل کے دریچے میں کھڑی نیچے دیکھ رہی تھیں۔ جب معظم علی اور اس کے ساتھی حویلی سے باہر نکل گئے تو فرحت بے اختیار عابدہ کے ساتھ لپٹ گئی۔ "امی جان!" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "دعا کیجیے کہ خدا انھیں فتح دے۔"



موسمِ برسات ختم ہو چکا تھا۔ بھاؤ نے نارو شنکر کو سات ہزار سپاہیوں کے ساتھ دلی کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر پیشقدمی کی اور دلی سے اسّی میل دور شمال کی طرف جمنا کے کنارے افغانوں کے مشہور قلعہ کنج پورہ پر حملہ کر دیا۔ نجابت خاں دس ہزار روہیلہ جانبازوں کے ساتھ اس قلعے کی حفاظت پر متعین تھا لیکن مرہٹوں کے سیلاب کے آگے اس کی پیش نہ گئی۔ انھوں نے گاردی کے توپخانے کی گولہ باری کے بعد یلغار کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ نجابت خاں اور سرہند کے سابق گورنر عبدالصمد خاں کے علاوہ ہزاروں سپاہیوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اس قلعے سے مرہٹوں کو اسلحہ اور بارود کے علاوہ رسد کے وہ ذخائر دستیاب ہوئے جو احمد شاہ ابدالی کی فوج کے لیے جمع کیے گئے تھے۔

دریائے جمنا طغیانی کے باعث ناقابلِ عبور تھا اور احمد شاہ ابدالی انتہائی رنج و ملال کے ساتھ دریا کے دوسرے کنارے مرہٹوں کے ہاتھوں اپنے بہترین ساتھیوں کے قتلِ عام کی خبریں سن رہا تھا لیکن جب مرہٹے کنج پورہ کے خزانے لوٹنے کے بعد دسہرے کی خوشیاں منا رہے تھے، احمد شاہ ابدالی دلی سے بیس میل شمال کی طرف باغپت کے قریب جا نکلا۔ کشتیوں کے بغیر وہاں بھی دریائے جمنا کو عبور کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ فوج کے افسر اور سپاہی دریا کی خشمگیں موجیں دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے لیکن کسی کو امیرِ لشکر کے حکم سے سرتابی کی مجال نہ تھی۔ احمد شاہ ابدالی کے حکم سے توپیں ہاتھیوں پر لاد دی گئیں اور سواروں کے دستے دریا کے کنارے صف بستہ کھڑے ہو گئے۔ پھر امیرِ لشکر نے "اللہ اکبر" کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دریا میں کود پڑا۔ اس کے ساتھ ہی نجیب الدولہ، شجاع الدولہ، نصیر خاں بلوچ، مراد خاں ایرانی، برخوردار خاں، شاہ ولی خاں، جہان خاں اور دوسرے افغان، ایرانی، بلوچ اور روہیلہ سرداروں نے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے اور پھر آن کی آن میں پوری فوج دریا کی موجوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب یہ لشکر دریا کے پار پہنچ چکا تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں کے عقب

سے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ ابدالی کی فوج کے چند دستوں نے کسی غیر متوقع حملے کے پیشِ نظر
آگے بڑھ کر صفیں باندھ لیں۔ چند ثانیے بعد بیس سواروں کا دستہ نمودار ہوا۔ اگلی صف
سے کسی نے بلند آواز میں کہا: "یہ ہمارے ساتھی ہیں انھیں آنے دو۔" اکبر خاں اور معظم علی
ان سواروں میں سب سے آگے تھے۔ وہ اپنے گھوڑوں سے اتر کر بھاگتے ہوئے لشکر کی صفوں
میں گھس گئے اور تھوڑی دیر بعد وہ نجیب الدولہ، حافظ رحمت خاں اور روہیلکھنڈ کے
دوسرے سرداروں سے باتیں کر رہے تھے۔ معظم علی کہہ رہا تھا: "یہاں سے صرف چھ کوس
کے فاصلے پر مرہٹوں کی ایک چوکی ہے اور اس چوکی کا صفایا کرنے کے بعد یہ علاقہ ہمارے لیے
محفوظ ہو جائے گا۔ وہاں سپاہیوں کی تعداد پانچ سو سے زیادہ نہیں۔ مرہٹے اس وقت دسہرہ
کا جشن منا رہے ہیں۔ اگر میرے ساتھ چند تیز رفتار دستے بھیج دیئے جائیں تو میں دوپہر سے
پہلے پہلے ان کا صفایا کر سکتا ہوں۔"

حافظ رحمت خاں نے کہا: "ہمیں وقت نہیں ضائع کرنا چاہیئے۔ چلیے آپ ہماری
رہنمائی کریں!"

"ہمارے گھوڑے تھکے ہوئے ہیں۔" یہ کہہ کر معظم علی نے ایک نوجوان کے گھوڑے کی
باگ پکڑ لی۔

نوجوان نے کہا: "لیکن میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔"

معظم علی نے اسے بازو سے کھینچ کر گھوڑے سے اتارتے ہوئے کہا: "تم سن چکے ہو کہ
ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے!"

اکبر خاں نے اس کی تقلید کی اور اپنے قبیلے کے ایک سپاہی کا گھوڑا پکڑ لیا۔

تھوڑی دیر بعد کوئی چار سو سوار لشکر کی صفوں سے نکل کر گرد و غبار کے بادلوں میں روپوش
ہو رہے تھے اور نجیب الدولہ احمد شاہ ابدالی سے کہہ رہا تھا: "عالیجاہ! اس کا نام معظم علی ہے،
اس نے دو دن قبل اس علاقے میں دشمن کی نقل و حرکت معلوم کرنے کے لیے دریا عبور کیا

تھا اور اب وہ یہاں سے چھ کوس دور دشمن کی ایک چوکی کا صفایا کرنے جا رہا ہے، پھر
یہ علاقہ بالکل محفوظ ہو جائے گا اور ہم اپنی پیشقدمی جاری رکھ سکیں گے۔"

اگلی رات مرہٹہ چوکی کے چند سپاہی جو روہیلہ دستوں سے جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب
ہو گئے تھے، بھاؤ جی کو یہ بتا رہے تھے کہ ابدالی کے لشکر نے اچانک دریا عبور کر کے ہماری
چوکی کا صفایا کر دیا ہے۔

بھاؤ جی نے مرہٹہ سرداروں سے مشورہ کرنے کے بعد اپنی فوج کو پانی پت کی طرف
ہٹا لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے شہر کے قریب پڑاؤ ڈال دیا۔ احمد شاہ ابدالی نے بھی پانی پت کا رُخ
کیا اور مرہٹہ کیمپ سے آٹھ میل دور پڑاؤ ڈال دیا۔ مرہٹوں نے ابراہیم گاردی کی ہدایات کے
مطابق شہر اور اپنے کیمپ کے گرد ساٹھ فٹ چوڑی اور بارہ فٹ گہری خندق کے پیچھے مٹی
کے بلند پشتے پر جگہ جگہ توپیں نصب کر دیں۔ بھاؤ کو امید تھی کہ اس کی پنڈارہ فوج احمد شاہ ابدالی
کے رسد اور کمک کے راستوں پر حملہ کر کے اسے حملے پر مجبور کر دے گی لیکن ابدالی، مرہٹہ
سپہ سالار کی نسبت کہیں زیادہ تجربہ کار اور دور اندیش تھا۔ وہ دشمن کی خواہش کے مطابق اپنی
فوج کو اس کی توپوں کے سامنے لانے پر تیار نہ ہوا۔ اس نے ارد گرد کے جنگلات سے بیشمار
درخت کٹوائے اور پڑاؤ کے ارد گرد لکڑی کے کھمبوں کی ایک دیوار کھڑی کر دی۔ ابدالی
کے اس اقدام سے مرہٹے ایک غیر متوقع صورتِ حالات کا سامنا کر رہے تھے۔ وہ اپنے
بھاری توپخانے کو ایک فیصلہ کن حربہ سمجھتے تھے لیکن بھاری ساز و سامان سے لیس
ہونے کے باعث بدلے ہوئے حالات کے مطابق جنگ کا کوئی نیا نقشہ تیار کرنے کے
قابل نہ تھے۔ انھوں نے دن رات ایک کر کے خندق کھودی تھی کہ احمد شاہ ابدالی ایک
طوفان کی طرح آگے بڑھے گا اور ان کی توپیں خندق کے ارد گرد افغان سپاہیوں کے ڈھیر
لگا دیں گی لیکن اتنی بڑی تیاری کے بعد انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ دشمن کیا سوچ رہا ہے۔ افغان
لشکر اگر کھلے میدان میں نکل کر حملہ کرتا تو مرہٹے ابدالی کے ہر سوار کے مقابلے میں کم از کم پانچ

سوار لا سکتے تھے۔ پھر اگر پڑاؤ میں مرہٹہ سرداروں کے ساتھ ان کی بیویاں نہ ہوتیں تو ان کے بیلے پسپا ہو کر جنگ کے لیے کوئی بہتر جگہ تلاش کرنا نسبتاً آسان ہوتا۔ اب ان کے لیے پڑاؤ سے باہر ہر جگہ غیر محفوظ تھی۔ اس کے برعکس احمد شاہ ابدالی کی فوج ہر وقت حالات کے مطابق نقل و حرکت کر سکتی تھی۔ ابدالی کے سپاہی بھاری توپوں کی بجائے اپنے تیز دل تلواروں، بندوقوں اور گھوڑوں پر بھروسہ رکھتے تھے۔

فریقین کے کیمپوں کے درمیان قریباً آٹھ میل کے خلا میں روزمرہ انفرادی شجاعت کے واقعات دیکھے جاتے تھے کبھی کوئی مرہٹہ ماتھے پر تلک لگا کر اپنے پڑاؤ سے نکلتا اور مسلمانوں کے پڑاؤ کے سامنے گھوڑا روک کر کسی افغان، کسی ایرانی، یا کسی بلوچ کو مقابلے کی دعوت دیتا۔ اسی طرح افغان فوج کے جوانمرد گھوڑے دوڑاتے ہوئے اپنے پڑاؤ سے نکلتے اور مرہٹہ کیمپ کی خندق کے پل کے قریب رک کر انھیں دعوت مبارزت دیتے ابدالی کے کیمپ میں ایک نوجوان کی زندہ دلی اور جرأت کی داستانیں ضرب المثل بن چکی تھیں۔ وہ ہر روز ایک نئے بھیس میں اپنے کیمپ سے نکلتا اور دشمن کے دو چار سورماؤں کا غرور خاک میں ملا کر واپس آتا۔ ابدالی کے جانباز اسے کبھی افغان، کبھی بلوچ، کبھی مغل اور کبھی روہیلہ سپاہی کے لباس میں دیکھتے اور داد و تحسین کے نعرے بلند کرتے۔ چند شاندار معرکوں کے بعد وہ نصیر خاں [illegible] سے [illegible] پٹکا، ملک جہان خان سے ایک تلوار، شجاع الدولہ سے ایک گھوڑا اور نجیب الدولہ سے ایک بندوق بطور انعام حاصل کر چکا تھا۔

یہ نوجوان اکبر خاں تھا۔ ایک دن احمد شاہ ابدالی نے اسے اپنے خیمے میں طلب کیا اور کہا: "بیٹا میں تمھارے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں اور تم اپنے آپ کو میری طرف سے بہترین انعام کا مستحق ثابت کر چکے ہو۔ تمھاری کوئی ایسی خواہش ہے جو میں پوری کر سکتا ہوں؟"

اکبر خاں نے انسانی سطوت و جبروت کے اس پیکر مجسم کی طرف دیکھا اور محبت

اور اطاعت کے جذبات سے مغلوب ہو کر گردن جھکا لی۔

احمد شاہ ابدالی نے کہا۔ "بیٹا تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا!"

اکبر خاں نے گردن اٹھائی۔ اس کی چمکدار آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "عالیجاہ! میری صرف ایک خواہش ہے اور وہ آپ کے سوا کوئی پوری نہیں کر سکتا۔"

"کہو!"

"عالیجاہ! میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ مرہٹے دوبارہ اس سرزمین میں پاؤں نہ رکھیں۔" اور ان الفاظ کے ساتھ اکبر خاں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

احمد شاہ ابدالی نے کہا: "بیٹا خدا مجھے ہمت دے۔ تمھاری یہ خواہش ضرور پوری ہوگی، اب میں تمھیں ایک حکم دیتا ہوں اور وہ یہ کہ آج کے بعد تمھیں تنہا دشمن کے مقابلے میں جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ مرہٹوں کا یوم حساب شروع ہونے والا ہے اور میں تمھیں اس دن کے لیے زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کاش اس ملک میں چند اور نوجوان تم جیسے ہوتے؟"

اکبر خاں نے کہا۔ "عالیجاہ! میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جس کا بچپن میرے بچپن سے اور جس کی جوانی میری جوانی سے بہتر تھی اور جو اب بھی میرے لیے باعث رشک ہے۔"

"اور وہ کون ہے؟"

"عالی جاہ! وہ چھاپہ مار روہیلہ دستوں کا سالار ہے اور میں نے سب کچھ اسی سے سیکھا ہے۔"

۱۹ نومبر کو گاردی نے اپنی پیادہ سپاہ کے ساتھ حملہ کیا لیکن اسے شدید نقصان اٹھانے کے بعد پسپا ہونا پڑا ہوا۔ تین دن بعد سندھیا نے یکے بعد دیگرے دو حملے کیے

لیکن اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ ۷ دسمبر کو روہیلوں نے جوابی حملہ کیا اور ان کی جھڑپ بلونت راؤ مہینڈیل کے دستوں کے ساتھ ہوئی۔ سخت لڑائی کے بعد بلونت راؤ مارا گیا اور اس کی فوج بھاگ گئی۔ روہیلوں نے شکست خوردہ دستوں کا تعاقب کیا اور مرہٹہ کیمپ میں داخل ہو گئے اور شام تک تباہی مچانے کے بعد واپس چلے آئے۔

قریباً اڑھائی ماہ فریقین کے درمیان اس طرح کی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ اس عرصہ میں دونوں فوجوں کے سامنے سپاہیوں کے لیے رسد اور گھوڑوں کے لیے چارے کی فراہمی سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ مرہٹہ فوج کو زیادہ تر رسد دلیّ کے قلعدار نارو شنکر کی طرف سے پہنچتی تھی۔ نجیب الدولہ نے امیر لشکر سے مشورہ کرنے کے بعد معظم علی کی قیادت میں اپنی فوج کا ایک حصہ مرہٹوں کی رسد و کمک کے راستوں پر چھاپے مارنے کے لیے بھیج دیا۔ چند دن کے بعد یہ چھاپہ مار دستے دلی اور پانی پت کے درمیان آمدورفت کے تمام راستے بند کر چکے تھے اور مرہٹہ فوج قحط کا سامنا کر رہی تھی۔

افغان فوج کو زیادہ تر رسد روہیلکھنڈ کے علاقوں سے ملتی تھی۔ بھاؤ صاحب نے بندیل کھنڈ میں گوبند پنتھ کو صورت حالات سے باخبر کیا اور اس نے بارہ ہزار تیز رفتار سواروں کے ساتھ روہیلکھنڈ پر یلغار کر دی۔ چند دن میں وہ روہیلوں کے کئی علاقے تباہ و برباد کرنے کے بعد میرٹھ تک پہنچ چکا تھا اور افغان افواج کو خوراک کی ترسیل بند ہو چکی تھی۔ اب مرہٹہ کیمپ کی طرح افغان فوج کے پڑاؤ میں بھی قحط کے اثرات محسوس کیے جا رہے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے جرنیلوں نے اسے مشورہ دیا کہ ہمیں یا تو فوراً مرہٹوں پر حملہ کر دینا چاہیئے یا یہاں سے پیچھے ہٹ جانا چاہیئے۔ ورنہ ہمیں چند دنوں تک ایک خطرناک قحط کا سامنا کرنا پڑے گا۔ احمد شاہ ابدالی کا جواب یہ تھا "تم ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ انتظار کرو اور دیکھو، ہمارے مقدر میں فتح ہے پسپائی نہیں!"

احمد شاہ ابدالی کی جوابی کارروائی یہ تھی کہ اس نے مرہٹوں کے کیمپ کے گرد اپنا گھیرا

تنگ کرنا شروع کر دیا اور اپنے اور دشمن کے پڑاؤ کے درمیان پانچ ہزار سپاہیوں کی ایک اور چوکی قائم کر دی اور وہاں اپنے لیے سرخ رنگ کا ایک چھوٹا سا خیمہ نصب کروایا۔ یہ چھوٹا سرخ خیمہ اس عظیم فوج کا ہیڈ کوارٹر تھا جو اپنی تلوار کی نوک سے ہندوستان کی تاریخ کا ایک نیا صفحہ الٹنے والی تھی۔ احمد شاہ ابدالی دن بھر گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی بیرونی چوکیوں کا معاینہ کرتا اور بسا اوقات اسے ایک دن میں پچاس ساٹھ میل سواری کرنی پڑتی۔ رات کے وقت اس کی اگلی چوکی کے سپاہی دشمن کے پڑاؤ تک پہنچ جاتے اور باقی فوج کے کئی دستے مرہٹوں کی رسد و کمک کے راستوں پر چھاپے مارتے۔

۱۷ دسمبر کو احمد شاہ ابدالی کے ایک جرنیل عطار خاں کی قیادت میں سواروں کی ایک فوج نے ایک دن میں پچاس میل یلغار کر کے گوبند پنتھ کو جا لیا اور بارہ ہزار مرہٹوں کے اس لشکر کو تہ تیغ کر ڈالا جو کئی دن سے رسد و کمک کے راستوں پر حملے کر کے افغانوں کو پریشان کر رہا تھا۔ چند دن بعد معظم علی اور اکبر خاں نے رات کے وقت مرہٹہ کیمپ کے ان دستوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو گھوڑوں کے لیے چارا تلاش کرنے کی نیت سے نکلے تھے۔

۶ جنوری ۱۷۶۱ء کو دلیّ سے ایک قافلہ جو مرہٹہ فوج کے لیے رسد اور تنخواہیں لے کر آ رہا تھا۔ افغان چھاپہ مار دستوں کے نرغے میں آ گیا اور اس قافلے کے بہت کم آدمی ایسے تھے جنھیں افغان سواروں نے بچ نکلنے کا موقع دیا۔ اب مرہٹہ کیمپ پر بیچارگی، بے بسی اور خوف چھایا ہوا تھا۔ قریباً چار لاکھ انسان ایک ایسے پڑاؤ میں بری طرح گھرے ہوئے تھے جہاں صفائی کا انتظام ناممکن تھا۔ سینکڑوں آدمی روزانہ بھوک سے مر رہے تھے اور سینکڑوں غلاظت اور تعفن کے باعث پیدا ہونے والی بیماریوں کا شکار ہو رہے تھے۔ وہ فوج جو اپنی تعداد اور اسلحہ کی برتری کے نشہ میں غزنی تک پہنچنے کا عزم لے کر نکلی تھی، اب کیمپ سے باہر جاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ مرہٹے دن بھر اپنے پڑاؤ

کے چاروں طرف افغان شہسواروں کے تیز رفتار گھوڑوں کے سموں سے اٹھنے والا گرد و غبار دیکھتے تھے اور موسم سرما کی طویل اور اداس راتیں گزارنے کے بعد جب وہ صبح کے وقت بیدار ہوتے تھے تو انھیں اپنے خیموں میں دشمن کی گولیوں کے نشان دکھائی دیتے تھے۔ بھوک سے مرنے والے انسانوں، گھوڑوں اور بیلوں کی لاشوں کا تعفّن میلوں تک پھیل چکا تھا۔ فضا میں دن بھر چیلوں اور گدھوں کے غول نظر آتے تھے۔



ایک دن احمد شاہ ابدالی کے خیمے میں فوج کے بڑے بڑے سردار جمع تھے۔ صلح کے لیے مرہٹوں کی پیشکش پر غور کیا جا رہا تھا۔ شجاع الدولہ جس کی وساطت سے مرہٹوں نے صلح کے لیے سلسلہ جنبانی کی تھی، احمد شاہ ابدالی سے کہہ رہا تھا۔ "عالیجاہ! مرہٹے فاقہ کشی سے تنگ آچکے ہیں اور وہ صلح کے لیے ہماری ہر شرط ماننے کو تیار ہیں۔ اگر ان کی پیشکش ٹھکرا دی گئی تو انھیں مجبوراً میدان میں آنا پڑے گا اور اس گئی گذری حالت میں بھی ان کی فوجی قوت ایسی نہیں کہ انھیں آسانی سے شکست دی جا سکے۔ وہ دلّی خالی کر کے واپس جانے کے لیے تیار ہیں۔ ان سے یہ وعدہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ وہ دوبارہ شمال کا رخ نہیں کریں گے، اگر ہم لڑے بغیر اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نجیب الدولہ ہزاروں جانیں ضائع کرنے پر کیوں مُصر ہیں؟"

نجیب الدولہ نے کہا۔ "عالیجاہ! ہمارا مقصد مرہٹوں کو پانی پت کے میدان سے بھگانا نہیں بلکہ اس طاقت کو ختم کرنا ہے جو اس ملک میں مسلمانوں کی عزت اور بقا کے لیے ایک خطرۂ عظیم بن چکی ہے۔ مرہٹے اب لڑے بغیر اس لیے واپس جانا چاہتے ہیں کہ انھیں لڑائی میں اپنی تباہی نظر آتی ہے لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ دوبارہ زیادہ تیاری کے بعد واپس نہیں آئیں گے۔"

شجاع الدولہ نے کہا۔ "ان کے سامنے یہ شرط پیش کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے چند

سرداروں کو بطور یرغمال ہمارے پاس چھوڑ دیں۔"

نجیب الدولہ نے جواب دیا۔ "ہمارا معاملہ چند سرداروں کے ساتھ نہیں، مرہٹہ قوم کے ساتھ ہے جو پورے ہندوستان پر قابض ہونے کا عزم کر چکی ہے، اگر چند سرداروں کی جان کا خطرہ اس کے ارادوں میں حائل ہو تو اسے نئے سردار تلاش کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ مجھے اپنے اکابر کی ذہنیت پر تعجب ہوتا ہے جو ایک ایسے دشمن کے ساتھ سودا بازیوں سے زندہ رہنا چاہتے ہیں جس کی پوری تاریخ ریاکاری، بدعہدی اور مکر و فریب کی داستانوں سے لبریز ہے۔ میں آپ کو ان لوگوں کے ساتھ مصافحہ کرنے کا مشورہ نہیں دوں گا جن کے ہاتھ میری قوم کے بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ ہمارا سابقہ ایک ایسے دشمن کے ساتھ ہے جو حالات کے مطابق اپنا طریق کار بدلتا رہتا ہے۔ جو طاقت ور کے سامنے بھیڑ اور کمزور کے سامنے شیر بن جاتا ہے۔ میں مرہٹوں کے ساتھ صلح کی بات کرنے سے پہلے اپنے معزز دوست سے یہ گذارش کروں گا کہ وہ ہمارے ساتھ بحث کرنے سے پہلے اپنی فوج کے کسی معمولی سپاہی کے ساتھ مشورہ کر لیں۔ اگر وہ یہ کہے کہ مرہٹوں کے یہاں سے زندہ اور سلامت بچ نکلنے کے دو یا تین سال بعد لکھنؤ کی گلیاں ان کی لوٹ مار اور قتل و غارت سے محفوظ ہوں گی تو میں اپنا موقف بدلنے کے لیے آمادہ ہو جاؤں گا۔ مرہٹوں کی منزلِ مقصود پانی پت نہ تھی۔ ان کی نگاہیں کابل، قندھار اور غزنی پر تھیں۔ اب وہ شاید یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کا یہاں آنا ایک احمقانہ فعل تھا اور ان کا یہ سمجھ لینا بھی ایک حماقت تھا کہ ہم آنکھیں بند کر کے ان کی توپوں کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے۔ اب ان کے لیے اپنی غلطی کی تلافی کی یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ وہ یہاں سے بچ کر چلے جائیں اور ان تجربات سے فائدہ اٹھا کر اگلے سال یا اس سے اگلے سال زیادہ تیاریوں کے ساتھ واپس آئیں۔ اگر ہم نے انھیں صحیح سلامت بچ نکلنے کی اجازت دی تو مستقبل کے مورخ ہمیں ان کی نسبت کہیں زیادہ احمق خیال کریں

گے۔ میں آئندہ کسی وقت ان کے ساتھ لڑنے کی بجائے آج ہی ان سے نپٹ لینا بہتر سمجھتا ہوں اور اگر میرے معزز دوست حقیقت پسندی کا ثبوت دیں تو انھیں بھی یہی فیصلہ کرنا پڑے گا۔ مرہٹے "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" کے اصول کے قائل نہیں۔ اگر وہ جنگ کے میدان سے بچ نکلنے کے لیے ہمارے ساتھ مصالحت کرلیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ واپس جاتے ہوئے مہاراشٹر تک راستے کی بستیوں اور شہروں کو راکھ کے انبار بنا کر نہیں رکھ دیں گے۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جس تلوار کو وہ ہمارے سپاہیوں کے سامنے بے نیام کرنے سے ہچکچاتے ہیں وہ ان کے راستے کے نہتے اور بے بس انسانوں کے قتلِ عام سے دریغ کرے گی!"

عالیجاہ! میرے حلق میں چیخوں کے سوا کچھ نہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ان لوگوں کے ہاتھوں اپنی قوم کی ذلت و رسوائی کے دلخراش مناظر دیکھے ہیں۔ میں نے روہیلکھنڈ کی بستیوں اور دلّی کے بازاروں میں ان درندوں کو انسانیت کا منہ نوچتے دیکھا ہے۔ میں ان کے قول و قرار پر اعتماد نہیں کرسکتا اور نواب شجاع الدولہ کو بھی میں یہ مشورہ دوں گا کہ انھیں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیئے۔ مجھے روہیلکھنڈ کی طرح اودھ کی سرحدوں پر بھی کوئی ایسی دیوار دکھائی نہیں دیتی جو مرہٹوں کی جارحیت کو روک سکتی ہو۔ مجھے تو ان سے یہ بات بھی بعید معلوم نہیں ہوتی کہ وہ نواب شجاع الدولہ کی کوششوں کے طفیل یہاں سے بچ کر نکلیں گے اور واپس جاتے ہوئے لکھنؤ میں اپنی وحشت اور بربریت کی ناقابلِ فراموش یادگار چھوڑ جائیں گے۔"

نواب شجاع الدولہ نے کہا۔ "نجیب الدولہ کو میرے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے، اگر آپ حضرات کی رائے یہی ہے کہ مرہٹوں کے ساتھ بہرحال جنگ کی جائے تو ہمیں تیار رہنا چاہیئے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ میری فوج کسی سے پیچھے نہیں رہے گی۔"



۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کا آفتاب ہندوستان کی تاریخ کا ایک عظیم ترین معرکہ دیکھ رہا تھا۔ طلوعِ سحر کے ساتھ مرہٹہ فوج نے میلوں لمبی صفوں میں اپنے پڑاؤ سے نکل کر آگے بڑھنا شروع کیا۔ ان کے میسرہ پر گاردی کے تربیت یافتہ دستے تھے اور اس کے ساتھ گیکوار کی فوجیں تھیں۔ میمنہ میں ملہار راؤ ہلکر اور جنکوجی سندھیا تھے۔ قلبِ لشکر میں بھاؤ اور بشواس راؤ ایک جنگی ہاتھی کے ہودج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے لشکر کے قلب میں ابدالی کا وزیرِ اعظم شاہ ولی خان تھا اور اس کی کمان میں دُرّانی فوج کے وہ آزمودہ کار جانباز تھے جو کئی میدانوں میں دادِ شجاعت دے چکے تھے۔ میسرہ پر شاہ پسند خاں اور نجیب الدولہ تھے۔ شجاع الدولہ کی افواج میسرہ اور قلب لشکر کے درمیان تھیں۔ میمنہ کی قیادت برخوردار خاں کے ہاتھ میں تھی اور روہیلہ، مغل اور بلوچ سپاہیوں کے کئی دستے اس کے ساتھ تھے۔

احمد شاہ ابدالی ایک سفید گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی عقابی نگاہوں سے میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھ رہا تھا۔ برق رفتار سواروں کی ایک جماعت فوج کے جرنیلوں اور سالاروں کو ایک کونے سے دوسرے کونے تک اس کی ہدایات پہنچانے میں مصروف تھی۔ جنگ کی ابتدا مرہٹہ توپوں کی آتشبازی سے ہوئی اور اس کے بعد گاردی کے تربیت یافتہ دستوں نے افغان فوج کے دائیں بازو کے روہیلہ دستوں پر سنگینوں سے حملہ کردیا۔ روہیلوں کے پیچھے ہٹتے ہی بھاؤ نے اپنے سواروں کو ایک عام حملے کا حکم دیا اور افغان فوج کی اگلی تین صفیں درہم برہم کردیں۔ پانی پت کا معرکہ اب پوری شدت کے ساتھ شروع ہو چکا تھا۔ گرد و غبار کے بادلوں میں گھوڑوں کی ٹاپ، توپوں کی دھنا دھن، بندوقوں کے دھماکوں، تلواروں کی جھنکار اور زخمیوں کی چیخ پکار کے ساتھ ایک طرف سے "اللہ اکبر" اور دوسری طرف سے "ہر ہر مہادیو" کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ شاہ ولی خاں نے

افغانوں کو پیچھے ہٹتے دیکھا تو گھوڑے سے اتر کر پوری قوت سے چلّایا "میرے رفیقو! تم کہاں جا رہے ہو؟ ہمارا وطن بہت دُور ہے"۔ لیکن اس کی آواز جنگ کے مہیب ہنگاموں میں گم ہو کر رہ گئی۔ جنگ کے ابتدائی دور میں مرہٹوں کا پانسہ بھاری معلوم ہوتا تھا۔ افغانوں کے میمنہ اور قلب لشکر میں افراتفری پھیل چکی تھی لیکن میسرہ کی افواج ابھی تک پوری طرح منظم تھیں۔ نجیب الدولہ جوابی حملہ کر چکا تھا اور اس کے ساتھ حافظ رحمت خاں اور دوسرے روہیلہ سرداروں کی افواج پوری شدت کے ساتھ مرہٹوں پر دباؤ ڈال رہی تھیں۔ نجیب الدولہ کے پیادہ سپاہی دشمن کی صفوں پر ہوائیاں اور گولے پھینکتے اور جب دشمن پیچھے ہٹتا تو نیزہ باز ٹوٹ پڑتے۔ معظم علی کی کمان میں ایک ہزار روہیلہ سوار تھے اور ان میں سے اکثر اکبر خاں کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس نے مرہٹہ لشکر کے میمنہ پر حملہ کیا اور چند منٹ کے اندر اندر جنکوجی سندھیا کی فوج کی کئی صفیں الٹ کر رکھ دیں۔ اس کے بعد دوسرے روہیلہ سردار اور نجیب الدولہ کے چند دستے اس کے ساتھ جا ملے اور انھوں نے مل کر پے در پے حملے کر کے دشمن کو پیچھے ہٹانا شروع کر دیا۔

سورج نصف النہار پر پہنچ چکا تھا لیکن لڑنے والوں کو گرد و غبار کے بادلوں میں اس کے صرف دھندلے سے آثار نظر آتے تھے۔ جنگ اب اس مرحلے میں داخل ہو چکی تھی کہ جب ہر وقت فریقین میں سے کسی ایک کے میدان چھوڑ کر بھاگ نکلنے کا امکان تھا۔ اس ہنگامۂ محشر میں جس شخص کے چہرے پر اضطراب، گھبراہٹ یا پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے وہ احمد شاہ ابدالی تھا۔ اس کی پیشانی پر اپنے سپاہیوں کے لیے فتح کی بشارت لکھی ہوئی تھی۔ مرہٹے اپنی ساری قوت میدان میں لا چکے تھے لیکن احمد شاہ ابدالی کے ترکش میں ایک آخری تیر ابھی باقی تھا۔ دوپہر کے وقت اس نے اپنی محفوظ فوج کے ان چودہ ہزار سواروں کو میدان میں آنے کا حکم دیا، جنھیں جنگ شروع ہونے سے قبل میدان سے پیچھے ہٹا دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہر محاذ سے

اپنے جرنیلوں کو فیصلہ کن حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اب گرد و غبار کی یہ حالت تھی کہ زمین اور آسمان میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ ابدالی کے محفوظ دستے اس کے لشکر کے عقب سے ایک آندھی کی طرح نمودار ہوئے اور دشمن کے میمنہ اور میسرہ کی صفیں چیرتے ہوئے اس کے عقب میں جا پہنچے۔ تازہ دم فوج کے میدان میں آجانے سے محفوظ فوج کے دستے دشمن کی صفیں روندتے ہوئے کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف نکل جاتے تھے۔ سوا دو بجے کے قریب لشواش راؤ گولی لگنے سے زخمی ہو گیا۔ بھاؤ نے دل برداشتہ ہو کر آخری بار پوری شدت کے ساتھ حملہ کیا اور بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ سپہ سالار کی موت سے مرہٹوں کے حوصلے پست ہو گئے اور شام کے چار بجے کے قریب یکایک ان کی ساری فوج میدان سے بھاگ نکلی۔ فاتح فوج نے ان کا پیچھا کیا اور مرہٹہ کیمپ کی خندق لاشوں سے بھر دی۔ آفتاب کی واپسیں نگاہیں کوسوں دور تک مرہٹوں کی تباہی کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ ابدالی کا لشکر چاندنی رات میں طلوعِ سحر تک مرہٹوں کا تعاقب کرتا رہا۔ اگلی صبح کیمپ میں پناہ لینے والے بچے کھچے دستوں پر بھی یلغار کی گئی۔ لشواش راؤ زخمی ہونے کے چند گھنٹے بعد مر چکا تھا۔ میدان سے بھاگنے والی مرہٹہ فوج کا تعاقب کرنے والے صرف افغان، روہیلے بلوچ اور مغل ہی نہ تھے بلکہ قرب و جوار کے وہ دیہاتی جن پر مرہٹوں نے پانی پت میں قیام کے دوران میں ان گنت مظالم کیے تھے۔ تلواروں، برچھیوں اور لاٹھیوں سے مسلح ہو کر جگہ جگہ انھیں موت کے گھاٹ اتار رہے تھے۔ مرہٹوں سے عوام کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ دیہات کی عورتیں ان کا پیچھا کر رہی تھیں۔ مرہٹہ کیمپ کا مالِ غنیمت کسی بڑی سلطنت کے خزانوں سے کم نہ تھا۔ جواہرات، سونے اور چاندی کے علاوہ ہزاروں بیل گاڑیاں، کوئی دو لاکھ مویشی، ہزاروں گھوڑے اور اونٹ اور پانچ سو ہاتھی افغانوں کے ہاتھ لگے۔

مرہٹہ فوج کے بیشتر سردار جنگ میں کام آ چکے تھے۔ اگلے دن مرہٹوں کے

تعاقب سے واپس آنے والے جرنیل اور بڑے بڑے افسر احمد شاہ ابدالی کے سامنے باری باری اپنی کارگزاری کی تفصیلات بیان کر رہے تھے۔ دوپہر تک قریباً تمام فوج کیمپ میں جمع ہو چکی تھی لیکن معظم علی اور اس کی کمان کے چند دستے لاپتہ تھے۔ اکبر خاں اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے اسے رات کے پچھلے پہر ہلکر کے ساتھ فرار ہونے والے سپاہیوں کا تعاقب کرتے دیکھا تھا۔ غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے جب اکبر خاں اس کی تلاش میں کیمپ کے اندر کئی چکر لگا چکا تھا اور نجیب الدولہ، حافظ رحمت خاں اور دوسرے روہیلہ سردار اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہے، ایک روہیلہ سپاہی نے جنوب مشرق کے افق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ "شاید وہ آرہے ہیں!"

اکبر خاں نے چونک کر دیکھا اور اسے دور حدِ نگاہ پر چند شتر سوار دکھائی دیئے اس نے مضطرب ہو کر کہا۔ "لیکن وہ گھوڑوں پر تھے، یہ کوئی اور ہیں۔"

نجیب الدولہ نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا تمھیں مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ معظم علی ضرور آئے گا۔" اور اکبر خاں اپنے دل میں کہہ رہا تھا: انھیں ضرور آنا چاہیئے۔ ہماری یہ شاندار فتح ان کے لیے تھی۔ ہماری اس کامیابی پر ان سے زیادہ خوش ہونے کا حق نہیں۔" پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "تم تیر [illegible] ہم ان کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ کسی جگہ دشمن کے گھیرے میں پھنسے ہیں۔"

نجیب الدولہ نے کہا۔ "دشمن میں اب لڑنے کی ہمت نہیں اور اس وقت کسی گھوڑے میں سوار کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں رہی۔"

"ہم پیدل جائیں گے۔" اکبر خاں نے کہا۔

نجیب الدولہ نے جواب دیا۔ "اپنے ساتھیوں کو تھوڑی دیر آرام کرنے دو۔ اگر معظم علی شام تک نہ آیا تو ہم چند دستے اس کی تلاش میں بھیج دیں گے۔"

تھکاوٹ کے باعث اکبر خاں کے اعضا شل ہو چکے تھے۔ وہ کچھ اور کہے بغیر زمین پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد شتر سوار کیمپ میں داخل ہو چکے تھے۔ ایک نوجوان بھاگتا ہوا آیا اور اس نے بلند آواز میں کہا۔ "اکبر! اکبر! معظم علی آگئے!"

"کہاں ہیں وہ؟" اکبر خاں نے جلدی سے اٹھ کر سوال کیا۔

نوجوان نے اس کے جواب میں شتر سواروں کی طرف اشارہ کر دیا۔ اکبر خاں بھاگ کر آگے بڑھا۔ معظم علی ایک اونٹ پر سوار تھا۔ اس کا چہرہ گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ اس کی قبا خون سے رنگی ہوئی تھی۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی اور آنکھیں بند تھیں۔ اس نے ڈھیلے ہاتھ سے اونٹ کی نکیل پکڑ رکھی تھی۔

"بھائی جان بھائی!" اکبر خاں نے اس کے ہاتھ سے اونٹ کی نکیل پکڑتے ہوئے پوچھا۔ "آپ ٹھیک ہیں نا، آپ زخمی تو نہیں؟"

معظم علی نے نیم بیہوشی کی حالت میں آنکھیں اوپر اٹھائیں اور تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

اکبر خاں نے نکیل کھینچ کر اس کا اونٹ بٹھا دیا اور معظم علی نیچے اتر پڑا۔ اکبر خاں کو اس کی آستین پر تازہ خون کے نشان دکھائی دیئے۔ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "بھائی جان آپ زخمی ہیں۔"

معظم علی مسکرایا۔ "یہ معمولی خراش ہے۔"

"معظم علی! معظم علی! تم کہاں تھے؟" نجیب الدولہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"میں بہت دور نکل گیا تھا۔" معظم علی نے یہ کہہ کر لڑکھڑاتے ہوئے نجیب الدولہ کی طرف چند قدم اٹھائے لیکن اچانک اس کی طاقت جواب دے گئی اور وہ زمین پر گر پڑا۔

اکبر، نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں نے بیک وقت آگے بڑھ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ ایک سپاہی نے پانی کی چھاگل اتار کر اس کے منہ سے لگا دی۔ معظم علی نے پانی کے چند گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد کہا:

"آپ لوگوں کو مطلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ مجھے تھوڑی دیر آرام کی ضرورت ہے۔"

حافظ رحمت خاں نے اس کی آستین پھاڑ کر بازو کا زخم دیکھتے ہوئے کہا۔ "زخم معمولی ہے، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

ایک سپاہی نے اپنا پٹکا پھاڑ کر بازو باندھ دیا اور وہ دوبارہ زمین پر لیٹ گیا۔

نجیب الدولہ نے کہا۔ "اسے اٹھا کر میرے خیمے میں لے جاؤ۔"

"نہیں" معظم علی نے نحیف آواز میں جواب دیا۔ "مجھے تھوڑی دیر یہیں رہنے دیجیے۔"

چند ثانیے بعد معظم علی گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے ساتھی بھی اب اونٹوں سے اتر کر اس کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ ایک نوجوان نجیب الدولہ کو بتا رہا تھا۔ "ہم نے چالیس میل تک دشمن کا پیچھا کیا تھا۔ ہمارے گھوڑے دم توڑ چکے تھے تو ہم پیدل ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ یہ اونٹ ہم نے مرہٹوں سے چھینے تھے اور ہمارے پچاس اور ساتھی پیدل واپس آ رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد احمد شاہ ابدالی اپنے چند جرنیلوں کے ساتھ پڑاؤ میں گشت کرتا ہوا اِدھر آنکلا۔ "یہ کون ہے؟" اس نے معظم علی کے قریب پہنچ کر سوال کیا۔

نجیب الدولہ نے جواب دیا۔ "عالیجاہ! یہ معظم علی خاں ہے اور یہ ابھی مرہٹوں کے تعاقب سے واپس آیا ہے۔"

"اس کے زخم زیادہ خطرناک تو نہیں؟"

"نہیں عالیجاہ! یہ بہت تھک گیا ہے۔"

شاہ ولی خاں نے کہا۔ "میں اسے میدان میں کئی بار دیکھ چکا ہوں اور اگر یہ اب تک دشمن کا پیچھا کر رہا تھا تو اس کا زندہ رہنا معجزہ ہے۔"

ابدالی نے کہا۔ "یہاں سردی ہے اسے خیمے کے اندر لے جاؤ۔"

اکبر خاں نے معظم علی کا بازو پکڑ کر ہلایا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ اپنے سامنے ابدالی کو دیکھ کر اٹھا اور باادب کھڑا ہو گیا۔

ابدالی نے اس کے خون آلود کپڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اب جنگ ختم ہو چکی ہے اور تمھیں اس سے بہتر لباس کی ضرورت ہے۔" پھر اس نے اپنے ایک افسر کی طرف دیکھا اور کہا۔ "جاؤ اسے میرا لباس لا دو!"

چند دن بعد احمد شاہ ابدالی کی افواج دلّی کا رخ کر رہی تھیں۔ پانی پت کی شکست مرہٹہ تاریخ کی ایک مکمل شکست تھی۔ ہُلکر، داماجی گیکواڑ، نارو شنکر، مہادیوجی سندھیا اور نانا فرنویس کے سوا تمام بڑے بڑے مرہٹہ سردار مارے جا چکے تھے۔ ابراہیم گاردی جسے مسلمانوں کا بدترین غدار سمجھا جاتا تھا، گرفتار ہونے کے بعد قتل کیا گیا۔ شمشیر بہادر اور اناجی منگیشور، جو زخمی ہو کر بھاگ گئے تھے۔ راستے میں مر گئے۔ مرہٹوں کی عظیم فوج میں سے صرف ایک چوتھائی سپاہی ایسے تھے جنھیں دوبارہ اپنا وطن دیکھنا نصیب ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کو بھی اس فتح کے لیے بھاری قیمت ادا کرنی پڑی لیکن وہ عظیم مقصد جس کے لیے یہ جنگ لڑی گئی تھی، پورا ہو چکا تھا۔ شمالی ہندوستان میں پاؤں پھیلانے کے متعلق مرہٹوں کے عزائم ہمیشہ کے لیے خاک میں مل چکے تھے۔

چودھواں باب

چند دن بعد افغان افواج دلی کے باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں اور شہر میں پانی پت کی فتح کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ جمعہ کے روز جامع مسجد میں عید کا سا سماں تھا۔ اہلِ شہر کے علاوہ فوج کے افسر اور سپاہی مسجد کے اندر اور مسجد کی چار دیواری سے باہر کھلے میدان میں جمع تھے۔ نماز کے بعد احمد شاہ ابدالی کی عزت، اقبال اور درازیٔ عمر کے لیے دعا کی جا رہی تھی۔ دعا کے اختتام پر جب نمازی اٹھنے لگے تو خطیب نے بلند آواز میں کہا۔ "حضرات تھوڑی دیر ٹھہر جائیے، پانی پت کا ایک مجاہد آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔" نمازی ہمہ تن گوش ہو کر منبر کی طرف دیکھنے لگے۔ معظم علی اٹھ کر منبر کے قریب پہنچا اور اس نے بلند آواز میں کہا،

"عزیزو اور بزرگو! پانی پت کی فتح بلا شبہ ہماری تاریخ کا شاندار کارنامہ ہے۔ ہمارے بعد آنے والی نسلیں یقیناً احمد شاہ ابدالی کو اپنا محسنِ عظیم خیال کریں گی۔ انھوں نے ہمیں اس وقت سہارا دیا ہے جب ہم تباہی کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے ہمیں اس دشمن سے نجات دلائی ہے جو ہمیں بدترین غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتا تھا۔ ہم ان کے احسانات کا بدلہ نہیں دے سکتے لیکن اس وقت ہماری دعاؤں کے سب سے زیادہ مستحق پانی پت کے وہ شہداء ہیں جنھوں نے ہماری عزت، ہماری آزادی اور ہماری بقا کے لیے اپنا خون پیش کیا ہے۔ آج ان گمنام شہیدوں کی روحیں ہم سے یہ مطالبہ نہیں کرتیں کہ ہم

پانی پت کے میدان میں جا کر ان کی قبروں پر چراغ جلائیں۔ ان کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ ہم کسی وقت بھی اس مقصد سے انحراف نہ کریں جس کے لیے وہ اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں۔ پانی پت کے شہیدوں نے ہمیں اس ملک میں عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنے کا ایک اور موقع دیا ہے اور اگر ہم نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ قدرت کسی گرتی ہوئی قوم کو بار بار سنبھالا نہیں دیتی۔

ہمارے عظیم محسن احمد شاہ ابدالی نے ہمیں اس وقت ایک نئی زندگی کا پیغام دیا ہے جب کہ ہمارے دروازے پر موت کا پہرہ تھا۔ انھوں نے ایک منتشر، مفلوک الحال اور مایوس قافلے کو اٹھا کر پھر زندگی کی شاہراہ پر ڈال دیا ہے۔ اب یہ سوچنا ہمارا کام ہے کہ ہماری اگلی منزل کیا ہے۔ ہماری ماضی کی وہ کون سی کوتاہیاں تھیں جن کے باعث مرہٹوں کی بربریت اور وحشت کا طوفان اٹک تک پہنچ چکا تھا اور ہم سے ہمارے حال اور ہمارے مستقبل کے مطالبات کیا ہیں؟

احمد شاہ ابدالی اپنے حصے کا کام پورا کر چکے ہیں لیکن ہمارے حصے کا کام ابھی باقی ہے۔ پانی پت کی جنگ میں مرہٹوں کی کمر ٹوٹ چکی ہے لیکن ہمیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ اگر ہم نے اپنی کمزوریوں کا علاج نہ کیا تو ممکن ہے کہ چند برس کے اندر اندر ہمیں مرہٹوں سے زیادہ خطرناک دشمنوں کا سامنا کرنا پڑے۔ بنگال میں ہماری آزادی کے پرچم سرنگوں ہو چکے ہیں۔ کرناٹک فرنگیوں کی شکارگاہ بن چکا ہے اور ان کی سازشیں دکن تک پہنچ چکی ہیں۔ پنجاب میں سکھوں کی طاقت ابھر رہی ہے اور اگر ہم نے آنکھیں نہ کھولیں تو یہ بعید نہیں کہ ہمارے لیے اس ملک کی زمین تنگ ہو جائے جس پر ہم نے صدیوں حکومت کی ہے۔

حضرات! احمد شاہ ابدالی نے ہمیں ایک خطرۂ عظیم سے نجات دلائی ہے لیکن وہ ہمیشہ کے لیے اس گھر کی حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکتے جس کے مکینوں نے چوروں اور ڈاکوؤں کو اپنا محافظ سمجھ رکھا ہو۔ ہماری بےبسی اور مظلومیت کا باعث وہ مفاد پرست

امراء ہیں جنھوں نے قوم کے مستقبل سے بے پروا ہو کر دلی کی عظیم سلطنت کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ ہماری مایوسی اور بددلی کا باعث وہ محلاتی سیاست ہے جو ہر ضابطۂ اخلاق سے آزاد ہو چکی ہے۔ بنگال میں مٹھی بھر انگریزوں سے ہماری شکست کا باعث وہ وطن فروش تھے۔ جنھوں نے قوم کا ساتھ چھوڑ کر اپنا مستقبل انگریزوں کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا اور اگر آپ نے بنگال کے واقعات سے سبق نہ لیا اور اسی طرح انتشار اور لامرکزیت کی لعنتوں میں مبتلا رہے تو بنگال کی تاریخ اس ملک کے ہر حصے میں دہرائی جائے گی۔ کسی قوم کے لیے اس سے بڑا عذاب اور کیا ہو سکتا ہے کہ ملت فروش اس کی عزت اور آزادی کے امین بن جائیں اور حریص طالع آزما اقتدار کی مسندوں پر متمکن ہو جائیں۔ گذشتہ نصف صدی کے واقعات سے ہم پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ یہ دنیا کسی کمزور قوم کو عزت اور آزادی کے ساتھ زندہ رہنے کا حق نہیں دیتی جو ملک انتشار اور لامرکزیت کا شکار ہوتا ہے وہ لامحالہ انسانی بھیڑیوں کی شکارگاہ بن جاتا ہے۔

آج اس مسجد میں وہ لوگ موجود ہیں جن کی حقیقت پسندی ہمیں مستقبل کے خطرات سے بچا سکتی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ملک کے باشعور لوگ ان جاہ پسندوں کے خلاف عوام کی قوت محاسبہ بیدار کریں جن کی چیرہ دستیوں کے باعث ہماری قوت مدافعت اس قدر کمزور ہو چکی ہے کہ ہم اپنے حقیر ترین دشمنوں کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پانی پت کی جنگ اس لیے نہیں لڑی گئی ہے کہ ہمارے حکمران مرہٹوں کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنی مسندوں پر سو جائیں یا انھیں کچھ عرصہ اور عیش و عشرت کی محفلیں آراستہ کرنے کا موقع مل جائے۔ پانی پت کی جنگ اس لیے لڑی گئی ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں کو عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنے کا ایک اور موقع دیا جائے۔ میں اس ملک کی حکومت کے دعوے داروں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ ماضی سے سبق سیکھیں اور ان غلطیوں کا

اعادہ نہ کریں جن کے باعث بنگال میں ہم ایک عبرتناک تباہی کا سامنا کر چکے ہیں اور میں عوام سے بھی یہ درخواست کروں گا کہ وہ اپنے گردوپیش سے خبردار رہیں اور جب انھیں کوئی بیرونی حملہ آور للکار رہا ہو تو وہ میدان میں آنے سے پہلے یہ تسلی کر لیں کہ ان کی صفوں میں کوئی میر جعفر تو نہیں ہے!

حضرات! مجھے تقریر کرنے کا شوق نہ تھا۔ میں صرف ایک سپاہی ہوں۔ میں نے بنگال کی آزادی کے لیے اپنی جان کی بازی لگائی تھی۔ میرا باپ، میرا بھائی اور میرے بہترین دوست بنگال پر قربان ہو چکے ہیں لیکن یہ بے لوث قربانیاں صرف اس لیے بے نتیجہ ثابت ہوئیں کہ بنگال کے عوام اس قدر بیدار نہ تھے کہ وہ محبان قوم اور وطن فروشوں کے درمیان تمیز کر سکتے۔ میں نے شہرت اور ناموری کے لیے پانی پت کی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا بلکہ میرے دل میں اگر کوئی تڑپ تھی تو یہ تھی کہ ان بھیانک تاریکیوں کو آپ کے گھروں سے دور رکھا جائے جو بنگال کے مسلمانوں پر مسلط ہو چکی ہیں اور آج میں نے آپ کے سامنے زبان کھولنے کی صرف اس لیے جرأت کی ہے کہ میں آپ کو ان خطرات سے خبردار کرنا چاہتا ہوں جو حال اور مستقبل سے آنکھیں بند کر لینے کی صورت میں آپ کو پیش آ سکتے ہیں۔

اختتام پر میں یہ دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو پانی پت کی فتح سے اپنے لیے اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے صحیح نتائج پیدا کرنے کی جرأت، ہمت اور طاقت دے۔ خدا ہمارے امراء اور حکمرانوں کو بھی یہ توفیق دے کہ وہ قوم کے لیے زندہ رہنا سیکھیں۔"

معظم علی کی تقریر کے اختتام پر جب لوگ مسجد سے باہر نکل رہے تھے تو ایک افغان افسر نے اس سے کہا: "حضور بادشاہ سلامت آپ کو بلاتے ہیں!"

احمد شاہ ابدالی منبر سے تھوڑی دور دلی کے اکابر اور اپنے سرداروں کے درمیان کھڑے تھے۔ معظم علی ان کے قریب پہنچا تو انھوں نے کہا: "میں ایک مدت سے اس

ملک کے کسی آدمی کے منہ سے ایسی باتیں سننے کا منتظر تھا۔ اگر ہندوستان کے ہر علاقے میں تمہارے جیسے صحیح الخیال لوگ جاگ اٹھیں تو مجھے یقین ہے کہ یہ قوم تباہی سے بچ سکتی ہے۔" پھر انھوں نے ایک ثانیہ کے لیے شجاع الدولہ کی طرف دیکھا اور دوبارہ معظم علی کی طرف متوجہ ہوکر کہا۔ "لیکن اگر تم کسی مرحلہ پر یہ محسوس کرو کہ اس ملک میں تمہاری خدمات کی ضرورت نہیں تو سیدھے میرے پاس پہنچ جاؤ۔ وہاں ایسے لوگ موجود ہیں جو حق گوئی کی قدر کرنا جانتے ہیں۔"



اگلے دن معظم علی ظہر کی نماز ادا کر کے جامع مسجد سے نکل رہا تھا کہ اسے نجیب الدولہ کی فوج کا ایک سپاہی دکھائی دیا۔

"آپ کو امیر الامراء نے یاد فرمایا ہے!" سپاہی نے آگے بڑھ کر ادب سے سلام کرتے ہوئے کہا۔

"وہ کہاں ہیں؟"

"وہ اس وقت فوج کے پڑاؤ میں ہیں۔ چلیے!"

تھوڑی دیر بعد معظم علی پڑاؤ کے ایک عالیشان خیمے کے اندر نجیب الدولہ کے سامنے کھڑا تھا۔ نجیب الدولہ نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "کل مسجد میں تمہارے منہ سے میرے دل کی آواز نکل رہی تھی لیکن شجاع الدولہ تمہاری تقریر سے بہت پریشان ہیں۔ وہ صبح مجھ سے ملے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ تم نے جو کچھ کہا ہے وہ سب ان کے متعلق تھا۔ وہ مجھ سے کہتے تھے کہ یہ نوجوان لکھنؤ پہنچ کر میرے لیے سردردی کا باعث بنے گا۔ وہ اس سے پہلے بھی تم پر زیادہ خوش نہ تھے لیکن کل تمہاری تقریر نے انھیں بہت زیادہ پریشان کردیا ہے۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ میں نے کوئی غلط بات نہیں کہی۔"

"میں تمہاری حق گوئی کا معترف ہوں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ شجاع الدولہ کو ناراض

کر کے تمہارا لکھنؤ ٹھہرنا مشکل ہو جائے گا۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "لکھنؤ میرے سفر کی آخری منزل نہیں اور جب مجھے اس بات کا احساس ہوگا کہ وہاں رہ کر میری زبان میرے ضمیر کا ساتھ نہیں دے سکتی تو میں اپنے لیے کوئی اور جگہ تلاش کرنے میں تکلیف محسوس نہیں کروں گا۔"

نجیب الدولہ نے چند ثانیے سوچنے کے بعد کہا۔ "میں نے شجاع الدولہ کو سمجھا دیا ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ تم کو پریشان نہیں کرے گا لیکن اگر کسی وقت تم کو لکھنؤ کی آب و ہوا راس نہ آئے تو تمہارے لیے دلی کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں۔ اگر اس وقت بھی تم پسند کرو تو میں تم کو فوج میں بہترین عہدہ دینے کے لیے تیار ہوں۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "ابھی دلی کے حالات اس قابل نہیں کہ میرے دل میں ملازمت کا شوق پیدا ہوا۔ جس دن مجھے اس بات کا احساس ہوگا کہ میں یہاں آکر کوئی مفید کام کرسکتا ہوں تو آپ مجھے ایک رضاکار کی حیثیت میں یہاں موجود پائیں گے۔ مجھے معلوم نہیں کہ احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد دلی کے حالات کیا ہوں گے۔ مجھے آپ کے تدبر اور فراست پر اعتماد ہے لیکن جب تک دلی کے تخت پر کوئی اولوالعزم حکمران نہیں بیٹھتا میرے نزدیک دلی اور لکھنؤ میں کوئی فرق نہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ایسی عظیم الشان فتح کے بعد اس ملک کے اکابر قوم کا مستقبل کسی ایسے حکمران کو نہیں سونپ سکے جس کی سیرت اور کردار رعایا کی آزادی اور بقا کی ضمانت دے سکتا ہو۔ میں یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ قابلیت کے بغیر کوئی شخص اپنے سر پر تاج پہننے کا پیدائشی حق رکھتا ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں ہم اپنے نام نہاد حکمرانوں کی نااہلیت کے باعث بہت کچھ کھو چکے ہیں۔ قدرت نے ہمیں زندہ رہنے کا ایک اور موقع دیا ہے لیکن کاش ہمارا وہ محسن جس نے ہمیں مرہٹوں کی جارحیت سے نجات دلائی ہے ہمیں یہ مژدہ بھی سنا سکتا کہ دلی کے تخت کے لیے ایک انسان کی ضرورت ہے اور اس ملک

کے امراء کا یہ فرض ہے کہ اپنے میں سے بہترین آدمی کو قوم کی سیادت سونپ دیں۔ خدا کرے دلّی کی حکومت کے نئے دعویدار سے آپ کی توقعات درست ثابت ہوں لیکن مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں کہ وہ صحیح معنوں میں حکمران ثابت ہوگا یا صرف یہاں کے بادشاہ گروں کے ہاتھ میں ایک نیا کھلونا ہوگا۔"

"تم جانتے ہو کہ میں اس معاملے میں تمھارا ہم خیال تھا لیکن مغل امراء کا یہ مطالبہ تھا کہ دلّی کے تخت پر کسی جائز وارث کو بٹھایا جائے۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "میرے نزدیک صرف وہ بات جائز ہوتی ہے جو صحیح بھی ہو۔ شاہ عالم کے متعلق میں اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ وہ دلّی کی سازشوں سے خوفزدہ ہو کر کہیں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور جن امراء نے اسے تخت پر بٹھانے کے لیے بہت زیادہ زور دیا ہے، وہ صرف اس بات پر خوش ہیں کہ وہ اپنے مقتول باپ سے زیادہ کمزور ثابت ہوگا۔ میرے لیے اگر کوئی بات اطمینان بخش ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ آپ دلّی میں احمد شاہ ابدالی کے نمائندے ہوں گے اور میں یہ دعا کرتا ہوں کہ نیا شہنشاہ کسی دن آپ سے منہ پھیر کر ان لوگوں کے ہاتھوں کا کھلونا نہ بن جائے جو اس سے پیشتر کئی کھلونے توڑ چکے ہیں۔"

"تمھیں اس بات کا یقین ہے کہ شاہ عالم ایک ناکام حکمران ثابت ہوگا؟"

"میں اس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ وہ ایک کمزور آدمی ہے اور اس کی بادشاہت ہمیشہ دوسروں کے رحم و کرم پر ہوگی۔ مجھے جلاوطنی کی حالت میں اس کی بے بسی کا احساس ہے لیکن مجھے یہ بھی اندیشہ ہے کہ تخت پر بیٹھ کر شاید وہ زیادہ بے بس ثابت ہوگا۔"

نجیب الدولہ نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "تم کب واپس جا رہے ہو؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "میں صرف اس امید پر ٹھہر گیا تھا کہ شاید احمد شاہ ابدالی واپس جانے کا خیال ترک کر دیں اور جنوب کی طرف پیش قدمی کریں۔ میں انھیں مہاراشٹر کے

میدانوں میں دیکھنا چاہتا تھا لیکن اب میں دو تین دن تک یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔"

نجیب الدولہ نے کہا۔ "یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ واپس جا رہے ہیں۔ اگر افغان سردار مخالفت نہ کرتے تو شاید اس وقت تک ہمارے گھوڑے دریائے نربدا کا پانی پی رہے ہوتے لیکن میں تمھیں پھر ایک بار یہ مشورہ دوں گا کہ تم لکھنؤ جا کر محتاط رہو۔ شجاع الدولہ ایک منتقم المزاج آدمی ہے۔ اگر اس کے دماغ میں یہ بات سما گئی کہ تم اسے پسند نہیں کرتے تو وہ تم سے نجات حاصل کرنے کے ہزاروں بہانے تلاش کرے گا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اسے اپنا دشمن بنانے کی بجائے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے کہ تمھارے خیالات سے متاثر ہو کر وہ قوم کی بھلائی کا کوئی کام کر سکے۔"

معظم علی مسکرایا۔ "قوم کی بھلائی کے لیے میں ایک حقیر ترین انسان کے پاؤں پر سر رکھنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔"

"اور تمھیں شاہ عالم کے متعلق اپنے خیالات کے اظہار میں بھی محتاط رہنا چاہیے۔ نواب شجاع الدولہ اور ان کے ہم خیال امراء ان کے بہت زیادہ طرف دار ہیں۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "میں جانتا ہوں کہ یہ لوگ انھیں ایک کارآمد کھلونا سمجھتے ہیں۔"

معظم علی نجیب الدولہ سے ملاقات کے بعد پڑاؤ میں اپنے خیمے کے قریب پہنچا تو اکبر خاں باہر دھوپ میں بیٹھا ایک نوجوان سے باتیں کر رہا تھا۔ معظم علی کو دیکھتے ہی اکبر خاں نے اٹھ کر کہا۔ "بھائی جان یہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں!"

معظم علی اجنبی کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد چٹائی پر بیٹھ گیا۔

اجنبی نے کہا۔ "میرا نام اسد خاں ہے۔ میں میسور سے حیدر علی کا ایک خاص پیغام لے کر احمد شاہ ابدالی کے پاس آیا تھا۔ کل مسجد میں میں نے آپ کی تقریر سنی تو میرے دل میں آپ سے متعارف ہونے کا شوق پیدا ہوا۔"

"آپ احمد شاہ ابدالی سے مل چکے ہیں؟"

جی ہاں! اور دو تین دن تک میں واپس جارہا ہوں۔ کل آپ کی تقریر سننے کے بعد میں نے فوج کے ایک سپاہی سے آپ کے متعلق کچھ معلومات حاصل کی تھیں میں نے یہ ضروری خیال کیا کہ آپ کو کسی دن میسور آنے کی دعوت دوں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق آپ جو خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ انشاءاللہ میسور میں پورے ہوں گے۔ حیدر علی اس دور کی ایک بہت بڑی شخصیت ہے۔ وہ جنوبی ہندوستان کو ایک طرف مرہٹوں کی چیرہ دستیوں سے اور دوسری طرف انگریزوں کی ہوس ملک گیری سے نجات دلانا چاہتا ہے اور اس نے میسور کے دروازے ہر صحیح الخیال مسلمان کے لیے کھول دیئے ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب آپ اس کے متعلق یہ سنیں گے کہ جنوبی ہندوستان کے مسلمان اسے اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ میری اپنی سرگزشت یہ ہے کہ میں کرناٹک کی فوج میں ملازم تھا اور محمد علی والا جاہ کی فوج کے افسروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس ملک کا بدترین دشمن سمجھتا تھا۔ جب انگریزوں نے نواب سراج الدولہ کے ساتھ جنگ شروع کی تھی تو محمد علی نے مدراس کے گورنر کی خواہش پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی مدد کے لیے چند دستے کلکتہ بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے ان دستوں کی کمان کے لیے منتخب کیا گیا تھا لیکن میں نے انکار کردیا۔ اس پر مجھے بغاوت کے جرم میں پانچ سال قید کی سزا دی گئی لیکن چھ ماہ قید کاٹنے کے بعد مجھے فرار ہونے کا موقع مل گیا اور میں سیدھا سرنگاپٹم پہنچ گیا۔ حیدر علی کی سفارش سے مجھے میسور کی فوج میں ملازمت مل گئی۔ اس وقت مجھے یہ توقع نہ تھی کہ میسور کے راجہ کی فوج کا یہ نڈر سپاہی کسی دن جنوبی ہند کی آزادی کا سب سے بڑا محافظ بنے گا۔ اگر آپ کسی ایسے آدمی کی تلاش میں ہیں جو ہندوستان کے بے بس اور مایوس مسلمانوں کو صحیح راستہ دکھا سکے تو آپ کسی دن سرنگاپٹم ضرور آیئے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔ آپ کو ان کے سامنے جاکر یہ بتلانے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی کہ آپ کون ہیں۔ ان کی مردم شناس نگاہیں آپ کے چہرے

سے آپ کے دل کا حال معلوم کرلیں گی۔"

معظم علی نے جواب دیا: "میں حیدر علی کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں لیکن سردست میں سرنگاپٹم جانے کا وعدہ نہیں کرسکتا۔ ممکن ہے کہ کچھ عرصہ تک مجھے حیدرآباد جانا پڑے اور اگر موقع ملا تو شاید میسور بھی دیکھ سکوں۔ بہرحال مجھے آپ سے مل کر بہت مسرت ہوئی ہے۔"



ایک دوپہر فرحت اپنے دو ماہ کے بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی اور عابدہ اس کے قریب مصلے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔ صابر ہانپتا ہوا آیا اور اس نے کمرے کے اندر جھانکتے ہوئے کہا: "بی بی جی۔ بی بی جی! خاں صاحب آگئے ہیں۔"

فرحت کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور عابدہ الحمدللہ کہہ کر سجدے میں گر پڑی۔ چند ثانیے بعد سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ فرحت نے بچے کو بستر پر لٹا دیا۔ معظم علی "السلام علیکم" کہہ کر کمرے میں داخل ہوا اور فرحت اپنی نگاہوں میں ہزاروں دعائیں لیے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پھر یہ دعائیں آنسو بن کر اس کی آنکھوں میں چھلکنے لگیں اور اس نے کہا: "آپ کو فتح مبارک ہو!"

عابدہ سجدے سے سر اٹھا کر معظم علی کی طرف متوجہ ہوئی اور وہ اسے سلام کرکے بچے کے بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ عابدہ دعائیں دیتی ہوئی اٹھی اور اس نے بچے کو بستر سے اٹھا کر معظم علی کی گود میں رکھ دیا: "تمھیں سب سے پہلے اس کی طرف متوجہ ہونا چاہیے!" اس نے کہا۔

معظم علی نے شرماتے ہوئے سوال کیا: "چچی جان اس کا نام کیا رکھا ہے؟"

"بیٹا ہم ہر روز اسے ایک نئے نام سے پکارا کرتے ہیں۔ شیر علی مصر تھے کہ اس کا نام صدیق علی رکھ دیا جائے لیکن فرحت کہتی تھی کہ تمھارے آنے تک انتظار کرلیا جائے۔"

"صدیق علی اچھا نام ہے چچی جان! کیوں فرحت تمھارا کیا خیال ہے؟"

فرحت ابھی تک مسرت کے ساتویں آسمان پر پرواز کر رہی تھی۔ اس نے جواب دیا۔ "مجھے اس کے لیے ہر نام اچھا لگتا ہے۔"

عابدہ نے کہا: "بیٹا میں تمھارے لیے کھانا لاتی ہوں۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "نہیں چچی جان کھانا میں راستے میں کھا چکا ہوں، آپ تشریف رکھیں۔ فرحت تم بھی بیٹھ جاؤ۔"

ماں اور بیٹی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

عابدہ نے کہا۔ "بیٹا اکبر خاں ملا تھا؟"

"چچی جان اکبر خاں میرے ساتھ تھا۔ جنگ میں اس کی بہادری کے قصّے دور دور تک مشہور ہو چکے ہیں۔"

فرحت نے کہا۔ "پچھلے مہینے حیدر آباد سے شیخ فخرالدین کا خط آیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ آپ اکبر خاں کو ساتھ لے کر حیدر آباد ضرور آئیں۔"

معظم علی نے کہا۔ "اب چند مہینے میرا گھر سے نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ ممکن ہے کہ اگلے سال میں وہاں جاؤں لیکن آپ اور چچی جان میرے ساتھ ہوں گی۔"

عابدہ نے کہا۔ "بیٹا جب پانی پت میں تمھاری فتح کی خبر آئی تھی تو لکھنؤ میں چراغاں کیا گیا تھا۔ صابر کو اس بات پر اصرار تھا کہ سب سے زیادہ چراغ ہمارے مکان میں جلنے چاہئیں، جشن کی رات ہمارے مکان کا کوئی گوشہ چراغوں سے خالی نہ تھا۔ پھر شہر میں ایک رات چراغ جلائے گئے تھے لیکن صابر نے پوری سات راتیں چراغاں کیا۔ اب تم اطمینان سے ہمیں جنگ کے واقعات سناؤ۔"

معظم علی نے پانی پت کے واقعات بیان کرنے شروع کیے تو فرحت نے کہا: "آپ کی باتیں سننے کے لیے صابر ہم سب سے زیادہ بیقرار ہے۔ آپ ذرا اونچی آواز میں باتیں کریں مجھے یقین ہے کہ وہ دروازے کے پیچھے کھڑا ہے۔"

معظم علی مسکرایا۔ "صابر اندر آجاؤ۔"

صابر کمرے میں داخل ہوا اور نیچے قالین پر بیٹھ گیا۔ پھر معظم علی جنگ کے واقعات سنا رہا تھا اور صابر کے دل کی دھڑکنیں کبھی تیز اور کبھی سست ہو رہی تھیں۔ پانی پت کے آخری معرکے کی تفصیلات سننے کے بعد صابر اٹھ کر دبے پاؤں کمرے سے باہر نکلا اور بھاگتا ہوا صحن میں جا پہنچا۔ تھوڑی دیر بعد گھر کے نوکر اور محلے کے لوگ اس کے گرد جمع تھے اور وہ انھیں اپنی رنگ آمیزیوں کے ساتھ معظم علی اور اکبر خاں کے بہادرانہ کارنامے سنا رہا تھا۔



پانی پت کی جنگ کے بعد ہندوستان کے دوسرے شہروں کی طرح لکھنؤ کے مسلمان عوام میں بھی ایک نیا ولولہ بیدار ہو چکا تھا۔ شہر کی گلیوں اور بازاروں میں غریبوں کے جھونپڑوں سے لے کر امرا کے محلات تک ان بہادروں کی جوانمردی کی داستانیں زبان زدِ عام تھیں جو مرہٹوں کی عظیم ترین طاقت کو پامال کر چکے تھے۔ پانی پت کی فتح کے بعد لکھنؤ واپس آنے والے سپاہی اپنے ساتھ بیشمار اولوالعزم مجاہدوں کے کارناموں کی روح پرور داستانیں لائے تھے اور معظم علی، جسے لکھنؤ کے لوگ کچھ مدت قبل صرف ایک کامیاب اور خوشحال تاجر کی حیثیت سے جانتے تھے، اب ان کی نگاہوں میں ایک قومی ہیرو بن چکا تھا۔ گھر سے باہر نکلتا تو عوام اس کے راستے میں آنکھیں بچھاتے۔ اس کے ساتھ ہمکلام ہونے یا مصافحہ کرنے میں ایک خوشی محسوس کرتے۔ امیر لوگ اسے دعوت دینے پر اصرار کرتے۔ طبقۂ اعلیٰ کی خواتین اس کے گھر آکر فرحت کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنا اپنے لیے باعثِ عزت سمجھتیں۔ معظم علی ان رسمی ملاقاتوں اور دعوتوں سے اجتناب کرتا لیکن کبھی لوگوں کی گرمجوشی میں کوئی فرق نہ آتا۔ ہر محفل میں اس سے پانی پت کی جنگ کی تفصیلات سنانے کا مطالبہ کیا جاتا۔ بسا اوقات وہ اپنے عقیدت مندوں کو مختصر سا جواب دے کر ٹالنے

کی کوشش کرتا لیکن کبھی کبھی وہ اس انداز سے گفتگو کرتا کہ سننے والوں کی نگاہوں کے سامنے پانی پت کے میدان کی تمام تفصیلات آجاتیں ۔

ایک دن اودھ کی فوج کے ایک بڑے افسر نے اسے اپنے ہاں دعوت دی۔ شہر کے چیدہ چیدہ لوگ اور فوج کے کئی افسر اس دعوت میں شریک تھے۔ جب پانی پت کی جنگ کے متعلق گفتگو شروع ہوئی تو شہر کے ایک رئیس نے سوال کیا "جناب آپ کے خیال میں احمد شاہ ابدالی اور ان کی افواج کے بعد اس جنگ میں سب سے زیادہ حصہ کن لوگوں کا ہے ؟"

معظم علی نے جواب دیا "میں جنگ میں شریک ہونے والے ہر سپاہی کو اس فتح میں یکساں حصہ دار سمجھتا ہوں "

دوسرے آدمی نے سوال کیا "لیکن میں نے سنا ہے کہ آپ روہیلکھنڈ کے سپاہیوں کی بہت تعریف کرتے ہیں ؟"

معظم علی نے جواب دیا "روہیلکھنڈ کے جوانوں نے پانی پت کی جنگ میں حصہ لینے والے ہر سپاہی کو متاثر کیا ہے اور میں نے احمد شاہ ابدالی کو بھی یہ کہتے سنا ہے کہ کاش ہندوستان کے باقی امرار کے پاس بھی ایسے سپاہی ہوتے "

فوج کے ایک افسر نے کہا "معاف کیجیے ! روہیلوں کے ساتھ آپ کی محبت کی وجہ یہ تو نہیں کہ ان کے چند دستے آپ کی کمان میں تھے ؟"

معظم علی نے برہم ہو کر کہا "اگر میں اودھ کی فوج کا سپہ سالار ہوتا تو بھی آپ اسی طرح میرے منہ سے روہیلوں کی تعریف سنتے۔ میں نے پانی پت کے میدان میں جو کچھ دیکھا ہے ایک سپاہی کی نگاہ سے دیکھا ہے "

فوجی افسر نے پھر کہا "لیکن جناب میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک سپاہی کی نظر سے دیکھنے کے بعد آپ نے اودھ کی فوج کے متعلق کیا رائے قائم کی ہے ؟ کیا آپ کے خیال میں

روہیلہ سپاہی اودھ کے سپاہیوں سے بہتر ہیں ؟"

معظم علی نے جواب دیا "اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ روہیلہ سپاہیوں کی تعریف کرنے سے اودھ والوں کی توہین ہوتی ہے تو میں آپ سے گفتگو کرنا پسند نہیں کروں گا "افسر خاموش ہو گیا اور معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا "اگر آپ حضرات برا نہ مانیں تو میں یہ کہوں گا کہ روہیلکھنڈ کا ہر جوان اس جنگ کو اپنی بقا اور آزادی کی جنگ سمجھتا تھا لیکن وہاں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو اس جنگ کو صرف اپنے امرار کی جنگ سمجھتے تھے اور میں آپ سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ اس محفل میں مجھے ان امرار کا تذکرہ چھیڑنے پر مجبور نہ کریں جو آخری وقت اس کوشش میں تھے کہ مرہٹوں کے ساتھ صلح کر لی جائے اور وہ لڑے بغیر فتح کے نعرے لگاتے ہوئے اپنے گھروں کو واپس جائیں "

ایک امیرزادے نے کہا "لیکن آپ اس بات سے انکار نہیں سکتے کہ پانی پت کی فتح کے لیے ہمیں بہت بڑی قربانی دینی پڑی ہے اور احمد شاہ ابدالی کے ہزاروں سپاہیوں کے نقصان کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ افغان سرداروں نے دلی سے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا ہے، اگر نجیب الدولہ پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کے ساتھ قوت آزمائی پر مصر نہ ہوتے تو مرہٹوں سے آئندہ پرامن رہنے کا وعدہ لیا جا سکتا تھا اور ہماری متحدہ افواج ایک طرف کلکتہ اور دوسری طرف مدراس تک پیشقدمی کر کے اس ملک کو انگریزوں کی چیرہ دستیوں سے نجات دلا سکتی تھیں "

معظم علی نے جواب دیا "یہ اس ملک کی بدقسمتی ہے کہ بعض لوگ نیام سے تلوار نکالے بغیر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کے دشمن کا سر قلم ہو چکا ہے۔ مرہٹوں کو فیصلہ کن معرکے سے پہلے اپنی شکست کا یقین ہو چکا تھا لیکن اگر ہم یہ سمجھ لیتے کہ ہمیں لڑائی کے بغیر فتح حاصل ہو چکی ہے تو یہ ایک بدترین حماقت ہوتی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ مرہٹے کچھ عرصہ بعد زیادہ تیاریوں کے ساتھ شمال کا رخ کرتے اور ہمیں ان کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ

ہولناک جنگ لڑنا پڑتی۔ مرہٹوں کے ساتھ مصالحت کے حق میں ہمارے ملک کے وہ سیاست دان تھے جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ اپنے تدبّر اور ذہانت کے بل بوتے پر مرہٹوں کی جارحیت کو اپنی سرحدوں سے دور رکھ سکتے ہیں لیکن نجیب الدولہ ایک حقیقت پسند انسان ہیں، وہ جانتے تھے کہ مرہٹوں کو ایک فیصلہ کن جنگ ہی راہِ راست پر لا سکتی ہے۔ آپ میں سے کسی کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے کہ مرہٹے جو گذشتہ چند برس میں سینکڑوں شہر اور ہزاروں بستیاں تاخت و تاراج کر چکے ہیں، پانی پت کے میدان میں پہنچنے کے بعد اچانک جنگ سے متنفر ہو گئے تھے اور آپ کو اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے کہ اگر انھیں وہاں سے بچ نکلنے کا موقع دے دیا جاتا تو وہ واپس جاتے جاتے دلّی سے دکن تک راستے کی ہر بستی کو تباہی و بربادی کا پیغام نہ دیتے اور پھر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ سیدھے گھر جانے کی بجائے آگرہ اور لکھنؤ جیسے شہروں کو اپنے راستے کی منزلیں بنانے کی کوشش نہ کرتے! مجھے افسوس ہے کہ آپ میں سے بہت کم لوگوں کو اس سیلاب کا صحیح اندازہ ہے جو پونا سے نکل کر پانی پت تک پہنچ گیا تھا۔ آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے اس سیلاب کے راستے میں ایک عظیم پہاڑ کھڑا کر دیا ورنہ اس ملک کے جو امراء اپنی فراست اور تدبّر پر فخر کرتے ہیں ان میں یہ سکت نہ تھی کہ وہ اس طوفان کی معمولی لہروں کا بھی مقابلہ کر سکتے۔ احمد شاہ ابدالی نے ہمیں اس وقت سہارا دیا ہے جب ہم تباہی کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ اب اگر ہم انسانوں کی طرح زندہ رہنا سیکھیں اور ہمارے امراء انفرادی خودکشی کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے متحد اور منظم ہو کر اجتماعی بقا کے لیے جدوجہد کریں تو ہم کسی دقّت کا سامنا کیے بغیر اس ملک کو انگریزوں کی ہوسِ ملک گیری سے بچا سکتے ہیں۔

قوم کی موت و حیات کے مسائل سے ہماری قسمت کے ناخداؤں کی بے حسّی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ انگریز بنگال کی آزادی پر چھاپہ مارتے ہیں تو ان میں سے کسی کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ جو بے رحم ہاتھ بنگال کے حریت پسندوں کا گلا گھونٹ چکے ہیں وہ کسی دن ان کی شہ رگ تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ اگر جاٹ اور مرہٹے دلّی یا روہیلکھنڈ کے علاقوں میں تباہی مچاتے ہیں تو اودھ، دکن، لاہور یا ملتان کے صوبیدار یہ سمجھ لیتے ہیں کہ آگ ابھی تک ان کے اپنے گھر کی چار دیواری سے دور ہے۔ اسی طرح جب دکن یا اودھ پر کوئی مصیبت آتی ہے تو دوسروں کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ برسوں کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اس ملک کے چند امراء ایک اجتماعی خطرہ سے خوف زدہ ہو کر ایک جھنڈے تلے جمع ہوئے تھے اور اس اتحاد کے شاندار نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا خطرہ دور ہو چکا ہے۔ اب اگر ہم فرنگی تاجروں کو اس ملک سے نکال نہ سکے یا اگر ہم نے مرہٹوں کو دوبارہ ابھرنے کا موقع دیا تو ہماری اس ناکامی کا باعث ہمارے اکابر کی نااہلیت اور کوتاہی ہو گی۔

احمد شاہ ابدالی کے لیے ہر سانس کے ساتھ میرے دل سے ایک دعا نکلتی رہے گی۔ انھوں نے مجھے ایک باعزت اور باوقار قوم کے ایک فرد کی حیثیت سے زندہ رہنے کا موقع عطا کیا ہے لیکن اس احسانِ عظیم کے بعد میں ان سے یہ مطالبہ نہیں کروں گا کہ آیئے اب آپ ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر بھی پہرہ دیجیے اور اس بات کا بھی خیال رکھیے کہ مرہٹے جو پانی پت کی جنگ کے بعد نیم جان ہو چکے ہیں۔ کہیں دوبارہ اٹھ کر ہمارے مقابلے پر نہ آجائیں۔ میں ان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اپنی مرکزیت برقرار رکھنے کے لیے ایک برائے نام شہنشاہ کی ضرورت ہے اور جس شخص کو دلّی کا تخت سونپا جا رہا ہے اسے امراء کی سازشوں یا دشمن کے حملے سے محفوظ رکھنے کے لیے بھی آپ کے پہرے کی ضرورت پڑے گی لیکن میں ان لوگوں سے کچھ کہنے کا حق رکھتا ہوں جو اپنے آپ کو قوم کی کشتی کا ناخدا سمجھتے ہیں اور میں ان سے یہ مطالبہ کرنے میں بھی حق بجانب ہوں کہ خدا کے لیے ماضی کے واقعات سے سبق حاصل کرو۔ اگر تمھاری کوتاہ اندیشی، عافیت پسندی اور سہل انگاری کے باعث قوم

کی نیّا ڈوب گئی تو تم بھی اس کے ساتھ ہی ڈوب جاؤ گے۔

آپ میں سے کسی کو اس بات پر پریشان نہیں ہونا چاہیئے کہ میں پانی پت کی جنگ میں حصہ لینے والے روہیلہ جانبازوں کی تعریف کرتا ہوں۔ میں روہیلکھنڈ کا دوست ہوں نہ اودھ کا دشمن۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت میں میں ان سب کو اپنے ملّی وجود کا ایک حصہ سمجھتا ہوں۔ پانی پت کی جنگ میں شہید ہونے والے افغان، مغل، بلوچ اور ہندی مسلمان سب میرے محسن تھے۔ ان کا مقدس خون میری عزت، میری آزادی اور میری سربلندی کے لیے بہا ہے اور میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اس خون کی روشنائی سے میرے اور میری قوم کے مستقبل کی تاریخ کے بہترین صفحات لکھے جائیں۔"

جب یہ محفل برخاست ہو رہی تھی تو لکھنؤ کا ایک عمر رسیدہ آدمی معظم علی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے میزبان کے گھر سے باہر نکلا اور اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا "آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ شجاع الدولہ کے کانوں تک پہنچایا جائے گا؟"

معظم علی نے اطمینان سے جواب دیا "خدا شاہد ہے کہ میں نے یہ تمام باتیں شجاع الدولہ کے لیے ہی کہی ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کا نیک اقدام قوم کے لیے خیر و برکت کا باعث ہو سکتا ہے اور جن کی کوتاہیوں سے لاکھوں انسانوں کے لیے تباہی اور بربادی کے راستے کھل سکتے ہیں۔"



لکھنؤ میں معظم علی کی بڑھتی ہوئی عزت اور شہرت کے ساتھ اس کے خلاف وہ عیب جُو اور حاسد لوگ بھی بیدار ہو چکے تھے جو کسی انسان کی تعریف کو اپنی مذمت کے مترادف سمجھ لیتے ہیں۔ وہ اُمراء جو ابتدا میں اس کے ساتھ محبت اور احترام سے پیش آئے تھے۔ اب اپنے طرزِ عمل سے یہ ظاہر کر رہے تھے کہ مسند نشینوں اور کورنش بجا لانے والوں یا خواجوں اور خواجہ سراؤں کی دنیا میں ایک حق گو اور بیباک انسان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ابتدا میں معظم علی اودھ کی

حکومت پر نکتہ چینی کرنے سے اجتناب کرتا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کے احساسات کی تلخی بڑھتی گئی۔ تجارت کا رہا سہا کاروبار عملی طور پر شیر علی کے سپرد کرنے کے بعد وہ اپنا بیشتر وقت قوم کے مستقبل پر سوچنے میں صرف کرتا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر یہ خیال بری طرح حاوی ہو رہا تھا کہ ملک کے امراء اگر نئے حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں تو بنگال کو انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائی جا سکتی ہے اور کرناٹک میں ان کی سازشوں کا سدباب ہو سکتا ہے۔ مرہٹوں کے متعلق بھی وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ انھیں دوبارہ سر اٹھانے کا موقع نہیں دینا چاہیئے ادھر پنجاب میں سکھوں کے حوصلے مسلمانوں کے لیے ایک نیا خطرہ بن چکے تھے اور معظم علی کے نزدیک ہر الجھن، ہر پریشانی کا واحد علاج یہ تھا کہ سلطنت کے تمام صوبیدار اور امراء منظم اور متحد ہو کر قوم کے حال اور مستقبل کے مسائل پر غور کریں اور ان مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے عوام میں ایک اجتماعی احساس بیدار کریں۔ پانی پت کی جنگ اس کے نزدیک ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کے ایک نئے دور کا پیش خیمہ تھی لیکن یہ تلخ حقیقت اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھیں کہ امراء کی بے حسی بتدریج عوام کے اٹھتے ہوئے حوصلوں اور ولولوں پر غالب آ رہی ہے۔ وہ لکھنؤ کے امراء سے ملتا اور انھیں یہ سمجھاتا کہ اگر ہم نے ان حالات سے فائدہ نہ اٹھایا تو اندیشہ ہے کہ قوم پھر ایک بار مایوسی اور بے حسی کے دلدل میں جا گرے گی۔ اگر ہمارے اکابر اپنی سیاسی سودا بازیوں اور محلاتی سازشوں پر اعتماد کرنے کی بجائے عوام کے جذبۂ مدافعت پر اعتماد کریں تو ہم چند ماہ کے اندر اندر مٹھی بھر انگریزوں کو خلیج بنگال کے گہرے پانیوں کی طرف دھکیل سکتے ہیں۔ مرہٹوں کے لیے ایسے حالات پیدا کر سکتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ اگر صرف اودھ اور دکن کی حکومتیں صرف چند ہفتوں کے لیے اتحاد کر لیں تو جنوبی ہندوستان کو انگریزوں اور فرانسیسیوں کی چیرہ دستیوں سے ہمیشہ کے لیے نجات دلائی جا سکتی ہے۔

معظم علی کبھی آدھی آدھی رات تک گھر میں بیٹھ کر دکن، لاہور، ملتان اور سرہند

کے صوبیداروں، دلی کے وزیروں اور امیروں اور روہیلکھنڈ کے سرداروں کے نام اس قسم کے خطوط لکھتا :-

"ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔ احمد شاہ ابدالی بار بار ہماری اعانت کے لیے نہیں آئیں گے۔ اگر آپ متحد ہو جائیں تو گئی گزری حالت میں بھی اس ملک کی کوئی طاقت آپ کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتی۔ آپ اس ملک کے مسلمانوں کی عزت اور آزادی کے محافظ ہیں۔ اگر آپ نے موجودہ حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کی تو آپ خدا کے سامنے کیا جواب دیں گے؟ پانی پت کی فتح کے بعد اس ملک کے مایوس اور بددل مسلمانوں میں جو حوصلے اور ولولے بیدار ہوئے تھے وہ اب سرد پڑتے جا رہے ہیں۔ آپ کو اس وقت کا انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اپنے حال سے مایوس اور مستقبل سے بے پروا ہو جائیں۔ ہماری سب سے بڑی بیماری لامرکزیت ہے۔ اگر آپ متحد اور منظم ہو جائیں تو دلی کے تخت کا کھویا ہوا وقار بحال کیا جا سکتا ہے لیکن اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ شاہ عالم ثانی جو ابھی تک جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے قوم کی ڈھال اور تلوار نہیں بن سکتا تو خدا کے واسطے سل[illegible] بوجھ ٹھانے کے لیے کسی ایسے آدمی کو آگے لانے کی کوشش کیجیے جس کی صلاحیتوں پر اعتماد کیا جا سکے۔ میں یہ تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ ایک قوم کا مستقبل کسی نااہل حکمران کی ذاتی خواہشات پر قربان کیا جا سکتا ہے۔ میں اس ملک کے کروڑوں مسلمانوں کی عزت آزادی اور بقا کا واسطہ دے کر آپ سے یہ التجا کرتا ہوں کہ آپ اپنے فرائض کا احساس کریں اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ ان ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے جو قوم کی آزادی کے پاسبان ہونے کی حیثیت سے آپ پر عائد ہوتی ہیں تو میری آخری

درخواست یہ ہے کہ آپ قوم کے راستے سے ہٹ جائیں اور ایسے لوگوں کو آگے آنے کا موقع دیں جو قوم کا بوجھ اٹھانے کی اہلیت رکھتے ہوں۔"



ایک دن معظم علی اپنے دفتر میں بیٹھا انتہائی انہماک کی حالت میں کچھ لکھ رہا تھا۔ اکبر خاں کمرے میں داخل ہوا اور دبے پاؤں آگے بڑھ کر اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ صابر دروازے پر کھڑا بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اکبر خاں دیر تک چپ چاپ بیٹھا ایک شرارت آمیز تبسم کے ساتھ معظم علی کی طرف دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد معظم علی لکھا ہوا کاغذ رکھ کر دوسرا کاغذ اٹھانے لگا تو اچانک اس کی نگاہ اکبر خاں پر جا پڑی۔

"بھائی جان، السلام علیکم!" اکبر خاں نے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

معظم علی "وعلیکم السلام" کہہ کر اٹھا اور اس سے ہاتھ ملانے کے بعد بغلگیر ہو کر بولا "تم کب سے یہاں بیٹھے ہو؟"

"میں ابھی آیا ہوں بھائی جان! آپ اطمینان سے اپنا کام ختم کر لیجیے۔"

"بیٹھو، میرا کام کبھی ختم نہیں ہوگا۔"

وہ بیٹھ گئے اور اکبر خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "بھائی جان ابھی صابر مجھ سے شکایت کر رہا تھا کہ آپ دن رات لکھتے رہتے ہیں اور اپنی صحت کا کوئی خیال نہیں کرتے۔ بھابی جان کیسی ہیں؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ میں کئی دنوں سے تمھارے ہاں جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ تم اتنا عرصہ کہاں تھے۔ کم از کم اپنی خیریت کی اطلاع تو بھیج دی ہوتی!"

اکبر خاں نے جواب دیا "بھائی جان یقین کیجیے کہ میں ہر روز آپ کی خدمت میں

حاضر ہونے کا ارادہ کیا کرتا تھا۔ دو ماہ قبل ہمارے علاقے کا ایک آدمی لکھنؤ آ رہا تھا اور میں نے اسے ایک خط دیا تھا۔ پچھلے ہفتے وہ مجھے ملا اور اس نے بتایا کہ گھر سے نکلنے کے بعد میرا ارادہ بدل گیا تھا اور میں لکھنؤ کی بجائے اپنے کسی رشتہ دار سے ملنے کے لیے آگرہ چلا گیا تھا۔"

معظم علی نے کہا۔ "شیخ فخرالدین ہر خط میں تمھارے متعلق پوچھا کرتے ہیں۔ میں نے پرسوں ہی انھیں لکھا ہے کہ اکبر خاں نے مدت سے کوئی اطلاع نہیں بھیجی اور عنقریب اس کے گاؤں جا رہا ہوں۔ شیخ صاحب تم سے بہت پیار کرتے ہیں اور وہ مُصر ہیں کہ میں حیدرآباد آؤں تو تمھیں ساتھ لے کر آؤں۔"

"وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ میں بھی انھیں بہت یاد کیا کرتا ہوں۔ اگر آپ حیدرآباد گئے تو میں ضرور آپ کا ساتھ دوں گا۔"

معظم علی نے کہا: "اب معلوم نہیں کہ مجھے کہاں کہاں جانا پڑے۔ بہرحال یہ بات یقینی ہے کہ میں زیادہ عرصہ لکھنؤ میں نہیں رہ سکوں گا۔ نواب شجاع الدولہ کے خوشامدی اور جی حضوری مجھ سے بہت خفا ہیں۔ پچھلے دنوں ان کے ایک بڑے اہلکار نے مجھ سے گلہ کیا تھا کہ میں لکھنؤ میں بغاوت پھیلا رہا ہوں۔"

اکبر خاں نے کہا: "بھائی جان! میں نجیب الدولہ کی دعوت پر پچھلے مہینے چند دنوں کے لیے دلی گیا تھا اور انھوں نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ شجاع الدولہ آپ جیسے حق گو آدمی کا زیادہ عرصہ لکھنؤ میں رہنا پسند نہیں کرے گا۔ آپ نے انھیں کوئی چٹھی لکھی تھی؟"

معظم علی نے جواب دیا: "ان دنوں میرا سب سے بڑا مشغلہ اس ملک کے اکابر کے نام خطوط لکھنا ہے اور اس وقت بھی میں میر نظام علی کے نام ایک خط لکھ رہا تھا۔"

"میر نظام علی کو آپ نے کیا لکھا ہے؟"

"میں نے مرہٹوں کے خلاف اس کی تازہ فتوحات پر اسے مبارک باد دی ہے۔ تمھیں

معلوم ہے کہ وہ مرہٹوں سے حیدرآباد کے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے چکا ہے۔ شیخ فخرالدین کی رائے اس کے متعلق اچھی نہ تھی لیکن پچھلے خط میں انھوں نے بھی اس کی تعریف کی ہے۔ میں نے نظام کو لکھا ہے کہ آپ اس ملک کے امراء کو اجتماعی خطرے کے مقابلے میں متحد اور منظم کرنے کا بیڑا اٹھائیں۔ تم یہ خط پڑھ سکتے ہو۔" معظم علی نے یہ کہہ کر لکھے ہوئے کاغذ میز پر سے اٹھائے اور اکبر خاں کے ہاتھ میں دے دیئے۔

اکبر خاں نے خط پڑھنے کے بعد معظم علی کی طرف دیکھا اور اس سے پوچھا: "بھائی جان! آپ کے کاروبار کا کیا حال ہے اور چچا شیر علی کہاں ہیں؟"

معظم علی نے جواب دیا: "پانی پت کی جنگ سے لوٹنے کے بعد میں تجارت میں زیادہ دلچسپی نہیں لے سکا۔ بیشتر کام چچا شیر علی نے سنبھال رکھا ہے اور وہ چند دن سے فیض آباد گئے ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ آج یا کل آجائیں گے۔"

صابر ایک کم سن بچہ اٹھائے کمرے میں داخل ہوا اور اسے اکبر خاں کی گود میں رکھتے ہوئے بولا: "بھلا یہ کون ہے؟"

اکبر خاں مسکرایا اور اس نے پیار سے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ میرا ننھا مُنا لاڈلا بھتیجا ہے اور کسی دن یہ اس ملک کی عظیم ترین فوج کا سپہ سالار بنے گا۔"

پانچ دن بعد معظم علی، اکبر خاں اور شیر علی ایک کمرے میں بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ اچانک باہر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور تھوڑی دیر بعد دلاور خاں انتہائی بدحواسی کی حالت میں کمرے کے اندر داخل ہوا اور اس نے کہا: "جناب شہر کا کوتوال آپ سے ملنا چاہتا ہے، اس کے ساتھ پانچ مسلح سپاہی ہیں۔"

معظم علی نے اطمینان سے جواب دیا: "کوتوال سے پوچھو اگر انھیں ناشتا کرنا ہو تو یہاں تشریف لے آئیں ورنہ انھیں ملاقات کے کمرے میں بٹھا دو اور کہو میں ابھی آتا ہوں۔"

دلاور خاں نے کہا: "جناب میں نے کہا تھا کہ آپ ناشتہ کر رہے ہیں لیکن وہ فوراً آپ سے ملنے پر مُصر تھے۔"

معظم علی نے ذرا تلخ ہو کر کہا۔ "جاؤ اسے کہہ دو میں ابھی آتا ہوں اور میرے لیے ایک گھوڑے پر زین بھی ڈال دو۔"

دلاور خاں کمرے سے باہر نکل گیا تو معظم علی نے کہا: "اکبر معلوم ہوتا ہے کہ مجھے شجاع الدولہ نے یاد کیا ہے۔ اگر مجھے کسی وجہ سے دیر لگ جائے تو تم اپنی بھابی اور ان کی والدہ کو حیدرآباد پہنچا دینا۔ میں انشاءاللہ وہاں پہنچ جاؤں گا۔ میں کئی ہفتوں سے شجاع الدولہ کے پیغام کا انتظار کر رہا تھا۔"

اکبر خاں نے کہا: "بھائی جان اگر کوئی خطرے کی بات ہو تو آپ کو شجاع الدولہ کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ حیدرآباد کی نسبت میرا گھر یہاں سے نزدیک ہے اور ہم کسی وقت کے بغیر کوتوال اور اس کے آدمیوں کو کسی کوٹھڑی میں بند کر کے یہاں سے روانہ ہو سکتے ہیں۔"

معظم علی مسکرایا۔ "مجھے یقین ہے کہ یہ آدمی مجھے گرفتار کرنے کی نیت سے نہیں آئے ہیں اور نہ ہی میرا قید ہونے کا ارادہ ہے۔"

اکبر خاں نے کہا: "بھائی جان میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔"

"نہیں!" معظم علی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "تم یہیں رہو۔ تمھیں اس کمرے سے نکلنے کی بھی ضرورت نہیں۔"

معظم علی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور شیر علی جو سکتے کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا اپنے حلق میں اٹکا ہوا لقمہ نگلنے کے بعد شکایت کے لہجے میں بولا:

"انھوں نے کبھی میرا کہا نہیں مانا۔ میں ان سے ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ جو لوگ قوم اور ملک کے خیرخواہ بن کر آپ کے پاس آتے ہیں ان میں سے آدھے حکومت کے جاسوس ہوتے ہیں

لیکن خدا معلوم پانی پت کی جنگ سے واپس آنے کے بعد انھیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ بھری محفل میں حکومت کے بڑے بڑے عہدیداروں پر نکتہ چینی شروع کر دیتے ہیں۔"

اکبر خاں نے اٹھ کر دروازے سے باہر جھانکنے کے بعد شیر علی کی طرف دیکھا اور کہا: "چچا جان پانی پت کی جنگ کے بعد اس ملک کے لاکھوں انسانوں میں زندہ رہنے کی خواہش بیدار ہو گئی ہے اور بھائی جان کے منہ سے ان لاکھوں انسانوں کے دل کی دبی ہوئی آواز نکلتی ہے۔"

"لیکن اب کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں چچا جان، آپ پریشان نہ ہوں۔ موجودہ حالات میں شجاع الدولہ ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

صحن میں مسلح سپاہی اپنے گھوڑوں کی باگیں تھامے ڈیوڑھی کے سامنے کھڑے تھے۔ معظم علی کوتوال کے ساتھ باتیں کرتا ہوا ملاقات کے کمرے سے باہر نکلا۔

اکبر خاں نے شیر علی سے کہا: "چچا جان میں ابھی آتا ہوں۔"

شیر علی نے کہا: "خدا کے لیے معظم علی کو یہ ضرور سمجھاؤ کہ شجاع الدولہ ایک تند مزاج آدمی ہے وہ اس کے ساتھ بات کرنے میں احتیاط کریں۔"

"چچا آپ اطمینان رکھیں۔" اکبر یہ کہہ کر آگے بڑھا۔ معظم علی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اکبر مجھے نواب وزیر اودھ نے کسی ضروری کام سے بلایا ہے۔ میں جلد واپس آ جاؤں گا۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر کوتوال اور اس کے ساتھیوں کے ہمراہ شہر کا رخ کر رہا تھا۔



معظم علی نواب شجاع الدولہ کی مسند کے سامنے کھڑا تھا اور مسند سے آگے دائیں بائیں

دو قطاروں میں چند امرار اور عہدہ دار بیٹھے ہوئے تھے۔ شجاع الدولہ نے چند ثانیہ اس کی طرف دیکھنے کے بعد کہا "مجھے تمھارے دو خط ملے ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تمھیں سلطنت کے ہر چھوٹے بڑے عہدہ دار کے نام خط لکھنے کا شوق ہے۔ آخر تم نے یہ کیسے فرض کر لیا ہے کہ ہمیں حکومت کا کاروبار چلانے کے لیے تمھارے نیک مشوروں کی ضرورت ہے؟"

معظم علی نے جواب دیا "اگر مجھے اس بات کا احساس نہ ہوتا کہ آپ کے ساتھ لاکھوں انسانوں کی قسمت وابستہ ہے اور آپ کا صحیح قدم قوم کے لیے خیر و برکت اور آپ کی معمولی کوتاہی اس کے لیے تباہی کا باعث ہو سکتی ہے تو میں آپ کو ہرگز پریشان نہ کرتا۔"

"لیکن تمھیں ملک کے سیاسی معاملات میں مداخلت کا حق کس نے دیا ہے؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم صرف اپنی تجارت سے سروکار رکھو اور لوگوں پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرو کہ قدرت نے سلطنت کا سارا بوجھ تمھاری گردن پر لاد دیا ہے؟ ہم یہ برداشت نہیں کریں گے کہ جو لوگ بنگال کو تباہی کے راستے پر ڈال کر وہاں سے بھاگے ہیں وہ یہاں آکر ہمارے لیے کوئی فتنہ پیدا کریں۔"

معظم علی ایک مبلغ کا جذبہ لے کر شجاع الدولہ کے دربار میں داخل ہوا تھا لیکن یہ الفاظ اسے چابک کی طرح لگے اور اس نے جواب دیا "معاف کیجیے مجھے اس سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ سلطنت مغلیہ کے کھنڈروں پر اقتدار کی مسندیں آراستہ کرنے والے امرار اپنے آپ کو کبھی مرہٹوں، کبھی جاٹوں، کبھی انگریزوں اور کبھی فرانسیسیوں کے سامنے بے بس پاتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میری آواز آپ کے کانوں کے لیے غیر مانوس ہوگی لیکن اقتدار کی مسند کسی شخص کو یہ حق نہیں دیتی کہ وہ اپنی قوم کی عزت اور آزادی پر جان دینے والوں کا مذاق اڑائے۔ بنگال میں میرا جرم صرف یہ تھا کہ میں اپنی زندگی کی ہزاروں خوشیاں اپنی قوم کی عزت اور آزادی پر قربان کر چکا ہوں۔

میرا باپ، میرا بھائی، میرے عزیز اور میرے دوست سراج الدولہ کے جھنڈے تلے قربان ہو چکے ہیں لکھنؤ پہنچ کر میں نے یہ جرم کیا ہے کہ جب مجھے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ ابھی تک میری رگوں میں خون کے چند قطرے باقی ہیں جو قوم کے کام آسکتے ہیں تو میں ایک رضاکار کی حیثیت میں پانی پت کے میدان میں پہنچ گیا تھا۔"

شجاع الدولہ نے جواب دیا "پانی پت کی جنگ میں اس ملک کے ہزاروں انسان حصہ لے چکے ہیں لیکن ان میں سے کسی کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ حکومت کے خلاف باغیانہ تقریریں کرے۔ تم ہمارے خلاف کئی مہینوں سے نفرت پھیلا رہے ہو۔ تم نے ہم پر یہ الزام لگایا ہے کہ ہم جنگ کے دوران میں مرہٹوں کے ساتھ ساز باز کرتے رہے ہیں۔ تم نے شہنشاہ کے خلاف انتہائی توہین آمیز باتیں کہی ہیں۔ تم نے دلی میں احمد شاہ ابدالی کو ہمارے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی ہے کہ پانی پت کی جنگ میں اودھ کی افواج کی حیثیت تماشائیوں سے زیادہ نہ تھی۔ ہم تمھیں روہیلوں کی طرف داری سے منع نہیں کر سکتے لیکن تمھیں نجیب الدولہ یا حافظ رحمت خاں کے اشاروں پر ہمارے لیے مشکلات پیدا کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ لکھنؤ میں تمھاری خدمات کا احساس نہ ہوتا تو ہم ایک ثانیہ کے لیے بھی تمھارا یہاں رہنا گوارا نہ کرتے۔"

معظم علی نے ایک ثانیہ کے لیے حاضرینِ دربار کی طرف دیکھا اور پھر شجاع الدولہ کی آنکھوں میں ڈال کر جواب دیا "مجھے معلوم نہیں کہ میرے دوستوں نے میرے متعلق آپ کو کیسی اطلاعات پہنچائی ہیں۔ لیکن میں یہ تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ میں آپ کے خلاف کوئی بغاوت پھیلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ میں اس ملک کے موجودہ حالات سے مطمئن نہیں ہوں اور کوئی باشعور آدمی ان حالات سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کے سامنے ایک ایسی قوم کے فرد کی حیثیت میں کھڑا ہوں۔ جس کا ہر قدم تباہی کی طرف اٹھ رہا ہے اور آپ اس ملک کے ان چند انسانوں میں سے ایک ہیں جو اسے تباہی سے بچا سکتے ہیں۔ پانی پت

کی جنگ کے بعد قدرت نے ہمیں عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنے کا ایک اور موقع دیا ہے لیکن اگر ہم نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو قدرت شاید ہماری اس کوتاہی کو قابل معافی نہ سمجھے۔ اگر ہمارے امراء اور صوبیداروں نے متحد اور منظم ہوکر مرکز کو مضبوط نہ کیا تو مرہٹوں کو دوبارہ سر اٹھانے میں دیر نہیں لگے گی اور ہمارے اکابر کو اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے کہ جب کوئی نیا طوفان آئے گا تو قدرت ان کی اعانت کے لیے کسی اور احمد شاہ ابدالی کو بھیج دے گی۔ مرہٹوں سے بھی زیادہ خطرناک اس وقت ہمارے لیے انگریز ہیں لیکن ہماری اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہوسکتی ہے کہ ہمارے امراء نے بنگال کے واقعات سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ ہم اس جنگل میں رہتے ہیں جس کے چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے اور میرے چیخنے اور چلّانے کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں لکھنؤ سے اس آگ کے شعلے دیکھ رہا ہوں۔ میں اس اژدہا کی پھنکاریں سن رہا ہوں جو بنگال کو ہڑپ کرچکا ہے۔ میں ان بھیڑیوں کی چیخیں سن رہا ہوں جو ایک بار پھر مہاراشٹر سے نکل کر اس ملک میں تباہی پھیلانا چاہتے ہیں۔ پھر جب میں اپنے ان اکابر کو دیکھتا ہوں جو اجتماعی خطرات کے مقابلے کے لیے عوام کی قوت مدافعت بیدار کرنے کی بجائے اپنی سیاسی چالوں اور سودا بازیوں کے بل بوتے پر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ اگر تم نے انگریزوں کے جارحانہ عزائم کا سدّباب نہ کیا تو وہ کسی دن دلّی پہنچ جائیں گے۔ اگر تم نے مرہٹوں کی جارحیت کو دوبارہ ابھرنے کا موقع دیا تو تمھاری آئندہ نسلیں تم پر لعنت بھیجیں گی اور اگر تم نے پنجاب میں سکھوں کی سرکوبی کے لیے افغانوں کا ساتھ نہ دیا تو شمال میں تمھارا اہم ترین دفاعی حصار ٹوٹ جائے گا۔ اگر اس قسم کے خیالات کا اظہار جرم ہے تو میں اس جرم کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ دلّی سے احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد میں نے صرف ایک حوصلہ افزا خبر سنی ہے اور وہ یہ ہے کہ نظام کی افواج نے مرہٹوں سے اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے لیے ہیں لیکن کاش میں اودھ، دلّی اور روہیلکھنڈ کی افواج کو بھی دکن کی افواج کے دوش بدوش

دیکھ سکتا اور پھر یہی افواج پونا سے آگے ارکاٹ اور مدراس کی طرف بڑھتیں اور اس ملک سے ان فرنگی تاجروں کو نکال کر دم لیتیں جو ہماری عزت اور آزادی کا سودا کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اس کے بعد شاید بنگال کو آزاد کرانے کے لیے ہمیں لڑنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔"

شجاع الدولہ نے قدرے نرم ہوکر کہا: "تم ہمارے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے کسی مرحلہ پر دوسرے امراء سے تعاون نہیں کیا۔ جب مرہٹوں کا خطرہ پیش آیا تھا تو ہم پانی پت کے میدان میں کسی سے پیچھے نہ تھے اور اب بھی اگر کسی مشترکہ دشمن کے مقابلے میں اس ملک کے امراء نے کوئی متحدہ محاذ بنایا تو ہم ان کا ساتھ دینے سے دریغ نہیں کریں گے لیکن ہماری حکمت عملی کسی ایسے حلیف کی خواہشات کی تابع نہیں ہوسکتی جس کی وفاداری پر ہمیں پورا بھروسہ نہ ہو۔ تم ہمیں نظام الملک کے ساتھ تعاون کا مشورہ دیتے ہو لیکن تمھارے پاس اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اگر ہم نظام کی حمایت کے لیے اٹھیں تو وہ مرہٹوں کے ساتھ سودا نہیں کرے گا؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں آپ کو نظام کے لیے نہیں، دکن کے مسلمانوں کی عزت اور آزادی کے لیے مرہٹوں کے خلاف میدان میں آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ میرا مقصد صرف امراء کا اتحاد ہی نہیں بلکہ عوام میں ایک ایسا اجتماعی شعور اور ایک ایسی قوتِ محاسبہ پیدا کرنا ہے جس کا احترام اور خوف کسی رہنما کو بے راہ روی کی اجازت نہ دے۔"

شجاع الدولہ نے طنزیہ لہجے میں کہا: "تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم یہاں وقت ضائع کرنے کی بجائے دکن جاکر وہاں کے عوام کا ضمیر بیدار کرو؟ مجھے آج ہی یہ اطلاع ملی ہے کہ میر نظام علی نے جسے تم شاید قوم کا نجات دہندہ سمجھتے ہو۔ مرہٹوں کے خلاف جنگ سے واپس لوٹتے ہی اپنے بھائی صلابت جنگ کو گدی سے اتار کر قید خانے میں ڈال دیا

ہے۔ ان حالات میں تم مجھے صلابت جنگ کی اعانت کا مشورہ دیتے ہو یا میر نظام علی کی اعانت کا؟" معظم علی نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میرے لیے یہ کھیل نیا نہیں۔ جب تک چند خاندان سلطنتِ مغلیہ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو اپنی شکارگاہیں سمجھتے رہیں گے اور جب تک دلی کی حکومت میں اتنی سکت نہیں ہوگی کہ وہ اقتدار کے بے حیا دعویداروں کا مقابلہ کرسکے، اس ملک کے مختلف صوبوں میں اس قسم کے کھیل ہوتے رہیں گے۔"

شجاع الدولہ نے کہا: "دلی کی حکومت کی طرف سے میں تمھیں یہ جواب دے سکتا ہوں کہ اگر ہم اس وقت دکن کے معاملات میں مداخلت کریں تو میر نظام علی، مرہٹوں یا انگریزوں کے ساتھ سودا کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اور یہی بات صلابت جنگ کے متعلق کہی جاسکتی ہے۔ ہمارے متعلق تمھارا یہ قیاس غلط تھا کہ ہم دکن اور مرہٹوں کی جنگ میں غیر جانبدار رہنا چاہتے تھے لیکن کاش دکن میں کوئی ایسی شخصیت ہوتی جسے صحیح معنوں میں ہم اپنا حلیف سمجھ سکتے۔ میر نظام علی کے متعلق اب یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک ہوشیار سپاہی اور ایک کامیاب سیاست دان ہے اور قرائن یہ بتا رہے ہیں کہ دکن پر اس کی سیادت تسلیم کرلی جائے گی لیکن ابھی ہمیں یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ قوم اور ملک کے مستقبل کے متعلق میر نظام علی کے عزائم کیا ہیں۔ اگر تم اپنی سرگرمیاں صرف اودھ کی حکومت پر نکتہ چینی تک محدود نہیں رکھنا چاہتے تو ہماری یہ خواہش ہے کہ تم دکن جاؤ اور میر نظام کو حال اور مستقبل کے خطرات سے آگاہ کرو اور اگر اسے تمھاری باتیں متاثر نہ کر سکیں تو یہ معلوم کرو کہ دکن کو تباہی سے بچانے کی کوئی اور صورت کیا ہوسکتی ہے! دکن کے امراء میں سے کئی تمھیں اپنے ہم خیال مل جائیں گے اور مجھے یقین ہے کہ اگر میر نظام علی انتہائی کوتہ اندیش ثابت نہ ہوا تو تم ایسے لوگوں کی مدد سے اسے اپنا ہم خیال بنا سکو گے اور ہم تمھارے ساتھ یہ وعدہ کرنے کے لیے تیار رہیں کہ جب میر نظام ہمارے مشترکہ

دشمنوں کے خلاف کوئی جرأت مندانہ قدم اٹھائے گا تو ہم اس کا ساتھ دیں گے اور اگر تمھیں اس مہم میں ناکامی ہوئی تو اس کا کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ تم ہر معاملے میں ہمیں موردِ الزام ٹھہرانے کی کوشش نہیں کرو گے۔ ہم بخوشی تمھیں اس بات کی بھی اجازت دیتے ہیں کہ تم ملک کے کونے کونے میں جاکر ہر بااثر آدمی کو ہماری طرف سے یہ پیغام دو کہ مسلمانوں کی عزت اور آزادی کے دشمنوں کے خلاف جو متحدہ محاذ بنایا جائے گا اودھ کے تمام وسائل اس کی فتح اور کامیابی کے لیے وقف ہوں گے لیکن اگر تم لوگ صرف باتیں بنانا جانتے ہو تو میں تم سے یہ کہوں گا کہ اودھ کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ مجھے نجیب الدولہ نے کہا تھا کہ تم ایک کارآمد آدمی ہو اور میں تمھیں قوم کی خدمت کا موقع دینا چاہتا ہوں۔ میں اب تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم حیدرآباد جانا چاہتے ہو یا نہیں لیکن میں تم سے یہ توقع ضرور رکھوں گا کہ جب تک تم لکھنؤ میں ہو میرے پاس اس قسم کی کوئی شکایت نہیں آئے گی کہ اس ملک کی تمام برائیاں میری ذات کے ساتھ وابستہ کی جارہی ہیں۔ تم جاسکتے ہو۔"

معظم علی نے چند ثانیے تذبذب کی حالت میں شجاع الدولہ اور حاضرینِ مجلس کی طرف دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اہل دربار پریشانی، اضطراب اور تذبذب کی حالت میں اس شخص کی طرف دیکھ رہے تھے جس کے سامنے ذرا سی گستاخی موت کو دعوت دینے کے مترادف سمجھی جاتی تھی۔ معظم علی کے ساتھ گفتگو کے دوران میں وہ ہر لمحہ اس بات کے منتظر تھے کہ شجاع الدولہ اچانک تالی بجائے گا اور سپاہی ننگی تلواروں کے پہرے میں اس گستاخ آدمی کو کسی تنگ و تاریک کوٹھڑی کی طرف لے جائیں گے اور معظم علی کے کمرے سے نکل جانے کے بعد بھی وہ یہ سوچ رہے تھے کہ شاید شجاع الدولہ پہرداروں کو آواز دے کر یہ کہہ دے کہ اس گستاخ آدمی کو محل کے دروازے سے باہر نکلتے ہی گرفتار کرلیا جائے لیکن شجاع الدولہ کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے اہل مجلس کو حیران اور پریشان دیکھ کر کہا "تمھیں یہ شکایت تھی کہ ایسے خطرناک آدمی کو لکھنؤ میں نہیں رہنا چاہیے

اور مجھے یقین ہے کہ اب وہ لکھنؤ میں نہیں رہے گا۔ ایسا آدمی اپنی ذات کے سوا کسی کے لیے خطرناک نہیں ہو سکتا۔"

ایک درباری نے اٹھ کر کہا: "لیکن عالیجاہ! اس نے حضور کے سامنے بھی انتہائی گستاخی کا مظاہرہ کیا ہے!"

شجاع الدولہ نے جواب دیا۔ "تم اس بات پر حیران ہو کہ میں اس کے ساتھ نرمی سے کیوں پیش آیا۔ سنو! وہ نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں جیسے لوگوں کا دوست ہے، اگر اس پر سختی کی جاتی تو یہ لوگ میرے خلاف طوفان کھڑا کر دیتے۔ احمد شاہ ابدالی سے کر نصیر خاں بلوچ تک اسے جانتے ہیں اور میری اپنی فوج کے ہزاروں جوان پانی پت کے میدان میں اس کے بہادرانہ کارناموں کے معترف ہیں۔ پھر اس کی باتیں سننے کے بعد تم اسے بدزبان اور گستاخ کہہ سکتے ہو لیکن اس پر بدنیتی کا الزام عائد نہیں کر سکتے۔ وہ ہمارے لیے سردردی کا باعث تھا لیکن میں نے یہ سردردی اب نظام کی طرف منتقل کر دی ہے اور مجھے نظام سے پوری توقع ہے کہ وہ اس کا صحیح علاج کر سکے گا۔ نظام سے یہ بعید نہیں کہ وہ اسے ہمارا ایک جاسوس سمجھ لے اور یہ حضرت حیدر آباد پہنچتے ہی لاپتہ ہو جائیں۔"

ایک درباری نے سوال کیا: "لیکن عالیجاہ اگر وہ یہاں سے نہ گیا تو؟"

شجاع الدولہ نے کہا: "شہر کا کوتوال اس بات کا پورا خیال رکھے گا کہ وہ کسی تاخیر کے بغیر لکھنؤ چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے۔"

معظم علی اپنے گھر کے قریب پہنچا تو اکبر خاں ڈیوڑھی کے دروازے سے باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر معظم علی کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کہا۔ "بھائی جان میں آپ کے متعلق بہت پریشان تھا۔ کیسے وہاں کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں!" معظم علی نے گھوڑے سے اترتے ہوئے جواب دیا۔ "شجاع الدولہ کی خواہش ہے کہ میں لکھنؤ چھوڑ کر حیدر آباد چلا جاؤں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اس نے میرے لیے قید خانے کی کوٹھڑی منتخب نہیں کی۔"

اکبر خاں نے کہا: "اس نے آپ کو لکھنؤ سے نکل جانے کا حکم دیا ہے؟"

"نہیں! اسے اس بات کا یقین تھا کہ میں ایسا حکم نہیں مانوں گا اور اس کی الجھنوں میں اضافہ ہو جائے گا۔ اس لیے اس نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں لکھنؤ کی بجائے حیدر آباد جا کر قوم کے مسائل حل کرنے کی کوشش کروں۔"

اکبر خاں نے کہا: "بھائی جان اگر آپ لکھنؤ چھوڑ کر میرے ہاں جانا قبول کریں تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔ اودھ کی نسبت روہیلکھنڈ میں یوں بھی آپ کی زیادہ ضرورت ہے۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "ابھی میں نے مستقل طور پر لکھنؤ چھوڑنے کا ارادہ نہیں کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب ایسا وقت آئے گا تو تمہارا گھر میری آخری جائے پناہ ہوگی لیکن ابھی میں حیدر آباد جانا چاہتا ہوں۔ میں شیخ فخر الدین سے کئی بار وعدہ کر چکا ہوں اور اب شجاع الدولہ نے اس وعدے کو پورا کرنے کے اسباب پیدا کر دیئے ہیں۔ تمہاری بھابی کو بھی حیدر آباد دیکھنے کا شوق ہے۔"

اکبر خاں نے پوچھا۔ "آپ کب جا رہے ہیں؟"

"میں انشاء اللہ ایک ہفتے کے اندر اندر روانہ ہو جاؤں گا۔"

اکبر خاں نے کہا: "بھائی جان میں آپ کے ساتھ چلوں گا!"

پندرھواں باب

عطیہ دوپہر کے وقت اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہی تھی۔ بلقیس بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے عطیہ کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا: "آپا جان! آپا جان! وہ آگئے!"

عطیہ نے بدحواس ہو کر آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی: "کون آگئے؟"

"بھائی معظم علی آئے ہیں آپا جان!"

"پھر میں کیا کروں؟" عطیہ نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھہریئے میں آپ کو ایک چیز دکھاتی ہوں۔"

بلقیس اسی طرح بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی اور تھوڑی دیر بعد ایک خوبصورت بچہ اٹھائے دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔

"بھلا بتایئے آپا جان یہ کون ہے؟" اس نے بچے کو عطیہ کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اسے کہاں سے اٹھا لائی ہو؟" عطیہ نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوال کیا۔

"آپا جان! یہ ان کا بیٹا ہے۔ ان کی بیوی اور ان کی ساس ان کے ساتھ آئی ہیں۔ وہ نیچے امی جان اور ممانی جان کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہیں۔ دیکھیے آپا جان یہ کتنا پیارا

بچہ ہے!"

عطیہ چند ثانیے بے حس و حرکت بیٹھی بچے کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اچانک اس نے اپنے دل میں جذبات کا تلاطم محسوس کیا اور بچے کو سینے سے لگا لیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور خوبصورت آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

بلقیس نے کہا: "چلیے آپا جان وہ آپ کے متعلق پوچھتی تھیں۔"

"تم چلو میں آتی ہوں۔"

بلقیس نے اس کی گود سے بچہ اٹھا لیا اور باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد عطیہ جھجکتی ہوئی نچلی منزل کے ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ فرحت اور اس کی والدہ فخر الدین کے خاندان کی چند خواتین کے درمیان بیٹھی ہوئی تھیں۔ عطیہ انھیں سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئی۔

بلقیس نے فرحت کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "بھابی جان! یہ عطیہ آپا ہیں۔"

فرحت نے مسکرا کر عطیہ کی طرف دیکھا اور پھر بلقیس کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "تمھیں دیکھنے کے بعد تمھاری بہن کو پہچاننا میرے لیے مشکل نہیں۔ تمھاری صورتیں بہت ملتی ہیں۔"

عطیہ بڑی عمر کی خواتین اور اپنی ماموں زاد بہنوں کی مجلس میں فرحت کے ساتھ بے تکلفی سے کوئی بات نہ کر سکی لیکن غروب آفتاب کے قریب جب فرحت بالائی منزل کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی اور بلقیس اس کا بچہ اٹھائے اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی، عطیہ جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ فرحت نے کرسی سے اٹھ کر کہا: "آؤ بہن! میں لکھنؤ میں تمھیں بہت یاد کیا کرتی تھی اور تمھارے بھائی جان بھی بہت یاد کیا کرتے تھے۔"

"بھابی جان!" عطیہ نے بے اختیار آگے بڑھ کر فرحت سے لپٹتے ہوئے کہا۔ "میں ہر نماز کے بعد یہ دعا کیا کرتی تھی کہ بھائی جان آپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور پھر جب انھوں نے ماموں جان کو یہ لکھا کہ آپ مل گئی ہیں تو میں یہ دعا کیا کرتی

تھی کہ آپ کسی دن یہاں آئیں "۔

فرحت نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "عطیہ تم فرشتہ ہو اور مجھے ہمیشہ تمہاری دعاؤں کی ضرورت رہے گی۔ بیٹھ جاؤ!"

عطیہ اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی اور اس نے غور سے فرحت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بھابی جان ایک بات کہوں؟"

"کہو۔"

"آپ بُرا تو نہ مانیں گی؟"

"کبھی نہیں"

عطیہ نے اپنی آنکھوں میں ایک شرارت آمیز تبسم لاتے ہوئے کہا "بھابی جان! آپ بہت خوبصورت ہیں۔"

فرحت نے ہنستے ہوئے جواب دیا "عطیہ بات یہ ہے کہ تم میرے چہرے میں اپنی آنکھوں کا حسن دیکھ رہی ہو۔"



اسی مکان کے مردانہ حصّے میں فخرالدین، معظم علی اور اکبر خاں کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ ان کے نوکروں اور گھوڑوں کو دوسری حویلی میں ٹھہرانے کا انتظام کرنے کے بعد وہ معظم علی اور اکبر خاں کے ساتھ دیوان خانے کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔ جب وہ ایک دوسرے کے قریب کرسیوں پر بیٹھ گئے تو اس نے معظم علی سے مخاطب ہو کر کہا "کہیے راستے میں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں، راستے میں ہمیں کوئی قابلِ ذکر حادثہ پیش نہیں آیا لیکن حیدر آباد سے کوئی آٹھ منزل دور ہمیں یہ پتہ چلا کہ ڈاکو چار دن پہلے ایک چھوٹا سا قافلہ لوٹ چکے ہیں۔"

فخرالدین نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ آپ خیریت سے پہنچ گئے لیکن اگر مجھے آپ

کی آمد کی اطلاع ہوتی تو میں حیدر آباد کی سرحد سے آگے آپ کی حفاظت کا انتظام کر سکتا تھا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ اکبر خاں کو بھی ساتھ لے آئے ہیں"۔

معظم علی نے کہا "یہ محض اتفاق تھا کہ جب میں نے سفر کا ارادہ کیا تھا تو یہ میرے پاس آئے ہوئے تھے۔"

"لکھنؤ میں آپ کے کاروبار کا کیا حال ہے؟"

معظم علی نے جواب دیا "پانی پت کی جنگ سے واپس آنے کے بعد میں تجارت میں زیادہ دلچسپی نہیں لے سکا۔ اب وہاں معمولی کاروبار رہ گیا ہے اور وہ میں شیر علی خاں کے سپرد کر آیا ہوں۔ میں کچھ عرصہ سیر و سیاحت سے جی بہلانا چاہتا ہوں۔"

فخرالدین مسکرایا اور قدرے توقف کے بعد بولا "جس معظم علی کو میں جانتا ہوں وہ سیر و سیاحت کے لیے پیدا نہیں ہوا ہے۔ آپ کا چہرہ بتا رہا ہے کہ آپ اپنی خواہش سے یہاں نہیں آئے ہیں۔"

معظم علی نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اب مجھے یہ معلوم نہیں کہ میری خواہشات کیا ہیں؟"

فخرالدین نے کہا "لوگ اپنے مہمانوں سے ایسی باتیں پوچھنا خلافِ تہذیب سمجھتے ہیں لیکن میں آپ کی ہر پریشانی میں حصہ دار بننا اپنا حق سمجھتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ میری حق تلفی نہیں کریں گے۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "میری پریشانیاں میری اپنی پیدا کردہ ہیں اور کاش مجھے یہ معلوم ہوتا کہ اس دنیا میں میرا صحیح مقام کیا ہے۔ لکھنؤ سے روانہ ہوتے وقت میں محسوس کرتا تھا کہ اب ملک کے کسی حصے کی آب و ہوا مجھے راس نہیں آئے گی۔"

فخرالدین نے کہا۔ "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کی حکومت کے ساتھ آپ کے تعلقات خراب ہو گئے ہیں

معظم علی نے جواب دیا: "آپ شاید اسے بزدلی خیال کریں لیکن اس مرتبہ میں نے قید ہونا پسند نہیں کیا۔ پچھلے وقتوں کے حکمران جب اپنے کسی گستاخ عہدہ دار یا مشیر پر ہاتھ ڈالنے سے گھبراتے تھے تو اس سے یہ کہا کرتے تھے کہ آپ حج کر آئیں۔ شجاع الدولہ کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ میں ایک گستاخ آدمی ہوں اور اس نے مجھے قید خانے کے داروغہ کے حوالے کرنے کی بجائے یہ مشورہ دیا کہ میں میر نظام علی کی خدمت میں حاضر ہو کر قوم کے اجتماعی مفاد کے لیے دکن اور اودھ کے اتحاد کے مکانات معلوم کروں اور میرے خیال میں آج تک اس نے اتنی رعایت کسی اور کے ساتھ نہیں برتی ہوگی۔"

فخرالدین کے استفسار پر معظم علی نے لکھنؤ میں اپنی سرگرمیوں اور شجاع الدولہ کے ساتھ ملاقات کی تفصیلات بیان کر دیں۔ اس کے بعد فخرالدین نے کہا: "جب آپ نے مجھے پانی پت کی جنگ کے واقعات لکھے تھے تو مجھے اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ آپ لکھنؤ واپس کیوں آ گئے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ ایک سپاہی کی حیثیت میں اپنا صحیح مقام تلاش کرنے کے بعد آپ تجارت میں دلچسپی نہیں لے سکیں گے۔ احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد آپ دلّی میں نجیب الدولہ کے ساتھ رہ کر بھی بہت کچھ کر سکتے تھے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد مجھے دلّی اور لکھنؤ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ ایک بے جان بادشاہ جس کا کوئی پرسانِ حال نہیں، میری آرزوؤں اور امنگوں کا مرکز نہیں بن سکتا تھا۔ کاش احمد شاہ ابدالی دلّی کے تخت پر کسی ایسے آدمی کو بٹھا جاتے جس میں اس دور کے طوفانوں کے ساتھ لڑنے کی جرأت اور ہمت ہوتی۔ نجیب الدولہ اپنے تدبر، اپنی قابلیت، اپنی جرأت، ہمت اور ذہانت کے باوجود گھاس کے تنکوں سے قوم کا دفاعی حصار تعمیر نہیں کر سکتے۔ دلّی کے امراء اور دلّی سے باہر سلطنت کے دوسرے عہدہ دار اگر کسی بات سے بے نیاز ہیں تو وہ قوم کا مستقبل ہے۔ وہ مرکز میں کسی ایسی قیادت کا تصور کرنے پر آمادہ نہیں جس کا اشارہ ہر چھوٹے

بڑے کے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہو۔ انھیں ایک کٹھ پتلی کی ضرورت تھی اور وہ انھیں مل گئی ہے۔ ان دنوں اس کے تار شجاع الدولہ کے ہاتھ میں ہیں لیکن آگے چل کر یہ معلوم نہیں کہ یہ کٹھ پتلی کس کس کے ہاتھ میں کھیلے گی۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ لوگ اپنے ماضی سے سبق حاصل کریں گے لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ دلّی پھر ایک بار ان بھیڑیوں کی شکارگاہ بننے والی ہے جو بار بار اسے تاخت و تاراج کر چکے ہیں۔

شیخ صاحب! میں ایک سپاہی ہوں اور اب زندگی کی اس منزل میں داخل ہو رہا ہوں جب قویٰ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور ہمت عزائم کا ساتھ نہیں دیتی۔ تاہم میرے حوصلے سرد نہیں ہوئے۔ کاش میں کسی ایسے شخص کی رفاقت میں جان دے سکتا جس کی نگاہیں میری قوم کے مستقبل سے روشن ہوتیں۔ میرے لیے پانی پت کی جنگ کے بعد اس ملک کے کسی صوبیدار کی فوج میں بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کرنا مشکل نہ تھا لیکن میرے سامنے وہ لوگ تھے جن کی زندگی کا مقصد قوم کی حفاظت کی بجائے قوم پر حکومت کرنا ہے۔ مجھے اگر صرف اپنی ذاتی خوشی اور سلامتی مطلوب ہوتی تو میں احمد شاہ ابدالی کے ساتھ بھی جا سکتا تھا لیکن مجھے اس وطن کی مٹی سے اسلاف کے خون پسینے کی مہک آتی ہے۔ میں اپنے خرمن کی بجھی ہوئی راکھ سے زندگی کی چنگاریاں تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس دور کے رجلِ عظیم کا متلاشی ہوں۔ لکھنؤ سے میں یہ ارادہ لے کر نکلا تھا کہ اگر میں دکن اور اودھ کا اتحاد کرا سکا تو یہ ایک بہت بڑا کام ہوگا لیکن دکن کے حدود میں داخل ہونے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ یہاں کی فضا لکھنؤ کی نسبت کم متعفن نہیں۔ میر نظام علی کے متعلق میں نے جو کچھ سنا ہے اس کے پیشِ نظر میں ملک و قوم کے لیے اس کی ذات سے کوئی نیک توقع وابستہ نہیں کر سکتا تاہم میں اس سے ملاقات کی کوشش کروں گا۔"

فخرالدین نے کہا: "میر نظام علی ان دنوں بیدار گئے ہوئے ہیں اور شاید چند ہفتوں تک واپس نہ آئیں۔ ان کی واپسی پر آپ کی ملاقات کا انتظام ہو جائے گا لیکن مجھے

اس ملاقات سے کسی اچھے نتیجے کی توقع نہیں۔ میری یہ خواہش ہے کہ آپ سرنگاپٹم دیکھ آئیں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی دن یہ شہر آپ کے سفر کی آخری منزل بن جائے۔ میں حیدرعلی کی آنکھوں میں قوم کے مستقبل کی امیدوں کی روشنی دیکھ چکا ہوں۔"

معظم علی نے کہا "آپ پہلے بھی حیدرعلی کی تعریف کرچکے ہیں اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ پانی پت کی جنگ کے بعد مجھے دلّی میں ایک نوجوان ملا تھا اور اس نے بھی مجھے سرنگاپٹم آنے کی دعوت دی تھی۔"

فخرالدین نے کہا۔" اس زمانے میں میں نے آپ سے جس حیدرعلی کا ذکر کیا تھا وہ اس قدر مشہور نہ تھا۔ ان دنوں میسور کی ریاست بھی ایک بڑی جاگیر کا درجہ رکھتی تھی لیکن آج میسور ایک سلطنت ہے اور مغلوں کی سلطنت کے کھنڈروں پر اپنے اقتدار کے محل تعمیر کرنے والے قسمت آزما اپنے وزیروں اور مشیروں سے یہ پوچھ رہے ہیں کہ حیدرعلی کون ہے ؟ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے ؟ اس کے باپ دادا کیا کرتے تھے ...؟ آج انگریز، مرہٹے اور نظام جن میں سے ہر ایک جنوبی ہندوستان کو اپنی وراثت سمجھتا ہے یہ محسوس کررہے ہیں کہ قدرت نے ان کے راستے میں ایک ناقابلِ تسخیر پہاڑ کھڑا کردیا ہے اس کی شہرت حیدرآباد، دلّی، لکھنؤ، مدراس اور کلکتہ سے نکل کر لندن اور پیرس تک پہنچ چکی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ احمد شاہ ابدالی جیسی پرشکوہ شخصیت سے متعارف ہونے کے بعد آپ کو حیدرعلی کی شخصیت کس حد تک متاثر کرسکے گی لیکن اس ملک کے حال اور مستقبل کے متعلق اس کے خیالات وہی ہیں جو آپ کے ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔" میں لکھنؤ میں بھی اس کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں۔ میں وہاں ضرور جاؤں گا۔ اگر وہ اس تاریک دور میں قوم کا مشعل بردار بن سکتا ہے تو میں اس کے پیچھے چلنا اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھوں گا۔ سردست میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں آپ کو دو دن سے زیادہ تکلیف دینا

نہیں چاہتا۔ شاید مجھے کچھ عرصہ یہاں ٹھہرنا پڑے، اس لیے اپنے ایک علیحدہ مکان کا بندوبست کرنا چاہتا ہوں۔"

فخرالدین نے جواب دیا۔" دیکھیے اگر آپ اس مکان میں اپنے آپ کو ایک اجنبی محسوس کریں تو میں بہتر سمجھوں گا کہ اسے آگ لگا دی جائے۔ اگر آپ حیدرآباد آ کر کہیں اور ٹھہریں تو میرے لیے اس کے سوا اور کیا راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ میں یہاں سے ہجرت کرکے کہیں اور چلا جاؤں۔"

معظم علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔" شیخ صاحب آپ خفا ہوگئے۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

فخرالدین نے کہا۔" آپ نے بات ہی ایسی کی تھی۔"

فخرالدین کا رہائشی مکان بہت وسیع تھا اس نے اس کی بالائی منزل کا ایک حصہ معظم علی کے سپرد کردیا اور اکبر خاں کو مہمان خانے کے ایک کمرے میں ٹھہرا دیا۔



چند دن حیدرآباد رہ کر معظم علی کو اس تلخ حقیقت کا زیادہ شدت کے احساس ہونے لگا کہ مرہٹوں کے خلاف میر نظام علی کی فتوحات کی خبریں سن کر اس نے دکن کے مستقبل سے جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ محض ایک خواب تھیں۔ دلّی کے تمام تکلفات حیدرآباد میں آ چکے تھے اور دکن کے امراء دورِ زوال کے مغل شہزادوں کی طرح عیش ونشاط کی زندگی بسر کرتے تھے۔ دکن کی بیشتر فوج ان امراء اور جاگیرداروں کے نجی دستوں پر مشتمل تھی جن کا مرکزِ وفا بدلتا رہتا تھا۔ پانی پت کی جنگ کے بعد مرہٹوں کی کمزوری اور انتشار سے فائدہ اٹھا کر میر نظام علی نے دکن کے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے لیے تھے لیکن فوج کی مدد سے صلابت جنگ کو گدّی سے اتارنے کے بعد اندرونی خلفشار کے خطرے نے اسے اپنے بیرونی دشمنوں کے ساتھ سودا بازیوں پر مجبور کردیا تھا۔ ابن الوقت اور مفاد پرست

امرا کی اکثریت صلابت جنگ کا ساتھ چھوڑ کر حکومت کے نئے دعویدار کی طرف دار بن چکی تھی اور جن امرا کی وفاداری مشکوک سمجھی جاتی تھی ان کی جگہ نئے جاگیردار پیدا کیے جا رہے تھے۔ میر نظام علی سے بغاوت کرنے والے چند امرا اور فوجی افسر حیدرآباد سے باہر پناہ لے چکے تھے۔ اس کے دوسرے بھائی بسالت جنگ کو دکن میں کافی اثر و رسوخ حاصل تھا اور وہ کسی وقت بھی خطرے کا باعث ہو سکتا تھا۔ نظام علی نے اسے مطمئن کرنے کے لیے ادھونی کی حکومت اس کے سپرد کر دی اور دریائے کرشنا کے جنوب میں چند اضلاع اس کے حوالے کر دیئے۔ بسالت جنگ بظاہر ادھونی کا خود مختار حکمران تھا لیکن عملاً اس کی سلطنت حیدرآباد کی ایک بڑی جاگیر کا درجہ رکھتی تھی۔

معظم علی بیکار بیٹھنے کا عادی نہ تھا۔ وہ کبھی فخرالدین کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا اور کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر اکبر خاں کے ساتھ سیر کی نیت سے شہر کے باہر نکل جاتا۔ فخرالدین کے دسترخوان پر دونوں وقت شہر کے چند امرا، تاجر یا علماء موجود ہوتے۔ ایک دعوت میں معظم علی کی ملاقات شہر کے ایک ایسے رئیس سے ہوئی جس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ کتابیں جمع کرنے پر صرف کرتا ہے۔ اس نے اپنے کتب خانے کی چند نایاب کتابوں کا ذکر کیا اور معظم علی اس کا کتب خانہ دیکھنے کے لیے اس کے ساتھ چلا گیا۔ اس کے بعد یہ کتب خانہ معظم علی کی توجہ کا مرکز بن چکا تھا۔

ایک دن معظم علی چند گھنٹے اس کتب خانے میں صرف کرنے کے بعد واپس گھر آ رہا تھا کہ بازار میں کسی نے اچانک اس کا بازو پکڑ کر روک لیا۔ معظم علی نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا۔ اجنبی نے کہا "میں اس گستاخی کے لیے معذرت چاہتا ہوں لیکن اگر میں غلطی پر نہیں تو میں دلی میں آپ سے مل چکا ہوں۔"

معظم علی چند ثانیے تذبذب کی حالت میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اچانک اس کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں اور اس نے کہا "ارے آپ اسد خاں ہیں!"

"خدا کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے پہچان لیا۔ آپ حیدرآباد میں کیسے پہنچے اور یہاں کس جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں؟ میں آپ کو اکثر یاد کرتا تھا۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "مجھے یہاں آئے ہوئے آٹھ دس دن ہو چکے ہیں اور میں شیخ فخرالدین کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہ یہاں کے ایک بہت بڑے تاجر ہیں۔"

اسد خاں نے کہا۔ "میں انھیں جانتا ہوں۔"

"آپ یہاں کب تشریف لائے تھے؟" معظم علی نے سوال کیا۔

"میں کوئی بیس دن قبل یہاں آیا تھا لیکن چند دن یہاں رہ کر نظام الملک سے ملاقات کے لیے بیدار چلا گیا تھا۔ پرسوں یہاں واپس پہنچا تھا اور انشاءاللہ کل یہاں سے سرنگاپٹم روانہ ہو جاؤں گا۔ میں شاہی مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا ہوں، چلیے وہاں چل کر اطمینان سے باتیں کرتے ہیں۔"

معظم علی اس کے ساتھ چل دیا۔ راستے میں مختصراً اپنی سرگزشت سنانے کے بعد اس نے اسد خاں کے بیدار جانے کی وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا۔ "میں نظام کے پاس حیدر علی کی طرف سے دوستی کا پیغام لے کر گیا تھا۔"

معظم علی نے پوچھا۔ "پھر آپ کی ملاقات کا کیا نتیجہ نکلا؟"

"میری ملاقات کا صرف یہ نتیجہ نکلا ہے کہ اب نظام الملک کے ساتھ آئندہ ملاقاتوں کا راستہ کھل گیا ہے لیکن ذاتی طور پر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میر نظام علی جیسے آدمی سے دوستانہ ملاقاتیں کسی کے لیے سودمند ثابت نہیں ہو سکتیں۔ وہ اپنے دل کی بات کسی سے نہیں کہتا اور وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کے ساتھ بغلگیر ہونے والے ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں لیکن میسور کے لیے یہ ایک مجبوری ہے کہ نظام کو خوش رکھا جائے اور ایسے حالات پیدا نہ ہونے دیئے جائیں کہ وہ ہمارے خلاف انگریزوں یا مرہٹوں کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہو جائے۔"

معظم علی نے کہا: "آپ کو یاد ہے کہ جب دلی میں ہماری ملاقات ہوئی تھی تو آپ نے مجھے سرنگاپٹم آنے کی دعوت دی تھی؟"

"ہاں مجھے یاد ہے اور میں اب بھی آپ کو سرنگاپٹم آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر میں کل ہی آپ کو اپنے ساتھ لے جاسکوں تو میں سمجھوں گا کہ میرا یہ سفر بہت کامیاب تھا۔ مجھے یقین ہے کہ میسور کے حالات دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ آپ کے بہترین خواب وہاں پورے ہو رہے ہیں۔ آج جب کہ لولے لنگڑے، اندھے بہرے اور اپاہج لوگ قوم کی سیادت کے دعویدار بنے ہوئے ہیں، میسور کا اولوالعزم حکمران اپنی تلوار کی نوک سے اس ملک کے نقشے پر نئی نئی لکیریں کھینچ رہا ہے۔ جب میں نے دلی کی جامع مسجد میں آپ کی تقریر سنی تھی تو میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھی بننے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ ایک بار حیدر علی کو دیکھ آئیں۔"

معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا: "میرے ساتھ اکبر خاں بھی آیا ہوا ہے۔ وہ دلی میں آپ سے ملا تھا۔ اگر آپ ایک دو دن ٹھہر جائیں تو ممکن ہے ہم دونوں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔"

اسد خاں نے جواب دیا: "میں ایک دو دن کی بجائے ایک دو ہفتے آپ کے لیے ٹھہر سکتا ہوں۔"

سرکاری مہمان خانے میں پہنچ کر معظم علی دیر تک اسد خاں کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ گفتگو کا موضوع زیادہ تر حیدر علی کی شخصیت تھی۔ قریباً دو گھنٹے کے بعد معظم علی نے اٹھ کر کہا: "اب مجھے اجازت دیجیے!"

اسد خاں نے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "تو اس بات کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ آپ میرے ساتھ جا رہے ہیں؟"

"ہاں" معظم علی نے جواب دیا۔ "اور اگر خدا کا فضل شامل حال رہا تو ہم انشاءاللہ

پرسوں علی الصباح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"



اکبر خاں اپنے کمرے کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ معظم علی کو دیکھتے ہی آگے بڑھا اور بولا: "آپ نے بہت دیر لگائی۔ میں بہت پریشان تھا۔"

معظم علی نے جواب دیا: "میں کتب خانے سے نکلا تو راستے میں اچانک اسد خاں سے ملاقات ہو گئی۔ یہ اسد خاں وہی ہے جو ہمیں دلی میں ملا تھا۔ ہم پرسوں اس کے ساتھ سرنگاپٹم جا رہے ہیں۔ تم تیار ہونا۔"

اکبر خاں نے جواب دیا: "میں تیار ہوں لیکن ہمیں بہت جلد واپس آنا پڑے گا۔ مجھے گھر سے نکلے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں۔"

معظم علی نے جواب دیا: "ہم جلد ہی واپس آجائیں گے۔"

اکبر خاں نے سوال کیا: "آپ بھائی جان کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے ہیں؟"

"نہیں وہ یہیں رہیں گی۔ شیخ فخرالدین کہاں ہیں؟"

"وہ اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"میں ابھی ان سے مل کر آتا ہوں۔" معظم علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا شیخ فخرالدین کے دفتر میں داخل ہوا۔ شیخ فخرالدین اپنے منشی کو کوئی خط لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے معظم علی کو اپنے قریب بٹھا لیا اور منشی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "میں تمھیں کچھ دیر بعد بلاؤں گا۔ اس وقت ان سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

جب منشی کمرے سے باہر نکل گیا تو شیخ فخرالدین نے معظم علی کی طرف دیکھ کر سوال کیا: "آپ سارا دن کہاں رہے؟"

معظم علی نے اس کے جواب میں اسد خاں سے اچانک ملاقات کی تفصیلات بیان کر دیں۔ بالآخر جب اس نے سرنگاپٹم جانے کے متعلق اپنا ارادہ ظاہر کیا تو فخرالدین نے کہا:

یہ ضروری ہے کہ آپ یا تو اگلے مہینے جائیں یا اس ماہ کے اختتام سے پہلے یہاں واپس آجائیں۔ اگلے مہینے کی تین تاریخ کو عطیہ کی برات آنے والی ہے اور میری یہ خواہش ہے کہ آپ اور اکبر خاں اس موقع پر موجود ہوں۔"

"میں ضرور پہنچ جاؤں گا لیکن ان کی منگنی کہاں ہوئی ہے؟"

"ادھونی کے ایک جاگیردار کے لڑکے کے ساتھ۔ وہ بسالت جنگ کے رشتے دار ہیں۔ لڑکے کا نام طاہر بیگ ہے اور وہ ادھونی کی فوج میں ملازم ہے۔ عطیہ کی شادی پر آپ کا موجود ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اب بلقیس بھی بڑی ہو چکی ہے اور میں ایک ہی دن دونوں بہنوں کی شادی کے امکانات پر غور کر رہا ہوں۔"

"بلقیس کا رشتہ کہاں طے ہوا ہے؟" معظم علی نے سوال کیا۔

فخرالدین مسکرایا: "بلقیس کے لیے میں نے جس نوجوان کا انتخاب کیا ہے۔ اسے آپ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔"

معظم علی نے غور سے فخرالدین کی طرف دیکھا اور جھجکتے ہوئے کہا: "میں جس نوجوان کو جانتا ہوں اس کا نام اکبر خاں ہے اور اگر آپ نے اسے پسند فرمایا ہے تو میں آپ کے حسنِ انتخاب کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بلقیس اگر میری سگی بہن ہوتی تو بھی مجھے اس سے زیادہ خوشی نہ ہوتی۔"

فخرالدین نے کہا: "بلقیس اور عطیہ دونوں آپ کو سگے بھائی سے زیادہ عزیز سمجھتی ہیں۔"

"میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے ایک بھائی کا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ میں ابھی اکبر خاں سے اس کا فیصلہ کرتا ہوں۔"

فخرالدین نے کہا: "اکبر خاں سے فیصلہ ہو چکا ہے۔ ہمیں صرف ان کے بھائی جان کی رضامندی کی ضرورت تھی۔ آج صبح جب آپ باہر گئے تھے تو ہمارے گھر میں یہ مسئلہ پیش ہوا تھا۔ پھر جب میں نے اکبر خاں سے کہا تو اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا تھا اور

آپ کا یہ کہنا غلط ہے کہ آپ نے ایک بھائی کا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ آپ اسے بلاوجہ یہاں لائے تھے۔"

معظم علی نے مسکراتے ہوئے کہا: "بات یہ ہے کہ مجھے یہ جوڑا ابتدا ہی سے بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ بارہا میرے دل میں خیال آیا کہ آپ کو خط لکھوں لیکن جرأت نہ ہوئی اور اب میرا خیال تھا کہ سرنگاپٹم سے واپس آکر یہ مسئلہ آپ کے سامنے پیش کروں گا اور پیش کرنے سے پہلے اپنے گھوڑوں پر زینیں ڈلوا دوں گا۔ تاکہ اگر آپ ہمیں فوراً گھر سے باہر نکالنے کی ضرورت محسوس کریں تو ہمیں پریشانی نہ ہو۔"

فخرالدین نے کہا: "میرے دوست میں پتھر اور ہیرے میں تمیز کر سکتا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی، اکبر خاں کے کمرے میں داخل ہوا۔ اکبر خاں اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

معظم علی نے کہا: "اکبر تمہیں گھر سے آتے بہت دن ہو گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم سرنگاپٹم جانے کی بجائے آج ہی لکھنؤ روانہ ہو جائیں۔ تم نوکروں کو گھوڑے تیار کرنے کا حکم دو۔ ہم شام سے پہلے پہلے ایک منزل طے کرنا چاہتے ہیں۔"

اکبر خاں کے چہرے پر اچانک مایوسی کے بادل چھا گئے۔

معظم علی نے پھر کہا: "جاؤ اکبر دیر نہ کرو! میں شیخ فخرالدین سے اجازت لے چکا ہوں۔"

"لیکن بھائی جان...!"

"کیا ہے اکبر؟"

"کچھ نہیں بھائی جان!" اس نے بددلی سے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"ارے ٹھہرو کیا بات ہے، تم واپس نہیں جانا چاہتے؟"

اکبر خاں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور معظم علی نے ایک قہقہہ لگانے کے بعد آگے بڑھ کر

اسے گلے لگالیا۔

"نالائق تم بہت خوش قسمت ہو۔ بیٹھ جاؤ اور مجھے بتاؤ شیخ صاحب کے ساتھ تمھاری کیا باتیں ہوئی تھیں ؟"

اکبرخاں کا دل دھڑک رہا تھا اور اس کے چہرے پر حیا کی سرخی چھا رہی تھی۔

تیسرے دن علی الصباح معظم علی اور اکبرخاں، اسدخاں کے ہمراہ سرنگاپٹم کا رخ کر رہے تھے۔



ایک روز دوپہر کے وقت معظم علی اور اس کے ساتھی سرنگاپٹم میں داخل ہوئے۔ اسدخاں انھیں اپنے مکان پر ٹھہرا کر حیدرعلی کے پاس چلا گیا۔ شام کے وقت اس نے واپس آکر معظم علی کو اطلاع دی کہ نواب حیدرعلی کل صبح آپ سے ملاقات کریں گے۔

اگلے دن صبح کی نماز کے تھوڑی دیر بعد معظم علی اور اکبرخاں اپنے میزبان کے ساتھ شاہی محل کی طرف چل دیئے، وہ پائیں باغ میں داخل ہوئے تو اسدخاں نے باغ کے درمیان ایک سائبان کے قریب پہنچ کر کہا "آپ یہاں تشریف رکھیں۔ اس وقت وہ عام طور پر یہیں ملاقات کیا کرتے ہیں۔"

وہ سائبان کے نیچے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد انھیں دو نوکر اور ایک کم سن لڑکا باغ میں بھاگتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان کے آگے آگے ایک شیر کا بچہ تھا۔ کمسن لڑکا نوکروں سے چند قدم پیچھے تھا۔ تھوڑی دور جا کر نوکروں نے شیر کے بچے کو گھیر لیا۔ ایک نوکر اس کے گلے کی زنجیر پکڑنے کے لیے جھکا لیکن اس نے غرّا کر اپنے دونوں اگلے پنجے اٹھائے اور نوکر بدحواس ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ دوسرے نوکر نے اپنی جگہ سے ہلنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ کمسن لڑکا ہنستا ہوا آگے بڑھا اور اس نے اطمینان سے شیر کے جسم پر ہاتھ پھیرنے کے بعد اس کی زنجیر پکڑ لی۔

"اب اسے لے جاؤ!" لڑکے نے نوکر کی طرف زنجیر بڑھاتے ہوئے کہا۔

"حضور یہ کاٹتا ہے۔"

"تم یوں ہی ڈرتے ہو۔ دیکھو!" لڑکے نے یہ کہہ کر اپنا ہاتھ شیر کے بچے کے منہ کے سامنے کر دیا۔

جب شیر کا بچہ لڑکے کا ہاتھ چاٹنے کے بعد اس کے پاؤں پر لیٹ گیا تو اس نے فاتحانہ انداز سے نوکروں کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تم اگر اس سے ڈرو گے تو یہ خواہ مخواہ کاٹے گا۔"

ایک نوکر نے کہا۔ "نہیں حضور اگر ہم نہ ڈریں تو بھی یہ کاٹتا ہے۔"

"یہ کون ہے ؟" معظم علی نے اسدخاں سے سوال کیا۔

"یہ شہزادہ فتح علی ٹیپو ہیں۔ انھیں شیروں کا بہت شوق ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "ایک شہزادے کے لیے شیروں سے بہتر کیا کھلونے ہو سکتے ہیں۔ انھیں بلایئے۔"

اسدخاں نے اٹھ کر آواز دی۔ "شہزادہ صاحب! ادھر تشریف لایئے!"

ٹیپو، شیر کا بچہ نوکروں کے حوالہ کر کے اطمینان سے قدم اٹھاتا ہوا سائبان کی طرف بڑھا۔ معظم علی اور اکبرخاں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ٹیپو نے "السلام علیکم" کہہ کر یکے بعد دیگرے ان کے ساتھ مصافحہ کیا اور معظم علی اور اکبرخاں کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اسدخاں نے کہا۔ "شہزادہ صاحب! یہ معظم علی خاں ہیں۔ آپ مرشدآباد کے رہنے والے ہیں۔ پلاسی کی جنگ سے پہلے آپ سراج الدولہ کی فوج میں عہدہ دار تھے اور یہ روہیلکھنڈ کے سردار اکبرخاں ہیں۔ آپ پانی پت کی جنگ کے متعلق بہت سوالات کیا کرتے ہیں اور یہ دونوں اس جنگ میں حصہ لے چکے ہیں۔"

شہزادہ ٹیپو نے کہا۔ "مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو

تو آپ مجھے جنگ کا نقشہ بنا دیں۔ پھر میں آپ سے چند سوالات پوچھوں گا۔"

ٹیپو کی عمر گیارہ سال سے زیادہ نہ تھی لیکن اس کا چہرہ اس کی عمر کے مقابلے میں بہت سنجیدہ تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ چمک دار آنکھوں سے غیر معمولی ذہانت مترشح تھی۔ تاہم معظم علی کے نزدیک وہ ایک کمسن بچہ تھا۔

اس نے کہا۔ "بہت اچھا میں آپ کو نقشہ بنا دوں گا۔"

ٹیپو نے کہا۔ اگر آپ کو فرصت ہو تو میں ابھی کاغذ قلم منگواتا ہوں۔"

حیدر علی محل کی طرف سے نمودار ہوا اور اسد خاں نے جلدی سے اٹھ کر کہا۔ "وہ آ رہے ہیں!"

معظم علی اور اکبر خاں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

شہزادہ ٹیپو نے کہا۔ "آپ ابا جان سے ملاقات کے بعد کہیں غائب نہ ہو جائیں۔"

اسد خاں نے کہا۔ "شہزادہ صاحب آپ مطمئن رہیں۔ یہ میرے مہمان ہیں اور جب تک یہ نقشہ نہیں بنائیں گے میں انھیں کہیں غائب نہیں ہونے دوں گا۔"

تھوڑی دیر بعد حیدر علی سائبان میں داخل ہوا اور اسد خاں اور اس کے ساتھیوں سے مصافحہ کرنے کے بعد بے تکلفی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ معظم علی ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"جی ہاں"

"اور آپ اکبر خاں ہیں؟"

"جی ہاں۔" اکبر خاں نے جواب دیا۔

معظم علی اور اکبر خاں کی نگاہیں رعب و جلال کے اس پیکر مجسم کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ حیدر علی کی آنکھیں اور اس کے چہرے کے خدوخال یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ حکم دینے

کے لیے پیدا ہوا ہے۔

حیدر علی نے کہا۔ "اسد خاں تمھاری میزبانی ختم ہو چکی ہے اور آج سے یہ میرے مہمان ہیں۔" پھر وہ معظم علی کی طرف متوجہ ہوا۔ "میں اسد خاں کی زبانی آپ کی سرگذشت سن چکا ہوں اور میری یہ خوش قسمتی ہے کہ آپ نے یہاں تک آنے کی تکلیف گوارا کی ہے۔ اسد خاں نے مجھے بتایا ہے کہ آپ بہت جلد واپس جانا چاہتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کو اس ملک کے مسلمانوں کے لیے کسی مضبوط قلعے کی تلاش ہے تو آپ دوبارہ یہاں آئیں گے۔ جو تڑپ آپ کو پانی پت کے میدان میں لے گئی تھی اور جو ولولہ آپ کو حیدر آباد لایا ہے۔ وہ کسی دن آپ کو یہاں آنے پر مجبور کر دے گا۔ کاویری کے پانی کے بغیر آپ کی پیاس نہیں بجھے گی۔ اگر آپ ایک اچھے سپاہی ہیں تو میسور کی فوج میں آپ کی جگہ خالی ہے۔ اگر آپ مدبر اور سیاست دان ہیں تو آپ یہ محسوس کریں گے کہ آپ کی یہاں ضرورت ہے۔ اگر آپ کو تجارت کا شوق ہے تو میسور میں آپ کے لیے ترقی کے راستے کھلے ہیں اور اگر آپ ایک بلند پایہ عالم ہیں تو یہاں آپ کے قدر دان موجود ہیں۔ اسد خاں نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کے سفر کا مقصد اس ملک کے مسلمان حکمرانوں میں اتحاد اور تعاون کے امکانات معلوم کرنا ہے۔ آپ میری طرف سے ان سب کو یہ پیغام دے سکتے ہیں کہ جب وہ کسی اجتماعی خطرے کی مدافعت کے لیے متحد ہوں گے تو مجھے سب سے اگلی صف میں پائیں گے۔

میرے نزدیک ہندوستان کے مستقبل کے لیے سب سے بڑا خطرہ انگریز ہیں اور جب تک جنوب میں ان کے جھنڈے سرنگوں نہیں ہو جاتے میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ میں جنوبی ہندوستان کو انگریزوں کی ہوس ملک گیری سے بچانے کے لیے نظام کی دوستی کا طلبگار ہوں اور اگر مرہٹے پُر امن رہے تو میں ان کے ساتھ بھی الجھنا پسند نہیں کروں گا۔"

معظم علی نے کہا۔ "خدا آپ کے ارادوں میں برکت دے لیکن مجھے یہ اندیشہ ہے

کہ نظام انگریزوں کے خلاف آپ کا ساتھ دینے کی بجائے انگریزوں کی مدد سے میسور پر قبضہ جمانے کی کوشش کرے گا اور مرہٹے بھی آپ کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔ پانی پت کی شکست کے بعد وہ جنوبی ہند میں ایک طاقتور مسلم حکمران کا عروج برداشت نہیں کریں گے۔ آپ کو بیک وقت ان تین طاقتوں کے خلاف جنگ لڑنی پڑے گی اور مجھے یہ بھی یقین نہیں کہ اودھ اور دلی کے مفلوج اور بے بس امراء آپ کو کوئی مدد دے سکیں گے۔ میرا مقصد آپ کی حوصلہ شکنی نہیں۔ لیکن بنگال کے واقعات نے مجھے بہت زیادہ حقیقت پسند بنا دیا ہے۔"

حیدر علی مسکرایا "ایک حقیقت پسند آدمی کی گفتگو میری حوصلہ شکنی یا دلآزاری کا باعث نہیں ہو سکتی۔ میں جانتا ہوں کہ ایک دن مجھے تنہا ان بھیڑیوں اور گیدڑوں کی افواج کے سامنے سینہ سپر ہونا پڑے گا لیکن مجھے خدا کی اعانت پر بھروسہ ہے، اگر مجھے کام کرنے کی مہلت مل گئی تو میں میسور کی سرزمین کو ایک ناقابل تسخیر قلعے میں تبدیل کر دوں گا۔ میں وہ فوج تیار کروں گا جو ہر میدان میں ان حریص طالع آزماؤں کے دانت کھٹے کر سکے گی۔ میرے جھنڈے تلے کرائے کے سپاہی نہیں ہوں گے بلکہ وہ لوگ ہوں گے جنھیں اس وطن کی خاک اپنی جانوں سے زیادہ عزیز ہوگی۔ جب تک میرے ہاتھ تلوار اٹھا سکیں گے میں لڑتا رہوں گا اور آپ جیسے لوگ حیدر آباد ا[illegible] د[illegible] کے مسلمانوں کو یہ بتا سکیں گے کہ میسور کی جنگ تمھاری بقا اور تمھاری عزت اور آزادی کی جنگ ہے۔"

حیدر علی کی گفتگو کے دوران میں معظم علی یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ برسوں بے آب و گیاہ صحراؤں میں گھومنے کے بعد اپنے سپنوں کی وادی میں پہنچ گیا ہے۔ اس کا دل حیدر علی کے لیے عقیدت اور محبت کے جذبات سے لبریز تھا۔ اس نے کہا۔ "مجھے یہاں آنے کا فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ میں ابھی سے کاویری کے پانی کی مٹھاس محسوس کر رہا ہوں۔"

حیدر علی نے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کا انتظار کروں

گا لیکن جتنے دن آپ یہاں ہیں، میں آپ کی موجودگی سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ اب انشاءاللہ شام کے وقت ملاقات ہوگی۔"

سائبان سے تھوڑی دور محل کے دروازے کے سامنے چند سپاہی اور افسر گھوڑوں کی باگیں تھامے کھڑے تھے۔ حیدر علی نے معظم علی کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد اکبر خاں سے ہاتھ ملایا اور شہزادہ ٹیپو کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "آؤ فتح علی!"

ٹیپو نے کہا۔ "ابا جان مجھے ان سے ایک کام ہے۔ میں تھوڑی دیر تک پہنچ جاؤں گا۔"

حیدر علی نے جواب طلب نگاہوں سے اسد خاں کی طرف دیکھا اور اس نے کہا۔ "عالی جاہ! شہزادہ ٹیپو ان سے پانی پت کے میدان کا نقشہ بنوانا چاہتے ہیں۔"

حیدر علی نے مسکرا کر معظم علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھا میں نہیں کہتا تھا کہ یہاں آپ کی ضرورت ہے؟"

تھوڑی دیر بعد حیدر علی گھوڑے پر سوار ہو کر سپاہیوں کے ساتھ باہر نکل گیا اور معظم علی اکبر خاں، اسد خاں اور شہزادہ فتح علی ٹیپو کے ساتھ شاہی مہمان خانے میں داخل ہوا۔ شہزادہ ٹیپو کے حکم سے ایک سپاہی کاغذ اور قلم لے آیا اور معظم علی قالین پر بیٹھ کر نقشہ بنانے میں مصروف ہو گیا۔ معظم علی کا خیال تھا کہ ایک کمسن لڑکے کو مطمئن کرنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگے گا لیکن شہزادہ ٹیپو کے غیر متوقع سوالات کے جواب میں اسے میدان جنگ کی تمام تفصیلات اور جزئیات پر تبصرہ کرنا پڑا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد کاغذ ان بیشمار نشانات اور لکیروں سے بھر چکا تھا۔ جن سے فریقین کے پڑاؤ، ان کے رسد اور کمک کے راستوں، ان کی افواج کی صفوں اور ان کے توپخانوں اور مختلف معرکوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔

نقشہ ختم کرنے کے بعد معظم علی یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ پانی پت کی جنگ کی پوری تاریخ بیان کر چکا ہے۔ جب کمسن شہزادہ نقشہ لے کر معظم علی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد

وہاں سے چلا گیا تو اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، خدا اس لڑکے کو نظرِ بد سے بچائے۔ بعض اوقات اس کے سوالات سے مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنے سپہ سالار سے باتیں کر رہا ہوں۔ شہزادہ کی عمر کتنی ہے؟"

اسد خاں نے جواب دیا۔"ان کی عمر بارہ سال سے کم ہے لیکن حیدر علی کے بیٹے کے منہ سے ایسی باتیں عجیب معلوم نہیں ہونی چاہئیں۔ قدرت نے اسے ایک غیر معمولی ذہانت عطا کی ہے۔ کل اگر آپ اس کا امتحان لیں تو یہ نقشہ اسے اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح یاد ہوگا۔"

معظم علی نے کہا۔"پہلے میرا خیال تھا کہ بچے کو بہلانے کے لیے چند الٹی سیدھی لکیریں کھینچ دوں گا لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں نے یہ غلطی نہیں کی۔ اس لڑکے سے باتیں کرنے کے بعد میں یہ محسوس کرتا ہوں کسی دن میرے جیسے ہزاروں انسان اس کی رفاقت میں جینا اور مرنا اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھیں گے۔ اسد خاں، تم درست کہتے تھے۔ مجھے بہت جلد دوبارہ یہاں آنا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ میں حیدرآباد سے لکھنؤ جانے کا خیال ترک کر دوں۔"

اگلی صبح اسد خاں، معظم علی اور اکبر خاں کو شہر میں اسلحہ سازی کا کارخانہ دکھانے کے لیے لے گیا جہاں تلواریں، بندوقیں اور توپیں بنائی جا رہی تھیں۔ بندوقوں کے کارخانے کی نگرانی ایک فرانسیسی ماہر کے سپرد تھی۔ کارخانے کے منتظم نے معظم علی کو چند بندوقیں دکھانے کے بعد کہا۔"یہ بندوقیں ولایت کی بہترین بندوقوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں اور ہمیں امید ہے کہ ہم اگلے سال تک توپیں بنانے کا کام بھی شروع کر دیں گے۔"

اسلحہ سازی کا کارخانہ دیکھنے کے بعد اسد خاں اپنے مہمانوں کو فوجی مستقر میں لے گیا جہاں ہزاروں سپاہی پریڈ کرنے اور دفاعی مورچے تعمیر کرنے میں مصروف تھے۔ وسیع میدان میں کہیں نیزہ بازی اور کہیں چاند ماری ہو رہی تھی۔ حیدر علی اور شہزادہ ٹیپو گھوڑوں

پر سوار ہو کر مختلف فوجی کھیلوں میں حصہ لینے والے سپاہیوں کی کارگزاری دیکھ رہے تھے۔

اسد خاں نے معظم علی سے کہا۔"اگر آپ میسور کا دورہ کریں تو آپ کو یہاں کے ہر شہر میں اسی طرح کا جوش اور ولولہ دکھائی دے گا۔ حیدر علی ملک کے ہر باشندے کو سپاہی بنانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔"

معظم علی نے سوال کیا۔"انھوں نے شہزادہ ٹیپو کی تعلیم کا کیا انتظام کیا ہے؟"

اسد خاں نے جواب دیا۔"حیدر علی کے سامنے اہم ترین مسئلہ ٹیپو کی تعلیم ہے۔ ٹیپو کے استاد اپنے وقت کے بہترین عالم ہیں۔ نواب حیدر علی یہ کہا کرتے ہیں کہ قدرت نے میرے ہاتھ میں صرف تلوار دی ہے لیکن میرے بیٹے کے ہاتھ میں قلم بھی ہوگا۔ ٹیپو کی ذہانت کا یہ عالم ہے کہ انھیں ایک سبق دوبارہ پڑھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔"



فرحت کی ماں اپنے رشتہ داروں کے ہاں گئی ہوئی تھی اور فرحت اپنے کمرے میں بیٹھی عطیہ سے باتیں کر رہی تھی۔ ننھا صدیق علی ایک جھولے میں سو رہا تھا۔ بلقیس بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا۔"بھابی جان! بھابی جان! بھائی جان آ گئے!"

فرحت کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ عطیہ نے ایک شرارت آمیز تبسم کے ساتھ بلقیس کی طرف دیکھا اور کہا۔"بلقیس تم اتنی بدحواس کیوں ہو۔ بھائی جان کے ساتھ تمھارے دولھا میاں بھی آئے ہیں یا نہیں؟"

بلقیس پریشانی کی حالت میں یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔ فرحت نے مسکرا کر کہا۔"عطیہ دیکھو میری بہن کو مت چھیڑو۔ آؤ بلقیس بیٹھ جاؤ!"

بلقیس آگے بڑھ کر فرحت کے قریب بیٹھ گئی۔ عطیہ نے اسے دوبا
کہا۔"بھابی جان سچ کہتی ہوں بلقیس کئی دن سے پریشان تھی اور آج ص

ہی بدحواس تھی۔"

بلقیس اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور سراپا احتجاج بن کر بولی۔" بھابی جان! آپا مجھے تنگ کرتی ہیں!"

" نہ بھئی عطیہ میری ننھی بہن کو تنگ نہ کرو۔"

عطیہ نے کہا۔" بھابی جان یہ بالکل مصنوعی غصہ ہے۔ ہم پر خواہ مخواہ رعب ڈالا جا رہا ہے۔ ورنہ یہ دل میں ہنس رہی ہے۔"

فرحت نے کہا۔" ہاں بھئی تم سچ کہتی ہو یہ تو واقعی ہنس رہی ہے۔"

بلقیس تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی لیکن دروازے کے باہر پہنچ کر وہ اچانک رکی اور مڑ کر کمرے کی طرف جھانکتے ہوئے بولی۔" بھابی جان! بھائی جان وہ اوپر آرہے ہیں۔"

عطیہ بدحواس ہو کر اٹھی اور بھاگتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔

جب وہ برآمدے سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تو بلقیس نے پیچھے سے اچانک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔" ٹھہریئے آپا جان آپ کیوں بھاگ رہی ہیں وہ تو ماموں جان کے دفتر میں گئے ہیں۔"

" بڑی چڑیل ہو تم!" عطیہ نے مڑ کر کہا۔

چند دن بعد اسی مکان کے نچلے حصے کے ایک کمرے میں عطیہ اور بلقیس دلھنوں کے لباس اور قیمتی زیورات پہنے بیٹھی تھیں عطیہ کی برات دو دن شیخ فخرالدین کے یہاں قیام کرنے کے بعد واپس جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ فرحت دلھنوں کے گرد جمع ہونے والی عورتوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے عطیہ اور بلقیس کے گلوں میں یکے بعد دیگرے موتیوں کا ایک ایک ہار ڈالتے ہوئے کہا۔" یہ تمھارے بھائی جان کا تحفہ ہے۔"

عطیہ کی برات بڑی دھوم دھام سے آئی تھی۔ فخرالدین نے اپنی بہن کو یہ احساس نہ

ہونے دیا کہ اس کی بیٹیاں یتیم ہیں۔ اس نے دونوں لڑکیوں کو بیش قیمت زیورات کے علاوہ دو دو ہاتھی اور تیس تیس گھوڑے جہیز میں دیئے۔

عطیہ کا شوہر ایک خوش وضع نوجوان تھا اور معظم علی اس کے ساتھ پہلی ملاقات میں ہی بے تکلف ہو چکا تھا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے معظم علی کو بڑے اصرار کے ساتھ ادھونی آنے کی دعوت دی۔ عطیہ کی سواری کو رخصت کرنے کے بعد معظم علی نے مہمان خانے کے اس کمرے میں داخل ہوا جہاں اکبر خاں شادی کے لباس میں بیٹھا ہوا تھا۔

"کیوں بھئی کیا سوچ رہے ہو؟" اس نے کہا۔

"کچھ نہیں بھائی جان۔" اکبر خاں نے جواب دیا۔" مجھے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ میری وجہ سے شیخ فخرالدین کی سبکی ہوئی ہوگی۔ حیدرآباد کے امرا میری طرف دیکھ کر ہنستے ہوں گے۔ میں رسومات کا قائل نہیں لیکن شیخ فخرالدین کی خاطر ہمیں روہیلکھنڈ سے برات کے ساتھ آنا چاہیئے تھا۔"

معظم علی نے کہا۔" ارے میں سمجھا تھا کہ تم پانی پت کی جنگ کے متعلق سوچ رہے ہو۔ شیخ فخرالدین تم سے زیادہ سمجھدار ہیں۔ اگر وہ دکھاوے کی ضرورت محسوس کرتے تو اسی شہر سے دس ہزار آدمی تمھاری برات میں جمع ہو سکتے تھے۔ تم بہت خوش قسمت ہو اکبر! میں نے تمھارے لیے اس لڑکی کو اس دن منتخب کیا تھا۔ جب حیدرآباد کے راستے میں ان لوگوں سے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ شیخ فخرالدین تمھیں کم از کم ایک ہفتہ اور یہاں ٹھہرانے پر مصر ہیں اور اتنے دن مجھے بھی یہاں رکنا پڑے گا۔ اس کے بعد تمھاری منزل روہیلکھنڈ ہوگی اور میرا رخ سرنگاپٹم کی طرف ہوگا۔ میں لکھنؤ جانے کا خیال ترک کر چکا ہوں۔ وہاں میری جائداد میں شیر علی اور تم برابر کے حصہ دار ہو۔ میں نے انھیں یہ لکھ دیا ہے کہ آئندہ وہ تجارت میں میرے حصے کا منافع تمھیں بھیجتے رہیں۔ آج تمھاری سیر و سیاحت کا زمانہ ختم ہوتا ہے۔ شادی کے بعد تمھیں اپنے گھر پہنچ کر نئی نئی ذمہ داریوں کا احساس ہوگا۔"

اکبر خاں نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "بھائی جان یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ ہمارے راستے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ مجھے آپ کی جائیداد کی قطعاً ضرورت نہیں لیکن آپ کی رفاقت سے محروم ہونا میرے لیے ناقابل برداشت ہوگا۔ اگر آپ سرنگاپٹم جانا ضروری سمجھتے ہیں تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیے۔ ورنہ روہیلکھنڈ میں میرے گھر کے دروازے آپ کے لیے ہر وقت کھلے ہیں۔ آپ وہاں کیوں نہیں چلتے؟ میں آپ کو کبھی یہ احساس نہیں ہونے دوں گا کہ آپ وہاں ایک اجنبی ہیں۔"

معظم علی نے شفقت سے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا "اکبر میں اپنی منزل دیکھ چکا ہوں۔ میں کسی جائے پناہ کی تلاش میں نہیں ہوں۔ بلکہ مجھے صرف اپنے فرائض کا احساس سرنگاپٹم لے جا رہا ہے۔"

"تو پھر میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔"

"نہیں اکبر! تمھارے فرائض تمھیں روہیلکھنڈ بلا رہے ہیں۔ تم میری طرح تنہا نہیں ہو۔ تم ایک قبیلے کے سردار ہو اور ان لوگوں کے تم پر کچھ حقوق ہیں۔ میرے ساتھ رہ کر تم نے جو تجربات حاصل کیے ہیں وہ تمھاری رہنمائی کریں گے۔ میں تمھیں روہیلکھنڈ کا بہترین سردار دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب کبھی وہاں جاؤں تو تمھارے قبیلے کے ہر فرد کے چہرے پر مسرت کی مسکراہٹیں دیکھوں۔ میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ تم روہیلکھنڈ کے مسلمانوں کی آزادی کے پاسبان بنو اور تمھارے بعد تمھارے بیٹے یا پوتے اپنے وطن کی آزادی کا پرچم بلند رکھیں۔

اگلے ہفتے یہاں سے ایک قافلہ لکھنؤ جا رہا ہے۔ شیخ فخرالدین کی خواہش ہے کہ تم اس قافلے کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ پہلے وہ تمھیں یہاں رکھنے پر مصر تھے لیکن میرے ساتھ بحث کرنے کے بعد وہ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ تمھیں اپنے گھر جانا چاہیے۔"

شادی سے دس دن بعد اکبر خاں، حیدرآباد سے لکھنؤ کا رخ کر رہا تھا۔ بلقیس اپنی

دو خادماؤں کے ساتھ ایک بہلی میں سوار تھی۔ جہیز کے ہاتھیوں، گھوڑوں اور دوسرے ساز و سامان کی حفاظت کے لیے فخرالدین نے قافلے کو ناکافی سمجھ کر ان کے ساتھ اپنے پچاس مسلح نوکر روانہ کر دیئے تھے۔ اکبر خاں شہر سے باہر نکلتے ہی معظم علی سے رخصت ہونا چاہتا تھا لیکن معظم علی کچھ دور اس کا ساتھ دینے پر مصر تھا۔ شہر سے ایک کوس دور آنے کے بعد اکبر خاں نے کہا۔ "بھائی جان! آپ بہت دور آگئے ہیں۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "نہیں اکبر خاں میں کچھ دور اور تمھارے ساتھ چلوں گا۔"

کچھ فاصلہ اور طے کرنے کے بعد اکبر خاں نے پھر ایک بار خدا حافظ کہنے کی کوشش کی لیکن معظم علی نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ قافلے نے ایک بستی سے باہر پڑاؤ ڈالا۔ نوکروں نے بلقیس کا خیمہ نصب کر دیا۔ عشاء کی نماز کے بعد بلقیس اپنے خیمے میں سو رہی تھی اور معظم علی اور اکبر خاں تھوڑی دور کھلی ہوا میں ایک چٹائی پر بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے۔

اگلے دن صبح کی نماز کے بعد جب قافلہ دوبارہ روانہ ہونے لگا تو اکبر خاں نے کہا۔ "بھائی جان آپ نے بہت تکلیف اٹھائی ہے اب آپ اس سے آگے نہیں جائیں گے۔ ورنہ آپ کو روہیلکھنڈ تک ہمارا ساتھ دینا پڑے گا۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "نہیں، اب میں اس سے آگے نہیں جاؤں گا۔ اب تم اپنے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ اور دیکھو میں تمھاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھنا چاہتا — خدا حافظ —!" معظم علی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

اکبر خاں مصافحہ کرنے کی بجائے بے اختیار اس کے ساتھ لپٹ گیا اور اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان آج تو میں آپ کی آنکھوں میں بھی آنسو دیکھ رہا ہوں۔"

"جاؤ، نالائق!" معظم علی کی آواز اس کے حلق میں بیٹھ گئی۔

اکبر خاں کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹا اور

گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ قافلہ چند قدم آگے جا چکا تھا۔ اکبر خاں نے گھوڑے کو ایڑ لگانے سے پہلے ایک ثانیہ کے لیے مڑ کر معظم علی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اس نے اپنے دل میں کہا "خدا حافظ! میرے رفیق، میرے دوست، میرے بھائی، میرے باپ، خدا حافظ!"

معظم علی کچھ دیر اپنے گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا رہا۔ پھر اس نے رکاب میں پاؤں رکھا اور گھوڑے کی باگ موڑ لی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک ٹیلے پر گھوڑا روک کر درختوں میں روپوش ہوتے ہوئے قافلے کی آخری جھلک دیکھ رہا تھا۔

تیسرے دن معظم علی ایک چھوٹے سے قافلے کے ساتھ میسور کا رخ کر رہا تھا۔

سولھواں باب

سرنگا پٹم میں حیدر علی کی رفاقت کے ایام معظم علی کے لیے قدرت کا بہترین انعام تھے۔ میسور کی سرزمین اس کے خوابوں کی جنت تھی اور زندگی کی کوئی خوشی ایسی نہ تھی جو اسے میسر نہ تھی۔ وہ ایک ایسے قافلے کے ساتھ زندگی کی شاہراہ پر قدم رکھ چکا تھا جس کے مسافروں کے دل ذوقِ یقین سے لبریز تھے۔ وہ اپنی منزل مقصود دیکھ چکا تھا اور اسے اپنے راستے کے نشیب و فراز کے متعلق کوئی پریشانی نہ تھی۔ اسے زندہ رہنے کے لیے ایک مقصد کی ضرورت تھی اور سرنگا پٹم میں آباد ہونے کے بعد وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی زندگی کا ہر سانس ایک مقصد کے لیے وقف ہے۔ اس نے حیدر علی کی فوج کے پانچ سو سواروں کے کماندار کی حیثیت سے سرنگا پٹم میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا اور پانچ سال کے عرصہ میں اپنی محنت، قابلیت اور فرض شناسی کی بدولت سرنگا پٹم کی محفوظ فوج کے تین ہزار جوانوں کا سالارِ اعلیٰ بن گیا۔ نظم و ضبط اور مستعدی کے لحاظ سے اس سے تربیت حاصل کرنے والے سپاہیوں کو حیدر علی کی فوج میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ سرنگا پٹم پہنچنے کے پہلے اور تیسرے سال اس کے ہاں دو لڑکے اور پیدا ہوئے جن میں سے ایک کا نام مسعود علی اور دوسرے کا نام انور علی رکھا گیا۔ اکبر خاں کے ساتھ کچھ عرصہ اس کی خط و کتابت جاری رہی لیکن آہستہ آہستہ نامہ و پیام کا یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

ان تھک مصروفیت کے باوجود اسے فرحت کی رفاقت میں زندگی کے ماہ و سال

ایک خواب معلوم ہوتے تھے۔ اس کا مکان سرنگاپٹم کے چند بہترین مکانات میں سے ایک تھا۔ میسور کی فوج کے بڑے بڑے آزمودہ کار جرنیل اور افسر اسے اپنا دوست اور رفیق سمجھتے تھے۔ حیدر علی اہم ترین قومی اور سیاسی معاملات میں اس سے مشورہ لیا کرتا تھا اور وہ کمسن شہزادہ ٹیپو جس کی روشن پیشانی پر ایک قوم کی تقدیر لکھی ہوئی تھی، اپنی فرصت کے لمحات اس کی صحبت میں بسر کیا کرتا تھا۔ معظم علی اپنی رفیقۂ حیات سے اکثر یہ کہا کرتا تھا۔ "فرحت! مجھے قدرت سے اب صرف ایک گلہ ہے اور وہ یہ کہ جب مجھ میں دشوار گذار راستوں پر چلنے کی ہمت تھی تو میرے سامنے تاریکیاں تھیں اور جب میں صبح کی روشنی میں اپنی منزل دیکھ رہا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرے پاؤں زیادہ دیر میرا بوجھ نہیں سہار سکیں گے۔ کاش میں اس ماضی کو واپس لاسکتا جس کی ہر آن زندگی کی دھڑکنوں سے لبریز تھی۔ صدیق، مسعود اور انور خوش نصیب ہیں۔ جب یہ بڑے ہوں گے تو ان کا قافلہ سالار فتح علی خاں ٹیپو ہوگا۔"

جن ایام میں سلطنتِ خداداد میں حوصلوں اور دلولوں کی ایک نئی دنیا آباد ہو رہی تھی۔ ہندوستان کے باقی حصوں میں آئے دن نئے نئے انقلاب آرہے تھے۔

بنگال کا نام نہاد حکمران میر قاسم، جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے میر جعفر کی جگہ گدّی پر بٹھایا تھا۔ ۱۷۶۳ء تک اپنے انگریز سرپرستوں کو اپنی رعایا کا خون مہیا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ بنگال کے عوام روٹی تک کے محتاج ہو چکے تھے لیکن انگریزوں کے مطالبات بڑھتے گئے اور میر قاسم کو اپنا خزانہ خالی کرنے، اپنی بیگمات کا زیور بیچنے ملک کے تاجروں اور زمینداروں کو لوٹنے کے بعد اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس کے پاس ایسٹ انڈیا کمپنی کی بھوک کا کوئی علاج نہیں ہے۔

انگریزوں نے اس سے بنگال کی حکومت کی گدّی چھین کر دوبارہ میر جعفر کے حوالہ کر دی۔ میر قاسم نے بنگال سے بھاگ کر اودھ میں پناہ لی۔ نواب وزیر اودھ اور مغل شہنشاہ شاہ عالم

جو ان دنوں الٰہ آباد میں اپنی بیچارگی کے دن گزار رہا تھا۔ میر قاسم کو مدد دینے پر آمادہ ہو گئے۔ ۱۵ ستمبر ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ میں انھیں شکست ہوئی۔ میر قاسم نے فرار ہو کر جان بچائی اور شہنشاہ جسے ابھی تک دلّی کے تخت پر بیٹھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے جاملا۔ انگریزوں کی فوج نے لکھنؤ کا رخ کیا اور شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ کو مجبوراً انگریزوں سے صلح کرنی پڑی۔ انگریزوں نے نواب وزیر اودھ سے پچاس لاکھ روپیہ تاوان جنگ وصول کیا اور الٰہ آباد اور کورہ کے اضلاع چھین کر شاہ عالم کے حوالے کر دیئے۔ الٰہ آباد کا قلعہ بھی انھوں نے شہنشاہ کے لیے خالی کروالیا۔ اور اس کی حفاظت پر انگریز سپاہیوں کا ایک دستہ متعین کر دیا۔ بالفاظ دیگر دلّی کا برائے نام شہنشاہ الٰہ آباد میں انگریزوں کا دست نگر اور وظیفہ خوار بن گیا اور اودھ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سازشوں کے دروازے کھل گئے۔

۱۷۶۵ء میں میر جعفر نے وفات پائی اور انگریزوں نے اس کے پندرہ سالہ بیٹے نجم الدولہ کو بیس لاکھ روپیہ بطور نذرانہ اور اس کے علاوہ پانچ لاکھ روپیہ سالانہ بطور خراج پیش کرنے کی شرط پر بنگال کی گدّی پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے لوٹ کھسوٹ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

شمال میں احمد شاہ ابدالی اور اس کے گورنروں کی سرگرمیاں اب زیادہ تر سکھوں کی بغاوتوں کو فرو کرنے تک محدود تھیں اور پنجاب کے دوسرے شہروں کے علاوہ چہار محل لاہور، جالندھر، دوآب، سرہند اور ملتان کے علاقے سکھوں کے ہاتھوں بارہا تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ احمد شاہ ابدالی، نصیر خاں بلوچ اور نجیب الدولہ کی افواج انھیں کئی میدانوں میں عبرتناک شکستیں دے چکی تھیں لیکن بدقسمتی سے ان شاندار فتوحات کے باوجود سکھوں پر دائمی غلبہ رکھنے کے لیے پنجاب میں مستقل طور پر کوئی بڑی فوج موجود نہ رہ سکی۔ جب احمد شاہ ابدالی کا لشکر پیشقدمی کرتا تو سکھ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتے لیکن ان کی واپسی

کے ساتھ ہی وہ اپنی کمین گاہوں سے نکل کر پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ قتل و غارت شروع کر دیتے۔

جنوب میں مرہٹے دوبارہ سر اٹھا رہے تھے۔ انھوں نے پانی پت کی جنگ میں جو زخم کھائے تھے۔ وہ مندمل ہو رہے تھے لیکن ان کی توجہ شمال کی بجائے جنوب کی طرف تھی، یہاں نظام اور انگریز ان کے حریف تھے لیکن یہ تینوں طاقتیں اب ایک دوسرے سے نظریں ہٹا کر حیدر علی کی توجہ متوجہ ہو چکی تھیں میسور کی خوشحالی اور ترقی اور میسور کے حکمران کی شخصیت ان سب کی آنکھ کا ناسور بن چکی تھی۔ حیدر علی کی طاقت کچل کر میسور کی بندر بانٹ کرنے کے لیے ۱۷۶۷ء میں ان گدھوں، بھیڑیوں اور گیدڑوں کے درمیان سمجھوتہ ہوا۔ میر نظام علی نے اپنے انگریز اور مرہٹہ حلیفوں کے ساتھ حملے کی تفصیلات طے کرنے کے بعد بنگلور کی طرف پیشقدمی کی اور وہاں سے کوئی تیس میل دور چینا پٹنا کے مقام پر ڈیرے ڈال دیئے۔

ایک دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ میر نظام علی کے وسیع خیمے میں محفل رقص و سرور آراستہ تھی۔ وزرا اور فوج کے بڑے بڑے افسر اس کے دائیں بائیں رونق افروز تھے۔ ایک فوجی افسر خیمے میں داخل ہوا اور اس نے کورنش بجا لانے کے بعد کہا۔ "حضور! انگریز فوج کا ایک کپتان اسی وقت باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔"

نظام نے جواب دینے کی بجائے قہر آلود نگاہوں سے اپنے سپہ سالار تہور جنگ کی طرف دیکھا اور وہ قدرے توقف کے بعد اٹھ کر خیمے سے باہر نکل گیا۔

نظام علی نے مشیر الملک کی طرف دیکھتے ہوئے شکایت کے لہجے میں کہا۔ "یہ لوگ ایسی بارش میں بھی آرام نہیں کرتے۔ میں انھیں بار بار یہ کہہ چکا ہوں کہ یہ موسم جنگ کے لیے موزوں نہیں۔"

مشیر الملک نے جواب دیا۔ "لیکن حضور! مدراس کے گورنر کا یہ خیال تھا کہ برسات کا موسم شروع ہونے سے پہلے ہمیں سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لینا چاہیے۔ اگر مرہٹوں کی طرف سے تاخیر نہ ہوتی تو اس وقت تک جنگ کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔"

نظام نے جواب دیا۔ "مرہٹے ہماری نسبت زیادہ ہوشیار رہیں۔ وہ اس وقت تک میدان میں نہیں آئیں گے جب تک کہ آدھی جنگ ختم نہیں ہو جاتی۔"

نظام کے محافظ دستوں کے سالارِ اعلیٰ شمس الامراء نے کہا۔ "حضور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ مزید ہوشیاری کا ثبوت دیں اور جنگ میں شریک ہی نہ ہوں۔"

مشیر الملک نے برہم ہو کر کہا۔ "آپ کو حضور نظام کے اتحادیوں کے متعلق ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔"

شمس الامراء نے جواب دیا۔ "معاف کیجیے، میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ حضور نظام کی وفاداری میں کوئی مجھ سے آگے ہے لیکن جب تک مرہٹے میدان میں نہیں آجاتے میں ان کی نیک نیتی کے متعلق کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

مشیر الملک کی توقع کے خلاف نظام نے شمس الامراء کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "تم درست کہتے ہو۔ ہم نے مرہٹوں کے متعلق اطمینان کیے بغیر پیشقدمی کرنے میں غلطی کی ہے۔"

شمس الامراء نے مشیر الملک کی طرف ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور پھر نظام کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "حضور میں شروع سے ہی اس پیشقدمی کے خلاف تھا۔ خدا معلوم اگر ہم مرہٹوں کی فوری اعانت کے بھروسے پر بنگلور پر حملہ کر دیتے تو اس وقت ہماری کیا حالت ہوتی!"

تہور جنگ دوبارہ خیمے میں داخل ہوا اور اس نے نظام کے قریب پہنچ کر آہستہ سے کہا۔ "ایلچی، مدراس کے گورنر کی طرف سے کوئی اہم پیغام لایا ہے اور وہ اسی وقت قدمبوسی کی اجازت چاہتا ہے۔"

"بہت اچھا۔ یہ محفل برخاست ہوتی ہے۔ بلاؤ اسے۔"

نظام کے اشارے سے رقاصائیں اور سازندے خیمے کے دوسرے دروازے سے نکل کر ساتھ والے خیمے میں چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد ایک انگریز افسر خیمے میں داخل ہوا۔ اس نے فوجی طریقے سے سلام کرنے کے بعد ایک تھیلا جو اس کی کمر سے لٹک رہا تھا، کھولا اور ایک مراسلہ نکال کر نظام کو پیش کر دیا۔ نظام نے مراسلہ پڑھ کر مشیر الملک کو دے دیا۔

انگریز افسر نے کہا: "یور ہائینس مجھے کرنل اسمتھ کا حکم ہے کہ میں کسی تاخیر کے بغیر اس خط کا جواب لے کر پہنچ جاؤں۔"

نظام نے جواب دیا۔ "ہم کرنل اسمتھ کو لکھ چکے ہیں کہ مرہٹوں کی طرف سے اطمینان کیے بغیر ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔"

انگریز افسر نے کہا۔ "ہز ایکسیلینسی گورنر مدراس اس مکتوب میں آپ کو یہ یقین دلا چکے ہیں کہ مرہٹے، سرنگا پٹم کی طرف آپ کی پیشقدمی کی اطلاع پاتے ہی میدان میں آجائیں گے۔ ان کی فوج کا ایک حصہ آپ کے ساتھ شامل ہو جائے گا اور دوسرا ملیبار میں ہمارے ساتھ تعاون کرے گا۔"

نظام نے کہا۔ "لیکن اگر بارش کا یہی حال رہا تو آپ کی کوئی تجویز ہمارے لیے قابل عمل نہیں ہوگی۔ ایسا موسم صرف حیدرعلی کی پنڈارہ فوج کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔ اب تک ہم نے اسلحہ، بارود اور رسد کا جو سامان یہاں جمع کرنے کی کوششیں کی ہیں اس میں سے نصف دشمن کے قبضے میں جا چکا ہے، اس وقت ہماری جتنی فوج اس پڑاؤ میں ہے قریباً اتنی ہی رسد و کمک کے راستوں میں پہرہ دے رہی ہے لیکن اس کے باوجود ہماری رسد و کمک کا کوئی دستہ صحیح سلامت یہاں نہیں پہنچا۔ اگر مرہٹے معاہدے کے مطابق ہمارا ساتھ دیتے تو ہمیں اس پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اس پانی اور کیچڑ میں

اگر پیشقدمی شروع کر دیں تو ہمیں دنوں کے سفر کے لیے ہفتے درکار ہوں۔ ہمارے آگے پیچھے اور دائیں بائیں دشمن کے چھاپہ مار دستے ہوں گے۔"

انگریز افسر نے کہا۔ "معاف کیجیے آپ کو دشمن کی طاقت کے غلط اندازے نے پریشان کر دیا ہے۔ ہماری فوج ملیبار کی طرف پیشقدمی شروع کر چکی ہے اور بارش وہاں بھی ہو رہی ہے لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ موسم کی خرابی کے باعث ہماری اور ہمارے دشمن کی مشکلات ایک جیسی ہیں۔"

نظام نے جواب دیا۔ "ملیبار کے ساحلی علاقے پر آپ کا سہارا آپ کا بحری بیڑہ ہے لیکن مجھے یہاں بیل گاڑیوں سے کام لینا پڑے گا۔"

"تو میں آپ کی طرف سے کیا جواب لے جاؤں؟"

"مدراس کے گورنر کے لیے ہمارا پہلا جواب کافی ہے۔"

"لیکن اس خط میں گورنر نے یہ لکھا ہے کہ آپ کرنل اسمتھ کو اپنے ارادے سے باخبر کر دیں۔"

"کرنل اسمتھ کو ہمارا جواب ایک ہفتہ تک پہنچ جائے گا۔"

انگریز افسر نے جواب دیا۔ "مجھے یقین ہے کہ اس سے قبل آپ کی خدمت میں ہماری طرف سے ایسے لوگوں کا وفد آئے گا جو آپ کو اپنی رائے تبدیل کرنے پر آمادہ کر سکیں گے۔"

"اگر کوئی وفد مرہٹوں کی نیک نیتی کے متعلق مجھے یقین دلا سکا تو مجھے اپنی رائے بدلتے ہوئے خوشی محسوس ہوگی۔ بہتر یہی ہوگا کہ وفد میرے پاس آنے کی تکلیف کرنے سے پہلے مرہٹوں کے ساتھ بات چیت کر آئے۔"

انگریز افسر نے کہا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ملیبار میں ہماری کامیابیوں کی اطلاعات سننے کے بعد آپ مرہٹوں کے متعلق سوچنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کریں۔"

نظام نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ کرسی سے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے"

انگریز افسر سلام کرنے کے بعد باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد رقص و سرود کا ایک نیا دور شروع ہو چکا تھا۔ جب یہ محفل پورے شباب پر تھی اور ایک لونڈی میر نظام علی کے جام میں شراب ڈال رہی تھی، خیمے سے باہر سپاہیوں کا شور سنائی دیا۔ حاضرینِ مجلس جواب طلب نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ نظام نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور طبلے اور سارنگی کی صدائیں اچانک خاموش ہو گئیں۔ رقاصائیں تذبذب کی حالت میں کھڑی تھیں۔ ایک فوجی افسر خیمے میں داخل ہوا اور اس نے کورنش بجا لانے کے بعد کہا۔ "عالیجاہ ایک آدمی اسی وقت قدم بوسی کی اجازت چاہتا ہے!"

"کون ہے وہ؟" نظام نے جھنجھلا کر کہا۔

"عالیجاہ وہ کہتا ہے کہ میں حیدر کا ایلچی ہوں"

مشیر الملک نے کہا۔ "تم نے اسے پڑاؤ سے باہر کیوں نہیں روکا، وہ یہاں تک کیسے پہنچ گیا؟"

"جناب وہ سرپٹ آرہا تھا اور اس نے پہریداروں کی کوشش کے باوجود اپنا گھوڑا نہیں روکا۔"

مشیر الملک نے کہا۔ "جاؤ اسے قید میں رکھو!"

افسر نے کہا۔ "لیکن حضور! اس نے دھمکی دی ہے"

"کیا دھمکی دی ہے اس نے؟"

"حضور اگر آپ کا حکم ہو تو اس کی زبان کھینچ لی جائے!"

نظام نے تلملا کر کہا۔ "بیوقوف! پہلے یہ بتاؤ وہ کہتا کیا ہے؟"

"عالیجاہ! وہ یہ کہتا ہے کہ اگر میں اسی وقت حضور کے ساتھ بات نہ کر سکا تو کل شام تک اس پڑاؤ کا صفایا ہو جائے گا۔"

سپہ سالار تہوّر خاں نے اٹھ کر اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ کوئی پاگل ہوگا۔ میں دیکھتا ہوں!"

نظام نے کہا۔ "نہیں ٹھہرو! اسے اندر بلاؤ!"

افسر باہر نکل گیا اور چند ثانیے بعد معظم علی کیچڑ اور پانی سے لت پت نظام کے خیمے میں داخل ہوا۔ اس نے "السلام علیکم" کہہ کر مجلس پر ایک نظر دوڑائی اور پھر نظام کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "اس بے وقت مداخلت کے لیے میری معذرت قبول فرمائیے لیکن میرے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہونا اشد ضروری تھا۔"

مشیر الملک نے کہا۔ "حیدر علی نے اپنے ایلچیوں کو معذرت پیش کرنے کے جو طریقے سکھائے ہیں وہ ہمارے لیے بالکل نئے ہیں۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "حیدر علی کے ایلچی کو آپ کے آداب سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو ان کی طرف سے یہ پیغام دینے آیا ہوں کہ اگر آپ مرہٹوں کی اعانت کے بھروسے پر یہاں آئے ہیں تو وہ اس جنگ میں حصہ نہیں لیں گے۔ انھوں نے حیدر علی سے صلح کر لی ہے۔"

مشیر الملک نے کہا۔ "حیدر علی کی گیدڑ بھبکیاں ہمیں متاثر نہیں کر سکتیں۔ اگر مرہٹوں کی علٰحدگی کی خبر درست ہو تو بھی ہمارے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "لیکن یہ بات آپ کو یقیناً متاثر کرے گی کہ اس وقت آپ ہمارے مکمل محاصرے میں ہیں۔ کل تک آپ کا یہ پڑاؤ چاروں طرف سے ہماری توپوں کی زد میں ہوگا۔ مجھے حیدر علی نے آپ کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کے لیے نہیں بھیجا ہے، بلکہ میں ان کی طرف سے دوستی کا ہاتھ بڑھانے آیا ہوں۔ حیدر علی کے اس اقدام کو آپ کمزوری یا بزدلی سے تعبیر نہ کریں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ ہمیں اس ملک

کا مستقبل عزیز ہے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ آنے والی نسلیں ہماری غلطیوں کی سزا بھگتیں۔ ہمیں آپ کی فوجی طاقت کا اعتراف ہے لیکن کاش آپ یہ قوت ہندوستان کی عزت اور آزادی کے دشمنوں کی سرکوبی کے لیے کام میں لا سکتے۔ اگر آپ قوم کے رہنما بنیں تو حیدر علی آپ کی قیادت میں اس ملک کے دشمنوں کے ساتھ لڑنا اپنے لیے باعث فخر سمجھیں گے۔ میں آپ کو انگریز کے خلاف اتحاد کی دعوت دینے آیا ہوں لیکن اگر آپ انگریزوں کے ساتھ جنگ کرنے سے کتراتے ہیں تو مرہٹوں کی طرح الگ ہو جائیں اور ہمیں ان سے نپٹنے دیں۔"

نظام نے کہا "اگر ہم انگریزوں کا ساتھ چھوڑنا پسند نہ کریں تو؟"

معظم علی نے جواب دیا "تو پھر ہمیں افسوس ہوگا۔ ہمیں اس بات کا افسوس ہوگا کہ ہم اپنی انتہائی کوشش کے باوجود اپنے بھائیوں کو اپنے ساتھ نہ ملا سکے۔ ہمیں آپ کے اس لشکر کی تباہی کا افسوس ہوگا جو اس وقت محاصرے کی حالت میں ہے۔ مرہٹے میدان سے نکل چکے ہیں اور انگریز ملیبار کا محاذ چھوڑ کر آپ کی مدد کے لیے نہیں آ سکتے۔ یہ سوچنا آپ کا کام ہے کہ آپ کتنی دیر ہمارے لشکر کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور پسپائی کی حالت میں آپ کو کس تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حیدر علی کو اس تباہی کا افسوس ہوگا لیکن مستقبل کے مورخ اسے قصوروار نہیں گردانیں گے۔"

نظام نے کہا "تمھیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم حیدر علی کی دھمکیوں سے مرعوب ہو جائیں گے۔"

"یہ دھمکی نہیں، آپ کے سوال کا سیدھا سادہ جواب ہے لیکن آپ اگر اسے دھمکی سمجھتے ہیں تو اپنے کسی سمجھدار افسر کو میرے ساتھ جانے کی اجازت دیجیے۔ میں اسے ہر محاذ کی سیر کرانے کے لیے تیار ہوں۔ پھر وہ آپ کو بتا سکے گا کہ آپ کی فوج کے بچ نکلنے کے امکانات کیا ہیں۔ حیدر علی اپنی نیک نیتی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا دے سکتے

ہیں کہ انھوں نے اپنے ولیعہد شہزادہ فتح علی ٹیپو کو آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔"

میر نظام علی خان نے حیران ہو کر سوال کیا۔ "شہزادہ فتح علی ٹیپو کہاں ہیں؟"

"وہ یہاں سے آٹھ کوس کے فاصلے پر میری واپسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ اگر آپ مصالحت پر آمادہ ہیں تو وہ کل صبح آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے لیکن اگر میری معروضات آپ کو متاثر نہ کر سکیں تو بھی وہ کل یہاں ضرور پہنچ جائیں۔ میں آپ کو اس وقت بھی یہ ثبوت دے سکتا ہوں کہ دکن سے آپ کی رسد اور کمک کے راستے بند ہو چکے ہیں۔ آج آپ کے سامان رسد کی جو پچاس گاڑیاں آ رہی تھیں وہ اس وقت ہمارے قبضے میں ہیں اور سپاہیوں کا جو دستہ ان کے ساتھ تھا وہ ہماری قید میں ہے۔ اس دستے کے افسر کا نام صولت خان ہے۔"

محفل پر تھوڑی دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔ نظام نے یکے بعد دیگرے اپنے وزیروں اور افسروں کی طرف دیکھا اور معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "ہم شہزادہ ٹیپو کے ساتھ مصالحانہ گفتگو کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جب ہم یہاں سے کوچ کریں گے تو میسور کی فوج ہمارا تعاقب نہیں کرے گی؟"

"میسور کے شہزادہ ٹیپو کے الفاظ سے بڑی ضمانت اور کیا ہو سکتی ہے اور اگر آپ کو نقصان پہنچانا ہی مطلوب ہوتا تو یہ ہمارے لیے بہترین موقع تھا۔"

میر نظام علی نے کہا۔ "تم شہزادہ ٹیپو کو ہماری طرف سے یہ پیغام دے سکتے ہو کہ ہم مصالحت کی گفتگو کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

شمس الامراء نے کہا۔ "عالی جاہ اگر اجازت ہو تو میں ان کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔"

"ہاں آپ کو اجازت ہے۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی اور شمس الامراء گھوڑوں پر سوار ہو کر شہزادہ ٹیپو کی قیام گاہ

کا رخ کر رہے تھے۔

اگلے دن نظام کے کیمپ میں شہزادہ فتح علی ٹیپو کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور تیسرے دن سرنگاپٹم میں اس خبر پر خوشیاں منائی جا رہی تھیں کہ حیدر علی کے ہونہار بیٹے نے اپنی پہلی سیاسی مہم میں ایک شاندار کامیابی حاصل کی ہے اور نظام کی افواج چینا پٹنا سے واپس حیدرآباد کا رخ کر رہی ہیں۔

مرہٹوں اور نظام کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد حیدر علی کی افواج آندھی اور طوفان کی طرح انگریزوں پر ٹوٹ پڑیں۔ ۱۷۶۹ء تک حیدر علی ملیبار کے ساحلی علاقوں پر قبضہ کر چکا تھا اور انگریز ہر محاذ سے پسپا ہو کر مدراس میں پناہ لے رہے تھے۔ حیدر علی فتوحات کے پرچم لہراتا ہوا مدراس کی طرف بڑھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایوانوں پر زلزلہ طاری ہو چکا تھا۔ انگریز صلح کے طالب ہوئے۔

شیرِ میسور نے جواب دیا: "صلح کی بات چیت اب مدراس میں ہوگی"۔ مدراس سے پانچ میل دور حیدر علی نے صلح کی شرائط پیش کیں اور انگریزوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

انگریز حیدر علی کے رحم و کرم پر تھے۔ اگر وہ چاہتا تو مدراس کے قلعے پر قبضہ کرنا اس کے لیے چند گھنٹوں کی بات تھی۔ مورخ اس سوال کا صحیح جواب نہیں دے سکتے کہ صلح نامہ مدراس کے اصلی محرکات کیا تھے۔ یہ اس فاتح کی بلند حوصلگی اور عالی ظرفی تھی جس کے نزدیک گرے ہوئے دشمن پر ہاتھ اٹھانا باعثِ عار تھا یا حیدر علی کو پیچھے سے نظام اور مرہٹوں کے حملے کا خطرہ تھا! بہرحال جب اس صلح کے عملی نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ ایک بڑے آدمی کی غلطی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اس معاہدے کی شرائط کے نبھانے کے متعلق اس وقت بھی نیک نیت نہ تھی جب مدراس کا گورنر اس معاہدے پر دستخط کر رہا تھا۔

آٹھ ماہ بعد مرہٹوں نے ڈیڑھ لاکھ فوج کے ساتھ دریائے تنگبھدرا عبور کر کے میسور

پر حملہ کر دیا۔ عہد نامہ مدراس کی رو سے انگریزوں پر حیدر علی کی مدد فرض تھی لیکن انھوں نے مرہٹوں کے خلاف حیدر علی کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور اس انکار کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریز مرہٹوں کی فتح کی امید پر میسور کی بندر بانٹ میں حصہ دار بننا چاہتے تھے۔

حیدر علی قریباً اڑھائی سال مختلف محاذوں پر مرہٹوں کی ٹڈی دل افواج سے برسرِپیکار رہا۔ اس عرصہ میں اس کے سرحدی علاقے تباہ ہو چکے تھے۔ مرہٹے شدید نقصانات اٹھانے کے باوجود تازہ دم افواج میدان میں لا رہے تھے۔ جولائی ۱۷۷۲ء میں حیدر علی نے مرہٹوں کی پیش کردہ شرائط پر صلح کر لی لیکن انگریز افسروں کی بدعہدی اور مرہٹوں کی جارحیت نے اس پر یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ میسور کی آزادی کے دشمن اسے زیادہ دیر آرام سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔

جنگ سے فارغ ہوتے ہی معظم علی نے اکبر خاں کے حالات معلوم کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ حیدر علی کی فوج میں روہیلکھنڈ کے چند نوجوان ملازم تھے اور جنگ کے بعد ان میں سے بعض چھٹی پر جا رہے تھے۔ معظم علی نے ایک طویل خط لکھا اور ان میں سے ایک نوجوان کے حوالے کر دیا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا:۔

"عزیز بھائی! تمھارے آخری خط کا جواب شاید ابھی تک میرے ذمے ہے۔ میں پچھلے چند برس بے حد مصروف رہا ہوں۔ تاہم مجھے احساس ہے کہ میں نے تمھارے متعلق اپنے فرض میں کوتاہی کی ہے لیکن تمھارے دل میں یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ میں تمھیں بھول گیا ہوں۔ گذشتہ دس سال میں زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب میں تمھاری یاد سے غافل تھا۔

تمھیں یہ سن کر خوشی ہو گی کہ انگریزوں اور اس کے بعد مرہٹوں کے خلاف ہماری جنگ کا ایک دور ختم ہو چکا ہے۔ وہ تاریک بادل جو میسور

کے آسمان پر چھائے ہوئے تھے، چھٹ گئے ہیں لیکن میسور میں میرے حصے کا کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ابھی ہمارے راستے میں کئی اور مراحل باقی ہیں۔ میسور کی آزادی اور بقا اور میسور کے علاوہ تمام ہندوستان کو انگریزوں کے جارحانہ عزائم سے بچانے کے لیے ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ سلطان حیدر علی جیسے بیدار مغز انسان کی قیادت اور شہزادہ فتح علی ٹیپو جیسے اولوالعزم مجاہد کی رفاقت میں لڑنا میرے نزدیک ایک بہت بڑی سعادت تھی۔ وہ کمسن لڑکا جسے تم نے کئی برس پہلے ایک شیر کے بچے سے کھیلتے دیکھا تھا۔ اب میسور کی فوج کا بہترین جرنیل بن چکا ہے۔ میں اپنی زندگی میں اس سے زیادہ کسی نوجوان کی ذہانت اور عزم و استقلال سے مرعوب نہیں ہوا۔ شہزادہ ٹیپو کے سپاہیانہ جوہر، ان کی علمی قابلیت اور ذہانت اور ان کی پاک بازی اور تقویٰ ہماری مٹتی ہوئی قوم کی سب سے بڑی پونجی ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ شہزادہ ٹیپو کی رفاقت میں میری زندگی کا ہر سانس عبادت ہے۔

سلطان حیدر علی نے جنگ سے فارغ ہوتے ہی مجھے سرنگاپٹم کی فوجی تربیت گاہ کا ناظم اعلیٰ مقرر کر دیا تھا اور میرے لیے اس سے بڑا اطمینان اور کیا ہو سکتا ہے کہ مجھ سے تربیت حاصل کرنے والے نوجوان کسی دن میسور کے اس رجل عظیم کی قیادت میں مردانگی کے جوہر دکھائیں گے جن کا نصب العین نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کا اتحاد ہے۔

قریباً چار سال ہوئے شیر علی نے مجھے لکھا تھا کہ میں حج پر جا رہا ہوں۔ اس کے بعد ان کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ آج میں ان

کو بھی خط لکھ رہا ہوں۔ تمہارے بڑے بھتیجے، صدیق علی خان کو میسور کے سب سے بڑے جنگی جہاز کا کپتان بننے کا شوق ہے اور میں نے اس کی تربیت کے لیے ابھی سے ایک فرانسیسی اتالیق مقرر کر دیا ہے۔ مسعود اور انور اکثر یہ کہا کرتے ہیں کہ ہم بڑے ہو کر اپنے چچا اکبر خاں کے پاس جائیں گے اور وہاں تیر مارا کریں گے۔ تمہارے سب سے چھوٹے بھتیجے کا نام مراد علی ہے اور وہ اگلے مہینے دو سال کا ہو جائے گا۔ فرحت کی والدہ پچھلے سال وفات پا گئی تھیں۔ صابر اور دلاور خاں ابھی تک میرے ساتھ ہیں اور تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ اگر کبھی فرصت ملے تو چند دن کے لیے سرنگاپٹم آ جاؤ۔ تمہیں دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے اور تمہاری بھابی، بلقیس کو بہت یاد کرتی ہیں۔ بچوں کی یہ حالت ہے کہ جب ان سے کوئی میسور کی فوج کے کسی جوان کی بہادری کا ذکر کرتا ہے تو وہ بڑے فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ تم نے ہمارا چچا اکبر خان نہیں دیکھا۔ خدا معلوم صابر انھیں تمہارے متعلق کتنی فرضی داستانیں سنا چکا ہے کہ وہ تمہیں اس دور کا سب سے زیادہ شہزور اور بہادر آدمی سمجھتے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو ضرور آنے کی کوشش کرو۔

تمہارا بھائی معظم علی

تین ماہ بعد معظم علی کو اکبر خاں کی طرف سے جواب موصول ہوا:

بھائی جان! میرا خیال تھا کہ آپ مجھے بھول چکے ہوں گے۔ کئی بار میں نے سرنگاپٹم آنے کا ارادہ کیا مگر حالات نے مجھے گھر سے نکلنے کی اجازت نہ دی۔ مرہٹوں نے چند برس سے پھر ہماری سرحدوں پر طوفان برپا کر رکھا ہے۔ میرے علاقے پر تین حملے ہو چکے ہیں۔ پچھلے

سال انھوں نے ہمارے دوگاؤں جلا کر راکھ کر دیئے تھے۔ اس کے بعد میں نے پڑوس کے سرداروں کی مدد سے ان کا تعاقب کیا اور سرحد کے قریب تین سو لٹیروں کے ایک گروہ کا صفایا کر ڈالا۔ اس کے بعد ہمارے علاقے پر کوئی حملہ نہیں ہوا لیکن روہیلکھنڈ کو ہمیشہ مرہٹوں کی یلغار کا خطرہ رہتا ہے۔ حافظ رحمت خاں کی قیادت میں ہم کافی منظم ہو چکے ہیں لیکن ہمارے وسائل محدود ہیں اور ہم تنہا کسی بیرونی طاقت کے ساتھ ٹکر نہیں لے سکتے۔ ہم دلّی کے حالات سے مایوس ہو چکے ہیں، پچھلے دنوں حافظ رحمت خاں نے نواب وزیر اودھ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا ہے جس کی رُو سے مرہٹوں کے حملہ کی صورت میں اودھ کی افواج ہماری مدد کریں گی لیکن کاش ہم نواب وزیر اودھ پر اعتماد کر سکتے۔ میسور کے متعلق سوچتے ہوئے بار بار میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کاش حیدر علی اور شہزادہ ٹیپو جیسے رہنما شمالی ہندوستان میں پیدا ہوتے۔

شیر علی حج کے بعد مدینہ شریف میں آباد ہو گئے ہیں۔ اپنے ایک ساتھی کی معرفت انھوں نے مجھے یہ پیغام بھیجا تھا کہ میں واپس نہیں آؤں گا۔ حج پر جانے سے پہلے وہ اپنا تجارتی کاروبار ختم کر چکے تھے۔ مکان فروخت کرنے کے بعد ان کے پاس اتنا سرمایہ تھا کہ وہ باقی زندگی بڑے آرام سے گزار سکیں۔

پچھلے سال بلقیس کی والدہ حیدرآباد سے عطیہ کے پاس چلی گئی تھیں۔ چند ماہ بعد ہمیں شیخ فخرالدین کے خط سے معلوم ہوا کہ وہ وہیں پر وفات پا گئی ہیں۔ بلقیس چند دن کے لیے اپنی بہن کے پاس جانے مصر ہے۔ اگر حالات نے مجھے گھر سے نکلنے کی اجازت دی تو ہم ڈھونی

سے ہو کر آپ کے پاس آئیں گے۔

بھائی جان! میں ہر وقت آپ کو یاد کرتا رہتا ہوں اور نماز کے بعد میری پہلی دعا آپ کے لیے ہوتی ہے۔ میرا بڑا لڑکا داؤد خاں نو سال کی عمر میں گھوڑے سے گر کر فوت ہو گیا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی شہباز خاں چوتھے سال میں ہے۔ پچھلے سال ہمیں خدا نے ایک لڑکی عطا کی ہے، بلقیس نے اس کا نام تنویر رکھا ہے۔ بلقیس آپ کو اور بھابی جان کو سلام کہتی ہے۔"

آپ کا بھائی اکبر



معظم علی کو سرنگا پٹم کی فوجی تربیت گاہ کے ناظم کے عہدے پر فائز ہوئے۔ چند مہینے گزرے تھے کہ پونا میں مرہٹوں کے پیشوا مادھو راؤ کے انتقال اور اس کی جانشینی کے دعویداروں کے درمیان خلفشار کی اطلاع ملی۔ حیدر علی کے دل پر مرہٹوں کے زخم ابھی تازہ تھے۔ اس نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور میسور کے چھنے ہوئے علاقے واپس لینے کے لیے چڑھائی کر دی۔ شہزادہ ٹیپو آزمودہ کار افسروں اور سپاہیوں کی ایک فوج لے کر سِرا کی طرف بڑھا اور اس نے تین ماہ کے اندر اندر سرا کے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مرہٹے ابھی سنبھلنے نہ پائے تھے کہ اس نے مدھا گری اور گرم کنڈہ پر یلغار کر دی۔ اس عرصہ میں حیدر علی ہوسکوٹ کا محاصرہ کر چکا تھا۔

ایک دن معظم علی سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا ہوسکوٹ کے باہر میسور کی فوج کے کیمپ میں داخل ہوا۔ وہ گھوڑے سے اترتے ہی حیدر علی کے خیمے کی طرف بڑھا محافظ دستے کے سالار نے اسے دیکھ کر سلام کرنے کے بعد کہا۔ "آپ کا صبح سے انتظار ہو رہا ہے۔ میں ابھی اطلاع دیتا ہوں۔" افسر خیمے کے اندر داخل ہوا اور چند ثانیے بعد اس

نے باہر آکر کہا۔ "تشریف لائیے۔" [illegible]

معظم علی خیمے کے اندر داخل ہوا۔ نواب حیدر علی، شہزادہ ٹیپو اور پنڈارہ[1] فوج کے سپہ سالار غازی خان چٹائی پر بیٹھے ایک نقشہ دیکھ رہے تھے۔ حیدر علی نے معظم علی کی طرف دیکھ کر کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "معظم علی تم سفر کے لیے تیار ہو کر آئے ہو نا؟"

"جی ہاں میں تیار ہوں۔" [illegible]

بیٹھ جاؤ۔ چند دن سے میں ایک اہم مہم کے لیے کسی موزوں آدمی کا متلاشی تھا۔ فتح علی کو اصرار ہے کہ اس مہم کے لیے تم سے زیادہ موزوں آدمی اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں تمھیں نواب وزیر اودھ کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں۔ اب مرہٹوں کے مظالم کا بدلہ لینے کا وقت آگیا ہے۔ ہم انشاء اللہ ایک ہفتے کے اندر اندر ہوسکوٹ فتح کر لیں گے۔ اس کے بعد میں دریائے کرشنا تک ان کا تعاقب کرنے کا تہیہ کر چکا ہوں۔ اس وقت نواب شجاع الملک کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ مرہٹوں پر ضرب کاری لگانے کے لیے اس سے بہتر وقت پھر کوئی نہیں ملے گا۔ اگر وہ اودھ سے پیشقدمی کریں اور ادھر سے ہم آگے بڑھیں تو اس ملک کو مرہٹوں کی چیرہ دستیوں سے ہمیشہ کے لیے نجات مل سکتی ہے۔ دلی کے دربار میں مرہٹوں کے اثر و رسوخ کے باعث اس ملک کے ہر مسلمان حکمران کے لیے ایک خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ شجاع الملک اگر بیوقوف نہیں تو وہ تمہاری باتوں سے ضرور متاثر ہوگا۔ اس کے بعد

[illegible]

---

[1] پنڈارے بے قاعدہ فوج جو تیز رفتار سواروں پر مشتمل تھی۔ اس فوج کا کام دشمن کی رسد اور کمک کے راستے مسدود کرنا اور اچانک حملے کر کے اسے زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانا تھا۔ حملے کے وقت یہ فوج ہراول دستوں کا کام دیتی تھی اور دشمن کے غلبے کی صورت میں اس سے گوریلا چھاپہ مار دستوں کا کام لیا جاتا تھا۔ [illegible]

تم روہیلکھنڈ میں حافظ رحمت خان کے پاس جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے اتحاد کے بعد دلی کے بے بس امراء بھی جاگ اٹھیں گے اور نظام بھی یہ محسوس کرے گا کہ غیر جانبداری اس کے لیے سود مند نہیں ہوگی۔ مرہٹوں سے نپٹنے کے بعد ہم چند ہفتوں میں انگریزوں کو سمندر کی طرف دھکیل سکیں گے۔ تم نواب اودھ کو یہ سمجھاؤ کہ اس وقت اودھ اور شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی جنگ میسور میں لڑی جا رہی ہے۔ سرنگا پٹم میں بھی تمھاری خدمات کی ضرورت تھی لیکن یہ کام زیادہ اہم ہے۔" [illegible]

معظم علی نے کہا۔ "مجھے اس کی اہمیت کا پورا احساس ہے اور اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آج ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔" [illegible]

"نہیں، تم کل صبح یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ میں آج شام تک نواب شجاع الملک اور حافظ رحمت خان کے نام خطوط لکھوا کر تمھارے حوالہ کر دوں گا لیکن تمھیں بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ جب تک ہمارے مابین تعاون کا کوئی معاہدہ طے نہیں پا جاتا اس وقت تک ہمارے ارادوں کی کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے۔ شہزادہ ٹیپو تمھیں لکھنؤ تک پہنچانے کا بندوبست کر دیں گے۔"

اگلے دن معظم علی علی الصباح پانچ سواروں کے ہمراہ لکھنؤ کا رخ کر رہا تھا۔

[illegible]

نواب وزیر اودھ اپنے محل کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا بیٹا آصف الدولہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "ابا جان یہ وہی معظم علی ہے جو دس بارہ سال قبل یہاں تجارت کرتا تھا اور جس نے پانی پت کی جنگ میں بھی کافی شہرت حاصل کی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ اس وقت آپ ملاقات نہیں کر سکتے لیکن وہ مصر ہے اور کہتا ہے کہ میں میسور سے حیدر علی کا ایک اہم پیغام لے کر آیا ہوں اور میری ملاقات کا اودھ کے مستقبل سے گہرا تعلق ہے۔ آپ اگر اجازت دیں تو میں اسے بلا لاؤں، ممکن ہے کوئی اہم

بات ہو۔ سپاہی اسے ملاقات کے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے پہلے یہ تسلی کر چکے ہیں کہ وہ مسلح نہیں ہے۔"

نواب شجاع الدولہ نے کہا۔ "اگر یہ وہی معظم علی ہے تو ہم اس سے ضرور ملیں گے، اسے بلاؤ!"

آصف الدولہ کمرے سے باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر بعد معظم علی کے ساتھ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا۔ معظم علی کے سلام کے جواب میں شجاع الدولہ نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن معظم علی نے اس کے ہاتھ کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ آصف الدولہ نے اپنے باپ کے قریب بیٹھتے ہوئے مسند کے سامنے خالی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ "تشریف رکھیے۔" لیکن اس نے کہا۔ "میں بیٹھ کر آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے بے وقت آپ کو تکلیف دی ہے۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے صرف چند منٹ درکار ہیں۔ میں نے لکھنؤ پہنچتے ہی ایک وحشت ناک خبر سنی ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے انگریزوں کے ساتھ مل کر روہیلکھنڈ پر چڑھائی کر دی ہے؟"

شجاع الدولہ نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور پھر معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے تمھیں یہاں آنے کی ضرورت نہ تھی۔"

معظم علی نے کہا۔ "اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے میں وارن ہیسٹنگز کے دربار میں نہیں جا سکتا۔ میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ اودھ کے مستقبل کے امین ہیں اور ایک مسلمان ہونے کی وجہ سے مجھے اودھ کی رعایا اور اودھ کی حکومت کے ساتھ دلچسپی ہے۔"

شجاع الدولہ نے جواب دیا۔ "تو تمھیں اودھ کے مستقبل کے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ چند دن تک تم یہ سنو گے کہ ہم اودھ کی مملکت میں ایک وسیع علاقہ شامل

کر چکے ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔ "اگر وسیع علاقے سے آپ کی مراد روہیلکھنڈ ہے تو وہ دن دور نہیں جب اودھ کا ہر بچہ بوڑھا آپ کے اس فیصلے کی مذمت کرے گا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ روہیلکھنڈ آپ کی مملکت کا حصہ بننے کی بجائے ان بھیڑیوں کی شکار گاہ بن جائے گا جن کے ہاتھ پلاسی اور بکسر کی جنگ کے شہیدوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ خدا کے لیے روہیلکھنڈ کو تباہی سے بچائیے ورنہ شرافت اور انسانیت کے یہ دشمن کسی دن دلی اور اودھ پر چڑھ دوڑیں گے!"

شجاع الدولہ نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "تمھیں معلوم ہے کہ حافظ رحمت خاں نے ہمارے ساتھ بدعہدی کی ہے؟ اس نے ہمارے ساتھ معاہدہ کیا تھا کہ اگر ہم مرہٹوں کے خلاف اسے مدد دیں گے تو وہ اس کے عوض ہمیں چالیس لاکھ روپیہ ادا کرے گا۔ گذشتہ سال جب مرہٹوں نے روہیلکھنڈ پر حملہ کیا تھا تو ہم نے معاہدے کے مطابق رحمت خاں کی اعانت کے لیے فوج بھیجی تھی لیکن مرہٹوں سے نجات حاصل کرنے کے بعد وہ ہمیں چالیس لاکھ روپیہ ادا کرنے کے وعدے سے منحرف ہو گیا ہے!"

معظم علی نے کہا۔ "لیکن میں نے سنا ہے کہ حافظ رحمت خاں نے جنگ کی صورت میں یہ رقم دینے کا وعدہ کیا تھا اور مرہٹے جنگ کیے بغیر واپس چلے گئے تھے۔ پھر بھی اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ روہیلوں کو یہ رقم ضرور ادا کرنی چاہیے تو اس کے لیے روہیلکھنڈ پر چڑھائی کرنا کسی صورت مناسب نہیں۔ خدا کے لیے اپنی افواج کو روکیے اور روہیلوں کو انگریزوں کے ساتھ نپٹنے دیجیے۔ میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ آپ کو چالیس لاکھ روپیہ ادا کر دیا جائے گا۔ میں حافظ رحمت خاں کے پاس جانے کے لیے تیار ہوں اور مجھے یقین ہے کہ وہ چالیس روپے کے بدلے آپ سے لڑائی مول لینا گوارا نہیں کریں گے۔ اگر مجھے وہاں سے مایوسی ہوئی تو بھی میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی ایک ایک کوڑی ادا کر دی جائے

گی۔ میں حیدر علی کے پاس جاؤں گا اور اگر میں نے بارہ سال کی رفاقت کے بعد انہیں غلط نہیں سمجھا تو مجھے یقین ہے کہ وہ دو مسلمان طاقتوں کا تصادم روکنے کے لیے چالیس لاکھ روپیہ قربان کرنے سے دریغ نہیں کریں گے۔"

شجاع الدولہ نے کہا۔ "تم بہت دیر سے آئے ہو۔ ہم چالیس لاکھ روپیہ انگریزوں کو ادا کر چکے ہیں۔ ہماری افواج روہیلکھنڈ میں داخل ہو چکی ہیں اور دو تین دنوں کے اندر اندر میراں پور کٹرہ پر ہماری فتح کا جھنڈا لہرا رہا ہوگا۔ اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ تیر کمان سے نکل چکا ہے اور اس جنگ کی تمام تر ذمہ داری حافظ رحمت خان پر عائد ہوتی ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں کہ مستقبل کے مورخ اس جنگ کی ذمہ داری کن پر عائد کریں گے لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ آج انگریز روہیلکھنڈ کو چالیس لاکھ کے عوض آپ کے ہاتھ فروخت کر رہے ہیں تو کل وہ لکھنؤ کی آزادی کوڑیوں کے مول کسی اور کے ہاتھ فروخت کریں گے۔ اگر آپ کو اس ملک کے خلاف انگریزوں کے عزائم کے متعلق کوئی غلط فہمی تھی تو وہ پلاسی اور بکسر کے واقعات کے بعد دور ہو جانی چاہیے تھی۔ روہیلکھنڈ پر آپ کی فتح نہیں ہوگی بلکہ اس بیرونی سامراج کی فتح ہوگی جو دلی تک اپنا راستہ صاف کرنا چاہتا ہے۔"

آصف الدولہ غصے سے کانپ رہا تھا اور نواب شجاع الدولہ کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ اس نے کہا۔ "ہمیں ان معاملات میں تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ تم نواب حیدر علی کی طرف سے کوئی ضروری پیغام لے کر آئے ہو۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "اب آپ کو حیدر علی کی طرف سے کسی پیغام کی ضرورت نہیں۔ اب آپ کو یہ سمجھانا حیدر علی کے بس کی بات نہیں کہ اس ملک میں آپ کے

دوست اور دشمن کون ہیں۔ حیدر علی وحشت و بربریت کی جس آگ کو سات سمندر دور رکھنا چاہتے ہیں وہ لکھنؤ کی چار دیواری تک پہنچ چکی ہے۔"

آصف الدولہ نے کہا۔ "آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" معظم علی نے تھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اب میں صرف یہ دعا کرتا ہوں کہ خدا اس قوم کو اس کے اکابر کی کوتاہیوں اور غلط اندیشیوں کی سزا نہ دے۔ مجھے اجازت دیجیے۔" معظم علی یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

آصف الدولہ نے اپنے باپ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "ابا جان اس کے متعلق آپ کا کیا حکم ہے۔ اگر اجازت ہو تو اسے گرفتار کر لیا جائے؟"

شجاع الدولہ نے جواب دیا۔ "نہیں، اسے گرفتار کرنے سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ حیدر علی نے اسے کس مقصد سے یہاں بھیجا تھا اور لکھنؤ میں اس کے ساتھی اور کون ہیں۔ ہم نے روہیلکھنڈ فوجیں روانہ کرتے وقت انتہائی راز داری سے کام لیا تھا لیکن میں حیران ہوں کہ شہر کے لوگوں کو کس نے باخبر کیا ہے۔ تم اس نوجوان پر کڑی نگرانی رکھو۔"

معظم علی نے محل سے نکل کر اس سرائے کا رخ کیا جہاں اس کے ساتھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ سرائے کے دروازے پر اس کا ایک ساتھی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے معظم علی کو دیکھتے ہی سوال کیا۔ "کہیے کچھ کامیابی ہوئی؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "ہمیں چند منٹ کے اندر اندر یہاں سے نکل جانا چاہیے۔" معظم علی کے تیور دیکھ کر اس کے ساتھی کو کوئی اور سوال پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی اور تھوڑی دیر بعد یہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر روہیلکھنڈ کا رخ کر رہے تھے۔

ایک گھنٹہ بعد آصف الدولہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اپنے باپ کے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "ابا جان میں نے جو جاسوس اس کے پیچھے روانہ کیا تھا وہ واپس آگیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ معظم علی اور اس کے پانچ ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو کر شہر

سے نکل گئے ہیں اور ان کا رُخ روہیلکھنڈ کی طرف تھا۔ اگر آپ کا حکم ہو تو ان کے پیچھے سپاہیوں کا ایک دستہ روانہ کر دیا جائے۔"

شجاع الدولہ نے جواب دیا: "نہیں اب روہیلکھنڈ پہنچ کر وہ ہمارے لیے کسی پریشانی کا باعث نہیں ہو سکتے۔ جنگ ایک دو دن کے اندر ختم ہو جائے گی۔ میں صرف لکھنؤ میں ان کی سرگرمیوں سے باخبر رہنا چاہتا تھا۔ اگر یہ آدمی چند دن پہلے آتا تو میں یقیناً اسے گرفتار کر لیتا۔ اب اس کا راستہ روکنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔"

سترھواں باب

ایک شام معظم علی اور اس کے ساتھی گھنا جنگل عبور کرنے کے بعد اس وادی میں داخل ہو چکے تھے۔ جہاں اکبر خاں کے قبیلے کی بستیاں آباد تھیں۔ اکبر خاں کے گاؤں کی طرف جانے والی پگڈنڈی ایک ٹیلے کے اوپر سے گزرتی تھی۔ معظم علی نے ٹیلے پر پہنچ کر اپنے سامنے اچانک وحشت ناک منظر دیکھا اور اپنا گھوڑا روک لیا۔ شام کے دھندلکے میں اکبر خاں کا گاؤں آگ کا ایک بہت بڑا الاؤ نظر آتا تھا۔ ایک ثانیہ کے لیے معظم علی کی رگوں میں خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ اکبر خاں کی بستی سے آگے افق پر دو اور بستیوں میں آگ کے شعلے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک لمحہ کے اندر اندر وحشت، بربریت اور مظلومیت کے کئی منظر معظم علی کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ اس کے ساتھی انتہائی پریشانی کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ معظم علی نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ اکبر خاں کا گاؤں ہے۔ اب وہاں شاید دشمن کے سوا کوئی اور نہ ہو۔ تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں!"

معظم علی کے ایک ساتھی نجف خاں نے کہا۔ "آپ کم از کم ایک آدمی کو ضرور ساتھ لے جائیں۔"

"بہت اچھا! تم میرے ساتھ آؤ!"

نجف خاں کے ساتھ ٹیلے سے اتر کر کوئی ایک کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد

معظم علی نے کہا "اب گھوڑوں کو آگے لے جانا ٹھیک نہیں۔ تم یہیں ٹھہرو اور میرا انتظار کرو۔ اگر مجھے کوئی خطرہ پیش آیا تو میں بندوق چلا کر تمھیں خبردار کردوں گا۔ پھر اگر میں صبح تک نہ پہنچوں تو تم باقی ساتھیوں کو لے کر واپس روانہ ہو جانا۔ میرا خیال ہے کہ بستی سے باہر اودھ یا انگریزی فوج کا کوئی دستہ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ ورنہ یہ ممکن نہیں کہ اکبر خاں کے گھر میں آگ لگی ہو اور علاقے کے لوگ دیوانوں کی طرح اس طرف نہ بھاگ رہے ہوں۔"

معظم علی نے اپنا گھوڑا نجف خاں کے سپرد کیا اور بھاگتا ہوا گاؤں کی طرف بڑھا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد اسے گاؤں کی دوسری طرف آدمیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ گاؤں کے درمیانی حصے میں آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے اور اس کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ آگ کا سارا زور اکبر خاں کی حویلی میں ہے۔ گاؤں سے باہر چند مقامات پر گندم کے کھلیان جل رہے تھے اور بعض کھیتوں میں پکی ہوئی گندم ابھی تک کھڑی تھی۔ معظم علی روشنی سے بچنے کے لیے گندم کے کھیتوں میں جھک جھک کر چلتا ہوا گاؤں کی دوسری طرف بڑھا۔

تھوڑی دیر بعد اسے ایک وسیع میدان میں فوج کا پڑاؤ دکھائی دیا۔ گاؤں سے آگ کی روشنی دور دور پہنچ رہی تھی۔ پڑاؤ کے درمیان چند خیمے نصب تھے اور پیچھے ایک ٹیلے کے نشیب میں گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ایک جگہ فوج کے لیے کھانا تیار ہو رہا تھا۔ کچھ سپاہی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں زمین پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے اور باقی گاؤں کی طرف جمع ہو کر آگ کا منظر دیکھ رہے تھے۔ یہ اودھ کی فوج تھی۔

معظم علی گندم کے ایک کھیت میں رینگتا ہوا آگے بڑھا اور سپاہیوں کی ایک ٹولی کے قریب جا پہنچا۔ اودھ کے سپاہیوں کے درمیان چند انگریز کھڑے تھے اور ان کے چہرے آگ کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ معظم علی ان کی باتیں سننے کے لیے قریب جانا چاہتا تھا لیکن گندم کے کھیت سے آگے کوئی چھپنے کی جگہ نہ تھی۔ سپاہیوں کے گروہ کے پاس معظم علی

کو دو توپیں دکھائی دیں۔

پہریداروں کی ایک ٹولی گشت لگاتی ہوئی کھیت کے قریب سے گزری اور معظم علی کھیت کے کنارے سے پیچھے ہٹ کر لیٹ گیا۔ ایک سپاہی اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا۔ "اب اس علاقے کے لوگ خواب میں بھی کسی انگریز پر گولی نہیں چلائیں گے۔"

دوسرے نے کہا۔ "تم انھیں نہیں جانتے۔ یہ لوگ مرتے دم تک اپنے دشمن کو معاف نہیں کرتے۔ تم نے ان کے سردار کو نہیں دیکھا؟ وہ رسیوں میں جکڑا ہوا بھی انگریز افسر کو گالیاں دے رہا تھا۔"

تیسرے نے کہا۔ "وہ تو نواب اودھ کو بھی گالیاں دے رہا تھا۔ اس کے خاندان کے لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ وہ حملے سے پہلے یہاں سے نکل گئے تھے۔ ورنہ ان میں سے کوئی زندہ نہ بچتا۔"

چوتھے نے کہا۔ "لیکن مجھے اب بھی یقین ہے کہ جن لوگوں نے انگریزوں پر گولی چلائی تھی وہ صبح تک اپنے سردار کی جان بچانے کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیں گے۔"

"لیکن اگر انھوں نے اپنے آپ کو پیش نہ کیا تو؟"

"تو کل اسے پھانسی دے دی جائے گی اور پھر اس قوم کی ہر بستی کا یہی حال ہوگا۔"

"لیکن یہ ظلم ہے!"

"ظلم کیا ہے یہ لوگ اپنی تباہی کے خود ذمہ دار ہیں۔"

پہرے دار دور چلے گئے اور معظم علی اسی طرح رینگتا ہوا واپس لوٹا اور تھوڑی دیر بعد وہ کھیت سے نکل کر بھاگ رہا تھا۔



معظم علی نے پگ ڈنڈی پر پہنچ کر ادھر ادھر دیکھا لیکن نجف خاں اسے کہیں نظر نہ آیا۔ "نجف خاں! نجف خاں!!" اس نے دبی زبان سے آوازیں دیں اور پھر کسی طرف سے

جواب نہ پاکر اس نے سوچا شاید میں تاریکی میں راستہ بھول کر کسی اور جگہ آگیا ہوں۔ وہ پریشانی، اضطراب اور تذبذب کی حالت میں پگ ڈنڈی پر کھڑا تھا۔ اچانک اسے کسی کی آواز سنائی دی۔ "اپنے ہتھیار پھینک دو تم ہماری بندوقوں کی زد میں ہو!"

معظم علی نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اگر تم انگریز یا اودھ کی فوج کے سپاہی نہیں ہو تو مجھے اپنا دوست سمجھو۔"

"تم اپنے ہتھیار پھینک دو ہم کسی پر اعتماد نہیں کر سکتے۔"

معظم علی نے اپنی بندوق پھینک کر دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا: "اگر تم اکبر خاں کے ساتھی ہو تو اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔"

پانچ آدمی بندوقیں سیدھی کیے کھیت کی مینڈ کی آڑ سے نمودار ہوتے اور انھوں نے آگے بڑھ کر معظم علی کو گھیرے میں لے لیا۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر اس کی بندوق اٹھالی۔

معظم علی نے کہا۔ "میں اکبر خاں کا دوست ہوں اور آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ میرا ساتھی کہاں ہے؟"

ایک آدمی نے کہا: "اکبر خاں کے دوست اس طرح مسلح ہو کر رات کو اس علاقے میں نہیں آتے۔ تمہارا ساتھی اگر یہیں تھا تو وہ ہماری قید میں ہے اور اگر جنگل کے قریب ٹیلے پر بھی تم ہی اپنے چار اور ساتھیوں کو چھوڑ آئے تھے تو وہ بھی ہماری قید میں ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔ "میرا نام معظم علی ہے اور اگر تم میں سے کوئی شخص اکبر کے گاؤں کا ہے تو میں اس پر یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ میں اکبر خاں کا دوست ہوں۔"

"ہم روہیلکھنڈ کے لوگوں کے سوا کسی کو اکبر خاں کا دوست نہیں سمجھتے تم ہمارے ساتھ چلو!"

"میں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس سے پہلے میں آپ سے

اکبر خاں کے خاندان کے لوگوں کا حال پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس وقت اس کی والدہ، بیوی اور بچے کہاں ہیں؟"

ایک آدمی نے بستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "اکبر خاں کی والدہ اور اس کے خاندان کے کئی افراد کی لاشیں اس مکان کے اندر جل رہی ہیں لیکن تم نے اکبر خاں کے متعلق کیوں نہیں پوچھا؟"

"اکبر خاں کے متعلق مجھے معلوم ہے کہ وہ اس وقت دشمن کی قید میں ہے۔ خدا کے لیے آپ اس کی بیوی اور بچوں کے متعلق بتائیے!"

"اس کی بیوی اور بچے سلامت ہیں لیکن تمہارا ساتھی یہ کہتا تھا کہ تم لوگ لکھنؤ کے راستے میسور سے آرہے ہو، پھر تمہیں اکبر خاں کے متعلق یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ قید میں ہے؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں ابھی دشمن کی فوج کا پڑاؤ دیکھ کر آرہا ہوں لیکن میں تمہاری تسلی نہیں کر سکتا۔ خدا کے لیے مجھے فوراً اکبر خاں کی بیوی کے پاس لے چلو وہ مجھے جانتی ہے۔"

"چلو!"

کھیتوں سے آگے قریباً دو میل گھنے جنگل میں چلنے کے بعد یہ لوگ ایک جگہ رکے جنگل کے پہریداروں میں سے کسی نے درختوں کی اوٹ سے آواز دی: "کون ہے؟"

معظم علی کے ایک ساتھی نے جواب دیا: "میں نعمت خاں ہوں، ہم نے چند قیدی بھیجے تھے وہ پہنچ گئے ہیں؟"

پہریدار نے جواب دیا: "وہ پہنچ گئے ہیں لیکن آپ سے بڑی غلطی ہوئی وہ قیدی نہیں ہیں، ان کا ایک ساتھی پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ کہاں ہے؟"

"وہ ہمارے ساتھ ہے۔"

"اسے آگے لے چلو!"

تاریک اور گھنے جنگل میں تھوڑی دور اور چلنے کے بعد معظم علی کو ایک جگہ روشنی دکھائی دی۔ ایک آدمی مشعل بلند کیے گھنے درختوں کی آڑ سے نمودار ہوا اور معظم علی کے قریب پہنچ کر بولا۔ "آپ معظم علی ہیں؟"

"ہاں!" اس نے جواب دیا۔

"معاف کیجیے ہمارے آدمیوں سے بڑی بھول ہوئی۔"

معظم علی نے جواب دیا: "آپ کے ساتھیوں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اکبر خاں کی بیوی اور بچے کہاں ہیں؟"

قریب سے آہوں، سسکیوں اور چیخوں میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ "بھائی جان! میں یہاں ہوں۔"

اور ایک ثانیہ بعد بلقیس تاریکی سے نکل کر معظم علی کے سامنے کھڑی تھی۔ معظم علی نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا: "بلقیس اب باتوں کا وقت نہیں۔ بھائیو! میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس جنگل میں کتنے آدمی ہیں جو ہتھیار اٹھا سکتے ہیں؟"

ایک آدمی نے جواب دیا: "اس جنگل میں آس پاس کی تمام آبادی جمع ہو چکی ہے لیکن جو لڑنے والے تھے، ان میں سے کچھ تو میراں پور کٹرہ کی جنگ میں کام آ چکے ہیں اور کچھ ہمارے گاؤں کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہو گئے ہیں۔ صبح تک انگریز اور اودھ کے سپاہی ہمیں بھی اس جنگل میں گھیر گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "اگر تین چار سو آدمی اس وقت اپنی جانوں پر کھیلنے کے لیے تیار ہو جائیں تو ایسی صبح کبھی نہیں آئے گی۔ میرا اندازہ ہے کہ دشمن کے پڑاؤ میں چار پانچ سو آدمیوں سے زیادہ نہیں ہوں گے۔"

ایک آدمی آگے بڑھ کر بے اختیار معظم علی کے ساتھ لپٹ گیا اور اس نے کہا: "ان

شکست خوردہ آدمیوں کو ایک رہنما کی ضرورت تھی۔ قدرت نے ہماری مدد کے لیے آپ کو بھیج دیا ہے۔ یہاں کم از کم دو سو آدمی ایسے ہیں جو پانی پت کی جنگ میں آپ کے ساتھ تھے۔ اگر آپ ہماری رہنمائی کریں تو ایک ہزار آدمی آپ کے ساتھ جان کی بازی لگانے کے لیے تیار ہیں۔ ہم اکبر خاں کو دشمن کی قید میں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتے۔"

معظم علی نے کہا: "تم فوراً تمام آدمیوں کو جمع کرو۔ ہم آدھی رات کے وقت یہاں سے روانہ ہوں گے۔"

چند منٹ کے اندر اندر جنگل کے طول و عرض میں پانی پت کے آزمودہ کار سپاہی کی آمد کی خبر مشہور ہو چکی تھی اور بوڑھے جوان اور نوعمر لڑکے معظم علی کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ ان میں بعض وہ بھی تھے جو تیرہ سال قبل پانی پت کے میدان میں معظم علی کے دوش بدوش دادِ شجاعت دے چکے تھے۔ معظم علی انھیں ضروری ہدایات دینے کے بعد ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے روہیلکھنڈ کی جنگ اور بستی پر حملے کی تفصیلات سن رہا تھا۔

اکبر خاں کے گاؤں کے ایک آدمی نے اسے بتایا کہ اودھ اور انگریزوں کی افواج نے مختلف مقامات سے روہیلکھنڈ میں داخل ہو کر میراں پور کٹرہ کی طرف پیش قدمی کی تھی۔ اکبر خاں اپنے علاقے کے ایک ہزار جوانوں کو لے کر حافظ رحمت خاں کی مدد کے لیے روانہ ہوا۔ اس کی روانگی کے دو دن بعد اودھ سے کمک کے چند دستے اس علاقے میں داخل ہوئے۔ ہمارے پاس بستیوں کی حفاظت کے لیے زیادہ آدمی نہ تھے۔ اس لیے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر دشمن ہماری بستیوں میں داخل نہ ہو تو ہم کوئی مزاحمت نہ کریں لیکن اودھ کی فوج اس علاقے کے لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کے ارادے سے ہمارے گاؤں میں داخل ہو گئی۔ ان کے ساتھ پانچ انگریز افسر تھے۔ گاؤں کے لوگ سراسیمہ ہو کر سردار اکبر خاں کی حویلی میں جمع ہو گئے۔ اودھ کے کماندار نے ہم سے مطالبہ کیا کہ اگر گاؤں کے لوگ اپنا اسلحہ ہمارے

حوالے کردیں اور ہمیں سردار کے مکان کی تلاشی لینے دیں تو ان پر کوئی سختی نہیں کی جائے گی۔ دشمن کو یقین تھا کہ ہم اس کی دھمکی سے مرعوب ہو جائیں گے لیکن ہم نے یہ جواب دیا کہ اکبر خاں کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے تمھیں ہماری لاشوں پر سے گزرنا پڑے گا۔ ایک انگریز نے شیخی میں آکر حویلی کے دروازے پر ہوائی فائر کر دیا۔ اس کے جواب میں ہم نے گولیاں چلائیں اور پلک جھپکنے کی دیر میں دس پندرہ آدمی وہیں ڈھیر ہو گئے۔ ہلاک ہونے والوں میں دو انگریز تھے۔ ایک انگریز نے زخمی ہو کر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ اودھ کے سپاہیوں کے لیے یہ صورتِ حالات غیر متوقع تھی اور وہ بھاگ نکلے۔ ان کی تعداد ڈیڑھ سو سے زائد تھی لیکن ہم نے تعاقب کرنا مناسب نہ سمجھا۔

پھر ہمیں میراں پور کٹرہ کے میدان میں اپنی شکست اور حافظ رحمت خاں کی شہادت کی اطلاع ملی۔ ہمارے علاقے کے چار سو نوجوان شہید ہوئے اور باقی اکبر خاں کے ساتھ واپس آگئے۔

تین دن بعد ہمیں یہ معلوم ہوا کہ اودھ کی فوج کے کچھ دستے چند انگریز سپاہیوں کے ساتھ اس گاؤں کا رخ کر رہے ہیں۔ سردار نے راتوں رات گاؤں کی عورتوں اور بچوں کو جنگل کی طرف بھیج دیا۔ ہمیں پتہ چلا کہ اس فوج کی رہنمائی وہی انگریز افسر کر رہا ہے جو یہاں سے زخمی ہو کر بھاگا تھا۔ اس نے سردار اکبر خاں کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر تم انگریز افسروں کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کر دو تو بہتر ورنہ تمھارے مکان کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا جائے گا۔

لڑائی شروع ہو گئی۔ انگریزوں نے تین بار حویلی پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار انھیں ہماری گولیوں کی بارش میں پیچھا ہٹنا پڑا۔

اگلے دن ان کی دو توپیں پہنچ گئیں اور انھوں نے گاؤں پر گولہ باری شروع کر دی۔ تیسرے پہر تک گاؤں ملبے کا ایک ڈھیر بن چکا تھا۔ اکبر خاں کے تین چچا زاد اور دو ماموں زاد بھائی مارے جا چکے تھے۔ ان کی والدہ جو خاندان کی دوسری عورتوں کے ساتھ

جانے کی بجائے اپنے بیٹے کے ساتھ رہنے پر مصر تھیں، زخمیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہو گئیں۔ اکبر خاں کی حویلی کے محافظوں کو باہر سے دشمن محاصرے میں لیے ہوئے تھا اور حویلی کے اندر وہ بڑی تیزی سے آگ کی لپیٹ میں آرہے تھے۔ چند گھوڑے حویلی کے اندر بندھے ہوئے تھے لیکن سردار کے ساتھیوں کی تعداد سو سے زیادہ تھی۔ اس نے ہم میں سے بہترین نیزہ بازوں کو گھوڑوں پر سوار ہو جانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد حویلی کا دروازہ کھولا گیا اور سردار نے سواروں کے ساتھ نکل کر گاؤں کے جنوب کی طرف دشمن کی صفوں پر حملہ کر دیا۔ اس کے پیچھے باقی آدمی بھی نکل آئے۔ دشمن کی گولیوں سے چار سوار شہید ہو گئے۔ اکبر خاں کے گھوڑے کو گولی لگی اور وہ گر پڑا۔ میرے ساتھ پندرہ آدمیوں نے مڑ کر اسے بچانے کی کوشش کی لیکن وہ بیہوش پڑا ہوا تھا۔ ہم نے اکبر خاں کو اس حال میں چھوڑ کر بھاگنا گوارا نہ کیا اور اپنے ہتھیار پھینک دیئے۔ دشمن نے ہمیں گرفتار کر لیا۔ باقی آدمیوں میں سے چند زخمی اور شہید ہو گئے اور باقی لڑتے بھڑتے نکل گئے۔ اکبر خاں کو تھوڑی دیر بعد ہوش آگیا اور انگریز افسر نے اس سے کہا کہ اگر تم اپنے قبیلے کے تمام آدمیوں کو یہاں جمع کر کے ہماری وفاداری کا یقین دلاؤ اور ان لوگوں کو ہمارے حوالے کر دو جنھوں نے دو انگریز افسروں کو ہلاک کر دیا تھا تو تمھیں رہا کر دیا جائے گا۔ ورنہ کل تمھیں پھانسی دے دی جائے گی۔ اکبر خاں نے جواب دیا۔ "تم مجھے قتل کر سکتے ہو لیکن ذلیل نہیں بنا سکتے۔" میں نے انگریز افسر سے کہا "اگر آپ مجھے چھوڑ دیں تو میں کل تک اس علاقے کے تمام چیدہ چیدہ آدمیوں کو یہاں حاضر کرنے کا ذمہ لیتا ہوں اور میں اس بات کا ذمہ بھی لیتا ہوں کہ انگریز افسروں کے قاتلوں کو آپ کے حوالہ کر دیا جائے گا۔" انھوں نے مجھے رہا کرتے وقت یہ دھمکی دی کہ اگر تم نے وعدہ خلافی کی تو اکبر خاں کے ساتھ تمھارے باقی ساتھیوں کو بھی پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ اکبر خاں نے مجھے غداری اور بزدلی کے طعنے دیئے۔ کاش میں اس کے کان میں اتنا کہہ سکتا کہ میں یہ سب کچھ تمھارے لیے کر رہا ہوں۔

آپ کی آمد سے پہلے میں رات کے وقت دشمن کے پڑاؤ پر حملہ کرنے کا ارادہ کرچکا تھا اور کوئی تین سو آدمی میرا ساتھ دینے کے لیے آمادہ بھی ہوگئے تھے لیکن ہمیں اپنی کامیابی بے حد مخدوش نظر آتی تھی۔ اب مجھے یقین ہے کہ قدرت نے آپ کو بلاوجہ نہیں بھیجا ہے۔ آپ کی آمد سے پہلے جب میں نے ان سے درخواست کی تھی تو ان میں سے بہت سے لوگ یہ کہتے تھے کہ ہم اپنی عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر کہاں جائیں لیکن اب ان کی عورتیں اور بچے بھی آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔"

ایک کمسن بچے نے معظم علی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔"

معظم علی نے اسے اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "بیٹا تمھارا نام کیا ہے؟"

"شہباز" اس نے جواب دیا۔

پیچھے سے بلقیس کی آواز آئی: "شہباز یہ تمھارے چچا جان ہیں۔"



اودھ کے سپاہی اور ان کے انگریز ساتھی رات کے دو بجے پہریداروں کی چیخ و پکار، بندوقوں کی آوازیں اور حملہ آوروں کے نعرے سن کر بیدار ہوئے۔ آن کی آن میں پڑاؤ کے اندر افراتفری پھیل گئی۔ حملہ آور تین اطراف سے پڑاؤ میں داخل ہو کر قتل عام شروع کرچکے تھے۔ تاریکی میں اودھ کے سپاہی یہ محسوس کر رہے تھے کہ روہیلکھنڈ کی ساری آبادی ان کے پڑاؤ پر حملہ کرچکی ہے۔ افسروں میں سے کوئی صفیں درست کرنے اور کوئی اپنے سپاہیوں کو بھاگنے کا حکم دے رہا تھا۔ سراسیمگی کی حالت میں اودھ کے کئی سپاہی اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ انھیں جنوب مشرق کے سوا ہر سمت حملہ آوروں کا سیلاب نظر آرہا تھا۔ بیشتر سپاہی اس طرف بھاگ نکلے۔

تھوڑی دیر میں جنوب مشرق کی طرف ایک عام پسپائی شروع ہوچکی تھی لیکن کوئی دو فرلانگ دور، بھاگنے والوں کو کھیتوں کی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ کا سامنا کرنا پڑا اور

وہ الٹے پاؤں پیچھے ہٹے۔ اس کے ساتھ ہی قریباً دو سو آدمیوں نے جو تلواروں اور نیزوں سے مسلح تھے، کھیت سے نکل کر ان پر ہلہ بول دیا۔ بعض سپاہیوں نے عقب کے ٹیلے کی طرف سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن حملہ آور ٹیلے کے نشیب پر بھی قابض ہوچکے تھے۔

اکبر خاں اور اس کے ساتھی قید کی حالت میں پڑاؤ کے درمیان انگریز سپاہیوں کے خیموں سے کچھ دور پڑے ہوئے تھے اور اودھ کے جو سپاہی ان کی حفاظت پر متعین تھے انتہائی اضطراب کی حالت میں ان سے پوچھ رہے تھے: "یہ کون ہیں۔ یہ کہاں سے آئے ہیں — یہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

اکبر خاں نے جواب دیا۔ "تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تھوڑی دیر بعد تمھیں یہ معلوم نہیں رہے گا کہ تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے۔"

اودھ کی فوج کا ایک افسر بھاگتا ہوا آیا اور اس نے پہریداروں سے پوچھا: "قیدی کہاں ہیں؟"

"قیدی یہیں ہیں" ایک پہریدار نے جواب دیا: "ان کے متعلق آپ کا کیا حکم ہے؟"

افسر جواب دینے کی بجائے آگے بڑھا اور تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر قیدیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا: "سردار اکبر خاں! اس حملے کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔ ہمارے سالار اور انگریز افسروں نے تمھیں فوراً قتل کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

اکبر خاں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "مجھے قتل کر کے تم اپنی جانیں نہیں بچا سکتے۔"

"لیکن اگر تم یہ قتل عام بند کرانے کا وعدہ کرو تو میں تمھیں آزاد کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

اکبر خاں نے جواب دیا: "میں تمھارے ساتھ کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔"

افسر نے جلدی سے اپنا خنجر نکال کر اکبر خاں کے ہاتھ پاؤں کی رسیاں کاٹتے ہوئے

کہا: "مجھے ایک بہادر دشمن سے کوئی وعدہ لینے کی ضرورت نہیں۔" پھر اس نے اپنے سپاہیوں سے کہا: "ان سب قیدیوں کو آزاد کر دو۔ جلدی کرو!"

سپاہیوں نے قیدیوں کی رسیاں کاٹنی شروع کر دیں۔

اکبر خاں نے اٹھتے ہوئے کہا: "تم اپنے ہتھیار ہمارے حوالہ کر دو اور اسی جگہ بیٹھے رہو۔"

نوجوان افسر نے کہا: "اگر آپ یہ وعدہ کریں کہ آپ اودھ کے سپاہیوں کو امان دیں گے تو ہم اپنے ہتھیار آپ کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

اکبر خاں نے جواب دیا: "میں لڑائی ختم ہونے سے پہلے کوئی وعدہ نہیں کرتا۔"

افسر نے اپنی تلوار نکال کر اکبر خاں کو پیش کر دی اور باقی پہریداروں نے بھی اپنے اپنے ہتھیار قیدیوں کے سامنے پھینک دیئے۔

قیدی ابھی تلواریں اور بندوقیں اٹھا رہے تھے کہ ایک طرف سے آواز آئی۔

"قیدی کہاں ہیں؟"

"قیدی یہاں ہیں۔" اکبر خاں نے جواب دیا۔

نوجوان افسر نے دبی زبان میں کہا: "یہ ہمارے کماندار ہیں۔"

کماندار پانچ اور سپاہیوں کے ساتھ آگے بڑھا اور اس نے کہا: "اکبر خاں کے سوا باقی تمام قیدیوں کو رہا کر دو اور ان سے کہو کہ اگر دس منٹ کے اندر اندر انھوں نے حملہ آوروں کو واپس جانے پر آمادہ نہ کیا تو اکبر خاں کی گردن مار دی جائے گی۔"

اکبر خاں نے اچانک بڑھ کر حملہ کیا اور کماندار ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔ کماندار کے ساتھیوں نے ابھی اپنی بدحواسی پر قابو نہیں پایا تھا کہ اکبر خاں نے دوسرے وار میں ایک اور آدمی کو مار گرایا۔ باقی قیدی دوسرے آدمیوں پر ٹوٹ پڑے اور آن کی آن میں انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس عرصہ میں پڑاؤ پر حملہ آوروں کا گھیرا بہت تنگ

ہو چکا تھا۔ تاہم وہ تاریکی میں غیر ضروری نقصان سے بچنے کے لیے دشمن کے ساتھ گتھم گتھا ہونے کی بجائے اکا دکا حملوں پر اکتفا کر رہے تھے۔ حملہ آوروں کی ایک ٹولی ایک شدید حملے کے بعد انگریزوں کے خیموں کے قریب پہنچ چکی تھی۔

اکبر خاں اس افسر کی طرف متوجہ ہوا جس نے قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس نے کہا: "اب تم ہمارے ساتھی ہو۔ میں ایک افسر کو اس کے اپنے سپاہیوں کے خلاف لڑنے کے لیے نہیں کہوں گا لیکن تم انھیں ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دے کر بہت سے آدمیوں کی جانیں بچا سکتے ہو۔"

افسر بھاگ کر آگے بڑھا اور چاروں طرف سے سمٹتی ہوئی فوج کے درمیان کھڑا ہو کر بلند آواز میں چلانے لگا: "کماندار مارا گیا۔ دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہتھیار ڈال دو!"

تھوڑی دیر میں اودھ کے سپاہی اس کا یہ پیغام ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پہنچا چکے تھے۔ انگریز سپاہیوں کے خیموں کے آس پاس ابھی تک شدید لڑائی ہو رہی تھی۔ اکبر خاں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس طرف بڑھا اور اس نے پیچھے ہٹنے والے سپاہیوں پر عقب سے حملہ کر دیا۔ چند آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ اپنا راستہ صاف کرتا ہوا حملہ آوروں سے جا ملا اور بلند آواز میں چلایا:

"میں اکبر خاں ہوں!"

اکبر خاں کے ایک رشتہ دار نے آگے بڑھ کر کہا: "اکبر خاں تم کہاں تھے؟ ہم تمھیں سارے پڑاؤ میں تلاش کر چکے ہیں۔"

اکبر خاں نے کہا: "تمھارے کسی سوال کا جواب دینے سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس حملے کی رہنمائی کون کر رہا ہے؟"

کوئی تاریکی میں آگے بڑھا اور اکبر خاں سے لپٹ کر بولا: "بھلا بتاؤ میں کون ہوں؟"

اکبر خاں نے کہا "اگر آپ معظم علی ہیں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں اپنی زندگی کی بھیانک رات میں ایک اور عجیب سپنا دیکھ رہا ہوں۔"

لڑائی قریباً ختم ہو چکی تھی اور بقیۃ السیف سپاہی جگہ جگہ ہتھیار پھینک کر امان طلب کر رہے تھے۔ معظم علی نے تمام قیدیوں کو ایک جگہ جمع کرنے اور مشعلیں جلانے کا حکم دیا۔ حملہ آوروں کے بیس آدمی زخمی اور سات ہلاک ہوتے تھے اس کے مقابلے میں اودھ کی فوج کے اسّی آدمی ہلاک اور کوئی ڈیڑھ سو زخمی ہو چکے تھے۔ اودھ کی یہ فوج پانچ سو سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ ہلاک ہونے والوں کے علاوہ ان تیس چالیس آدمیوں کے سوا جو تاریکی میں موقع پا کر اِدھر اُدھر بھاگ گئے تھے۔ باقی سب حملہ آوروں کی قید میں تھے ہلاک ہونے والوں میں پانچ انگریز بھی تھے اور باقی دس انگریز جن میں وہ لیفٹیننٹ بھی تھا جو اپنے دو ساتھیوں کی موت پر اس گاؤں کو سزا دینے کی نیت سے آیا تھا، قید ہو چکے تھے۔

معظم علی نے اکبر خاں سے کہا "یہاں میرے حصے کا کام ختم ہو چکا ہے موجودہ حالات میں تمھارے قبیلے کے لوگ یہاں نہیں رہ سکتے۔ ہمیں بہت جلد یہاں سے دور نکل جانا چاہیے۔ ان قیدیوں کے متعلق فیصلہ کرنا اب تمھارا یا تمھارے قبیلے کے لوگوں کا کام ہے۔"

اکبر خاں نے کہا۔ "اودھ کے سپاہیوں کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ انگریز میرے حوالے کر دیئے جائیں۔"

"تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا اور آپ سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ ان کے متعلق کوئی سفارش نہ کریں۔"

معظم علی نے جواب دیا "اگر میں انھیں جنگی قیدی سمجھتا تو یقیناً ان کے ساتھ اسی

سلوک کا مطالبہ کرتا جو جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے لیکن میں ان بھیڑیوں کو انسان سمجھنے کی غلطی نہیں کروں گا۔ تمھیں ان پر مکمل اختیار ہے۔"

اکبر خاں کے حکم سے اس کے آدمیوں نے لیفٹیننٹ اور اس کے ساتھ دوسرے انگریزوں کو پکڑ کر باقی قیدیوں سے الگ کر لیا۔ پھر چند آدمیوں نے خیموں کے رسّے کاٹ کر ان کی گردنوں میں ڈال دیئے۔ اکبر خاں کے ساتھ چند آدمی انگریزوں کو گھیرے میں لئے کر گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔

انگریز لیفٹیننٹ چلّایا "ہماری فوج جلد یہاں آئے گی اور اگر تم نے ہمارے ساتھ زیادتی کی تو وہ تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

ایک نوجوان نے بڑھ کر اپنی تلوار کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی اور وہ خاموش ہو گیا۔

اکبر خاں نے کہا "ہمیں معلوم ہے کہ تمھاری فوج ضرور آئے گی لیکن وہ صرف ہماری بے بسی کا تماشا ہی نہیں دیکھے گی۔"

دوسرا انگریز بولا "سردار صاحب! اگر آپ ہمیں چھوڑ دیں تو ہم یہ وعدہ کرتے ہیں کہ انگریز اس علاقے پر کوئی زیادتی نہیں کریں گے۔"

اکبر خاں نے جواب دیا "میں تم لوگوں کے وعدوں کی حقیقت سے واقف ہوں۔"

لیفٹیننٹ نے چند قدم اور چلنے کے بعد کہا "آپ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟"

اکبر خاں نے جواب دیا "میں حیران ہوں کہ تم اب بھی یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہو۔"

کوئی آدھ گھنٹہ بعد اکبر خاں کے مکان کے سامنے آم کے ایک درخت کی مضبوط شاخوں کے ساتھ دس آدمیوں کی لاشیں لٹک رہی تھیں اور وہ دروازے کے سامنے کھڑا اس آگ کے انگاروں کو دیکھ رہا تھا جو اس کی زندگی کی بہترین راحتوں اور مسرتوں

کو بھسم کر چکے تھے۔

ایک طرف سے حویلی کی دیوار توپوں کی گولہ باری کے باعث ٹوٹی ہوئی تھی۔ اکبر خاں اور اس کے ساتھی اس کی طرف سے اندر داخل ہوئے۔ صحن میں جگہ جگہ لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اکبر خاں کے ساتھی لاشیں اٹھا کر باہر نکل آئے اور وہ کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا اس کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں ملبے کے ڈھیر سے اب تک دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کمرے میں اس کی ماں کی لاش دفن تھی۔

"اکبر خاں! اکبر خاں!" اس کے کسی ساتھی نے آواز دی اور وہ حویلی سے باہر نکل آیا۔

جب صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے تو روہیلے پڑاؤ میں اپنے ساتھیوں کی لاشیں دفن کرنے میں مصروف تھے۔ اودھ کی فوج کا نوجوان افسر جس نے رات اکبر خاں کو قید سے آزاد کیا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر بولا: "آپ نے ہمارے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟ میں یہ اس لیے نہیں پوچھتا کہ مجھے اپنی زندگی بہت عزیز ہے۔ میں اس دن مر چکا تھا جب میراں پور کٹرہ کے میدان میں میری تلوار ایک بے گناہ مسلمان کے خون میں آلودہ ہوئی تھی۔ ضمیر کی موت کے بعد جسم کی موت کوئی حقیقت نہیں رکھتی لیکن ان لوگوں میں اکثر ایسے ہیں جنھیں شاید یہ بھی معلوم نہ ہو کہ اس ملک کے مسلمانوں کے لیے روہیلکھنڈ کے حریت پسندوں کی تباہی کیا نتائج پیدا کرے گی۔ یہ لوگ جنگ میں اس لیے شریک ہوئے تھے کہ اودھ میں پیدا ہوئے تھے اور اودھ کی فوج میں ملازم تھے۔ اگر یہ روہیلکھنڈ میں پیدا ہوئے ہوتے تو یہ حافظ رحمت خاں کی طرف سے لڑتے۔ میں نیکی بدی کا شعور رکھتا تھا لیکن میرا ضمیر شاید اس لیے مر چکا ہے کہ میں ایک بے ضمیر حکمران کے ساتھ اپنی زندگی وابستہ کر چکا ہوں۔ تاہم میری سزا ان لوگوں کی نسبت زیادہ ہونی چاہیے۔"

اکبر خاں نے معظم علی کی طرف دیکھا اور معظم علی نے نوجوان کی طرف چند ثانیے غور

سے دیکھنے کے بعد پوچھا۔ "تمھارا نام کیا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "میرا نام عبداللہ ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "پانی پت کی جنگ میں اودھ کی فوج کا ایک سالار ہمارے ساتھ تھا۔ اس کی شکل بالکل تم جیسی تھی۔ شاید اس کا نام محمد عمر تھا۔ جب ہم دشمن کا تعاقب کر رہے تھے تو وہ ہمارے ساتھ تھا اور اس نے بڑی بہادری سے جان دی تھی۔"

عبداللہ نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ "وہ میرا باپ تھا۔"

اکبر خاں نے معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "یہ وہی صاحب ہیں جنھوں نے مجھے اپنی فوج کے کمانڈر کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچایا تھا۔"

معظم علی نے کہا۔ "عبداللہ! اگر تم محمد عمر کے بیٹے ہو تو مجھے اپنا دوست سمجھو۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم کم از کم دو دن ان سپاہیوں کو اسی علاقے میں ٹھہرانے کی کوشش کرو۔ اس عرصہ میں ہماری عورتوں اور بچوں کو یہاں سے نکلنے کا موقع مل جائے گا۔ اس کے بعد تم لکھنؤ یہ خبر بھیج سکتے ہو کہ اس علاقے کی بستیاں خالی ہو چکی ہیں۔"

عبداللہ نے جواب دیا۔ "مجھے لکھنؤ اطلاع بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ میں واپس نہیں جاؤں گا لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ ہمارے جو آدمی رات کے وقت بھاگ نکلے ہیں ان میں سے بعض لکھنؤ ضرور پہنچ جائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض لکھنؤ کا رخ کرنے کی بجائے میراں پور کٹرہ کے پڑاؤ میں پہنچ جائیں اور وہاں سے فوج کے چند دستے اس طرف روانہ ہو جائیں۔"

"اس صورت میں بھی تمھارے لیے ان کی توجہ کسی اور طرف مبذول کرنا مشکل نہ ہوگا۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں یہاں سے زخمیوں، عورتوں اور بچوں کو نکالنے کے لیے دو دن مل جائیں۔"

عبداللہ نے کہا۔ "میں یہ کوشش کروں گا کہ آپ کو دو دن کی بجائے دو ہفتے مل جائیں

لیکن اس کے بعد میری منزل لکھنؤ نہیں ہوگی۔ شاید میرے کئی اور ساتھی بھی لکھنؤ جانا پسند نہ کریں۔"

معظم علی نے کہا "میں ان سب کو سرنگاپٹم آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ میرا نام معظم علی ہے اور تم مجھے سرنگاپٹم میں آسانی سے تلاش کر سکو گے۔ اکبر خاں! تم گھوڑے تیار کراؤ، اور ان کا تمام اسلحہ اپنے ساتھیوں میں بانٹ دو۔ صرف عبداللہ کے ہتھیار اور گھوڑا اسے واپس دے دو۔"

عبداللہ نے کہا "نہیں، اس وقت آپ کو ان چیزوں کی زیادہ ضرورت ہے۔"

"بہت اچھا! لیکن جانے سے پہلے میں تمھارے ساتھیوں سے چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔"

معظم علی یہ کہہ کر قیدیوں کی طرف بڑھا اور انھیں مخاطب کرتے ہوئے بولا "تم کسی رحم کے مستحق نہیں ہو۔ تمھارے ہاتھ ان بے گناہوں کے خون سے رنگین ہیں جن کا گناہ صرف یہ تھا کہ ان کے پاس اودھ کے سفاک بے حس اور عیاش حکمران کے خزانے بھرنے کے لیے روپیہ نہ تھا۔ تمھارے حکمران نے روہیلکھنڈ کے حریت پسندوں کا گلا گھونٹنے کے لیے چالیس لاکھ روپے کے عوض، انگریزوں کی خدمات حاصل کی تھیں لیکن تمھیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انگریز یہاں اس لیے نہیں آئے تھے کہ وہ تمھارے یا اودھ کے حکمران کے دوست تھے۔ نواب شجاع الدولہ نے انھیں دلی کی طرف چند اور منزلیں طے کرنے کا موقع دیا ہے اور انھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر مرہٹے یا تمھارا کوئی اور دشمن اودھ کے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے انھی انگریزوں کو چالیس لاکھ سے زیادہ روپیہ پیش کر دے تو تمھارا کیا انجام ہوگا؟ شجاع الدولہ کا خیال ہے کہ اس نے انگریزوں کی اعانت سے اپنی سلطنت کی حدود وسیع کر لی ہیں لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ وہ تباہی اور بربادی کے سیلاب کو بنگال سے لکھنؤ تک لے آیا ہے۔ روہیلکھنڈ شمالی ہندوستان کا ایک مضبوط ترین قلعہ تھا اور اودھ کے حکمران نے یہ قلعہ توڑ کر ان بیرونی

حملہ آوروں کا راستہ صاف کر دیا ہے جو مغلوں کی سلطنت کے کھنڈروں پر اپنے اقتدار کی عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔ کاش تم سب انگریز ہوتے اور ہم ضمیر کی ملامت محسوس کیے بغیر تم سب کو اسی درخت سے لٹکا کر پھانسی دے سکتے جہاں تمھارے انگریز سرپرستوں کی لاشیں لٹک رہی ہیں لیکن یہ لوگ جن کے گھر تم نے راکھ کے ڈھیر بنا دیئے ہیں، انتہائی غم و غصہ کی حالت میں بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ تم مسلمان ہو۔ تم نے چند ٹکوں کے لیے ان کی عزت اور آزادی پر حملہ کرتے وقت یہ نہیں سوچا کہ جو لوگ تمھارے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں وہ مسلمان ماؤں کے بیٹے، مسلمان بیویوں کے شوہر، مسلمان بہنوں کے بھائی اور مسلمان بچوں کے باپ ہیں۔ تمھارے دشمن یہ لوگ نہیں جنھوں نے پانی پت کے میدان میں اپنی جانوں پر کھیل کر تمھیں مرہٹوں کی غلامی سے بچایا تھا۔ بلکہ تمھارا دشمن وہ کوتا اندیش اور ملت فروش حکمران ہے جو انگریزوں کے ساتھ تمھاری اور تمھارے بعد آنے والی نسلوں کی عزت اور آزادی کا سودا کر چکا ہے۔ ہم سب جانتے کہ روہیلکھنڈ میں قیامت آ چکی ہے لیکن میں تمھیں اس دن سے خبردار کرتا ہوں جب تم اس سے بدتر قیامت کے اثرات لکھنؤ کی گلیوں میں دیکھو گے۔

تم آزاد ہو اور تمھیں اس لیے آزاد کیا جاتا ہے کہ ہم تمھیں اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق سوچنے کا موقع دینا چاہتے ہیں ہم تمھیں اس بات کا موقع دینا چاہتے ہیں کہ تم ان ملت فروشوں سے نجات حاصل کر سکو۔ جنھوں نے ان بازوؤں کو کاٹا ہے جو خطرے کے وقت تمھاری مدافعت کے لیے اٹھ سکتے تھے اور ان گھروں کو جلایا ہے جو تمھارے دفاعی حصار بن سکتے تھے۔"

جنگ ختم ہوتے ہی ایک سوار جنگل میں چھپے ہوئے لوگوں کو فتح کی خوشخبری دینے کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ اکبر خاں اور اس کے ساتھی وہاں پہنچے تو چار ہزار عورتیں، بچے

دو بوڑھے جنگل سے باہر نکل کر ان کی راہ دیکھ رہے تھے۔ بلقیس نے اپنے شوہر کو دیکھا تو اس کی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ ننھا شہباز خاں "اباجان اباجان" کہتا ہوا آگے بڑھا۔ اکبر خاں نے گھوڑے سے اتر کر اسے گلے سے لگا لیا۔ پھر اس نے بلقیس کے قریب جا کر سوال کیا "تنویر کہاں ہے؟"

بلقیس اس کے جواب میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ ایک نوجوان لڑکی نے آگے بڑھ کر کہا "تنویر میرے پاس ہے۔"

اکبر خاں نے شہباز کو نیچے اتار کر تنویر کو اٹھا لیا۔

معظم علی اپنا گھوڑا ایک آدمی کے حوالے کرنے کے بعد آگے بڑھا اور اس نے اکبر خاں کے قریب آ کر کہا "اب سوچنے یا باتیں کرنے کا وقت نہیں۔ ہمیں فوراً یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیئے۔ آپ ان لوگوں سے پوچھیں کہ ان کا کیا ارادہ ہے؟"

اکبر خاں نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ ہمارے پیدل آنے والے ساتھی بھی یہاں پہنچ جائیں تو سب کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا جائے۔"

معظم علی نے کہا "تو یہ بہتر ہوگا کہ ہم جنگل میں ان کا انتظار کریں۔"

"بہت اچھا!" اکبر خاں یہ کہہ کر قبیلے کے لوگوں سے مخاطب ہوا۔ "آپ سب جنگل میں اسی جگہ واپس پہنچ جائیں۔ ہمارے باقی آدمی پیدل آ رہے ہیں اور وہ ابھی پہنچ جائیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد قبیلے کے لوگ جنگل میں بیٹھے اکبر خاں کی تقریر سن رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا:-

"بھائیو اور بہنو! میں اب تمھیں یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ اس وقت ہم کتنی بڑی تباہی کا سامنا کر رہے ہیں۔ میران پور کٹرہ کی جنگ میں ہماری قوم کا بہترین خون بہہ چکا ہے۔ ہماری تلواریں ٹوٹ چکی ہیں اور اب ہمارے پاس آنسوؤں اور

آہوں کے سوا کچھ نہیں رہا۔ کاش الفاظ ان بہنوں اور ماؤں کی تسلّی کے لیے کافی ہوتے جن کے بھائی، شوہر اور بیٹے اپنے وطن کی حفاظت پر قربان ہو چکے ہیں۔ کاش الفاظ ان بھیڑیوں کی خصلت بدل سکتے جنھیں انسانوں کے خون کی پیاس روہیلکھنڈ میں لے آئی ہے۔ اب ہمارے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا کہ اس وطن سے نکل جائیں جس کی خاک میں ہمارے اسلاف کی ہڈیاں دفن ہیں۔ یہاں اب انسانوں کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی ہے۔ نہ معلوم اب روہیلکھنڈ کی کتنی بستیوں میں میری بستی کی داستان دہرائی جائے گی۔ اگر صرف میری ذات کے لیے خطرہ ہوتا تو میں یہاں سے ہجرت کرنا گوارا نہ کرتا لیکن میرے سامنے پورے قبیلے کا مسئلہ ہے۔ میرے سامنے ان یتیم بچوں اور بیوہ ماؤں اور بہنوں کا مسئلہ ہے۔ جن کے باپ اور شوہر جنگ میں شہید ہو چکے ہیں۔ انھیں اس ملک میں سر چھپانے کے لیے کسی جائے پناہ کی ضرورت ہے۔ میرے بزرگ بھائی معظم علی خاں کو اصرار ہے کہ ہم ان کے ساتھ میسور چلے جائیں لیکن جو کچھ میسور کے متعلق میں جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا قلعہ ہے جہاں بہترین سپاہیوں کی ضرورت ہے، حیدر علی کے متعلق میں نے سنا ہے کہ وہ ایک فیاض حکمران ہے لیکن انگریزوں اور مرہٹوں کے خلاف اس کے جنگ کے نتائج کے متعلق کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ ان بے سہارا عورتوں اور بچوں کے لیے میسور ایک اور روہیلکھنڈ بن جائے۔ بھائی معظم علی مجھ سے ناراض ہوں گے لیکن سر دست میرا یہی فیصلہ ہے کہ ہم میسور کی بجائے حیدر آباد جائیں اور وہاں کسی ایسی جگہ آباد ہونے کے امکانات کا جائزہ لیں جہاں ہمیں قابل کاشت زمین مل سکتی ہو۔ قبیلے کے بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ہم یہاں سے دلی، لاہور یا پشاور کا رُخ کریں۔ شمال کی طرف کہیں دور نکل جانا ہمارے لیے یقیناً بہتر ہوگا لیکن کاش مجھے اس بات کا اطمینان ہوتا کہ وہاں کسی علاقے کی حکومت اتنے لوگوں کو سہارا دینے کے لیے تیار ہوگی۔ میری اپنی

رائے سر دست یہی ہے کہ ہم حیدرآباد جائیں۔ تاہم میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ متفقہ طور پر کوئی فیصلہ کیا جائے۔"

معظم علی پریشانی اور اضطراب کی حالت میں اکبر خاں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب وہ تقریر کر کے بیٹھ گیا تو معظم علی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوتے دبی زبان میں کہا۔ "اکبر خاں میرا خیال تھا کہ آپ میسور جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔"

اکبر خاں نے جواب دیا۔ "میں اس موضوع پر آپ کے ساتھ علٰحدگی میں بات کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ میں آپ کی ناراضگی دور کر سکوں گا۔"

دوسری بستیوں کے چھوٹے چھوٹے سردار اور قبیلے کے عمر رسیدہ لوگ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے پر بحث کر رہے تھے۔ بعض لوگ اکبر خاں کا ساتھ دینے پر آمادہ تھے۔ لیکن بعض انتہائی شدومد کے ساتھ شمال کی طرف ہجرت کرنے کی حمایت کر رہے تھے۔ اکبر خاں کا ایک خالہ زاد بھائی منور خاں جو قبیلے میں اکبر خاں کے بعد سب سے زیادہ اثر و رسوخ کا مالک تھا، یہ کہہ رہا تھا کہ اس ملک کی کسی ریاست میں ہمارے لیے عزت اور آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے امکانات ختم ہو چکے ہیں۔ میرا یہی مشورہ ہے کہ ہم اٹک کے پار کوئی جائے پناہ تلاش کریں۔ یہ نااہل، بدطینت اور سفاک حکمران اس ملک کے لیے ایک لعنت ہیں اور میرے نزدیک اودھ، حیدرآباد اور میسور میں کوئی فرق نہیں۔ اگر ہمارے مقدّر میں صرف ذلت اور رسوائی ہے تو ہم یہیں رہ کر اودھ کی غلامی کیوں نہ قبول کر لیں۔ آپ یہ کہیں گے کہ یہاں آزادی سے محروم ہونے کے بعد ہماری بقا کو بھی خطرہ ہے لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کسی اور حکمران کی غلامی ہماری بقا کے لیے خطرناک نہ ہو گی؟"

قبیلے کے ایک اور باثر آدمی نے اٹھ کر کہا۔ "بھائیو! میری بھی یہی رائے ہے کہ ہم شمال کا رخ کریں لیکن موجودہ حالات میں آپ میں سے ہر شخص اپنے مستقبل کے

متعلق فیصلہ کرنے کا حق رکھتا ہے جو لوگ میرے بھائی اکبر خاں کا ساتھ دینا چاہیں ہم انھیں نہیں روکیں گے اور مجھے امید ہے کہ اکبر خاں کے طرفدار بھی ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کریں گے۔"

یہ بحث ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہی۔ بالآخر معظم علی اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس نے کہا۔ "بھائیو! میں آپ کو میسور آنے کی دعوت دے چکا ہوں لیکن اکبر خاں کے لیے میرا مشورہ قابل قبول نہیں۔ اب میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ وقت ضائع نہ کریں اور جلد از جلد کسی نتیجے پر پہنچ جائیں۔"

اکبر خاں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب بحث کو طول دینے سے کوئی فائدہ نہیں جو لوگ شمال کی طرف جانا چاہتے ہیں، میں انھیں روکنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں ان کے لیے دعا کروں گا کہ خدا ان کا حامی و ناصر ہو لیکن میری پہلی ذمہ داری ان بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی پرورش ہے جو اب بے سہارا ہو چکے ہیں اور مجھے یہ اعتماد ہے کہ میں ان کے لیے حیدرآباد پہنچ کر بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ اگر وہاں کے حالات اطمینان بخش نہ ہوئے تو میری دوسری منزل میسور ہو گی۔ بہرحال اگر مجھے معلوم ہوا کہ میرے وہ بھائی جو دوسری طرف جانا چاہتے ہیں کوئی تسلی بخش جائے پناہ تلاش کر چکے ہیں تو ہم بھی شاید کسی دن وہاں پہنچ جائیں ــــ منور خاں! تم تیاری کرو اب باتوں کے لیے وقت نہیں میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم یہیں سے اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائیں۔"

تھوڑی دیر بعد منور خاں اور اکبر خاں کی قیادت میں دو قافلے مختلف سمتوں کو روانہ ہو رہے تھے۔ ایک کا رخ شمال مغرب کی طرف تھا اور دوسرے کی منزل مقصود حیدرآباد تھی۔ اکبر خاں کے ساتھ بارہ سو افراد تھے۔ جن میں سے نصف سے زیادہ لاوارث بچے اور بیوہ عورتیں تھیں۔ بلقیس اپنی بچی تنویر کو گود میں لیے ایک گھوڑے پر سوار تھی اور شہباز

دوسرے گھوڑے پر اکبر خاں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ معظم علی اور اس کے ساتھی، قافلے کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں مسلح آدمیوں کو ہدایات دے رہے تھے۔

کوئی دو کوس چلنے کے بعد اکبر خاں نے اپنا گھوڑا معظم علی کے قریب لے جا کر کہا۔ "بھائی جان آپ مجھ سے خفا ہیں؟ اگر آپ کا حکم ہے تو میں حیدرآباد کی بجائے میسور جانے کو تیار ہوں۔"

"نہیں!" معظم علی نے جواب دیا۔ "میں اب تمھیں میسور جانے کے متعلق نہیں کہوں گا۔"

اکبر خاں نے کہا۔ "حیدرآباد جانے کے متعلق میرا فیصلہ بلاوجہ نہیں۔ شیخ فخر الدین اور مرزا طاہر بیگ کو ایک مدت سے یہ اصرار تھا کہ میں اپنے خاندان سمیت روہیلکھنڈ چھوڑ کر حیدرآباد میں آباد ہو جاؤں۔ جن دنوں مرہٹوں نے ہمارے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کی تھی۔ حیدرآباد سے شیخ فخر الدین اور ادھونی سے طاہر بیگ کے ایلچی میرے پاس آئے تھے۔ انھوں نے یہ پیغام بھیجے تھے کہ اب روہیلکھنڈ کی بجائے نظام کی سلطنت بہت زیادہ محفوظ ہے۔ اس لیے جب تک ملک کے حالات ٹھیک نہیں ہوتے تم یہاں آ جاؤ۔ میں نے انھیں یہ جواب دیا تھا کہ میں اپنے قبیلے کا سردار ہوں اور میرا مرنا اور جینا ان کے ساتھ ہے۔

اس کے بعد مجھے شیخ فخر الدین کا ایک اور خط ملا۔ انھوں نے یہ لکھا تھا کہ اگر تم چاہو تو حیدرآباد یا ادھونی میں تمھارے تمام قبیلے کو آباد کرنے کا انتظام کیا جا سکتا ہے اور میں نے اسے ایک مذاق سمجھا تھا۔ اب میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے حیدرآباد یا ادھونی کے آس پاس اتنی زمین مل جائے جس میں یہ بے سہارا لوگ امن و چین کے دن گزار سکیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی بدولت مجھے ایسی جگہ میسور میں بھی مل سکتی ہے لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میسور کا مستقبل حیدرآباد کی نسبت کہیں زیادہ مخدوش ہے۔

آپ یہ کہتے ہیں کہ میسور کا حکمران حیدرآباد کے حکمران کی نسبت کہیں زیادہ بیدار مغز، دور اندیش اور بہادر ہے اور اس کے سامنے ایسے مقاصد ہیں جن کے لیے تلوار اٹھانا ایک نیکی ہے لیکن بھائی جان! اگر آپ خفا نہ ہوں تو میں یہ کہوں گا کہ اب میں کسی حکمران کو بھی قابل اعتماد نہیں سمجھتا۔ اب انسانیت سے میرا اعتماد اٹھ چکا ہے۔ حکمرانوں کی عاقبت اندیشی، نیکی اور شرافت میرے لیے ایک سراب ہے اور مجھ میں اس سراب کے پیچھے دوڑنے کی ہمت نہیں رہی۔ آپ بنگال کی آزادی کے محافظ بن کر میدان میں نکلے تھے لیکن آپ کو کیا حاصل ہوا؟ اور جب میں پانی پت کے میدان میں لڑ رہا تھا تو میں یہ محسوس کرتا تھا کہ اس جنگ کے بعد روہیلہ سپاہیوں کو اودھ، دلی اور حیدرآباد کے امراء اپنا محسن خیال کریں گے لیکن ہماری قربانیوں کا جو صلہ ہمیں نواب وزیر اودھ نے دیا ہے وہ آپ دیکھ چکے ہیں۔ ہم ان کے دشمنوں کو کوسوں دور رکھنے کے لیے گئے تھے لیکن انھوں نے کوسوں دور بیٹھ کر ہماری تباہی و بربادی کا تماشا دیکھا ہے۔ میں ان لوگوں کے لیے ایثار و خلوص کے ہر جذبہ سے محروم ہو چکا ہوں جن کی بے حسی کے باعث ہماری بستیاں راکھ کے ڈھیر بن گئی ہیں۔

آپ میرے محسن ہیں۔ آپ نے میری مدد کی ہے اور آپ کے لیے میں اپنے جسم کی بوٹیاں نچوانے کے لیے تیار ہوں لیکن آج سے میں یہ عہد کر چکا ہوں کہ میری تلوار کسی حکمران کے لیے نہیں اٹھے گی۔ میں ایک کسان بنوں گا۔ میں ایک چرواہا بنوں گا۔ میری زندگی کا اب پہلا اور آخری مقصد ان بے بس لوگوں کی حفاظت اور پرورش ہے۔ آپ یہ کہتے ہیں کہ حیدر علی نہ صرف میسور بلکہ اودھ اور حیدرآباد کے مسلمانوں کی آزادی اور بقا کی جنگ لڑ رہا ہے لیکن یہی وجہ ہے جو میں میسور جانے سے ڈرتا ہوں۔ میں اور میرے قبیلے کے جانبازوں نے بھی ان لوگوں کی بقا اور آزادی کے لیے جنگ لڑی تھی لیکن ہماری بے لوث قربانیاں ان درندوں کی خصلت نہیں بدل سکیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ یہ احسان فراموش قوم کہیں ہماری طرح حیدر علی کو بھی اپنا دشمن نہ سمجھ لے۔

بھائی جان! میری پونجی میرے جلتے ہوئے گھر کی راکھ اور ان بے سہارا لوگوں کے آنسو ہیں۔ میں نظام کے پاس جا کر یہ کہوں گا کہ اگر تمھیں اچھے کسانوں اور اچھے چرواہوں کی ضرورت ہے تو ہمیں اپنی مملکت میں آباد کر لو لیکن اگر یہاں صرف تمھارے اقتدار کے پرچم اٹھانے والے سپاہیوں کی ضرورت ہے تو ہم واپس جانے کے لیے تیار ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔ "میں تمھارے احساسات سے غافل نہیں۔ تم نے ایک بھیانک ترین انقلاب دیکھا ہے لیکن یقین کرو جب میں نے بنگال سے ہجرت کی تھی اس وقت میرے دل میں بھی اسی طرح کے خیالات تھے۔ میں بھی یہ سوچا کرتا تھا کہ میں اب کسی حکمران کے ساتھ سروکار نہیں رکھوں گا اور یہی وجہ تھی کہ میں نے تجارت شروع کر دی تھی لیکن زمانے کا کوئی انقلاب سلگتی ہوئی آگ سے دھواں اور دہکتے ہوئے انگاروں سے حرارت جدا نہیں کر سکتا۔ میں دعا کروں گا کہ حیدر آباد میں تم امن اور سکون کی زندگی گزار سکو لیکن مجھے یقین ہے کہ تم کسی دن میسور ضرور آؤ گے۔ دکن کا سب سے بڑا زمیندار بن جانے کے باوجود تم کسی دن یہ محسوس کرو گے کہ تمھاری آخری منزل سرنگا پٹم ہے۔"

میراں پور کٹرہ کی شکست کے بعد روہیلوں کے سامنے موت یا ہجرت کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور اودھ کے سپاہی انھیں جنگلی جانوروں کی طرح گھیر گھیر کر قتل کر رہے تھے۔ ان کی بستیاں جلائی جا رہی تھیں۔ آگ اور خون کے اس طوفان سے بچ کر بھاگ نکلنے والے دور دراز علاقوں میں پناہ لے رہے تھے۔

یہ جنگ کسی حکومت یا فوج کے خلاف نہ تھی بلکہ ان انسانوں کے خلاف تھی جن کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ وہ کسی میر جعفر، کسی شجاع الدولہ یا کسی نظام علی خاں۔ جیسے ملت فروش کے اطاعت گزار نہ تھے۔ روہیلکھنڈ کی سرزمین اس شریف، بہادر اور غیور قوم کے فرزندوں کے خون سے لالہ زار تھی اور روہیلکھنڈ سے باہر اس قوم کی بے بسی کے

آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا۔ مہاجرین کے قافلے اپنی جنم بھوم چھوڑ کر پہاڑوں، جنگلوں اور بیابانوں میں پناہ لے رہے تھے۔ ان کا ماضی اجڑی ہوئی بستیوں، بے گور و کفن لاشوں اور لٹی ہوئی عصمتوں کی داستانوں سے لبریز تھا۔ چند دنوں کے اندر اندر ایک لاکھ انسان جلا وطنی کی حالت میں غربت، افلاس، قحط اور طرح طرح کی وباؤں کا سامنا کر رہے تھے۔ نواب وزیر اودھ اس بات پر خوش تھا کہ اس کی سلطنت میں ایک سرسبز و شاداب خطہ زمین کا اضافہ ہو گیا ہے۔ انگریز خوش تھے کہ ہندوستان کا ایک بازوئے شمشیرزن کٹ چکا ہے اور مرہٹے خوش تھے کہ وہ لوگ جو کسی وقت دلی میں ان کے مدمقابل بن سکتے تھے۔ پوری طرح مغلوب ہو چکے ہیں۔

جو قافلہ معظم علی اور اکبر خاں کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ ان گنت مصائب کا سامنا کرنے کے بعد ایک دن حیدر آباد کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ راستے میں دو مقامات پر ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کیا لیکن قافلے کے محافظوں کے ساتھ معمولی جھڑپوں کے بعد وہ بھاگ گئے۔ معظم علی کو اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ اودھ کی فوج ان کا تعاقب کرے گی لیکن اودھ کی فوج کا سپہ سالار فتح کے جشن میں حصہ لینے کے لیے لکھنؤ پہنچ چکا تھا اور اس کے سپاہی اکبر خاں کی بستی پر حملہ کرنے والے ساتھیوں کے انجام سے بے خبر روہیلکھنڈ کے طول و عرض میں قتل و غارت اور لوٹ مار میں مصروف تھے۔

چار دن بعد جب انگریزی فوج کے افسروں کو اپنے ساتھیوں کے انجام کا پتہ چلا تو یہ قافلہ کئی منزلیں دور جا چکا تھا۔

حیدر آباد کے دارالحکومت سے تین منزل کے فاصلے پر معظم علی نے اکبر خاں سے کہا۔ "میرے دوست اب تمھاری منزل قریب آگئی ہے۔ مجھے بہت جلد سرنگا پٹم واپس پہنچنا چاہیے تھا۔ اب مجھے اجازت دو اور یہ وعدہ کرو کہ اگر حیدر آباد کے حالات تمھاری توقع کے مطابق نہ ہوئے تو تم میرے پاس آجاؤ گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔" اکبر خاں نے جواب دیا۔

معظم علی نے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمھارے خط کا انتظار کروں گا۔"

جب وہ گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا تو بلقیس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان! بھابی جان کو میرا اسلام کہیں۔ میں انھیں دیکھنے کے لیے کسی دن سرنگا پٹم ضرور آؤں گی۔"

معظم علی نے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹیا تم ضرور آنا۔ مجھے ڈر ہے کہ حیدر آباد پہنچ کر تم ہمیں بھول جاؤ گے۔"

معظم علی اور اس کے پانچ ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو کر ایک طرف نکل گئے اور اکبر خاں نے قافلے کو کوچ کا حکم دیا۔

سرنگا پٹم پہنچ کر معظم علی نے دوبارہ فوجی تربیت گاہ کا انتظام سنبھال لیا۔ مرہٹوں کے ساتھ حیدر علی کی جنگ ابھی تک جاری تھی اور آئے دن میسور کی سلطنت میں نئے نئے مفتوحہ علاقوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک سال تک معظم علی کو اکبر خاں کی طرف سے کوئی پیغام نہ ملا۔ ایک دن اس نے شیخ فخرالدین کی معرفت اسے خط لکھا۔ قریباً ایک ماہ بعد اسے اکبر خاں کی طرف سے یہ جواب ملا:

"بھائی جان! آپ نے بلقیس کے ماموں جان کی معرفت جو خط لکھا تھا وہ میرے پاس دیر سے پہنچا۔ حیدر آباد پہنچنے کے بعد شیخ فخرالدین کی یہ کوشش تھی کہ میں ان کے ساتھ تجارت میں شریک ہو جاؤں مگر میرے سامنے اپنے قبیلے کے لوگوں کو بسانے کا مسئلہ تھا۔ عطیہ کا خاوند طاہر بیگ میرے لیے ادھونی کی فوج میں ایک عہدے کی پیشکش لے کر آیا تھا لیکن میں اس پر بھی آمادہ نہ ہوا۔ اس کے بعد ہمیں شیخ فخرالدین کی کوشش اور

طاہر بیگ کے اثر و رسوخ کے باعث دریائے کرشنا اور تنگ بھدرہ کے درمیان آباد ہونے کے لیے زمین کا ایک وسیع قطعہ نہایت سستے داموں میں مل گیا ہے۔ میرے قبیلے کے لوگ اپنے گھر چھوڑتے وقت جو نقدی اپنے ساتھ لائے تھے، وہ ہمارے کام آئی۔ یہ علاقہ مرہٹوں کی مملکت کی سرحد سے صرف چند میل دور ہے۔ ہم نے کچھ زمین ان زمینداروں سے خرید لی ہے جو مرہٹوں کی چھیڑ چھاڑ کے خوف سے ادھونی کے آس پاس آباد ہونا چاہتے تھے۔ باقی زمین سرکاری ہے اور ہمیں اس کے لیے ادھونی کی حکومت کو کوئی معاوضہ نہیں دینا پڑا۔ صرف یہ شرط رکھی گئی ہے کہ اگر مرہٹوں کی طرف سے کوئی خطرہ پیش آیا تو ہم اپنی حفاظت کے ذمہ دار خود ہوں گے۔ یہ زمین بہت اچھی ہے لیکن جنگل صاف کر کے اسے قابلِ کاشت بنانے میں ہمیں کچھ عرصہ سخت محنت کرنی پڑے گی۔

شیخ فخرالدین کی کوشش تھی کہ مجھے حیدر آباد کے گرد و نواح میں کوئی جاگیر مل جائے اور وہ اپنی کوشش میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئے تھے لیکن مجھے ایک جاگیر دار کی حیثیت سے نظام کی فوج کے لیے کرائے کے سپاہی مہیا کرنا منظور نہ تھا۔ ادھونی کی حکومت کے ساتھ میرا یہ معاہدہ ہوا ہے کہ جتنی زمین آباد ہوتی جائے گی ہم اس کا لگان ادا کرتے جائیں گے اور ہم سے کسی وقت سپاہی مہیا کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔

روہیلکھنڈ کے کئی اور قبیلے ابھی تک اس ملک میں سرگرداں پھر رہے ہیں کوئی پانچ سو آدمی مجھ سے دو ماہ بعد حیدر آباد پہنچے تھے اور میں انھیں یہاں لے آیا ہوں۔ اگر حالات نے اجازت دی تو ہم دو تین سال کے اندر اندر اس غیر آباد جنگل کو لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل کر دیں گے۔ بھیلوں کے چند قبیلے اس جنگل میں صرف شکار پر گزارہ کرتے تھے لیکن اب ہماری وجہ سے وہ بھی کھیتی باڑی کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔

بھیل اپنے پاس ملازم رکھ لیے ہیں۔ اب یہ علاقہ ہماری چھوٹی سی دنیا ہے اور ہم اسے بیرونی طوفانوں سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ میرے دل میں اگر سرنگاپٹم آنے کا کوئی خیال تھا تو وہ اب جا چکا ہے۔ اب اگر میں کبھی آؤں گا تو صرف آپ کو دیکھنے کے لیے۔ بلقیس آپ کو اور بھابی جان کو سلام کہتی ہے۔"

آپ کا بھائی اکبر۔

اپنی نئی جائے پناہ سے یہ اکبر خاں کا پہلا اور آخری خط تھا۔ اس کے بعد یہ دونوں دوست اپنی اپنی دنیا کی تعمیر میں مصروف رہے اور کسی کو اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ دوسرے کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔

اٹھارھواں باب

چھ سال اور گزر گئے۔ اس عرصہ میں میسور کے سینکڑوں نوجوان سرنگاپٹم کے فوجی مدرسہ سے تربیت حاصل کرکے حیدر علی کی فوج میں شامل ہو چکے تھے۔ معظم علی کے بیٹوں نے تلواروں کی جھنکار میں آنکھ کھولی تھی اور انھوں نے اس ماں کا دودھ پیا تھا جسے اپنے اور اپنے شوہر کے خاندان کی غیرت و شجاعت پر ناز تھا۔ یہ بچے ہوش سنبھالتے ہی جنوں، بھوتوں اور سانپوں کی کہانیاں سننے کی بجائے جنگوں کے واقعات سنا کرتے تھے اور بڑے ہو کر وہ اپنے باپ کی مجلس میں حیدر علی کی فوج کے نامور سپہ سالاروں اور بڑے بڑے افسروں کو دیکھا کرتے تھے۔ صدیق علی سترہ سال کی عمر میں سرنگاپٹم کے فوجی مدرسے سے فارغ التحصیل ہو کر جہازرانی کا تجربہ حاصل کرنے کے لیے اپنے فرانسیسی اتالیق کے ساتھ منگلور جا چکا تھا۔ مسعود علی، انور علی اور مراد علی فوجی درسگاہ میں تعلیم پا رہے تھے۔ معظم علی اپنے تمام بچوں کو بہترین سپاہی اور بہترین عالم دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے گھر پر عربی اور فارسی کے علوم کی تعلیم دینے کی خدمت ایک ایرانی عالم کے سپرد کر رکھی تھی اور وہ خود بھی فرصت کے اوقات ان کی تعلیم و تربیت پر صرف کیا کرتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں میں انگریزوں کے مظالم اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک معمولی کلرک سے لے کر گورنر جنرل تک لوٹ مار میں مصروف تھے۔ بنگال کے شہروں کی تجارت تباہ ہو چکی تھی۔ خوشحال تاجروں

کو کوڑی کوڑی کا محتاج بنا کر ترکِ وطن پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ میر جعفر کی ذلیل خدمات کا اس کے پسماندگان کو یہ صلہ دیا گیا کہ وارن ہیسٹنگز نے ڈرا دھمکا کر ان سے لاکھوں روپے وصول کیے۔ بنگال کے ایک عالی نسب اور جرأت مند برہمن نند کمار نے وارن ہیسٹنگز کی لوٹ مار کے خلاف آواز بلند کی اور وارن ہیسٹنگز نے اس کے بدلے نند کمار کے خلاف ایک جھوٹا مقدمہ کھڑا کر کے اسے موت کی سزا دلوا دی۔

بنگال کے امراء کو جی بھر کر لوٹنے کے بعد وارن ہیسٹنگز نے بنارس کے راجہ چیت سنگھ کی طرف توجہ کی۔ راجہ چیت سنگھ نے اسے مطمئن کرنے کے لیے اپنے خزانے خالی کر دیئے لیکن اس کے پاس وارن ہیسٹنگز اور کمپنی کے دوسرے ملازمین کی بھوک کا کوئی علاج نہ تھا، جوں جوں بنارس کے خزانے خالی ہوتے جا رہے تھے وارن ہیسٹنگز کے مطالبات بڑھتے جا رہے تھے، بالآخر جب راجہ کے پاس کچھ نہ رہا تو ہیسٹنگز اس پر حکم عدولی کا الزام عائد کر کے خود بنارس پہنچا اور اس نے راجہ چیت سنگھ کی گرفتاری کا حکم دیا۔ امن پسند راجہ نے اپنی نیک نیتی کا ثبوت دینے کے لیے کسی مزاحمت کے بغیر اپنے آپ کو گرفتاری کیلئے پیش کر دیا لیکن بنارس کی فوج اور عوام اپنے راجہ کی یہ توہین برداشت نہ کر سکے۔ انھوں نے انگریز افسروں اور سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور راجہ کو ان کی قید سے چھڑا لیا۔ ہیسٹنگز بنارس سے بھاگا اور اس نے ایک بڑی فوج جمع کر کے دوبارہ چڑھائی کی۔ راجہ چیت سنگھ اپنی جان اور عزت کے خوف سے گوالیار کی طرف بھاگ گیا۔ وارن ہیسٹنگز نے چیت سنگھ کی جگہ اس کے بھتیجے کو گدی پر بٹھا دیا اور اپنا خراج سوا دو لاکھ سے بڑھا کر چار لاکھ پاؤنڈ کر دیا۔

نواب وزیر اودھ شجاع الدولہ کی وفات کے بعد اودھ کی حکومت اس کے بیٹے آصف الدولہ کے ہاتھ آئی۔ روہیلکھنڈ پر قبضہ کرنے کے لیے وارن ہیسٹنگز سے مدد لینے کے باعث شجاع الدولہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقروض ہو چکا تھا۔ آصف الدولہ کے گدی پر بیٹھتے ہی وارن ہیسٹنگز نے اس سے پندرہ لاکھ روپے کا مطالبہ کیا۔ آصف الدولہ

کے پاس روپیہ نہ تھا لیکن اس نے برٹش ریذیڈنٹ کی مدد سے اپنی بیوہ ماں اور دادی سے ساڑھے پانچ لاکھ پاؤنڈ کی رقم اس شرط پر حاصل کی کہ اس کے بعد وہ یا انگریز ان سے کوئی اور مطالبہ نہیں کریں گے لیکن وارن ہیسٹنگز کے کانوں تک بیگماتِ اودھ کی دولت کے قصے پہنچ چکے تھے اور وہ روپیہ حاصل کرنے کے لیے ہر حربہ جائز سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے آصف الدولہ اور لکھنؤ کے انگریز ریذیڈنٹ کو بیگماتِ اودھ سے مزید روپیہ حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ جب آصف الدولہ ایک حد سے آگے جانے کے لیے تیار نہ ہوا تو ہیسٹنگز نے انگریز ریذیڈنٹ کو یہ حکم دیا کہ وہ انگریز سپاہیوں کا ایک دستہ فیض آباد بھیج کر بیگمات کے محلات کا محاصرہ کر لے اور انھیں ہر ممکن اذیت پہنچا کر روپیہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ انگریز ریذیڈنٹ مڈلٹن نے جب بیگمات سے مزید روپیہ حاصل کرنے میں اپنی ناکامی کا اعتراف کیا تو وارن ہیسٹنگز نے اس مقصد کے لیے اس کی جگہ برسٹوف نامی ایک نیا ریذیڈنٹ بھیج دیا۔ نئے ریذیڈنٹ نے بیگمات کے محل کا محاصرہ کرنے کے بعد ان کے نوکروں کو حراست میں لے لیا اور خفیہ خزانے کا پتہ معلوم کرنے کے لیے چند ماہ تک ان پر بے پناہ مظالم توڑتا رہا۔ چند سال قبل شجاع الدولہ نے انگریزوں کی مدد سے روہیلکھنڈ کی غیرت، عزت اور آزادی پر حملہ کیا تھا اور اب یہی انگریز اس کے اپنے حرم تک پہنچ چکے تھے۔ اس کی بوڑھی ماں اور اودھ کی شہزادیاں قیدیوں کی سی حالت میں اپنے ان نوکروں اور خادماؤں کی چیخیں سنا کرتی تھیں جنھیں انگریز سپاہی خفیہ خزانے کا راز معلوم کرنے کے لیے صبح و شام زدوکوب کیا کرتے تھے۔ بالآخر جب قریباً ایک سال بدترین اذیتیں برداشت کرنے کے بعد بیگمات نے سب کچھ انگریزوں کے حوالے کر دیا تو ان کی خلاصی ہوئی۔

شاہ عالم ثانی جو چند سال قبل انگریزوں کی سرپرستی سے نکل کر مرہٹوں کی سرپرستی میں دلی کے تخت پر رونق افروز ہوا تھا اور جسے شاید یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی سلطنت

کا نیا حدود اربعہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم ہوتا ہے، ایک خاموش، بے بس تماشائی کی حیثیت میں یہ تمام واقعات دیکھ رہا تھا:

جنوبی ہندوستان میں کرناٹک کے حالات بنگال، اودھ اور بنارس سے بھی بدتر تھے۔ محمد علی والاجاہ بظاہر کرناٹک کا حکمران تھا لیکن درحقیقت وہ ایک ایسا کولھو تھا جس سے انگریز اہل کرناٹک کا خون نچوڑنے کا کام لے رہے تھے۔ والاجاہ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ انگریز میسور فتح کریں اور پھر اس کے بعض حصے ارکاٹ کی سلطنت میں شامل کر دیئے جائیں تاکہ انگریزوں کے دسترخوان کے بچے ٹکڑوں سے اس بیگمات اور شہزادوں کی پرورش کا بہتر انتظام ہو سکے جن کی تعداد اب دو جنوں تک پہنچ چکی تھی۔

نیکی اور شرافت کا منہ نوچا جا رہا تھا۔ انسانوں کی تقدیر درندوں کے ہاتھ میں تھی۔ کرناٹک کے تباہ حال لوگ کسی نجات دہندہ کی تلاش میں تھے۔ قدرت کی انتقامی قوتیں حرکت میں آئیں۔ ایک آتش فشاں پہاڑ پھٹا اور کرناٹک میں انا ولا غیری کا نعرہ لگانے والے انگریز اس کے دہانے پر کھڑے تھے — یہ حیدر علی تھا جو ایک آتشیں سیلاب کے ساتھ میسور سے نکلا اور کرناٹک پر چھا گیا۔ سات سمندر پار سے آنے والے وہ تاجر جو اپنی عیاری اور مکاری کی بدولت ہندوستان پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اس سیلاب کے آگے آگے بھاگ رہے تھے۔ وہ جو اپنی توپوں کی دھنا دھن کے جواب میں بے بس انسانوں کی چیخیں سننے کے عادی تھے اب ایک ایسی قوم کے جوانوں کی غیرت کا مظاہرہ دیکھ رہے تھے جو ان کے اندازوں کے مطابق مفلوج ہو چکی تھی اور وہ جو اس ملک کے نااہل امراء کی ملت فروشی اور ابن الوقتی کو اپنی کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت خیال کرتے تھے، حیدر علی کے دائیں بائیں وقت کے بہترین جرنیل دیکھ رہے تھے وہ انگریز

سیاست دان جنھوں نے چند سال قبل صرف اس امید پر معاہدۂ مدراس کی شرائط کی خلاف ورزی کر کے حیدر علی کو مرہٹوں کے خلاف تنہا چھوڑ دیا تھا کہ مرہٹے اپنی بے پناہ قوت کے بل بوتے پر میسور کو فتح کریں گے اور وہ ان سے اپنا حصہ وصول کر سکیں گے، اپنے سامنے ان نوے ہزار سواروں کی فوج دیکھ رہے تھے جو انھیں سمندر کی طرف دھکیلنے کے ارادے سے میدان میں آ چکی تھی۔ مدراس کے گورنر نے اس صورت حالات کا سامنا کرنے کے لیے کمپنی کے لشکر کی قیادت بکسر کے فاتح سر ہیکٹر منرو کو سونپی اور کرنل بیلی کو حکم بھیجا کہ وہ گنتھور سے اپنی فوج کے ساتھ پیشقدمی کر کے سر ہیکٹر منرو کے ساتھ آملے۔

جنرل منرو مدراس سے روانہ ہوا اور کنجی ورم پہنچ کر کرنل بیلی کا انتظار کرنے لگا۔

حیدر علی نے شہزادہ ٹیپو کو کرنل بیلی کا راستہ روکنے کے لیے روانہ کیا اور خود ارکاٹ کا محاصرہ چھوڑ کر کنجی ورم کی طرف بڑھا۔ ٹیپو نے کرنل بیلی کے لشکر کو کنجی ورم سے پندرہ میل کے فاصلے پر جا لیا اور پہلی جھڑپ میں اس کے دو سو سپاہی ہلاک کر دیئے۔

اس عرصہ میں ٹیپو کی مدد کے لیے سپاہیوں کے چند دستے پہنچ گئے اور کرنل بیلی نے سر منرو کو پیغام بھیجا کہ وہ فوری مدد کے بغیر ٹیپو کا محاصرہ توڑ کر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ۹ ستمبر کو سر منرو نے کرنل بیلی کی مدد کے لیے ایک ہزار سپاہیوں کی کمک بھیج دی اور اسی رات سے اس نے کنجی ورم کی طرف کوچ کر دیا لیکن ٹیپو کی فوج نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ کنجی ورم سے نو میل کے فاصلے پر کرنل بیلی نے اپنی فوج کو پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔ اسے یہ امید تھی کہ صبح تک منرو بذاتِ خود اس کی مدد کے لیے پہنچ جائے گا لیکن صبح ہوتے ہی ٹیپو کی فوج نے عقب سے اس پر گولہ باری شروع کر دی اس کے ساتھ ہی حیدر علی کنجی ورم کا رخ کرنے کی بجائے ٹیپو کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ کرنل بیلی نے مایوسی کی حالت میں پیشقدمی شروع کی لیکن وہ عقب سے توپوں کی گولہ باری اور بازوؤں سے میسور کے سواروں کے حملوں کے باعث ہر قدم پر سخت تباہی کا سامنا کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے

انتہائی مجبوری کی حالت میں کنجی ورم سے چھ میل کے فاصلے پر جم کر لڑنے کا فیصلہ لیا، لیکن اتنی دیر میں ٹیپو کی مدد کے لیے حیدر علی کا توپ خانہ بھی پہنچ چکا تھا۔ توپوں کی دو طرفہ گولہ باری کے باعث انگریزوں کی فوج میں افراتفری مچ گئی۔ ان کی فوج کے دیسی سپاہی میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے اور یورپین سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

سر ہیکٹر منرو کرنل بیلی کی شکست سے اس قدر بدحواس ہوا کہ وہ اپنی بھاری توپیں ایک تالاب میں پھینک کر مدراس کی طرف بھاگ نکلا۔ ٹیپو کے طوفانی دستے اس کے پیچھے تھے۔ منرو قدم قدم پر لاشیں چھوڑتا ہوا انتہائی بے سروسامانی اور بیچارگی کی حالت میں مدراس پہنچا۔ مدراس کے باشندے بکسر کے فاتح کو اس حالت میں دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے۔

شہزادہ ٹیپو، منرو کی فوج کا جنگی سامان اور رسد کے ذخیرے چھیننے کے بعد دوبارہ اپنے باپ سے جا ملا۔ میسور کا لشکر کرناٹک کے دارالحکومت ارکاٹ کی طرف بڑھا اور محمد علی والاجاہ اپنے انگریز سرپرستوں سمیت وہاں سے بھاگ نکلا اور ماہ اکتوبر ۱۷۸۰ء میں ارکاٹ پر حیدر علی کی فتح کا پرچم لہرا رہا تھا۔

حیدر علی ارکاٹ کو اپنا مستقر بنا کر مفتوحہ علاقوں کے انتظامات میں مصروف ہو گیا اور ٹیپو نے دس ہزار سواروں کے ساتھ پیشقدمی کر کے ست گڑھ کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ یہ قلعہ بہت مضبوط تھا اور دو ہزار سپاہی، جن کے پاس کئی مہینوں کے لیے اسلحہ بارود اور رسد کے ذخیرے موجود تھے، اس کی حفاظت پر متعین تھے لیکن قلعہ کے محافظ نے شہزادہ ٹیپو کے پے در پے حملوں سے بدحواس ہو کر ۱۳ جنوری ۱۷۸۱ء کو ہتھیار ڈال دیئے۔

اس کے بعد ٹیپو نے انبور کے قلعہ پر حملہ کیا۔ اس قلعے کا محافظ ایک انگریز کیپٹن تھا۔ وہ قریباً پندرہ دن تک حملہ آور فوج کا مقابلہ کرتا رہا لیکن جب بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو ہتھیار ڈال دیئے۔

کرناٹک کے ان دو اہم قلعوں پر قبضہ کرنے کے بعد شہزادہ ٹیپو نے تیاگڑھ کی طرف پیش قدمی کی۔ چار ہفتوں کے محاصرہ کے بعد جب اس کی فوج تیاگڑھ کے قلعے پر فیصلہ کن حملہ کر چکی تھی انگریز کمانڈنٹ نے فصیل پر صلح کے جھنڈے بلند کر دیئے۔ ٹیپو نے فوج کی گولہ باری بند کر دینے کا حکم دیا لیکن اگلے دن جب انگریز کمانڈنٹ قلعہ خالی کرنے والا تھا اسے یہ اطلاع ملی کہ سر آئر کوٹ ایک کمک کے ساتھ پہنچنے والا ہے اور اس نے قلعہ خالی کرنے کی بجائے میسور کی فوج پر گولہ باری شروع کر دی۔ جنگ دوبارہ شروع ہو گئی لیکن چند دن بعد قلعے کے محافظوں کو معلوم ہوا کہ سر آئر کوٹ چند منازل دور پڑاؤ ڈالے رسد کا انتظار کر رہا ہے۔ انگریز کمانڈنٹ نے دوبارہ قلعہ خالی کرنے کی پیشکش کی لیکن ٹیپو نے اسے کوئی رعایت دینے سے انکار کر دیا اور ایک شدید حملے کے بعد قلعہ فتح کر لیا۔

اب کرناٹک کے مضبوط ترین قلعے فتح ہو چکے تھے اور ٹیپو کی فوج کسی دقت کا سامنا کیے بغیر چھوٹے چھوٹے قلعوں اور چوکیوں سے دشمن کا صفایا کر رہی تھی۔ جون کے مہینے میں شہزادہ ٹیپو شاندار فتوحات کے بعد ارکاٹ پہنچا تو حیدر علی نے شہر سے باہر نکل کر اس کا استقبال کیا۔ یہ صرف ایک حکمران کی طرف سے اپنے ولی عہد کا استقبال نہ تھا بلکہ ایک اولوالعزم سپہ سالار کی طرف سے اپنی فوج کے اس نوعمر جرنیل کا خیر مقدم تھا جس کی قابلیت اور بہادری کی داستانیں سات سمندر پار تک پہنچ چکی تھیں۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں حیدر علی اس بوڑھے عقاب کی مانند تھا جو نشیمن سے اپنے نوعمر بچے کی پرواز دیکھ رہا ہو۔ اس نے اپنی تلوار کی نوک سے ہندوستان کے نقشے پر ایک عظیم سلطنت کی حدود کی لکیریں کھینچ دی تھیں اور اس کا ولی عہد اس سلطنت کے خاکے میں نئے نئے رنگ بھر رہا تھا۔ حیدر علی کے آزمودہ کار جرنیل ہر میدان میں ٹیپو کی قیادت کو فتح کی ضمانت سمجھتے تھے۔ کرناٹک کی جنگ کے دوسرے سال میسور کے اس اولوالعزم حکمران کے قوی جواب دے چکے تھے۔ جس کی جوانی کے بیشتر ایام تلواروں

کی چھاؤں میں گزرے تھے۔ اب اس کے لیے زندگی کی آخری خوشی یہ تھی کہ کسی حکمران کو ٹیپو سے بہتر جانشین نہیں مل سکتا۔

ٹیپو، کرنل بیلی اور جرنیل منرو کے بعد سر آئر کورٹ اور اسٹورٹ جیسے جہاندیدہ جرنیلوں سے اپنا لوہا منوا چکا تھا۔ ارکاٹ میں انگریزوں کی قوتِ مدافعت کچلنے کے بعد وہ تنجور کی طرف بڑھا اور اس کے سامنے انگریزوں کی افواج بھیڑوں کی طرح بھاگ رہی تھیں۔ کرنل بریتھ ویٹ جسے اپنی توپوں کے بل بوتے پر کئی ہفتے مقابلہ کرنے کی امید تھی، ۲۶ گھنٹوں کے بعد اپنی تلوار پھینک چکا تھا۔

بریتھ ویٹ کو شکست دینے کے بعد ٹیپو نے کسی دقت کا سامنا کیے بغیر تنجور کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ فروری ۱۷۸۲ء کے آخری دنوں میں حیدر علی کی ہدایت پر ٹیپو تنجور سے پوالونود کی طرف بڑھا۔ وہاں سے اس نے فرانسیسی دستوں کو ساتھ لے کر پیشقدمی کی اور کڈلور پر قبضہ کر لیا۔ مئی کے مہینے ٹیپو کی فوج اور فرانسیسی دستوں نے حیدر علی کے لشکر سے ساتھ شامل ہو کر پانڈی چری کے شمال مغرب میں پرموکل کے پہاڑی قلعے پر حملہ کر دیا۔ جنرل آئر کوٹ نے قلعے کی محافظ فوج کو مدد دینے کے لیے پیشقدمی کی لیکن وہ ابھی کرنگلی پہنچا تھا کہ اسے یہ اطلاع ملی کہ میسور کی فوج قلعے پر قبضہ کر چکی ہے۔ جنرل آئر کوٹ نے میسور کی افواج کے رسد اور بارود کے ذخائر پر قبضہ کرنے کی نیت سے ارنی کا رخ کیا لیکن حیدر علی نے انگریزوں کی پیشقدمی کی اطلاع ملتے ہی ٹیپو کو ان کا راستہ روکنے کے لیے روانہ کیا۔ دو جون کی صبح جنرل آئر کوٹ کی فوج ایک طرف ٹیپو کے لشکر اور فرانسیسی دستوں کی گولہ باری کا سامنا کر رہی تھی۔ دوسری طرف حیدر علی یلغار کرتا ہوا ان کے عقب سے حملہ آور ہوا۔ جنرل آئر کوٹ کی فوج بھاری اسلحہ اور رسد کی گاڑیاں چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ سر آئر کوٹ جس تیز رفتاری سے میسور کے خلاف قوت آزمائی کے لیے آیا تھا اس سے کہیں زیادہ رفتار سے واپس مدراس کا رُخ کر رہا تھا۔

○

جنگ کے زمانے میں معظم علی کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ فوجی تربیت گاہ کے نگران کی حیثیت میں سلطنتِ خداداد کی ایک اہم ضرورت پوری کر رہا ہے۔ فوجی تربیت گاہ کی نگرانی کے علاوہ سرنگاپٹم کے قلعے کی توسیع اور نئے مورچوں کی تعمیر کا کام بھی اسے سونپا جا چکا تھا۔ اس کے پاس ان نوجوانوں کے خطوط آتے جو فوجی مدرسے سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد میسور کی فوج میں شامل ہو کر دشمن کے خلاف مختلف محاذوں پر لڑ رہے تھے۔ تاہم وہ بڑی شدت سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ میدان جنگ سے دور ہے۔ اس کا بڑا بیٹا صدیق علی میسور کے ایک جنگی جہاز کا کپتان بن چکا تھا اور معظم علی کو اس کے متعلق نہایت حوصلہ افزا خبریں مل رہی تھیں۔ اس سے چھوٹا مسعود علی فارغ التحصیل ہونے کے بعد بری فوج میں شامل ہو چکا تھا۔

جنگ کے دوسرے سال معظم علی فارغ التحصیل طلبا کے سامنے الوداعی تقریر کر رہا تھا جن میں اس کے تیسرے بیٹے انور علی کا نام سرفہرست تھا۔ اس نے کہا:

"میرے عزیزو! مجھے تمھاری خوش نصیبی پر رشک آتا ہے۔ تم نے اس سرزمین میں جنم لیا ہے جہاں عزت کی زندگی اور عزت کی موت کے راستے کھلے ہیں۔ تم اس حکمران کی فوج کے سپاہی بننے جا رہے ہو جس کی نگاہیں اپنے دوست اور دشمن میں تمیز کر سکتی ہیں۔ تم اس دور کے بہترین جرنیلوں کی رہنمائی میں جوانمردی کے جوہر دکھا سکو گے۔ میرے بال اب سفید ہو چکے ہیں لیکن ایک زمانہ تھا جب میری رگوں میں خون کی بجائے بجلیاں دوڑتی تھیں۔ جوانی میں میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میں کسی رجلِ عظیم کی فتوحات میں حصہ دار بنوں لیکن میں نے ایسی سرزمین میں آنکھ کھولی تھی جہاں آزادی کے پرستاروں کے لیے قید خانوں کی تاریک کوٹھڑیاں تھیں اور محبانِ قوم و وطن کے لیے پھانسی کے پھندے تھے جہاں قوم کے شہیدوں کی لاشوں کو پیروں تلے روندا جاتا تھا اور ملت فروشی

کے لیے حکومت کی مسندیں سجائی جاتی تھیں۔

لیکن تمھیں قدرت نے ان سپہ سالاروں کی قیادت میں لڑنے کا موقع دیا ہے جن کے گھوڑوں کی رکھوالی کرنا بھی میرے نزدیک ایک سعادت ہے۔ میں شہزادہ فتح علی کی فتوحات کے متعلق سنتا ہوں تو میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ کاش میں یہاں پیدا ہوتا۔ میرا بچپن میری جوانی اور میرا بڑھاپا ان کے ساتھ گزرتا۔ ایک قافلے کی اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا امیر اپنے راستے کے نشیب و فراز پر نگاہ رکھتا ہے اور ایک سپاہی کے لیے قدرت کا اس سے بڑا انعام اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کا سپہ سالار کسی مقصد کے لیے قربانی دینا جانتا ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ تمھاری جرأت اور ہمت نواب حیدر علی اور شہزادہ ٹیپو کے بلند عزائم کا ساتھ دے سکے اور میں اس بات پر فخر کر سکوں کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔"

ایک ہفتہ بعد انور علی، حیدر علی کے نامور جرنیل غازی کی قیادت میں محاذِ جنگ کو روانہ ہو چکا تھا اور اس کی کمان میں پچاس سوار تھے۔ اس کے بعد گھر میں معظم علی اور فرحت کی تمام دلچسپیاں ننھے مراد تک محدود ہو گئیں۔ مراد علی اپنے تمام بھائیوں میں سب سے زیادہ ذہین تھا۔ اس کی شوخیاں اور اس کی شرارتیں اس کے والدین، بھائیوں، نوکروں اور پڑوسیوں کی گفتگو کا موضوع بنی رہتی تھیں لیکن جب تینوں بھائی یکے بعد دیگرے گھر سے چلے گئے تو اسے اپنی مسکراہٹوں اور قہقہوں کی زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہونے لگا۔ بھائیوں کی موجودگی میں وہ مکتب سے فارغ ہونے کے بعد باقی سارا دن کھیل کود میں گزارتا تھا لیکن وہ فرصت کے لمحات میں ہمیشہ ماں کے پاس رہنا پسند کرتا تھا۔

معظم علی کے بیٹے بڑی باقاعدگی کے ساتھ اسے خطوط بھیجا کرتے تھے۔ ان خطوط میں مراد علی کے متعلق اس قسم کی باتیں ہوتی تھیں: "اس کی صحت کیسی ہے — اب بھی وہ اسی طرح شرارتیں کرتا ہے یا کچھ سنجیدہ ہو گیا ہے — محلے کے لڑکوں کے ساتھ

اس کی جنگیں ختم ہوئیں یا نہیں — صابر کے ساتھ اب بھی جھگڑا ہوا کرتا ہے یا نہیں — وہ بہت یاد آتا ہے۔" اور فرحت اپنے بیٹوں کو جواب میں لکھا کرتی تھی: "مراد علی اب بہت بدل گیا ہے — اس کی شوخیاں تمھارے ساتھ رخصت ہو چکی ہیں — وہ میری تنہائی کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور مکتب سے فارغ ہو کر سیدھا گھر آ جاتا ہے — فوجی تربیت حاصل کرنے اور کتابیں پڑھنے کے علاوہ اس کی تمام دلچسپیاں جنگ کی خبریں سننے تک محدود ہو چکی ہیں۔"



ایک دوپہر معظم علی، فرحت اور مراد مکان کے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک مکان کے مردانہ حصے کی طرف گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد صابر بھاگتا ہوا صحن میں داخل ہوا اور کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ کر بلند آواز میں چلایا: "صدیق علی خاں آ گئے۔"

معظم علی اور فرحت کے چہرے مسرت سے چمک اٹھے اور مراد "بھائی جان، بھائی جان!" کہتا ہوا باہر نکل آیا۔ اس کے بعد معظم علی اور فرحت کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئے۔ صدیق علی مراد کو اپنے ساتھ چمٹائے صحن میں داخل ہوا اور اس نے اپنے والدین کو سلام کیا۔ اس کے سر پر پگڑی کی بجائے سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ فرحت اضطراب اور بدحواسی کی حالت میں چند قدم آگے بڑھ کر بولی: "بیٹا کیا ہوا؟ تم نے سر پر پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟"

"امی جان میں زخمی ہو گیا تھا۔ اب ٹھیک ہوں۔ زخم بہت معمولی تھا۔ گولی میری کھوپڑی کو چھوتی ہوئی نکل گئی تھی۔"

مراد علی نے کہا: "امی جان! آپ نے غور نہیں کیا، بھائی جان لنگڑا بھی رہے تھے!"

صدیق علی نے کہا۔" مراد تم بہت شریر ہو۔ امی جان آپ پریشان نہ ہوں گھوڑے پر سفر کرتے کرتے میری ٹانگیں شل ہوگئی ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔"بیٹا چلو اندر بیٹھو! صابو خادمہ سے کہو ان کے لیے کھانا لے آئے"

صدیق علی ان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور معظم علی نے اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔" مجھے توقع نہ تھی کہ آج کل تمھیں گھر آنے کی چھٹی ملے گی۔"

"ابا جان! میں صرف دو دن یہاں ٹھہروں گا۔"

"تم اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟"

"ابا جان! میں سیدھا کالی کٹ سے آرہا ہوں۔ میں ماہی کے قریب بحری جنگ میں زخمی ہوگیا تھا۔ میرے جہاز پر دو انگریزی جہازوں نے حملہ کردیا تھا۔ ان میں سے ایک کو ہم نے غرق کردیا لیکن دوسرے جہاز کی گولہ باری سے ہمارے جہاز کو آگ لگ گئی۔ ایک فرانسیسی جہاز بروقت ہماری مدد کے لیے پہنچ گیا اور اس نے انگریزی جہاز کو بھگا دیا۔ ہمیں اپنے جلتے ہوئے جہاز سے سمندر میں کودنا پڑا۔ فرانسیسی ملاحوں نے ہمیں سمندر سے نکال کر اپنے جہاز میں کالی کٹ پہنچا دیا۔ میرے زخم معمولی تھے۔ تاہم مجھے چند دن آرام کرنے کی ضرورت تھی۔ ابھی چھ سات روز گزرے تھے کہ انگریزوں نے اچانک تیلی چری اور ماہی پر قبضہ کر کے کالی کٹ پر حملہ کردیا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی کارگزاری کے متعلق آپ کے لیے کوئی حوصلہ افزا خبر نہیں لایا ہوں۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جن دو آدمیوں نے سب سے آخر میں کالی کٹ کا قلعہ چھوڑا تھا ان میں سے ایک قلعے کا محافظ اور دوسرا میں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری فوج بہت جلد پہنچ جائے گی اور ہم کسی تاخیر کے بغیر انگریزوں کو وہاں سے نکال دیں گے۔ مسعود اور انور کے متعلق کوئی خبر آئی ہے؟"

"ہاں وہ بخیریت ہیں۔ انور ان دنوں تبخور پہنچ چکا ہے اور مسعود، حیدر علی کے

ساتھ ہے۔ کچھ عرصہ سے میں بھی یہ کوشش کررہا ہوں کہ مجھے کسی محاذ پر بھیج دیا جائے۔ میں نے شہزادہ ٹیپو کو درخواست بھیجی تھی لیکن ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔"

صدیق علی نے کہا۔" نہیں ابا جان! اب آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔"

معظم علی نے کہا۔" مجھ سے زیادہ حیدر علی کو آرام کی ضرورت تھی۔"

"لیکن ابا جان اگر آپ جنگ پر چلے گئے تو یہاں آپ کے حصے کا کام کون سنبھالے گا؟"

"یہاں میری جگہ لینے والے اب کئی لوگ موجود ہیں۔"

تیسرے دن صدیق علی اپنے والدین اور اپنے ننھے بھائی کو خدا حافظ کہہ رہا تھا



ایک رات آسمان صاف تھا۔ معظم علی، فرحت اور مراد علی نماز مغرب کے بعد کھلے صحن میں بیٹھے خوشگوار ہوا کا لطف اٹھا رہے تھے۔ صابر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا ان کے قریب آیا اور اس نے کہا۔" اسد خاں آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

اسد خاں، معظم علی کے انتہائی بے تکلف دوستوں میں تھا اور اسے چند سال قبل ایک لڑائی میں زخمی ہونے کے بعد سرنگاپٹم میں اسلحہ سازی کے کارخانوں کا ناظم بنا دیا گیا تھا۔

معظم علی نے صابر سے پوچھا۔" ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

"جی نہیں۔"

معظم علی نے فرحت کی طرف دیکھا اور کہا۔" تم اوپر چلی جاؤ میں انھیں یہیں بلا لیتا ہوں۔"

فرحت اٹھ کر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد صابر، اسد خاں کے ساتھ صحن میں داخل ہوا۔ معظم علی نے آگے بڑھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے

پوچھا۔ "کیا بات ہے آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں ؟"

اسد خاں نے جواب دیا : "مجھے اسی وقت ارکاٹ پہنچنے کا حکم ملا ہے۔ حیدر علی نے سرنگا پٹم کے چند اور افسر بھی اپنے پاس بلا لیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کوئی اہم مسئلہ درپیش ہے۔ پرسوں مجھے برہان الدین کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ نواب صاحب کی طبیعت ناساز ہے۔"

معظم علی نے پوچھا : "آپ کب جا رہے ہیں ؟"

"میں ابھی روانہ ہو جاؤں گا۔ میں صرف آپ سے الوداع کہنے کے لیے آیا تھا۔"

معظم علی نے کہا : "خدا انھیں صحت دے۔ اس وقت حیدر علی کی صحت سے زیادہ میسور کو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔"

اسد خاں نے کہا "آپ اپنے لڑکوں کو کوئی پیغام بھیجنا چاہتے ہیں ؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "حیدر علی کے کیمپ میں شاید آپ کو مسعود علی کے سوا کوئی اور نہ ملے۔ صدیق علی ان دنوں منگلور میں ہوگا اور انور علی نے مجھے پچھلے ہفتے یہ اطلاع بھیجی تھی کہ مجھے تجور بھیجا جا رہا ہے۔ اگر مسعود علی ملے تو اس سے یہ کہیں کہ گھر سب خیریت ہے۔"

مراد علی نے کہا۔ "چچا جان ! بھائی جان سے یہ بھی کہیں کہ وہ چھٹی لے کر چند دن کے لیے گھر ضرور آئیں۔ امی انھیں بہت یاد کرتی ہیں۔"

معظم علی نے کہا "میں نے شہزادہ ٹیپو کو پچھلے ہفتے ایک خط لکھا تھا۔ انھوں نے مجھے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا۔ آپ ان کے ساتھ کافی بے تکلف ہیں اگر ممکن ہو تو میرے خط کا ذکر ضرور کریں۔ میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ مجھے جنگ میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے۔"

اسد خاں نے اٹھ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں ان سے ضرور

کہوں ا لیکن مجھے یقین ہے کہ شہزادہ ٹیپو اشد ضرورت کے بغیر آپ کو کسی محاذ پر بھیجنا گوارا نہیں کریں گے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ سرنگا پٹم میں زیادہ مفید کام کر رہے ہیں۔"

اسد خاں باہر نکل گیا تو مراد علی نے کہا "ابا جان آپ مجھے کب لڑائی پر بھیجیں گے ؟"

معظم علی نے اسے بازو سے کھینچ کر اپنی گود میں بٹھا لیا اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بیٹا جب تم سپاہی بننے کے قابل ہو جاؤ گے تو تمھیں مجھ سے یہ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

مراد علی نے کہا۔ "ابا جان میں یہ سوچتا ہوں کہ جب میں بڑا ہوں گا تو جنگ ختم ہو جائے گی۔ پھر ہم لوگ کیا کریں گے ؟"

معظم علی نے جواب دیا "بیٹا ! جب جنگ ختم ہو جائے گی تو تم ایک آزاد اور باعزت قوم کے معمار ہو گے۔ تم ان شہروں اور بستیوں کو دوبارہ آباد کرو گے جو ہماری عزت اور آزادی کے دشمنوں کے ہاتھوں ویران ہو چکی ہیں۔ تمھارے سامنے نہریں کھودنے اور بنجر زمینیں آباد کرنے کا کام ہوگا۔ بیٹا تم یہ دعا کیا کرو کہ تمھارے بھائی فتح کے پھریرے اڑاتے ہوئے گھر واپس آئیں اور تمھارے مقدر میں جنگ کی کلفتوں کی بجائے فتح کے انعامات ہوں۔"



میسور کی افواج ارکاٹ سے چند میل دور شمال کی طرف پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی حیدر علی علالت کے باعث ایک خیمے میں لیٹا ہوا تھا۔ ٹیپو ملیبار کی مہم پر روانہ ہونے والے لشکر کی صفوں کا معائنہ کرنے کے بعد اپنے باپ کو خدا حافظ کہنے کے لیے خیمے میں داخل ہوا۔ حیدر علی کے اشارے سے طبیب اور تیمار دار باہر نکل گئے اور اس نے ٹیپو کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "فتح علی بیٹھ جاؤ ! آج میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" ٹیپو اس کے بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور حیدر علی نے قدرے توقف کے بعد کہا "بیٹا تم ایک نہایت اہم مہم پر جا رہے ہو۔ ملیبار کی بندرگاہوں کو انگریزوں کے قبضے سے

چھڑانا ضروری ہے۔ جنگ کے متعلق اب میں تمھیں کوئی نصیحت نہیں کرسکتا۔ مجھے تمھاری عزت، تمھاری شجاعت اور تمھاری ذہانت پر فخر ہے۔ ملک کی حکومت اور سیاست کے بارے میں تمھیں میری نصیحتوں کی ضرورت نہیں۔ میں ایک ان پڑھ آدمی ہوں لیکن تم اس ملک کے چوٹی کے علماء کی صفِ اول میں کھڑے ہو سکتے ہو۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میرا بیٹا اپنے زمانے کا بہترین سپاہی، بہترین عالم اور بہترین حکمران ثابت ہو اور خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری یہ خواہش پوری کردی لیکن میرے دل پر ایک بوجھ ہے۔۔۔۔"

حیدر علی یہاں تک کہہ کر خاموش ہوگیا اور ٹیپو نے کہا۔ "ابا جان اگر مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو آپ کو بتانے میں جھجک محسوس نہیں ہونی چاہیئے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اپنی اصلاح کردوں گا"۔

حیدر علی نے جواب دیا۔ "نہیں بیٹا! تم نے ہمیشہ میری بلندترین توقعات پوری کی ہیں۔ مجھے صرف یہ افسوس ہے کہ میں اپنے حصے کا کام پورا نہ کرسکا۔ میں اپنی موت سے پہلے ہندوستان کو انگریزوں سے پاک دیکھنا چاہتا تھا لیکن اب شاید میری یہ خواہش پوری نہ ہو"۔

ٹیپو نے مغموم لہجے میں کہا۔ "ابا جان آپ کی یہ خواہش ضرور پوری ہوگی"۔

حیدر علی نے محبت بھری نگاہوں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ٹیپو! ممکن ہے کہ میں چند دن تک تندرست ہوجاؤں اور تمھاری مدد کے لیے ملیبار پہنچوں لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔ اس لیے میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، غور سے سنو۔ میری زندگی کی دوسری ناکامی یہ ہے کہ میں نظام اور مرہٹوں کو راہِ راست پر نہ لا سکا۔ انگریز ہمارے اس لیے دشمن ہیں کہ ہم ان کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کا سودا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ مرہٹے ہمارے اس لیے مخالف ہیں کہ وہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان کو اپنی شکارگاہ سمجھتے ہیں اور انھیں کسی دوسری

طاقت کا ابھرنا گوارا نہیں۔ نظام ہمارا ایک طاقت ور حلیف بن سکتا تھا لیکن وہ ان ابن الوقتوں کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے جنھیں ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ فرانسیسی اس وقت بیشک ہمارے ساتھ ہیں لیکن ہمیں یہ سمجھنے کی غلطی نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ ہمیشہ ہمارے دوست رہیں گے۔ وہ محض اپنی انگریز دشمنی کے باعث ہمارا ساتھ دینے پر مجبور ہیں لیکن اگر کسی وقت انگریزوں کے ساتھ ان کی مصالحت ہوگئی تو وہ ہمیں تنہا چھوڑ دیں گے۔ محمد علی کی حیثیت اب نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں اس کی دوستی یا دشمنی کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ وہ انگریزوں کی بساطِ سیاست کا ایک پٹا ہوا مہرہ ہے اور اگر ہم نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دیا تو ایسے بے ضمیر آدمی کے لیے اس ملک میں کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ میں نے اپنی زندگی کے بیشتر لمحات لڑائی کے میدانوں میں گزارے ہیں لیکن ابھی تک اس جنگ کا فیصلہ نہیں ہوا ہے جس پر اس ملک کی آزادی کا دارومدار ہے۔ میرے بعد یہ جنگ تمھیں لڑنی پڑے گی لیکن میسور میں ابھی اجتماعی خصوصیات کا فقدان ہے جو ایک طویل اور صبر آزما جنگ سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ تم میسور کو ہندوستان کے مسلمانوں کا آخری حصار بنانا چاہتے ہو اور یہ امید رکھتے ہو کہ مسلمان عوام تمھاری آواز پر لبیک کہیں گے لیکن مجھے یہ اندیشہ ہے کہ تمھیں عوام سے پہلے ان خودغرض اور بدطینت امراء سے سابقہ پڑے گا جو اسلام کے نعرہ کو اپنے اقتدار کے خلاف اعلانِ جنگ سمجھتے ہیں"۔

ٹیپو نے جواب دیا۔ "ابا جان! اگر ہندوستان کے مسلمان اپنی بے راہ روی کے باعث مغضوب قوم نہیں بن چکے ہیں اور قدرت انھیں سنبھلنے کا کوئی موقع دینا چاہتی ہے تو وہ ہماری آواز پر لبیک کہیں گے اور ہماری آواز پر وہ غیر مسلم بھی لبیک کہیں گے جو اس ملک کو انگریزوں کی غلامی سے بچانا چاہتے ہیں لیکن اگر وہ خودکشی کا ارادہ ہی کرچکے ہیں تو ہمارے مقدر میں انگریزوں کی غلامی نہیں ہوگی۔ ہم اس مقصد کے لیے قربان ہوجائیں

گے جو ہماری ذات سے بہت بلند ہے ہماری فتح انسانیت کی فتح ہوگی اور ہماری شکست ان لوگوں کی شکست ہوگی جنھوں نے ذلت کا راستہ اختیار کیا ہے؟

حیدر علی نے کہا۔ "بیٹا میں تمھیں مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ تمھارے راستے میں کتنے دریا اور کتنے پہاڑ ہیں اور تمھیں اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے کتنے مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ تمھارے لیے خدمت پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں کا بستر ہوگی۔"

ٹیپو نے کہا۔ "ابا جان! میسور کے حکمران کو خدا سلامت رکھے۔ اس وقت میں آپ کی فوج کا ادنیٰ سپاہی ہوں اور یہ اعزاز میرے لیے کافی ہے کہ میں ملیبار کے محاذ پر آپ کی توقعات پوری کرسکوں۔"

حیدر علی نے کہا۔ "میں اپنی ہر سانس کے ساتھ تمھارے لیے دعا کیا کرتا ہوں۔"

شہزادہ ٹیپو نے کہا: "ابا جان! آپ کو طبیبوں کے مشوروں پر سختی سے عمل کرنا چاہیئے۔ ان سب کی یہی رائے ہے کہ تندرست ہونے سے پہلے آپ کے لیے سفر ٹھیک نہیں ہوگا۔"

حیدر علی مسکرایا: "میں نے طبیبوں کے مشوروں پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا لیکن اب اگر وہ یہ مشورہ نہ دیتے تو بھی میرے لیے بستر پر لیٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

"ابا جان! آپ بہت جلد تندرست ہو جائیں۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔"

حیدر علی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بیٹا جاؤ خدا تمھارے ساتھ ہو!"

تھوڑی دیر بعد بیس ہزار آزمودہ کار سپاہیوں کی فوج ملیبار کا رخ کر رہی تھی۔

ماہ نومبر کے تیسرے ہفتے شہزادہ ٹیپو کی افواج ملیبار میں رام گلی کے دروازے

پر دستک دے رہی تھیں۔ ہمبراسٹون کی قیادت میں انگریزی فوج ان کی آمد کی اطلاع ملتے ہی رفوچکر ہوچکی تھی۔ ٹیپو نے اس کا پیچھا کیا اور رام گلی سے چند میل کے فاصلے پر اسے جالیا۔ ہمبراسٹون نے شیر میسور کا مقابلہ کرنے کی بجائے بھاگنا زیادہ مناسب سمجھا۔ رات کے وقت ہمبراسٹون کی فوج نے دریا عبور کرنے کے بعد پونانی کا رخ کیا۔ اس عرصہ میں کرنل میکلوڈ کی کمان میں انگریزوں کی ایک اور فوج ہمبراسٹون کی مدد کو پہنچ چکی تھی۔ ٹیپو، پونانی کے گرد گھیرا ڈال کر فیصلہ کن حملے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسے حیدر علی کی وفات کی خبر ملی۔

انیسواں باب

مدراس کا گورنر اپنے دفتر میں جنرل اسٹورٹ سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے سامنے میز پر ایک نقشہ کھلا ہوا تھا۔ گورنر کا سیکرٹری، نواب محمد علی والا جاہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ گورنر اور جنرل اسٹورٹ اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ محمد علی نے جھک کر انھیں سلام کیا اور مصافحہ کرنے کے بعد گورنر کے اشارے سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ محمد علی کے چہرے سے امارت اور سیر چشمی کی بجائے بھوک اور حرص اور مردانہ وجاہت کی بجائے لومڑی کی سی عیاری اور سفلہ پن مترشح تھا۔ اس کا بھاری عمامہ اور قیمتی جبّہ اس کی شان و شوکت میں اضافہ کرنے کی بجائے اس پر ایک غیر ضروری بوجھ معلوم ہوتا تھا۔

اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی گورنر سے مخاطب ہو کر کہا: "حضورِ والا! ابھی تک جنرل اسٹورٹ یہیں ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہم یہ موقع کھو بیٹھیں گے۔ خدا کے لیے دیر نہ کیجیے۔ سرنگا پٹم میں ہمارے دوست آپ کی فوج کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ دشمن کو سنبھلنے کا موقع دینا دانشمندی نہیں۔"

گورنر نے ایک حقارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ محمد علی کی طرف دیکھا اور کہا۔

"نواب صاحب! دشمن کو کمزور یا احمق سمجھ لینا بھی دانشمندی نہیں۔"

محمد علی نے جواب دیا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا!"

"میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کی اطلاعات غلط ہیں۔ ٹیپو کے خلاف آپ کے دوستوں

کی سازش کامیاب نہیں ہوئی۔ وہ سب گرفتار ہو چکے ہیں اور وہ سلطنت پر قبضہ جما چکا ہے۔"

محمد علی پھٹی پھٹی آنکھوں سے گورنر، اس کے سیکرٹری اور جنرل اسٹورٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "جناب والا اگر آپ کی فوج حیدر علی کی موت کی اطلاع پاتے ہی سرنگا پٹم کی طرف کوچ کر دیتی تو باغیوں کے حوصلے بلند ہو جاتے اور ٹیپو کو تخت پر بیٹھنے کا موقع نہ ملتا۔"

جنرل اسٹورٹ نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ ہم نے ایسی حماقت نہیں کی ورنہ ہماری تباہی یقینی تھی۔"

"لیکن ٹیپو کو اطمینان سے تیاری کا موقع دینا ایک غلطی ہے۔ اگر آپ سرنگا پٹم کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے تیار نہیں تو کرناٹک کے مقبوضہ علاقوں سے میسور کی فوج کو نکالنے میں آپ کو کون سی مشکل درپیش ہے؟"

جنرل اسٹورٹ نے جواب دیا۔ "سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہم فوری حملہ کے لیے تیار نہیں اور میسور کے سپاہی آپ کی خواہشات کا احترام کرنے کی بجائے ہر قدم پر مزاحمت کریں گے۔"

"تو پھر آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ میں حیران ہوں کہ آپ جیسا بہادر اور تجربہ کار جرنیل، ٹیپو سے اتنا مرعوب ہے۔"

جنرل اسٹورٹ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ تاہم اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "نواب صاحب ہم جانتے ہیں کہ آپ ٹیپو کے متعلق بہت پریشان ہیں لیکن وہ ایک طاقتور اور ہوشیار دشمن ہے اور ہم پوری تیاری کے بغیر میسور پر حملہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اگر وہ آپ کی طرح محض ایک نواب ہوتا تو میں اور میرے سپاہی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر سرنگا پٹم کی طرف یلغار کر دیتے لیکن وہ

محض سپاہی ہے اور اگر آپ کو اپنی سلطنت کا بیشتر حصہ کھو بیٹھنے کے بعد بھی اس[1] کی قابلیت کے متعلق کوئی شبہ ہے تو ہمیں مشورہ دینے کی بجائے خود سرنگا پٹم کا رخ کیجیے۔"

اسٹورٹ کا خیال تھا کہ محمد علی آپے سے باہر ہو جائے گا لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ محمد علی کے چہرے پر ایک فدویانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جنرل اسٹورٹ حیران تھا لیکن انگریز گورنر اور اس کے سیکرٹری کے لیے یہ مسکراہٹ کوئی نئی بات نہ تھی۔ محمد علی کرناٹک کا حکمران بننے کے بعد ہر انگریز کی گالیوں پر مسکرانے کا عادی ہو چکا تھا۔

گورنر نے جنرل اسٹورٹ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "نواب صاحب اس ملک میں ہمارے بہترین دوست ہیں اس لیے ان کی پریشانی بلاوجہ نہیں۔"

گورنر کے ان الفاظ سے محمد علی کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس کی حالت اس بچے کی سی تھی جس کا باپ اسے تھپڑ مارنے کے بعد سیب دکھا کر خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے کہا۔ "جناب جنرل صاحب بہادر! میرا مطلب یہ تھا کہ میسور پر ایک کاری ضرب لگانے کے لیے یہ بہترین موقع ہے اور ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

جنرل اسٹورٹ نے جواب دیا۔ "نواب صاحب آپ مطمئن رہیں ہم تیاری کر رہے ہیں اور ایک ماہ تک ہم میسور پر چڑھائی کر سکیں گے۔"

"مجھے یقین ہے کہ آپ کو فتح ہو گی۔"

گورنر نے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "نواب صاحب! ہمیں آپ کے مشوروں سے زیادہ آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

تھوڑی دیر بعد نواب محمد علی والا جاہ گورنر کے کمرے سے باہر گورنر کے اردلیوں، بیروں، خانساموں اور چپراسیوں کو روپے تقسیم کر رہا تھا اور وہ اسے مبارکباد پیش کر رہے تھے۔

○

[1] ٹیپو نے عنانِ حکومت اس وقت سنبھالی جب مدراس، کلکتہ اور بمبئی میں ایسٹ انڈیا

کمپنی کے حکام اور انگریزوں کی بری و بحری فوج کے جرنیل اس مسئلے پر بحث کر رہے تھے کہ سرنگا پٹم پہنچنے کا آسان ترین راستہ کون سا ہے۔ سلطان ٹیپو حکومت اور فوج کا نظم و نسق درست کرنے میں مصروف تھا کہ اسے ڈنڈی وش کی طرف جنرل اسٹورٹ کی پیشقدمی کی اطلاع ملی۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ معلوم ہوا کہ پونانی سے جنرل میکلوڈ کی افواج بدنور کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ انگریزوں کی تیسری فوج جنرل میتھیوز کی کمان میں تھی۔ وہ بدنور کے آس پاس ملیبار کے چند ساحلی مقامات پر قبضہ کر چکا تھا اور اس کی تجویز یہ تھی کہ بدنور کی طرف پیشقدمی کرنے سے پہلے عقب سے رسد اور کمک کے راستے محفوظ کرنے کے لیے ملیبار کے تمام ساحلی علاقوں پر قبضہ کر لیا جائے لیکن مدراس اور بمبئی کی حکومتیں بدنور کی طرف فوری پیشقدمی کرنے کے لیے مضطرب تھیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ بدنور کا صوبہ میسور کی سلطنت کا زرخیز ترین علاقہ تھا اور کمپنی کو یہاں بآسانی رسد کا سامان مل سکتا تھا اور اس کے علاوہ یہ علاقہ ساحل سے زیادہ دور نہ تھا اور انگریز اپنی بحری طاقت سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ بمبئی اور مدراس کی حکومتوں کو یہ یقین تھا کہ بدنور کا زرخیز علاقہ خطرے میں دیکھ کر سلطان ٹیپو کمپنی کی شرائط پر صلح کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے گا۔

سلطان ٹیپو کو بدنور کی دفاعی قوت پر اعتماد تھا۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے انگریزوں کی ان افواج کی طرف توجہ دی جو جنرل اسٹورٹ کی کمان میں ڈنڈی وش کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ۱۳ فروری کو سلطان ٹیپو نے جنرل اسٹورٹ کو ڈنڈی وش کے قریب جا لیا۔ فرانسیسی دستے اس کے ساتھ تھے جن کی راہنمائی لاسگنی کر رہا تھا۔ سلطان کے لشکر کی شدید گولہ باری نے جنرل اسٹورٹ کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ جنرل اسٹورٹ کی گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ اس نے ڈنڈی وش اور کرنگلی کے قلعے بارود سے اڑا دیئے تاکہ میسور کی افواج اسلحہ اور رسد کے ذخائر سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ کرناٹک کے میدانوں پر ایک بار پھر دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے اور جنرل اسٹورٹ کی پسپائی سے مدراس میں کمپنی کے ایوانوں میں زلزلہ

آچکا تھا۔

لیکن اس عرصہ میں بدنور میں ایک غیر متوقع صورت حالات پیدا ہو چکی تھی۔ سات سمندر پار کے تاجروں کی نگاہیں ایک ایسے ملت فروش کو تلاش کر چکی تھیں جس کی غداری ان کی توپوں اور بندوقوں سے زیادہ موثر ثابت ہوئی۔ یہ غدار حیدر علی کا لے پالک ایاز خاں تھا۔



منگلور کی بندرگاہ پر کشتیوں کے ذریعے ایک چھوٹے سے جہاز پر اسلحہ اور بارود لادا جا رہا تھا۔ صدیق علی خاں بندرگاہ پر ایک فوجی افسر سے باتیں کر رہا تھا۔ ایک خوش پوش آدمی جس کی عمر پچاس سال سے اوپر معلوم ہوتی تھی ہانپتا ہوا اس کے قریب آیا اور اس نے سوال کیا۔ "آپ کا نام صدیق علی خاں ہے؟"

"جی ہاں! فرمائیے۔"

"آپ اس جہاز کے کپتان ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"یہ جہاز کنڈاپور جا رہا ہے؟"

"جی۔"

عمر رسیدہ آدمی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے ابھی اطلاع ملی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ وقت پر پہنچ گیا ہوں۔"

صدیق علی نے کہا۔ "فرمائیے آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے؟"

نووارد نے جواب دیا۔ "ہم آپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔"

"معاف کیجیے یہ جہاز ایک فوجی مہم پر جا رہا ہے اور مسافروں کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں ہوگی۔"

نووارد نے اطمینان سے کہا۔ "میں فوجدار سے مل چکا ہوں۔ وہ خود بھی یہاں

آ رہے ہیں۔ انھوں نے یہ کہا تھا کہ آپ ان کا انتظار کریں۔"

چار کہار ایک خوبصورت پالکی اور ان کے پیچھے چند آدمی سامان کے صندوق اٹھائے نمودار ہوئے۔ عمر رسیدہ آدمی صدیق علی کو حیران اور پریشان چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے کشتیوں کے قریب پالکی اور سامان اتروا دیا۔

ایک سیاہ فام عورت جو اپنے لباس سے خادمہ معلوم ہوتی تھی۔ پالکی کے قریب کھڑی تھی۔ فوجی افسر نے صدیق علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا سفر بہت دلچسپ رہے گا۔"

صدیق علی نے کہا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ یہ بڑے میاں اپنے پورے خاندان کے ساتھ میرے جہاز پر سوار ہوں گے؟"

"جی ہاں! اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ کو اپنے جہاز کا بہترین حصہ ان کے لیے خالی کرنا پڑے گا۔ وہ دیکھیے فوجدار صاحب بھی تشریف لا رہے ہیں!"

"لیکن یہ بزرگ ہیں کون؟"

"یہ یہاں کے ایک مشہور تاجر ہیں ان کا نام ناصر الدین ہے۔ پہلے ان کا مرکز کالی کٹ تھا۔ وہاں سے انگریزوں کے حملے کے باعث سخت نقصان اٹھانے کے بعد یہاں آگئے تھے۔ بدنور کے صوبیدار کے ساتھ ان کے گہرے مراسم ہیں اور پچھلے دنوں میں نے سنا تھا کہ وہاں ان کے بیٹے کو فوج میں کوئی اچھی ملازمت بھی مل گئی ہے۔"

منگلور کا فوجدار سیدھا صدیق علی کی طرف بڑھا۔ فوجی افسر اسے سلام کرنے کے بعد ایک طرف ہٹ گیا۔

فوجدار نے صدیق علی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں آپ کو ایک اور ذمہ داری سونپنے آیا ہوں۔"

"فرمائیے!"

فوجدار نے ناصرالدین کی طرف، جو اب کہاروں اور مزدوروں کو پیسے بانٹنے میں مصروف تھا، اشارہ کرتے ہوئے کہا "آپ ان سے مل چکے ہیں؟"

"جی ہاں! لیکن میں حیران ہوں کہ ان کے خاندان کے لیے میرے جہاز میں کہاں جگہ ہوگی"

فوجدار نے کہا "یہ ایک مجبوری ہے۔ یہ بڈنور کے گورنر کے دوست ہیں اور وہاں اپنے لڑکے کے پاس جانا چاہتے ہیں۔ گورنر نے پچھلے ہفتے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ میں انھیں جہاز پر کنڈاپور پہنچانے کا انتظام کر دوں لیکن یہ سواریوں کے جہاز کا انتظار کرنے کے لیے تیار نہیں۔ میں نے انھیں کہا ہے کہ فوجی جہاز پر آپ کو تکلیف ہوگی لیکن وہ بضد ہیں اور اگر میں آپ کو یہ بتا دوں کہ یہ بضد کیوں ہوں تو آپ یہ نہیں کہیں گے کہ فوجی جہاز پر عورتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں"

"مجھے ان کی ضد سے کوئی بحث نہیں۔ بہرحال مجھے آپ کا حکم ماننا پڑے گا"

فوجدار نے کہا "اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ ان کی صاحبزادی، بڈنور کے گورنر کی بیوی بننے کے لیے وہاں جا رہی ہیں تو میں آپ کو تکلیف نہ دیتا۔"

ایک گھنٹہ بعد جہاز کے بادبان کھولے جا چکے تھے۔ ناصرالدین کے ساتھ اس کی بیٹی کے علاوہ ایک خادمہ اور دو نوکر تھے۔ صدیق علی نے انھیں اپنے کمرے میں جگہ دیتے ہوئے کہا "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اس جہاز پر اس سے بہتر جگہ نہیں مل سکتی۔ آپ نے بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ ان دنوں بحری سفر خطرے سے خالی نہیں۔ انگریزوں کے جنگی جہاز ہمارے ساحل کے آس پاس گھوم رہے ہیں"

ناصرالدین نے بے اعتنائی سے جواب دیا "یہ ایک مجبوری ہے ورنہ میں آپ کو تکلیف نہ دیتا"



اگلے روز شام سے کچھ دیر پہلے ناصرالدین کی لڑکی نے اسے گہری نیند سے جگایا "اباجان! اباجان!"

ناصرالدین نے آنکھیں ملتے ہوئے شکایت کے لہجے میں کہا "بیٹی تمھیں معلوم ہے کہ گزشتہ رات مجھے بالکل نیند نہیں آئی اور اب بھی میں آدھ گھنٹہ سے زیادہ نہیں سویا۔"

لڑکی نے کہا "اباجان آپ پورے پانچ گھنٹے سوئے ہیں، دیکھیے اب شام ہو رہی ہے۔ اباجان ملاح شور مچا رہے ہیں۔ خادمہ کہتی ہے کہ جہاز کا کپتان آنکھوں سے دوربین لگائے کھڑا تھا"

ناصرالدین نے برہم ہو کر کہا "یہ کون سی نئی بات ہے۔ جہاز کے کپتان ہمیشہ دوربین لگا کر دیکھا کرتے ہیں"

"لیکن خادمہ کہتی ہے، اس نے دور کوئی جہاز دیکھ کر ملاحوں کو خبردار رہنے کا حکم دیا ہے!"

"خادمہ کہاں ہے؟"

"میں نے اسے دوبارہ پتہ کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ خدا کے لیے آپ بھی جا کر پتہ کر آئیں"

ناصرالدین نے کہا "بیٹی اگر کوئی خطرے کی بات ہوتی تو کپتان ہمیں خود آکر بتاتا۔"

صدیق علی دروازے میں نمودار ہوا اور اس نے کہا "آپ ذرا باہر تشریف لائیے!"

"خیر تو ہے؟" ناصرالدین نے گھبرا کر اٹھتے ہوئے پوچھا

"پریشانی کی کوئی بات نہیں"

ناصرالدین کمرے سے باہر نکلا اور صدیق علی نے اسے چند قدم دور لے

جاکر کہا۔ "میں آپ کی صاحبزادی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے دوپہر کے وقت ایک جہاز دیکھا تھا لیکن اس وقت وہ کافی دور تھا اور میرے لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ انگریزی ہے یا فرانسیسی۔ اب اس پر انگریزوں کا جھنڈا صاف دکھائی دے رہا ہے۔ رات آرہی ہے۔ ہمیں چند گھنٹوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں لیکن اس بات کا بہت امکان ہے کہ صبح ہوتے ہی ہم دشمن کی توپوں کی زد میں ہوں۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کو کشتی میں ساحل پر پہنچا دیا جائے۔"

نوجوان لڑکی اپنے چہرے پر نقاب ڈالے کمرے سے باہر نکلی اور اس نے کہا۔ "ابا جان! کیا بات ہے؟"

ناصرالدین نے جواب دیا۔ "بیٹی پریشانی کی کوئی بات نہیں، جاؤ بیٹھو!"

لڑکی نے کہا۔ "اگر کوئی خطرہ ہے تو میں جاننا چاہتی ہوں"

ناصرالدین نے پریشان ہو کر صدیق علی کی طرف دیکھا اور اس نے کہا: "دیکھیے مجھے ڈر ہے کہ صبح تک ہمارے جہاز پر انگریزی جہاز حملہ نہ کر دے۔ اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو راتوں رات ساحل پر پہنچا دیا جائے۔ ساحل یہاں سے زیادہ دور نہیں اور اس علاقے میں جگہ جگہ ہماری چوکیاں ہیں اور کسی چوکی سے بھی آپ کے لیے گھوڑوں کا بندوبست ہو سکتا ہے۔"

لڑکی نے کہا۔ "اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ راستے میں رکنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہم گھوڑوں پر سفر کرنے کی بجائے آپ کے ساتھ رہیں گے۔"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "میں چند منٹ کے لیے بھی نہیں رک سکتا۔ میرا کام کنڈاپور اسلحہ پہنچانا ہے۔ میں اس کشتی کا انتظار بھی نہیں کروں گا۔ جو آپ کو ساحل تک پہنچانے جائے گی۔ میرے جو ملاح آپ کے ساتھ جائیں گے وہ ساحل کی کسی چوکی سے

خشکی کے راستے آپ کے باقی سفر کا انتظام کر دیں گے۔"

لڑکی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "لیکن ہم کشتی پر نہیں جائیں گے۔ میں کشتی پر سوار ہونے کی بجائے جہاز پر رہنا زیادہ بہتر سمجھتی ہوں۔"

صدیق علی نے کہا۔ "شاید میں نے آپ کے سامنے صورت حالات کا صحیح نقشہ پیش نہیں کیا۔ میں نے آپ کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ انگریزی جہاز جو میں نے دیکھا ہے، تنہا نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ صبح تک ایک دو اور جہاز ہمارے مقابلے پر آجائیں۔ اس صورت میں آپ کی حفاظت کا مسئلہ میرے لیے انتہائی پریشان کن بن جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر اپنی منزل تک پہنچ جائیں لیکن میں خطرات سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔"

لڑکی نے کہا۔ "اس جہاز پر سوار ہوتے وقت ہمیں کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ آپ جب چاہیں ہمیں راستے میں اتار سکتے ہیں۔ اگر آپ ہمیں آگے نہیں لے جانا چاہتے تو ہمیں واپس منگلور پہنچا دیجیے!"

صدیق علی نے کہا۔ "معاف کیجیے میں آپ کے ساتھ بحث میں نہیں الجھنا چاہتا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اس جہاز میں کسی مسافر کو جگہ دینا میری غلطی تھی۔"

ناصرالدین نے صدیق علی کا لب و لہجہ دیکھ کر فوری مداخلت کی ضرورت محسوس کی اور کہا۔ "رضیہ، کپتان صاحب ہمارے فائدے کی بات کہہ رہے ہیں۔ یہ منگلور سے ہی ہمیں اس جہاز پر جگہ دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔"

رضیہ بولی۔ "لیکن کپتان صاحب کو یہ حق نہیں کہ وہ ہمیں منگلور سے لا کر کسی ویران جگہ پر اتار دیں۔"

ناصرالدین نے صدیق علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "کپتان صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ ہم کسی تاخیر کے بغیر بدنور پہنچنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس بدنور کے صوبیدار

کے دو پیغامات آچکے ہیں اور انھوں نے منگلور کے قلعہ دار کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ ہمارے سفر کا فوری انتظام کر دیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ کنڈاپور کی بندرگاہ پر میرا لڑکا ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔"

صدیق علی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ایک ملّاح تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے کہا۔" جناب معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی جہاز ہم سے کترا کر جنوب کا رخ کر رہا ہے۔"

صدیق علی کچھ کہے بغیر جہاز کے عرشہ کی طرف بڑھا اور دُوربین آنکھوں سے لگا کر انگریزی جہاز کی طرف دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے مڑ کر دیکھا تو ناصرالدین اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

صدیق علی نے کہا:" معلوم ہوتا ہے کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ آپ اپنی صاحبزادی کو تسلّی دیں۔"

رات کے وقت ناصرالدین رضیہ سے یہ کہہ رہا تھا:" بیٹی! تمھیں کپتان کے ساتھ اس قدر زیادتی سے پیش نہیں آنا چاہیئے تھا۔ وہ سرنگا پٹم کے ایک نہایت معزز خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ میں اس کے والد کو جانتا ہوں وہ میسور کی فوج کا ایک قابلِ قدر افسر ہے۔

رضیہ نے کہا۔" ابّا جان میں اسے یہ بتانا چاہتی تھی کہ میں بزدل نہیں ہوں۔ جب وہ آپ کے پاس آیا تھا تو میں سمجھ گئی تھی کہ وہ کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔ پھر جب اس نے آپ کے ساتھ علحدگی میں بات کرنے کی کوشش کی تو میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ شاید میرے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ میں کوئی خطرناک خبر سنتے ہی چیخیں مارنا شروع کر دوں گی، اگر وہ اپنے اختیارات کا مظاہرہ کرنے کی بجائے ہمیں نرمی سے سمجھاتا تو شاید میں کشتی پر سوار ہونے کے لیے تیار بھی ہو جاتی۔ اس کا طرزِ گفتگو میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔"

ناصرالدین نے کہا:" مجھے معلوم ہے کہ تمھارا مقصد صرف اسے چڑانا تھا ورنہ تمھارا چہرہ یہ بتا رہا تھا کہ جب کشتی اتاری جائے گی تو تم مجھ سے پہلے اس میں سوار ہونے کی کوشش کرو گی اور میں یہ بھی کہوں گا کہ اس کی گفتگو نہایت شائستہ تھی۔ بہرحال میں نے تمھاری طرف سے معذرت کر دی ہے۔"

"آپ نے یہی کہا ہوگا کہ میں بہت ضدی ہوں؟"

"نہیں! میں نے یہ کہا تھا کہ تم کشتی پر سوار ہونے سے ڈرتی ہو۔"



اس کے بعد راستے میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا اور ایک دن علی الصباح صدیق علی کا جہاز کنڈا پور کی بندرگاہ میں کھڑا تھا۔ قلعے کے سپاہی اور جہاز کے ملاح کشتیوں پر سامان اتارنے میں مصروف تھے۔

رضیہ نے اپنے باپ کو جگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔" ابا جان اٹھیے! شاید بندرگاہ آگئی ہے۔"

" دیکھو بیٹی! مجھے تنگ نہ کرو۔" باپ نے یہ کہتے ہوئے کروٹ بدلی اور دوبارہ سو گیا۔

رضیہ نے دوبارہ اس کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔" ابا جان دیکھیے! شاید کنڈا پور آگیا ہے۔"

باپ نے ملتجی ہو کر کہا:" خدا کے لیے مجھے سونے دو کنڈا پور ابھی بہت دور ہے۔"

رضیہ مایوس ہو کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

صدیق علی عرشے پر کھڑا سامان اتارنے والے سپاہیوں اور ملاحوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ رضیہ کچھ دیر اس سے چند قدم دور کھڑی بندرگاہ کی طرف دیکھتی رہی۔ آنکھوں کے سوا اس کا باقی چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ صدیق علی نے ایک بار اس کی طرف

دیکھا اور بے توجہی سے منہ پھیر لیا۔ جہاز پر پہلی گفتگو کے بعد وہ حتی الوسع اس سے دور رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ رضیہ کچھ دیر تذبذب کی حالت میں کھڑی رہی۔ بالآخر جرأت کر کے آگے بڑھی اور صدیق علی کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولی "یہ کنڈاپور ہے؟"

"جی ہاں! ہم رات کے تیسرے پہر یہاں پہنچ گئے تھے۔"

"کوئی ہمارے متعلق پوچھنے نہیں آیا؟ مجھے یقین ہے کہ میرا بھائی ضرور آیا ہوگا۔"

ممکن ہے آپ کا بھائی بندرگاہ پر کہیں ٹھہرا ہوا ہو۔ میرا خیال ہے کہ کسی کو اس جہاز پر آپ کی آمد کی توقع نہیں ہو سکتی۔"

رضیہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ ہم خیریت سے پہنچ گئے، ورنہ آپ تو ہمیں راستے میں ہی دھکا دینے پر آمادہ تھے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "بعض فرائض بہت ناخوشگوار ہوتے ہیں اور یہ ان میں سے ایک تھا۔ بہرحال مجھے خوشی ہے کہ آپ تکلیف سے بچ گئیں۔ اب آپ تیاری کریں آپ کے لیے کشتی تیار ہے۔ میں نے قلعہ دار کو آپ کی آمد کی اطلاع بھیجدی ہے۔ شاید وہ آپ کے استقبال کے لیے پہنچ جائے۔"

رضیہ نے کہا۔ "اس دن شاید آپ کو میری باتیں ناگوار محسوس ہوئی تھیں۔ میرا یہ ارادہ تھا کہ کنڈاپور پہنچ کر آپ سے معذرت کروں گی۔"

صدیق علی نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "باتوں میں شاید میں نے بھی آپ کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ آپ شام کے وقت کشتی پر سوار ہونے سے ڈرتی ہیں۔"

"جی یہ بالکل غلط ہے۔" رضیہ یہ کہہ کر صدیق علی سے زیادہ اپنے باپ کو کوستی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ناصر الدین کو بازو سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر یہ کہہ رہی تھی۔

"اباجان! آپ نے اس نیم پاگل آدمی سے یہ کیوں کہا تھا کہ میں کشتی پر سوار ہونے سے ڈرتی ہوں؟"

ناصر الدین نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے آج تم مجھے بالکل نہیں سونے دو گی۔"

تھوڑی دیر بعد ناصر الدین، رضیہ اور ان کی خادمہ اور نوکر ایک کشتی پر سوار ہو کر بندرگاہ کا رخ کر رہے تھے اور صدیق علی خاں ان کے پیچھے دوسری کشتی میں سوار تھا، دونوں کشتیاں ایک ساتھ ساحل پر لگیں۔ کنڈاپور کا قلعہ دار چند افسروں اور سپاہیوں کے ساتھ ان کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر پہلے ناصر الدین اور پھر رضیہ کو سہارا دے کر کشتی سے اتارا۔ قلعہ دار صدیق علی سے مصافحہ کرنے کے بعد ناصر الدین کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے کہا۔ "ہم نے آپ کے سفر کا انتظام کر دیا ہے۔ چلیے پہلے قلعہ میں ناشتا کر لیجیے۔"

ناصر الدین نے صدیق علی کو اس نوجوان کی طرف جو چند قدم پیچھے رضیہ کے پاس کھڑا تھا متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "کپتان صاحب یہ میرا بیٹا افتخار الدین ہے۔"

افتخار الدین نے آگے بڑھ کر گرمجوشی کے ساتھ صدیق علی سے مصافحہ کیا۔

قلعہ دار نے اپنے سپاہیوں سے کہا۔ "ان کا سامان قلعے میں لے چلو!"

افتخار الدین نے قلعہ دار سے کہا۔ "لیکن ہم کھانا کھاتے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"

ناصر الدین نے احتجاج کیا۔ "نہیں نہیں! کھانا کھانے کے بعد میں آرام کروں گا۔ اب ہمیں کوئی جلدی نہیں۔"

سپاہیوں نے سامان اٹھا لیا اور ناصر الدین اور اس کے ساتھی ان کے پیچھے قلعے کی طرف چل دیے۔

قلعہ دار نے صدیق علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ انھیں لے آئے۔ صوبیدار صاحب مجھ سے بہت برہم تھے۔ چند دن قبل انھوں نے یہ حکم بھیجا تھا کہ انھیں لانے کے لیے ایک خاص جہاز بھیج دیا جائے۔ بدقسمتی سے یہاں کوئی جہاز موجود نہ تھا۔ پھر ان کا دوسرا حکم آیا کہ منگلور کے فوجدار کو ان کے سفر کا انتظام کرنے کا حکم بھیجا جا چکا ہے، اس لیے یہاں سے خاص جہاز بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ان کا صاحبزادہ ایک ہفتے سے ان کا یہاں انتظار کر رہا تھا لیکن کل صبح ان کا تیسرا حکم آیا کہ اب سمندر کا راستہ خطرناک ہے، اگر وہ پہنچ نہیں گئے تو تم خشکی کے راستے چند سپاہی بھیج کر منگلور کے فوجدار کو یہ ہدایت کر دو کہ انھیں سمندر کے بجائے خشکی کے راستے بھیجنے کا انتظام کیا جائے اور میں نے یہ حکم ملتے ہی چند سوار منگلور کی طرف روانہ کر دیئے تھے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "گورنر صاحب ایک باخبر آدمی ہیں۔ بحری سفر کے متعلق ان کے خدشات بلاوجہ نہیں تھے۔ میں نے راستے میں ایک انگریزی جہاز دیکھا تھا آپ کو چوکس رہنا چاہیئے۔"

ایک نوجوان ہجوم سے نکل کر "بھائی جان، بھائی جان!" کہتا ہوا صدیق علی کی طرف بڑھا اور صدیق علی نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ "مسعود! تم کب یہاں آئے؟"

"بھائی جان! میں تین دن سے یہاں ہوں۔ مجھے اس قلعے کے آس پاس کی دفاعی چوکیوں کی حفاظت کے لیے بھیجا گیا ہے۔ ہمارے دستے یہاں سے دو میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ اگر آپ اس وقت فارغ ہوں تو میرے ساتھ چلیے۔ چچا اسد خاں آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

"وہ یہاں ہیں؟"

"ہاں بھائی جان! اور جب میں آپ کو یہ بتاؤں کا کہ وہ ہمارے کمانڈر ہیں

تو آپ اور زیادہ حیران ہوں گے، چلیے میں آپ کو ان سے ملاتا ہوں۔"

صدیق علی نے کہا۔ "ابھی جہاز پر دو توپیں رہ گئی ہیں۔ میں انھیں اتروانے کے بعد تمھارے ساتھ چلوں گا۔"

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد جب توپیں جہاز سے اتار کر ساحل پر پہنچا دی گئیں تو صدیق علی نے قلعہ دار سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اب جہاز پر غلّہ لدوانا آپ کی ذمہ داری ہے میں کل صبح ہونے سے پہلے یہاں سے روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔"

قلعہ دار نے کہا۔ "غلّے کے لیے چند دن آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔"

صدیق علی نے کہا۔ "لیکن منگلور کے فوجدار نے مجھے فوراً واپس پہنچنے کا حکم دیا تھا۔ آپ کو ان کی ہدایات موصول نہیں ہوئیں؟"

"ان کی ہدایات موصول ہو چکی ہیں لیکن مجھے بدنور کے صوبہ دار کا حکم ہے کہ ان کی اجازت حاصل کیے بغیر یہاں سے کوئی چیز نہ بھیجی جائے۔ میں نے منگلور کے فوجدار کا مراسلہ ان کی خدمت میں بھیج دیا تھا لیکن ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔ چلیے آپ قلعے میں قیام کریں۔ مجھے امید ہے کہ آج یا کل تک ان کی طرف سے جواب آجائے گا۔"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "نہیں میری جگہ جہاز میں ہے۔ میں اب اسد خاں سے ملنے جا رہا ہوں۔ چلو مسعود!"

مسعود علی نے کہا۔ "بھائی جان! میں پیدل آیا ہوں لیکن اگر آپ چاہیں تو قلعے سے گھوڑوں کا انتظام ہو سکتا ہے۔"

"نہیں! میں پیدل چلنا چاہتا ہوں۔"

صدیق علی اور مسعود سمندر کے کنارے کنارے چند دفاعی چوکیوں کے قریب سے گزرنے کے بعد دائیں ہاتھ مڑے اور کوئی دو میل چلنے کے بعد محفوظ فوج کے پڑاؤ میں

داخل ہوئے۔

اسد خاں اپنے خیمے سے باہر چہل قدمی کررہا تھا۔ وہ اچانک صدیق علی کی طرف متوجہ ہوا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "ارے تم کہاں؟"

"جی میں منگلور سے اسلحہ لے کر آج ہی پہنچا ہوں۔ ابھی مسعود نے بتایا کہ آپ یہاں ہیں اور میں حیران ہوں کہ۔۔۔!"

اسد خاں بولا۔ "کہو کیا بات ہے تم خاموش کیوں ہوگئے؟"

"کچھ نہیں چچا جان!"

اسد خان مسکرایا۔ "برخوردار! تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اس عمر میں ایک سپاہی کا لباس مجھے عجیب معلوم ہوتا ہے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "نہیں چچا جان، میں دراصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ میسور کو جنگ کے میدان سے باہر آپ کی خدمات کی زیادہ ضرورت ہے۔"

اسد خان نے کہا۔ "مجھے ہنگامی حالات میں صرف خانہ پُری کے لیے بھیجا گیا ہے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "چچا جان! یہ آپ کی کسرِ نفسی ہے میں جانتا ہوں کہ چند سال قبل میسور کی فوج کے بہترین افسر آپ کی فوجی صلاحیتوں کے معترف تھے۔"

اسد خان بولا۔ "بیٹا! یہ ان دنوں کی بات ہے جب میری رگوں میں خون تھا۔ اب خدا سے دعا کرو کہ میں اپنے آپ کو اس ذمہ داری کا اہل ثابت کرسکوں۔"

"چچا جان! آپ ہر ذمہ داری کے اہل ہیں اور مجھے صرف آپ کی ذات کے لیے دعا کرنی چاہیئے۔"

اسد خاں نے کہا۔ "فوج میں رہ کر میری صحت ٹھیک ہو جائے گی۔ تم کب تک یہاں ہو؟"

"میں کل علی الصباح یہاں سے واپس جانا چاہتا تھا لیکن اب شاید ایک دو دن ٹھہرنا پڑے۔"



صدیق علی نے باقی دن اسد خان اور اپنے بھائی کے ساتھ پڑاؤ میں گزارا غروبِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے جب اس نے اسد خان سے اپنے جہاز پر واپس جانے کی اجازت لی تو مسعود اسے ساحل تک پہنچانے کے لیے اس کے ساتھ ہوگیا۔

قلعے کے قریب سے گزرتے ہوئے انھیں افتخار الدین بندرگاہ کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ وہ ہاتھ سے اشارہ کرنے کے بعد تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا ان کے قریب پہنچا اور اس نے کہا۔ "میں جہاز پر آپ کو تلاش کرنے گیا تھا۔"

"کیوں خیر تو ہے، میرا خیال تھا آپ یہاں سے روانہ ہو چکے ہوں گے۔"

"میں تو اسی وقت روانہ ہونا چاہتا تھا لیکن ابا جان آج سفر کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔ اب ہم انشاءاللہ کل علی الصباح روانہ ہوجائیں گے۔ ابا جان کی خواہش ہے کہ آپ آج رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔"

"بہت اچھا! لیکن میں زیادہ دیر آپ کے پاس نہیں ٹھہر سکوں گا۔ رات کے وقت میرا جہاز پر ہونا ضروری ہے۔"

افتخار الدین نے کہا۔ "ہم آپ کو بہت جلد فارغ کر دیں گے۔ چلیے ابا جان کہتے تھے کہ میں آپ کو اپنے ساتھ لے کر آؤں۔"

صدیق علی نے مسعود کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا بھائی مسعود علی ہے۔"

افتخار الدین نے مسعود علی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا نام افتخار الدین ہے میں نے آپ کو یہاں دو تین بار بندرگاہ پر دیکھا ہے۔ آیئے آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں ابا جان! آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

مسعود علی نے جواب دیا۔ "لیکن مجھے واپس اپنے پڑاؤ میں جانا ہے۔"

افتخار الدین نے کہا۔ "میں آپ کو اپنے نوکر کے ساتھ گھوڑا دے کر بھیج دوں گا۔"

افتخار الدین کے اصرار پر مسعود اس کی دعوت میں شریک ہونے سے انکار نہ کر سکا۔

تھوڑی دیر بعد یہ تینوں قلعے کے ایک کمرے میں ناصر الدین کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ رضیہ برابر کے کمرے میں نیم وا دروازے کی آڑ میں کھڑی تھی۔ افتخار الدین اور مسعود علی پہلی ملاقات میں ہی یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ ایک دوسرے کو مدت سے جانتے ہیں۔

ناصر الدین کا ایک نوکر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "قلعہ دار صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ دروازے پر کھڑے ہیں۔"

ناصر الدین نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "انھیں اندر لے آؤ۔"

نوکر باہر نکل گیا اور چند ثانیہ بعد قلعہ دار کمرے میں داخل ہوا۔ صدیق علی، مسعود علی اور افتخار الدین اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

قلعہ دار نے کہا۔ "بڈنور سے صوبیدار صاحب کا ایلچی ابھی پہنچا ہے۔ انھوں نے تاکید کی ہے کہ اگر آپ پہنچ گئے ہوں تو آپ کو فوراً یہاں سے روانہ کر دیا جائے۔"

ناصر الدین نے کہا۔ "تشریف رکھیے! ہم انشاءاللہ علی الصباح روانہ ہو جائیں گے۔"

"میرا خیال تھا کہ آپ کھانا کھانے کے بعد فوراً روانہ ہو جاتے تو اچھا تھا۔"

ناصر الدین نے جواب دیا۔ "صوبیدار صاحب کو شاید اس بات کا احساس نہیں کہ رات خدا نے آرام کے لیے بنائی ہے۔"

قلعہ دار نے کہا۔ "جناب! صوبیدار صاحب یہ محسوس کرتے ہیں کہ ساحلی علاقے ہر وقت خطرے میں ہیں اور یہاں آپ کا قیام ٹھیک نہیں۔"

ناصر الدین نے کہا۔ "یہ قلعہ جہاز کی نسبت بہرحال زیادہ محفوظ ہے اور صوبیدار صاحب کو تو اس بات کا علم بھی نہیں ہوگا کہ ہم یہاں پہنچ گئے ہیں۔"

"لیکن انھیں آپ کی آمد کی توقع تو تھی نا؟"

"بہرحال رات کے وقت سفر کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور اگر آپ کو اس قلعے میں ہمارا ٹھہرنا پسند نہیں تو ہم پڑاؤ میں جانے کے لیے تیار ہیں۔"

"جناب یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اگر آپ حکم دیں تو میں سارا قلعہ آپ کے لیے خالی کرا دوں۔"

صدیق علی نے سوال کیا۔ "صوبیدار صاحب کا ایلچی غلّے کے متعلق بھی کوئی پیغام لایا ہے؟"

"نہیں غلّے کے متعلق انھوں نے کچھ نہیں لکھا لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ بہت ممکن ہے کل ان کا حکم آ جائے۔ اگر کل نہیں تو پرسوں ضرور آ جائے گا۔"

کچھ دیر بعد یہ لوگ قلعے کے ایک اور وسیع کمرے میں چند افسروں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ دسترخوان پر ناصر الدین کی گفتگو انتہائی شگفتہ تھی لیکن قلعہ دار کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔ ناصر الدین نے کوئی لطیفہ سنانے کے بعد قلعہ دار سے سوال کیا۔

"آپ بہت مغموم نظر آتے ہیں خیر تو ہے؟"

"جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

کھانا کھانے کے بعد ناصر الدین اور اس کا لڑکا، صدیق علی اور اس کے بھائی کو رخصت کرنے کے لیے قلعے کے دروازے تک آئے۔ مسعود علی کے لیے افتخار الدین کا ایک نوکر گھوڑا لیے کھڑا تھا۔

ناصر الدین نے صدیق علی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہم علی الصباح روانہ

ہیں؟" جواب میں اسے بدحواس سپاہیوں کی آوازیں سنائی دیتیں: "کمانڈر ابھی یہاں تھے۔" "کمانڈر صاحب گھوڑے پر آگے نکل گئے ہیں۔"

صدیق علی نے پانچویں چوکی کے قریب پہنچ کر اپنا سوال دہرایا، تو تاریکی میں اسے مسعود علی کی آواز سنائی دی۔ "بھائی جان! بھائی جان! کمانڈر صاحب اگلے مورچے میں ہیں وہ زخمی ہوکر گھوڑے سے گر پڑے تھے۔"

"مسعود! مسعود!!" صدیق علی نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے ان کے پاس لے چلو!"

وہ بھاگتے ہوئے اگلے مورچے میں داخل ہوئے۔ اسدخان زمین پر لیٹا ہوا تھا اور چند افسر اور سپاہی اس کے گرد جمع تھے۔

"چچا جان!" صدیق علی نے اس کے قریب بیٹھ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اسدخان نے نحیف آواز میں کہا۔ "کون —! صدیق علی — تم یہاں!! لیکن تمہارا جہاز؟"

"میرا جہاز ڈوب چکا ہے۔ آپ کے زخم زیادہ شدید تو نہیں؟"

"میرے زخموں کی پروا نہ کرو۔ میری منزل آ چکی ہے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "چچا جان! ان حالات میں فوج کو آگے لانے کی بجائے پیچھے ہٹانے کی ضرورت تھی۔"

اسدخان نے جواب دیا۔ "ان چوکیوں کی حفاظت میرا فرض تھا۔"

صدیق علی نے کہا۔ "ان چوکیوں کے سپاہی دور مار توپوں کے بغیر کچھ نہیں کرسکتے اور وہ آپ کے پاس نہیں ہیں۔"

اسدخان نے کہا۔ "ہمارے پاس چار بڑی توپیں تھیں اور وہ میں نے قلعہ دار کے اصرار پر یہاں پہنچتے ہی قلعہ کے اندر بھجوا دی تھیں۔ تم لوگوں کو میرے گرد جمع ہونے

کی ضرورت نہیں۔ اب تمہارا کام یہ ہے کہ دشمن کو رات کے وقت ساحل پر اترنے کا موقع نہ دو۔"

صدیق علی نے کہا۔ "چچا جان! دشمن اس جگہ فوجیں نہیں اتارے گا۔ وہ جانتا ہے کہ قلعے کے آس پاس کا علاقہ اس کیلئے کہیں زیادہ محفوظ ہے۔"

اسدخان نے کہا۔ "تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی!"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "جب دشمن کے جہاز ہمارے جہاز پر گولہ باری کر رہے تھے تو قلعے کی توپیں خاموش تھیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ قلعے کے محافظ برجوں سے مشعلیں دکھا کر یہ بتا رہے تھے کہ ہم یہاں ہیں۔ اس لیے تمہاری توپوں کا رخ دوسری طرف ہونا چاہیئے۔"

اسدخان نے اچانک اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن درد سے کراہتا ہوا دوبارہ لیٹ گیا اور قدرے توقف کے بعد بولا۔ "صدیق علی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ تمہارا مشورہ کیا ہے؟"

صدیق علی نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ ان مورچوں پر دشمن کی گولہ باری محض ایک دکھاوا ہے۔ وہ صبح کے وقت اطمینان سے قلعے کے آس پاس فوجیں اتار دے گا۔ اگر آپ کنڈاپور کو بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں صبح سے پہلے قلعے پر قبضہ کرلینا چاہیئے۔ آپ پڑاؤ میں سوار دستوں کو یہ حکم بھیج دیجیے کہ اس طرف ابھی ان کی ضرورت نہیں۔ وہ دشمن کے جنگی بیڑے کی توپوں کی زد سے دور رہیں۔ پھر اگر دشمن نے کسی جگہ فوج اتار دی تو انہیں کام میں لایا جاسکے گا۔"

اسدخان نے کہا۔ "صدیق میرا وقت آ چکا ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ قدرت نے تمہیں بلاوجہ نہیں بھیجا۔ جب تک یہاں میری جگہ لینے کے لیے کوئی اور نہیں آجاتا میں اس فوج کی کمان تمہیں سونپتا ہوں۔"

"چچا جان! مجھے یقین ہے کہ آپ اچھے ہو جائیں گے۔" یہ کہہ کر صدیق علی سپاہیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ "انھیں پڑاؤ کے پیچھے کسی محفوظ جگہ لے جاؤ۔ یہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔"

اسد خان نے نحیف آواز میں کہا۔ "بیٹا تم وقت ضائع نہ کرو۔ اب میرے لیے کوئی جگہ غیر محفوظ نہیں۔"

سپاہی اسد خاں کو تختے پر ڈال کر اٹھانے لگے تو کسی نے کہا۔ "جلدی سے پانی لاؤ یہ بے ہوش ہیں۔"

فوجی طبیب نے جلدی سے نبض ٹٹولی اور پھر جھک کر تھوڑی دیر اس کے سینے سے کان لگانے کے بعد کہا۔ "اب انھیں پانی پلانے کی ضرورت نہیں۔"



صدیق علی نے ڈیڑھ سو سپاہیوں کو ساحلی چوکیوں کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر محفوظ فوج کے ایک ہزار سپاہیوں کو قلعے کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ صبح کی روشنی کے ساتھ دشمن کے جنگی بیڑے کی گولہ باری بند ہو چکی تھی۔ صدیق علی کی رہنمائی میں یہ فوج قلعے کے قریب پہنچی تو برج پر سفید جھنڈا دکھائی دیا۔ صدیق علی نے دروازے کے قریب پہنچ کر بلند آواز میں کہا۔ "دروازہ کھولو!"

کچھ دیر کوئی جواب نہ ملا۔ پھر بڑے پھاٹک کی بجائے بغلی دروازہ کھلا اور صدیق علی کی توقع کے خلاف قلعہ دار نے باہر نکل کر کہا۔ "تمھارے کماندار کہاں ہیں؟"

صدیق علی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے یہ صلح کا جھنڈا کس کے حکم سے بلند کیا ہے؟"

قلعہ دار نے جواب دیا۔ "آپ مجھ سے اس قسم کے سوالات پوچھنے کا حق نہیں رکھتے تاہم آپ کی تسلی کے لیے یہ بات کافی ہونی چاہیے کہ میں نے اپنے سے بڑے دل

کی ہدایات پر عمل کیا ہے۔"

"اور حملے کے وقت آپ نے قلعے کے برجوں پر جو روشنی کی تھی وہ بھی غالباً کسی بڑے کی ہدایت کے مطابق تھی؟"

"ہاں!"

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ بڑا کون ہے؟"

"اس وقت اس سوال کا جواب میں صرف فوج کے کماندار کو دے سکتا ہوں۔ تمھارا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔"

صدیق علی نے کہا۔ "اس وقت میں اس فوج کا کماندار ہوں۔"

"اگر آپ اس فوج کے کماندار ہیں تو آپ کے لیے بدنور کے گورنر کا یہ حکم ہے کہ آپ فوج کو یہاں سے نکال کر حیدر گڑھ پہنچ جائیں۔ وہاں آپ کو مزید ہدایات مل جائیں گی۔"

"میں بدنور کے گورنر سے تصدیق کیے بغیر کوئی نیا قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اس فوج کو کنڈا پور کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اور کنڈا پور کی حفاظت ہم اس وقت تک کریں گے جب تک کہ دشمن اس قلعے کی دیواریں زمین سے ہموار نہیں کر دیتا۔"

قلعہ دار کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے کہا۔ "اس قلعے کے ساتھ تمھارا کوئی تعلق نہیں۔ اس کی حفاظت کے متعلق سوچنا ہمارا کام ہے۔"

"اور تم نے اس کی حفاظت کا جو نیا طریقہ اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب رات ہو تو قلعے کے برجوں پر روشنی کر دی جائے اور جب صبح ہو جائے تو سفید جھنڈا لہرا دیا جائے؟"

"میں نے جو کچھ کیا ہے میں اس کی پوری ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

ہمیں حکم تھا کہ خطرے کے وقت یہ قلعہ خالی کر دیا جائے۔"

"اور تمھیں یہ بھی حکم تھا کہ خطرے کے وقت دشمن کو یہ بتا دیا جائے کہ تمھارا مقابلہ کرنے والی فوج باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔"

"میرا فرض اپنے سپاہیوں کو بلاوجہ ہلاک ہونے سے بچانا تھا لیکن تم جیسے گستاخ آدمی سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تمھارے نزدیک ان سپاہیوں کی زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی تو تمھیں اس بات کی آزادی ہے کہ تم سینہ تان کر دشمن کی توپوں کے سامنے کھڑے ہو جاؤ لیکن مجھے حیدرگڑھ پہنچنے کی ہدایات موصول ہو چکی ہیں۔"

یہ کہہ کر قلعہ دار دروازے کی طرف پلٹا لیکن صدیق علی نے اچانک آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا اور میان سے تلوار نکال کر اس کے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "تم قلعے کے اندر نہیں جا سکتے۔"

ایک ثانیہ کے اندر اندر پہرے داروں نے قلعے کا بغلی دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

قلعہ دار نے کہا۔ "تمھیں شاید معلوم نہیں کہ تمھارے سپاہی اس وقت ہماری گولیوں کی زد میں ہیں۔ اگر تم فصیل کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی تکلیف کرو تو تمھاری بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔"

صدیق علی نے کہا۔ "تم یہ دیکھنے کے لیے موجود نہیں ہو گے کہ ہماری غلط فہمیاں کس حد تک دور ہوئی ہیں۔ اگر ایک منٹ کے اندر اندر قلعے کا دروازہ نہ کھلا تو میری تلوار تمھارے سینے سے پار ہو گی۔"

قلعہ دار نے صدیق علی کے الفاظ سے زیادہ اس کی تلوار کی نوک کا دباؤ اپنے سینے پر محسوس کیا اور اس نے کسی توقف کے بغیر بلند آواز میں کہا۔ "دروازہ کھول دو!"

دروازہ کھل گیا اور صدیق علی اپنے ایک ہزار سپاہیوں کے ساتھ قلعے کے اندر داخل ہو گیا۔ قلعے کے سپاہی پریشانی اور تذبذب کے عالم میں یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ صدیق علی نے بلند آواز میں کہا۔ "جس ملک کی فوج میں غدار موجود ہوں اس کے آہنی قلعے بھی محفوظ نہیں ہوتے۔ میرے دوستو! اس قلعے کا محافظ دشمن کے ساتھ مل گیا ہے۔ میسور کی فوج تمھاری اور تمھاری آنے والی نسلوں کی عزت اور آزادی کی جنگ لڑ رہی ہے۔ میسور کی فتح اس ملک کے ہر اس باعزت انسان کی فتح ہو گی جو ایک باعزت قوم کے فرد کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتا ہے اور اگر خدانخواستہ میسور کو شکست ہوئی تو اس کے نتائج صرف میسور کی سرحدوں تک محدود نہیں رہیں گے۔ بلکہ ہندوستان کا ہر حریت پسند یہ محسوس کرے گا کہ اس کے لیے عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنے کے امکانات ختم ہو چکے ہیں۔ تمھارے قلعہ دار کو دشمن کے حملے کا قبل از وقت علم تھا اور اس نے دشمن کے استقبال کے لیے قلعے پر چراغاں کیا تھا۔ اس کی بزدلی اور غداری کے باعث ہمارے کئی آدمی شہید ہو چکے ہیں۔ کاش میں ہر غدار کو قلعے کے دروازے پر چالیس بار پھانسی دے سکتا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم میں سے اور کون ہیں جو اس سازش میں شریک ہیں۔"

قلعے کے سپاہیوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

صدیق علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "میں یہ پوچھتا ہوں کہ تم دشمن کے خلاف جنگ میں ہمارا ساتھ دینا چاہتے ہو یا بزدلوں اور غداروں کی موت مرنا چاہتے ہو؟"

ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔ "ہم آپ کے ساتھ ہیں۔"

چند اور آدمیوں نے اس کی تقلید کی اور وہ ایک ایک کر کے صدیق علی کے گرد جمع ہونے لگے۔

صدیق علی نے کہا: "اس قلعے میں اسلحہ کی کمی نہیں، بارود کا ذخیرہ جو میں لایا تھا، اتنا ہے کہ ہم کم از کم ایک ہفتہ دشمن کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ اس عرصہ میں یقیناً ہمیں کمک پہنچ جائے گی۔"

ایک نوجوان افسر نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ہم آپ کے ساتھ جان دینے کے لیے تیار ہیں لیکن ہمارے پاس جو بارود ہے وہ ایک دن کے لیے بھی کافی نہیں۔ آپ جو بارود اپنے جہاز پر لائے تھے وہ رات کے حملے سے پہلے ہی سمندر میں پھینک دیا گیا تھا۔ قلعہ دار دشمن کے ساتھ ساز باز کرنے کے بعد ہماری طرف سے مطمئن نہ تھا، اسے یہ خدشہ تھا کہ ہم کہیں اس کے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ یہ شخص کنڈاپور کی قسمت کا فیصلہ دشمن کی آمد سے پہلے ہی کر چکا تھا۔ اسے لے جاؤ اور قلعہ سے باہر کسی درخت کے ساتھ لٹکا دو۔"

صدیق علی کے اشارے سے چند سپاہیوں نے اپنی سنگینیں قلعہ دار کی طرف سیدھی کر دیں اور اسے باہر نکلنے کے لیے کہا۔

قلعہ دار چلایا۔ "بدنور کا گورنر میرے بدلے تم میں سے ہر ایک کو پھانسی پر لٹکا دے گا۔ میں نے اس کے احکام کی تعمیل کی ہے۔ میں مطالبہ کرتا ہوں کہ میرا معاملہ اس کے سپرد کر دیا جائے۔ خدا کے لیے کسی آدمی کو بھیج کر میرے متعلق ان سے پوچھ لو۔ ورنہ مجھے بدنور بھیج دو۔"

صدیق علی نے کہا۔ "اگر تم بدنور کے صوبیدار کے بھائی ہوتے تو بھی اس غداری کے بعد میں تمہارے متعلق کسی تحقیقات کی ضرورت محسوس نہ کرتا۔ اگر تم سلطان معظم کے بھائی ہوتے تو بھی تمہارے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا۔"

ناصر الدین، افتخار الدین اور رضیہ اپنے اپنے کمروں سے نکل کر انتہائی پریشانی کی حالت میں یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ افتخار الدین سپاہیوں کو راستے سے ہٹاتا

ہوا آگے بڑھا اور اس نے کہا "بھائیو! یہ شخص جھوٹ بولتا ہے، اس نے اس شخص کے خلاف غلط بیانی کی ہے جسے حیدر علی اپنا بیٹا سمجھتا تھا۔ اس کے لیے کوئی سزا کافی نہیں ہوسکتی۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اس کی سازش میں جو افسر یا سپاہی شریک ہیں، ان سب کو پھانسی دے دی جائے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "افتخار میں اس معاملے کی پوری چھان بین کروں گا لیکن اس وقت ہمارے سامنے فوری مسئلہ اس قلعے کی حفاظت ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں تم دوبارہ جنگ شروع ہونے سے پہلے اپنے والد اور ہمشیرہ کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤ۔"

افتخار الدین نے جواب دیا: "میں ایک سپاہی ہوں اور میرے ابا اور ہمشیرہ بھی یہ پسند نہیں کریں گے کہ میں میدان چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ میرے ساتھ جو دس آدمی آئے تھے وہ انھیں بدنور پہنچانے کے لیے کافی ہیں۔"

صدیق علی نے آگے بڑھ کر ناصر الدین سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ وقت ضائع نہ کریں۔ آپ بدنور پہنچ کر گورنر کو میرا یہ پیغام دیجیے کہ کنڈاپور کی فوج آخری دم تک دشمن کا مقابلہ کرے گی۔"

ناصر الدین نے کہا۔ "میں وہاں پہنچتے ہی آپ کو کمک بھجوانے کی کوشش کروں گا۔"

تھوڑی دیر بعد قلعے کے دروازے سے باہر افتخار الدین اپنے باپ اور اپنی بہن کو خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ سامنے ایک درخت پر قلعہ دار کی لاش لٹک رہی تھی۔

رضیہ نے گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد اپنی آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے "بھائی جان! اپنا خیال رکھنا!"

فصیل سے ایک سپاہی نے بلند آواز میں کہا "سامنے دو جہاز کشتیوں پر فوج اتار رہے ہیں اور شمال مغرب سے چار اور جہاز اس طرف آرہے ہیں۔"

صدیق علی نے کہا "سپاہیو! اپنے مورچے سنبھال لو۔ سفید جھنڈا اتار دو اور قلعے کا دروازہ بند کر لو۔"

افتخار الدین نے کہا "انگریز لڑائی سے زیادہ چال اور دغابازی پر بھروسا کرتے ہیں۔ ہمیں سفید جھنڈا اس وقت اتارنا چاہیئے جب ان کی کشتیاں ہماری توپوں کی زد میں آجائیں۔"

صدیق علی نے جواب دیا "جنگ اور صلح کے متعلق ہمارے اصول ان سے مختلف ہیں۔ میں سلطان ٹیپو کا سپاہی ہوں اور سلطان کبھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ ہم دھوکے اور فریب میں دشمن کی پیروی کریں۔ میں قلعہ دار کو اس کے جرم کی سزا دے چکا ہوں۔ دشمن سے اس کی غداری کا انتقام نہیں لے سکتا۔"

صدیق علی فصیل پر چڑھا۔ دشمن کے جہازوں سے چھ کشتیاں کنارے کی طرف آرہی تھیں۔ ایک کشتی پر سفید جھنڈا لہرا رہا تھا۔ صدیق علی نے دشمن کو خبردار کرنے کے لیے توپ چلانے کا حکم دیا۔ توپ کی آواز سن کر کشتیاں واپس چلی گئیں اور دشمن کے جہازوں [illegible] شروع کر دی۔ قریباً ایک گھنٹہ بعد دشمن کے دو جہاز بھی بندرگاہ کے سامنے پہنچ گئے جنھوں نے رات کے وقت شمال کی ساحلی چوکیوں پر گولہ باری کی تھی۔ قلعے میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد ساٹھ اور زخمیوں کی تعداد ڈیڑھ سو تک پہنچ چکی تھی۔ صدیق علی دوربین لیے ایک برج پر کھڑا توپچیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ افتخار الدین بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے کہا۔

"دیکھیے ایک جہاز ساحل کے قریب آرہا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے!" صدیق علی نے جواب دیا "لیکن اُدھر دیکھو وہ دو جہاز

اب پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ بری طرح شکستہ ہو چکا ہے۔

افتخار الدین نے کہا "مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ میری حیثیت ابھی تک ایک تماشائی سے زیادہ نہیں۔ کاش میری بندوقوں کی گولیاں دشمن تک پہنچ سکتیں۔"

صدیق علی نے جواب دیا "تمھارے امتحان کا وقت آرہا ہے، اس لڑائی کا آخری فیصلہ تلواروں اور بندوقوں سے ہی ہوگا۔"

صدیق دوربین لگا کر سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک اسے اپنے دائیں ہاتھ ایک ہلکی سی چیخ اور اس کے ساتھ ہی کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، افتخار منہ کے بل پڑا تھا۔ صدیق علی نے اسے اٹھانے کی کوشش کی اور اس کے ہاتھ خون سے تر ہو گئے۔

"افتخار! افتخار!" اس نے اسے پیٹھ کے بل لٹاتے ہوئے کہا لیکن افتخار کسی اور دنیا میں پہنچ چکا تھا۔

"اسے نیچے لے جاؤ!" اس نے گھٹی ہوئی آواز میں سپاہیوں سے کہا۔

صدیق علی چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر دوربین لگا کر سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور فضا بیک وقت قلعے کی کئی توپوں کے دھماکوں سے گونج اٹھی۔

بیسواں باب

بڑنور کا گورنر ایاز خاں اپنے محل کے ایک کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ایک بھیڑیئے کی سفاکی اور اس کے چہرے سے ایک لومڑی کی عیاری مترشح تھی۔ ناصرالدین کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "میں ساری رات نہیں سو سکا۔ کہیے کنڈاپور سے کوئی خبر آئی؟"

"نہیں! میں حیران ہوں کہ میرے ایلچی نے اتنی دیر کیوں لگائی!"

"میرے خیال میں آپ کی کمک پہنچ گئی ہوگی۔"

ایاز خاں نے جواب دیا۔ "کمک بھیجنے سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں نے قلعے کے محافظ کو یہ حکم بھیج دیا تھا کہ وہ فوج وہاں سے نکال کر حیدر گڑھ پہنچ جائے۔"

"لیکن مجھے تو آپ نے بتایا تھا کہ آپ کمک بھیج رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے لیکن اب میں قلعے کی حفاظت بے سود سمجھتا ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ قلعے کے نئے محافظ کی حماقت کی وجہ سے بہت سی جانیں ضائع ہو جائیں گی اور مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ آپ افتخار الدین کو ایسے آدمیوں کے پاس چھوڑ آئے ہیں۔ بہرحال آپ کو فکرمند نہیں ہونا چاہیے، مجھے یقین ہے کہ قلعے کی فوج اب حیدر گڑھ پہنچ چکی ہوگی اور میں نے افتخار الدین کے لیے یہ حکم بھیج دیا ہے کہ وہ فوراً یہاں آجائے۔"

ناصرالدین نے کہا۔ "مجھے اندیشہ ہے کہ اگر آپ نے کنڈاپور خالی کرنے کا حکم بھیجا ہے تو صدیق علی آپ کے ایلچی پر اعتماد نہیں کرے گا۔ اسے اس بات کا یقین نہیں آئے گا کہ آپ ایسی غلطی کر سکتے ہیں۔"

ایاز خاں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "میں اب یہ سوچ رہا ہوں کہ اس بیوقوف کو پھانسی دینے کے لیے کون سی جگہ موزوں رہے گی۔"

ناصرالدین نے کہا۔ "اس نے ایک محب وطن سپاہی کا فرض ادا کیا ہے اور وہ سزا کی بجائے انعام کا مستحق ہے۔ قلعہ دار کی غداری کے بعد اس کا وہاں پہنچنا تائید غیبی تھا۔"

ایاز خاں نے کہا۔ "آپ تشریف رکھیے! میں آپ سے ایک اہم مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

ناصرالدین ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ایاز خاں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "میں یہاں پہنچتے ہی آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے درمیان کوئی غلط فہمی نہیں رہنی چاہیے۔ کنڈاپور کے قلعہ دار نے میرے ساتھ غداری نہیں کی تھی۔"

ناصرالدین چند ثانیے سکتے کے عالم میں ایاز کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "آپ کا مطلب یہ ہے کہ اس نے آپ کے حکم کی تعمیل کی تھی؟"

"ہاں۔"

"اور آپ کا حکم یہ تھا کہ کنڈاپور کا قلعہ کسی مزاحمت کے بغیر دشمن کے حوالے کر دیا جائے؟"

"جی ہاں۔"

ناصرالدین اٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن ایاز خاں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوبارہ کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ زندگی میں ہمیں بسا اوقات

ایسی حقیقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو ناقابلِ یقین معلوم ہوتی ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم جنگ ہار چکے ہیں۔"

"آپ مذاق کر رہے ہیں!" ناصرالدین نے اپنی بدحواسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں مذاق نہیں کر رہا۔ میسور ساری دنیا کے ساتھ نہیں لڑ سکتا۔ وہ چند جہاز جو آپ نے کنڈاپور کی بندرگاہ میں دیکھے تھے، ایک زبردست جنگی بیڑے کے ہراول تھے۔ انگریزوں کی فوج چند دن تک یہاں پہنچ جائے گی۔ ملیبار کے تمام ساحلی علاقوں پر ان کا قابض ہوجانا یقینی ہے۔ سلطان ٹیپو جنوب اور مشرق کے تمام علاقے خطرے میں ڈالے بغیر اس طرف نہیں آسکتا۔ اب ہمیں میسور کی بجائے اپنے مستقبل کے متعلق سوچنا چاہیئے!"

ناصرالدین نے کہا۔ "میں اپنا مستقبل میسور کے ساتھ وابستہ کرچکا ہوں۔"

"نہیں! آپ کا مستقبل بڈنور کے صوبیدار کے ساتھ وابستہ ہوچکا ہے۔"

"لیکن ان حالات میں جب کہ انگریزی فوجیں ......!"

ایاز خاں نے بات کاٹتے ہوئے کہا: "آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ انگریز مجھ سے بڈنور کی صوبیداری نہیں چھینیں گے۔"

"ان حالات میں میرے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں۔ افتخارالدین کے یہاں پہنچتے ہی واپس منگلور چلا جاؤں گا۔"

"آپ رضیہ کو چھوڑ کر کیسے جاسکتے ہیں؟"

ایک ثانیہ کے لیے ناصرالدین کی زبان گنگ ہوکر رہ گئی۔ بالآخر اس نے کہا۔

"رضیہ میرے ساتھ جائے گی۔"

"نہیں! رضیہ یہیں رہے گی اور آپ بھی یہیں رہیں گے۔ ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ اب آپ منگلور واپس جانے کا خیال بھی اپنے دل میں نہ لائیں۔

منگلور آپ کے وہاں پہنچنے سے پہلے انگریزوں کے قبضہ میں جاچکا ہوگا۔"

"ہم کسی اور جگہ چلے جائیں گے۔"

"اگر آپ یہ ثابت کرسکیں کہ آپ کی صاحبزادی کے لیے اس ملک میں بڈنور سے بہتر کوئی اور جگہ ہوسکتی ہے تو میں اسے بخوشی وہاں بھیج دوں لیکن وہ اس محل میں رہنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ اگر آپ کو میرے متعلق کوئی شبہ ہے تو میں آج اسے اپنی رفیقۂ حیات بنانے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گوارا نہیں کہ آپ لوگ اس محل سے باہر ایک معمولی سے مکان میں رہیں۔"

باہر پہرہ داروں کا شور سنائی دیا۔ کوئی بلند آواز میں کہہ رہا تھا: "میں اسی وقت صوبیدار سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم میرا راستہ نہیں روک سکتے۔ بیوقوفو! میں کنڈاپور سے آیا ہوں!"

ایاز خاں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے دائیں بائیں اور پیچھے چار پہرے دار ننگی تلواریں بلند کیے ہوئے تھے۔ ایاز نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ پیچھے ہٹ گئے۔ نوجوان چند قدم آگے بڑھا اور ایاز خاں کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ ناصرالدین نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ یہ مسعود علی تھا۔

ایاز نے پوچھا۔ "تم کنڈاپور سے آئے ہو؟"

"جی ہاں! وہاں حالات بہت مخدوش ہیں۔ ہمارا بارود ختم ہوچکا ہے۔ دشمن کے جنگی بیڑے کے پانچ اور جہاز وہاں پہنچ چکے ہیں۔ انھوں نے تین بار قلعے کے آس پاس مختلف مقامات پر فوجیں اتارنے کی کوشش کی ہے لیکن ہم نے انھیں ہر بار سمندر میں دھکیل دیا ہے۔ قلعے کے محافظ اس وقت ملبے کے ڈھیروں پر مورچے بنا کر لڑ رہے ہیں۔ ہمارے نصف سے زیادہ سپاہی زخمی اور ہلاک ہوچکے ہیں۔ ہمیں بہت جلد پیچھے ہٹ کر ساحل پر اترنے والی فوج کے ساتھ فیصلہ کن جنگ لڑنا پڑے

گی۔ ہم کمک کا انتظار کر رہے تھے لیکن کل چند غدار آپ کے ایلچیوں کا بھیس بدل کر وہاں پہنچے اور انھوں نے ہمیں آپ کا یہ حکم دیا کہ ہم میدان چھوڑ دیں اور تین حصوں میں تقسیم ہو کر حیدر گڑھ۔ امنت پور اور ادنور پہنچ جائیں۔ یہ حکم نہایت عجیب تھا۔ کماندار نے ان آدمیوں کو گرفتار کر لیا ہے اور مجھے آپ کے پاس تصدیق کے لیے بھیجا ہے۔"

ایاز خاں کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے کہا۔" اب اگر تمھیں اس بات کا یقین ہے کہ وہ تمھیں بھی غدار نہیں سمجھے گا تو تم فوراً واپس جا کر اسے میرا یہ حکم دو کہ وہ کنڈا پور خالی کر دے اور سیدھا میرے پاس آئے۔ تم وقت ضائع نہ کرو۔ تمھارے ساتھ اور کتنے آدمی ہیں؟"

مسعود علی نے جواب دیا۔" میرے ساتھ صرف دو آدمی ہیں۔"

ایاز خاں نے پہرے داروں سے مخاطب ہو کر کہا۔" تم ان کے ساتھ جاؤ اور اصطبل کے داروغہ سے کہو انھیں تازہ دم گھوڑے دے دے۔"

پہریدار کمرے سے باہر نکل گئے لیکن مسعود علی اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ اس کی نگاہیں ناصرالدین پر مرکوز تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا۔"میں نے یہاں پہنچتے ہی آپ کو تلاش کیا تھا آپ گھر پر نہیں تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے لیے اچھی خبر لے کر نہیں آیا ... افتخارالدین شہید ہو چکا ہے۔"

"مجھے معلوم تھا۔" ناصرالدین نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

ایاز خاں انتہائی پریشانی کی حالت میں کبھی ناصرالدین کی طرف اور کبھی مسعود علی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ناصرالدین اٹھا اور کچھ کہے بغیر دروازے کی طرف بڑھا ایاز خاں نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔" چلیے میں آپ کو گھر چھوڑ آتا ہوں۔"

ناصرالدین نے کہا۔"نہیں! خدا کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دو۔ مجھے چند گھنٹے تنہائی کی ضرورت ہے۔"

یہ کہہ کر ناصرالدین باہر نکل گیا۔ مسعود علی اس کے پیچھے جانے لگا لیکن ایاز خاں نے کہا۔"نوجوان ٹھہرو! میرا خیال ہے کہ تم نے ابھی ناشتا بھی نہیں کیا ہے۔"

"ناشتا مجھے راستے میں مل جائے گا۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو میں فوراً واپس جانا چاہتا ہوں۔"

"تم ناصرالدین کے گھر میں یہ خبر دے آئے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"اب واپسی پر بھی وہاں جاؤ گے؟"

"جی نہیں! اگر وہ یہاں نہ ملتے تو بھی میرے پاس انھیں تلاش کرنے کے لیے وقت نہ تھا۔"

"مجھے ان کے بیٹے کی موت کا بڑا افسوس ہے۔ اچھا تم جاؤ اور کنڈا پور کے محافظ سے کہو کہ میں اس سے خفا بھی ہوں اور خوش بھی ... خفا اس بات پر کہ اس نے میرے ایلچیوں کو قید کر دیا ہے اور خوش اس بات پر کہ اس نے فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے لیکن اب اسے قلعہ خالی کرنے کے متعلق میرے احکام کی تعمیل کرنی چاہیئے۔"



تھوڑی دیر بعد مسعود علی اور اس کے ساتھی گھوڑے دوڑاتے ہوئے شہر سے باہر نکل رہے تھے تو انھیں سامنے ایک سوار دکھائی دیا۔ جب وہ قریب پہنچے تو اس نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے چلّا کر کہا۔" مسعود علی صاحب ٹھہریئے!"

مسعود علی نے گھوڑا روکا اور سوار نے کہا۔" میں ناصرالدین کا نوکر ہوں۔ وہ آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ آپ تھوڑی دور آگے چل کر ان کا انتظار کریں۔"

"وہ یہاں آئیں گے؟"

"ہاں! چلیے ذرا آگے نکل چلیں۔"

کوئی آدھ میل چلنے کے بعد ناصرالدین کے نوکر نے کہا "بس اب یہیں ٹھہر جائیے۔ وہ تھوڑی دیر تک پہنچ جائیں گے۔"

مسعود علی اور اس کے ساتھی گھوڑوں سے اتر کر زمین پر بیٹھ گئے۔ کوئی آدھ گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد مسعود علی نے کہا "ہمیں بہت دیر ہو رہی ہے۔ ہم اس سے زیادہ انتظار نہیں کرسکتے۔"

نوکر نے کہا "جناب انھوں نے یہ کہا تھا کہ آپ کو روکنا بہت ضروری ہے اور وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر میں آپ کو نہ روک سکا تو بدنور اور ملیبار کی تباہی یقینی ہے۔"

مسعود علی کے ایک ساتھی نے شہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "شاید کوئی آ رہا ہے۔"

مسعود علی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ایک سوار پوری رفتار سے آ رہا تھا۔ جب وہ قریب پہنچا تو مسعود علی نے کہا لیکن یہ ناصرالدین تو نہیں معلوم ہوتے۔ ارے یہ تو کوئی عورت ہے!"

نوکر نے کہا "یہ ناصرالدین کی صاحبزادی ہیں۔"

مسعود علی اور اس کے ساتھی پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ رضیہ نے گھوڑا روکا اور کسی تمہید کے بغیر کہا "چلیے!"

"کہاں؟" مسعود علی نے سوال کیا۔

"کنڈا پور۔"

"آپ ہمارے ساتھ جائیں گی؟"

"ہاں، وقت ضائع نہ کیجیے!"

"لیکن کنڈا پور میں اب عورتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔"

"آپ کا بھائی وہاں ہے؟"

"ہاں۔"

"اباجان نے مجھے ایک ضروری پیغام دے کر آپ کے پاس بھیجا ہے۔ خدا کے لیے اب وقت ضائع نہ کیجیے!"

مسعود علی کچھ کہے بغیر گھوڑے پر سوار ہوگیا اور اس کے ساتھیوں نے اس کی تقلید کی۔

تھوڑی دیر بعد ان کے گھوڑے ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ مسعود علی اور اس کے ساتھی اپنے رسالے کے بہترین سوار تھے لیکن ان کے نزدیک رضیہ کی ہمت قابلِ داد تھی۔ مسعود علی کے ذہن میں کئی سوال تھے جو وہ رضیہ سے پوچھنا چاہتا تھا لیکن جب وہ حزن و ملال کی اس تصویر کو دیکھتا تو اسے بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ راستے کی پہلی چوکی پر وہ گھوڑے بدلنے کے لیے رکے۔ مسعود علی اور اس کے ساتھیوں کا بھوک سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ مسعود علی نے چوکی کے محافظ کو کھانا لانے کے لیے کہا اور پھر رضیہ کی طرف دیکھ کر بولا "میرے خیال میں آپ بھی کچھ کھا لیں۔"

"مجھے بھوک نہیں! آپ جلدی کریں!"

شام کے وقت وہ کنڈا پور سے تھوڑی دور ایک چوکی میں پہنچ گئے۔ مسعود علی نے رضیہ کو ایک کمرے میں پہنچا کر کہا "آپ کو آرام کی ضرورت ہے، آپ کھانا کھا کر سو جائیں میں آپ کا نوکر اور اپنا ایک ساتھی آپ کے پاس چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ہماری منزل اب زیادہ دور نہیں ہے۔ میں دو گھنٹے میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ خدا معلوم وہاں حالات کیسے ہیں۔ اس لیے آپ کے پاس آدمی بھیج دوں گا۔ اگر آپ کے پاس کوئی ضروری اطلاع ہے تو مجھے بتا دیجیے۔"

رضیہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا "میں آپ کے ساتھ جاؤں گی، مجھے آرام کی ضرورت نہیں۔"

مسعود علی نے کہا "میں افتخارالدین کی بہن کو ناراض نہیں کرسکتا لیکن کاش مجھے اس بات کا یقین ہوتا کہ کنڈا پور آپ کے لیے محفوظ ہے۔ آپ کے بجے اپنے بھائی کی موت

یقیناً ایک بہت بڑا سانحہ ہے لیکن وہاں جاکر آپ کا غم غلط نہیں ہوسکتا۔ آپ کے اباجان اگر وہاں کوئی ضروری پیغام پہنچانا چاہتے تھے تو اس کے لیے آپ کا بھیجنا بھی ضروری نہ تھا۔ وہ مجھ پر اعتماد کر سکتے تھے۔"

رضیہ نے مضطرب ہوکر کہا۔ "آپ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ میں آپ کو صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ میرا فوراً کنڈاپور پہنچنا ضروری ہے۔"

مسعود علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "اگر آپ کسی خطرے سے بھاگ رہی ہوں تو بھی آپ کو مجھ پر اعتماد کرنا چاہیئے۔ میں صدیق علی کا بھائی ہوں۔"

رضیہ نے مسعود علی کی طرف دیکھا اور اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ چند ثانیے ضبط کرنے کی ناکام کوشش کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

ایک سپاہی کھانے کا طشت اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ مسعود علی نے اس کے ہاتھ سے طشت لے کر رضیہ کے سامنے رکھ دیا۔ سپاہی واپس چلا گیا۔ مسعود علی نے رضیہ کی طرف متوجہ ہوکر کہا: "اگر آپ کو میری کسی بات سے دکھ پہنچا ہے تو میں معافی کا خواستگار ہوں۔"

رضیہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: "اگر آپ پر مجھے اعتماد نہ ہوتا تو میں آپ کے ساتھ یہاں تک کیوں آتی؟ سنیئے! اباجان نے محل سے واپس آتے ہی مجھے بتایا تھا کہ ایاز انگریزوں کے ساتھ بدنور کا سودا کر چکا ہے۔ کنڈاپور کے قلعہ دار نے اس کی ہدایات پر عمل کیا تھا ایاز بدنور کے تمام قلعے انگریزوں کے قبضہ میں دینے کا فیصلہ کر چکا ہے۔"

مسعود علی کچھ دیر سکتے کے عالم میں رضیہ کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "یہ خبر نہایت المناک ہے۔ لیکن اس کے لیے آپ کو کنڈاپور جانے کی ضرورت نہ تھی۔"

رضیہ نے کہا۔ "آپ نہیں جانتے۔ اس وقت بدنور کی تمام فوج مجھے تلاش کر رہی ہوگی۔ اباجان نے محل سے آتے ہی یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ وہ غدار اب زبردستی مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے میرے لیے بھاگنے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ اباجان

کو یقین تھا کہ آپ کے بھائی جان مجھے کسی محفوظ جگہ پہنچا دیں گے۔ جب اباجان ایاز کے ساتھ میری منگنی کر رہے تھے تو وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ایک بڑا آدمی ہے اور میں بھی یہ سوچتی تھی کہ میں خوش قسمت ہوں۔ خدا کے لیے مجھے کسی ایسی جگہ پہنچا دیجیے جو اس قوم فروش کی دسترس سے باہر ہو۔"

مسعود علی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "آپ اطمینان رکھیں۔ اب آپ کو کوئی خطرہ نہیں لیکن میں آپ کے والد کے متعلق پریشان ہوں۔ وہ آپ کے ساتھ کیوں نہ آئے؟"

"انھیں یہ ڈر تھا کہ ایاز بہت جلد ہمارے گھر آئے گا۔ وہ اسے غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کے لیے وہاں ٹھہرنا ضروری سمجھتے تھے۔ اگر انھیں موقع ملا تو وہ آج رات وہاں سے روانہ ہوکر خشکی کے راستے سیدھے منگلور کا رخ کریں گے اور انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر منگلور کو کوئی خطرہ درپیش ہوا تو وہ سرنگاپٹم چلے جائیں گے۔"

مسعود علی نے کہا۔ "میں گھوڑے دیکھتا ہوں۔ اب شاید ہمارا سفر بہت طویل ہو جائے۔ آپ چند نوالے ضرور کھا لیجیے!"

"مجھے بالکل بھوک نہیں۔ آپ جلدی تیاری کریں۔"



چند منٹ بعد مسعود علی، رضیہ اور ان کے ساتھی رات کی تاریکی میں گھوڑوں پر سوار ہوکر وہاں سے روانہ ہوئے اور قریباً چار میل سفر کرنے کے بعد جب وہ ایک ندی کے پل کے قریب پہنچے تو کسی نے بلند آواز میں کہا۔ "ٹھہرو، کون ہے؟"

مسعود علی نے گھوڑا روک کر جواب دیا۔ "میں مسعود علی ہوں۔"

چار مسلح سپاہی آگے بڑھے اور ان میں سے ایک نے کہا۔ "آپ کمانڈر صدیق علی خاں کے بھائی ہیں؟"

"ہاں ــــ اور تم کنڈاپور کی فوج کے آدمی ہو؟"

"جی ہاں"۔

"یہاں کر رہے ہو؟"

"فوج یہاں آگئی ہے اور ہم پڑاؤ کے گرد پہرہ دے رہے ہیں"۔

"قلعہ خالی ہو چکا ہے؟"

"جی ہاں! قلعے میں اب ملبے کے سوا کچھ نہیں رہا۔ ہم غروبِ آفتاب کے بعد وہاں سے نکل آئے تھے"۔

مسعود علی اپنے بھائی کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس میں بولنے کی سکت نہ تھی۔ رضیہ نے گھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "صدیق علی خاں کہاں ہیں؟"

"وہ یہیں ہیں"۔ سپاہی نے جواب دیا۔

مسعود علی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ہمیں ان کے پاس لے چلو!"

"چلیے!"

تھوڑی دیر بعد یہ لوگ صدیق علی خاں اور فوج کے چند افسروں کے سامنے کھڑے تھے اور رضیہ انھیں ایاز خاں کی غداری کی داستان سنا رہی تھی۔ رضیہ کا بیان سننے اور مسعود علی سے چند سوالات کرنے کے بعد صدیق علی نے کہا۔ "مسعود تم بہت تھکے ہوئے ہو لیکن تمھیں آج رات آرام نہیں ملے گا۔ تم پانچ سواروں کے ساتھ اسی وقت شیموگہ کی طرف روانہ ہو جاؤ اور وہاں قلعے کے محافظ کو موجودہ صورتِ حالات سے خبردار کرو۔ اسے میری طرف سے یہ پیغام دو کہ انگریز ملیبار اور بدنور کے کئی ساحلی مقامات پر فوجیں اتار چکے ہیں۔ ہم نے کنڈاپور اس وقت خالی کیا ہے جب کہ دشمن کی توپیں قلعے کو ملبے کا ڈھیر بنا چکی تھیں اور ان کی فوج کنڈاپور کے شمال اور جنوب میں کئی مقامات پر اتر چکی تھی اور ہمارے لیے رسد اور کمک کے تمام راستے بند ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ ہم قلعے کی توپیں نکال کر حیدر گڑھ اور بدنور لے جانا چاہتے تھے لیکن اب وہ شیموگہ بھیج

دی جائیں گی۔ اس وقت ہمارے ساحل کی کوئی چوکی محفوظ نہیں۔ ایاز خاں کی غداری کے بعد ہمارے لیے بدنور کو بچانا ممکن نہیں لیکن میں بدنور کی طرف پیش قدمی کرنے والی فوج پر عقب سے حملے کر کے اسے زیادہ سے زیادہ عرصہ کے لیے مصروف رکھنے کی کوشش کروں گا۔ میرے پاس اس وقت صرف ساڑھے تین سو سوار اور آٹھ سو پیادہ سپاہی ہیں۔ زخمیوں کو ایک دستے کی حفاظت میں شیموگہ روانہ کر دیا گیا ہے۔ ہمارے پاس بارود کی کمی ہے۔ اس لیے جب تک کمک نہیں پہنچتی ہم دشمن کے عقب پر اکا دکا حملوں پر اکتفا کرتے رہیں گے"۔

مسعود علی نے کہا۔ "آپ نے افتخار الدین کی ہمشیرہ کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "اب اننت پور بھی زیادہ محفوظ نہیں۔ اس لیے ہمیں شیموگہ کو ہی اپنا فوجی مستقر بنانا پڑے گا۔ زخمیوں اور پناہ گزینوں کا قافلہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا، میں رضیہ کو ان تک پہنچانے کا انتظام کر دیتا ہوں"۔ پھر وہ ایک افسر کی طرف متوجہ ہوا۔ "انھیں قافلے کے ساتھ شامل کرنا تمھارے ذمہ ہے۔ اپنے ساتھ چار سپاہی لے کر ابھی روانہ ہو جاؤ!"

رضیہ نے کہا۔ "میں یہیں رہ کر اباجان کا انتظار کروں گی"۔

صدیق علی نے جواب دیا۔ "ہم دو تین گھنٹے سے زیادہ یہاں نہیں ٹھہریں گے۔ میں نے کنڈاپور سے شمال کی طرف اترنے والی فوج کی نقل و حرکت معلوم کرنے کے لیے چند جاسوس بھیجے ہیں اور ان کی طرف سے اطلاع ملتے ہی ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے"۔

رضیہ نے کہا۔ "میں لڑائی میں آپ کی فوج کا ساتھ دے سکتی ہوں"۔

"نہیں! ابھی ہماری بہنوں کے لیے تلوار اٹھانے کا وقت نہیں آیا۔ ابھی ہماری رگوں میں خون کے چند قطرے باقی ہیں"۔

رضیہ نے کہا۔ "اگر آپ مجھے شیموگہ بھیجنا ضروری سمجھتے ہیں تو مجھے قافلے کے

ساتھ بھیجنا ضروری نہیں۔ میں آپ کے بھائی کے ساتھ سفر کر سکتی ہوں۔"

"آپ کو بہت تکلیف ہوگی، مسعود راستے میں ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں رکے گا لیکن اگر آپ مسعود کا ساتھ دے سکیں تو اس سے یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ آپ شموگا کے قلعہ دار کو کسی اور کی نسبت زیادہ متاثر کر سکیں گی۔"

رضیہ نے کہا۔ "مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اگر ابا جان آپ کے پاس پہنچیں تو انھیں میرے متعلق بتا دیجیے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "بہت اچھا ___ مسعود علی اب تم انھیں لے کر روانہ ہو جاؤ!"

مسعود علی کو روانہ کرنے کے دو گھنٹہ بعد صدیق علی کو جاسوسوں نے واپس آ کر اطلاع دی کہ انگریزی افواج جنرل میتھیوز کی قیادت میں حسن گدی کے درے کے قریب پہنچ کر پڑاؤ ڈال چکی ہیں۔ اس نے اپنی فوج کو کوچ کا حکم دیا۔

علی الصباح جب جنرل میتھیوز کی افواج درے کی ایک تنگ گھاٹی سے گزر رہی تھیں۔ میسور کے سپاہیوں نے آس پاس کی چوٹیوں سے اچانک نمودار ہو کر ان کے عقب کے دستوں پر فائرنگ شروع کر دی۔ انگریزی فوج نے پلٹ کر حملہ کرنے کی بجائے اپنی رفتار تیز کر دی۔ یہ درہ دفاعی لحاظ سے بہت مضبوط خیال کیا جاتا تھا۔ اور سات میل تک جگہ جگہ توپیں نصب تھیں۔ صدیق علی نے اس امید پر دشمن کا تعاقب جاری رکھا کہ شاید ایاز خاں کی غداری کے باوجود کسی چوکی کے سپاہی دشمن کا راستہ روکنے کی کوشش کریں لیکن اس کی یہ توقع عبث ثابت ہوئی۔ جنرل میتھیوز کے لیے راستہ کھلا تھا۔ وہ عقب سے بار بار حملہ کرنے والی فوج کے ساتھ الجھنا اپنے لیے نقصان دہ سمجھتا تھا۔

صدیق علی کے سپاہی قریباً ڈیڑھ سو انگریزوں کو ہلاک اور زخمی کرنے کے بعد ان کے بارود سے لدے ہوئے چند خچر چھین چکے تھے لیکن جنرل میتھیوز کو ان نقصانات

کی پروا نہ تھی۔ انگریزی فوج درے سے نکل کر حیدر گڑھ کے قلعے میں داخل ہوئی حیدر گڑھ کے قلعے کے سترہ سو محافظوں میں سے اکثر ایاز خاں کے حکم کے مطابق بڈنور پہنچ چکے تھے۔ باقی قلعے کے دروازے پر دشمن کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ یہ قلعہ ایک بلند مقام پر تھا اور اپنے محلِ وقوع کے باعث ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ اس میں پچیس توپیں نصب تھیں لیکن قلعہ دار نے انھیں صرف دشمن کو سلامی دینے کے لیے استعمال کیا۔ حیدر گڑھ سے آگے بڈنور کا راستہ انگریزوں کے لیے کھلا تھا اور صدیق علی کے تھکے ماندے سپاہیوں کے لیے ان کا تعاقب جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔

۲۸ر جنوری ۱۷۸۳ء کی شام بڈنور کے باشندے حسرت و یاس کے عالم میں قلعے کے دروازے پر میسور کی بجائے انگریزوں کا جھنڈا دیکھ رہے تھے اور ایاز خاں کمپنی کی فوج کے افسروں کو بڈنور کا سرکاری خزانہ تقسیم کرنے میں مصروف تھا۔



مسعود علی نے شموگا کے قلعے میں داخل ہوتے ہی کماندار سے ملاقات کی اور اس نے نئے حالات سے باخبر ہوتے ہی سلطان ٹیپو اور ملیبار کی فوجی چوکیوں کے محافظوں کو خبردار کرنے کے لیے اپنے ہرکارے روانہ کر دیئے۔ رضیہ کو اس نے اپنے مکان میں جگہ دی۔

دو دن بعد کنڈاپور کے زخمیوں اور پناہ گزینوں کا قافلہ شموگا پہنچ گیا اور اس کے ساتھ ہی قلعے کے محافظ کو یہ اطلاع ملی کہ بڈنور اور حیدر گڑھ پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ چوتھے روز سلطان کی فوج کا ایک افسر لطف علی چند دستوں کے ساتھ چیتل ڈرگ سے یلغار کرتا ہوا شموگا پہنچ گیا اور اس نے قلعے کے محافظ کو یہ خوشخبری سنائی کہ سلطان کا لشکر بہت جلد پہنچنے والا ہے۔

اگلے روز رضیہ قلعہ دار کے گھر میں عصر کی نماز پڑھ رہی تھی کہ اسے باہر "فو-

آرہی ہے، فوج آرہی ہے" کا شور سنائی دیا۔ وہ نماز ختم کرکے اٹھی اور قلعہ دار کی بیوی اور لڑکیوں کے ساتھ مکان کے دروازے میں کھڑی ہوکر وسیع احاطے کی طرف جھانکنے لگی۔

مسعود علی چند افسروں کے ساتھ صحن میں کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد صدیق علی گھوڑا دوڑاتا ہوا قلعے کے اندر داخل ہوا اور رضیہ اسے دیکھ کر اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگی۔ پھر چند ثانیے بعد سواروں کے دستے داخل ہو رہے تھے اور رضیہ کی نگاہیں ان میں اپنے باپ کو تلاش کر رہی تھیں۔ مسعود علی بھاگتا ہوا آگے بڑھا۔ صدیق علی نے اسے دیکھ کر اپنا گھوڑا روکا اور نیچے اتر کر اس کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ رضیہ اپنے باپ کے متعلق سننے کے لیے بے تاب تھی اور اسے اپنا سانس بھی بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ مسعود علی کے ساتھ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد صدیق علی نے قلعہ دار اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر ان کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوگیا۔

رضیہ کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ اچانک وہ مکان سے باہر نکل آئی اور تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی صدیق علی کی طرف بڑھی۔ مسعود علی نے صدیق علی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان! رضیہ آرہی ہے۔ وہ اپنے باپ کے متعلق بہت پریشان ہے۔"

صدیق علی نے مڑ کر رضیہ کی طرف دیکھا اور رضیہ کے پاؤں اچانک زمین سے پیوست ہوکر رہ گئے۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے صدیق علی کا مغموم چہرہ دیکھ رہی تھی۔ صدیق علی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے کہا۔ "رضیہ! مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں لایا۔"

"ابا جان کہاں ہیں؟" رضیہ نے ڈوبتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

صدیق علی نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں انھیں

اپنے ساتھ نہیں لا سکا۔ اب وہ ہم سے بہت دور جا چکے ہیں۔ میں نے ان کا پتہ کرنے کے لیے بدنور میں اپنا ایک جاسوس بھیجا تھا۔ تمہارے نوکروں نے اسے بتایا کہ انھوں نے اسی روز رات کے وقت بدنور سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن شہر سے تھوڑی دور ایاز خاں کے آدمیوں نے انھیں جا لیا۔ وہ رات کی تاریکی میں سڑک چھوڑ کر ایک طرف بھاگنے لگے لیکن وہ گھوڑے سمیت ایک گہرے کھڈ میں جا گرے۔ ایک نوکر آخری وقت تک ان کے ساتھ تھا اور میرا جاسوس اس سے مل کر ان کی موت کی تصدیق کر چکا ہے۔"

رضیہ ایک سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ مسعود علی اور قلعہ دار آگے بڑھے قلعہ دار نے کہا "بیٹی! مجھے تمہارے باپ کی موت کا افسوس ہے!"

رضیہ کوئی جواب دیئے بغیر مڑی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی مکان کی طرف چل دی۔



عشاء کی نماز کے بعد قلعہ دار مسجد سے نکل کر اپنے مکان کی طرف جا رہا تھا کہ صدیق علی نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ "میں ناصرالدین کی صاحبزادی سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"چلیے! میری بیوی کہتی تھی کہ اس نے اپنے باپ کی موت کی خبر سننے کے بعد سے کسی سے بات نہیں کی۔ اگر آپ اسے تسلی دے سکیں تو بہت اچھا ہوگا۔"

صدیق علی، قلعہ دار کے ساتھ مکان کے اندر داخل ہوا۔ قلعہ دار نے ایک کمرے کے دروازے پر رکتے ہوئے کہا۔ "وہ اس کمرے میں ہیں۔"

صدیق علی نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے؟" اندر سے آواز آئی۔

"میں صدیق علی ہوں۔"

کمرے میں پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور پھر نیم وا کواڑ کی اوٹ سے رضیہ کی آواز آئی "میرا خیال تھا کہ آپ کہیں جا چکے ہیں۔"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "میں اس قلعے میں پناہ لینے والے زخمیوں کی مزاج پرسی میں مصروف تھا لیکن اگر میں کہیں چلا گیا ہوتا تو بھی یہ کوئی غیر متوقع بات نہ ہوتی۔ جو حادثہ آپ پر گزرا ہے۔ مجھے اس کا پورا احساس ہے لیکن کاش تسلّی کے الفاظ آپ کے زخموں کا مداوا بن سکتے۔ میں آپ کو یہ بتلانے آیا ہوں کہ اب شموگا اور اس کے آس پاس کوئی شہر یا قلعہ محفوظ نہیں۔ ہمیں ابھی تھوڑی دیر پہلے بدنور اور حیدر گڑھ سے انگریزی افواج کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی ہے لیکن ابھی یہ معلوم نہیں ہوسکا ان کی منزلِ مقصود کدھر ہے۔ ممکن ہے کہ دو ایک روز تک مجھے کسی اہم محاذ پر جانا پڑے۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کو کسی محفوظ جگہ پہنچا دیا جائے۔ مجھے آپ کے نوکر نے بتایا ہے کہ بنگلور میں آپ کے کوئی عزیز رہتے ہیں۔"

بنگلور میں ہمارے رشتہ دار ہیں لیکن میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد آج تک انھیں نہیں دیکھا، میں ان کا سہارا تلاش کرنے کی بجائے اس قلعے میں جان دینا آسان سمجھتی ہوں۔"

صدیق علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "اگر آپ کو کسی اور جگہ جانا پسند نہیں تو سرنگا پٹم میں ہمارے گھر کا دروازہ آپ کے لیے ہر وقت کھلا ہے، آپ کو وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ میری امی جان آپ کی دلجوئی کر سکیں گی۔ اگر آپ کو وہاں جانے میں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں کل ہی آپ کے سفر کا بندوبست کر دوں گا۔ آپ کا نوکر اور چند سپاہی آپ کے ساتھ جائیں گے۔"

صدیق علی، رضیہ کی طرف سے کسی جواب کی بجائے دروازے کی اوٹ میں

اس کی سسکیاں سن رہا تھا اور یہ سسکیاں آہستہ آہستہ دبی دبی چیخوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔

قلعہ دار نے کہا۔ "بیٹی! میں صدیق علی کے ابا جان کو جانتا ہوں۔ سرنگا پٹم میں ان کے گھر سے بہتر تمھارے لیے کوئی اور جائے پناہ نہیں ہوسکتی۔ شموگا اب ہماری فوج کا مرکز بننے والا ہے۔ اس لیے میں بھی اپنے بچوں کو یہاں سے بھیج رہا ہوں۔"

قلعہ دار کا ایک نوکر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا ان کے قریب پہنچا اور بولا۔

"ایک افسر دروازے پر کھڑا ہے اور وہ آپ سے اسی وقت ملنا چاہتا ہے۔"

"اسے ملاقات کے کمرے میں بٹھاؤ، میں ابھی آتا ہوں۔"

نوکر چلا گیا تو قلعہ دار نے صدیق علی سے کہا۔ "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی اہم خبر سننے والے ہیں۔ آپ انھیں تسلّی دیں میں ابھی پتہ کرتا ہوں۔"

قلعہ دار ملاقات کے کمرے کی طرف چل دیا اور صدیق علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "رضیہ اگر آپ کو ہمارے گھر جانے میں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کل ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں۔"

رضیہ نے اپنی سسکیاں ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے میں یہ سوچ رہی تھی کہ اب اس دنیا میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں۔ آپ شاید بہت رحمدل ہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ میں پتھر نہیں ہوں۔"

رضیہ نے کہا۔ "کاش میں آپ کی فوج میں شامل ہو کر اپنے بھائی اور باپ کا انتقام لے سکتی۔"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "آپ کے بھائی اور ابا جان کا خون رائگاں نہیں جائے گا۔"

قلعہ دار کا نوکر بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا۔ "وہ آپ کو بلا رہے ہیں انگریزوں

کی پیش قدمی کے متعلق کوئی اہم خبر آئی ہے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "رضیہ! کاش میرے پاس باتوں کے لیے وقت ہوتا اگر مجھے اسی وقت کسی مہم پر جانا پڑا تو میری غیر حاضری میں قلعہ دار تمہارے سفر کا بندوبست کر دے گا۔" اس کے بعد اس نے نوکر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "چلو!"

رضیہ چند منٹ کواڑ سے لگی کھڑی رہی۔ پھر اپنے بستر کے قریب ایک مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ سرنگاپٹم میں صدیق علی کے والدین اور اس کے گھر کی مختلف خیالی تصویریں اس کے ذہن میں آ رہی تھیں۔ کبھی اسے یہ خیال آتا کہ جب جنگ کے بعد سپاہی اپنے گھروں کو لوٹیں گے تو وہ صدیق علی اور مسعود کی ماں کے ساتھ بالکنی میں کھڑی ان کی راہ دیکھ رہی ہو گی اور اس کی نگاہوں کے سامنے امیدوں کے چراغ روشن ہو جاتے ـــ اور کبھی وہ سوچتی کہ میدانِ جنگ سے کوئی ایلچی ایک عمر رسیدہ ماں کو آکر یہ پیغام دے گا کہ تمہارے جواں سال بیٹے لڑائی میں کام آ چکے ہیں اور اس کی نگاہوں کے سامنے بھیانک تاریکیاں چھا جاتیں۔ جہاز پر صدیق علی کے ساتھ ابتدائی ملاقات کو وہ ایک اتفاقی حادثہ سمجھتی تھی لیکن کنڈاپور سے رخصت ہوتے وقت اسے افسوس تھا کہ ان کے راستے ایک دوسرے سے اتنی جلدی جدا ہو گئے ہیں تاہم یہ احساس اتنا شدید نہ تھا کہ وہ مڑ کر پیچھے دیکھتی لیکن اب دنیا بدل چکی تھی اور صدیق علی اس کے لیے زندگی کا آخری سہارا بن چکا تھا۔ اپنے بھائی اور اپنے باپ کی موت کے بعد وہ بار بار یہ سوچ رہی تھی کہ اگر صدیق علی نہ ہوتا تو یہ دنیا میرے لیے کتنی تاریک ہوتی!

وہ دیر تک اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق سوچتی رہی۔ قریباً ایک گھنٹہ بعد اسے قلعے کے صحن میں گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور اس کا دل بیٹھنے لگا۔ "صدیق علی کہیں جا رہا ہے ـــ صدیق علی کسی خطرناک مہم پر جا رہا ہے، شاید وہ واپس نہ آئے" "نہیں! نہیں! صدیق علی تم مت جاؤ، اب دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ میں

اکیلی ہوں۔ میں اب افتخار الدین کی بہن اور ناصر الدین کی بیٹی نہیں ہوں۔ اب میرے لیے بدنور کے گو محل نہیں ہے۔ میں ایک بے بس لڑکی ہوں۔" صدیق علی مجھے اپنے ساتھ ہی لے چلو۔ میں گولیوں کی بارش میں تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں۔"

رضیہ کے دل و دماغ میں ایک ہیجان برپا تھا۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکلی تو اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ قلعے کے صحن میں داخل ہوئی۔ صدر دروازے پر سپاہیوں کی آوازیں اور قلعے سے باہر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دے رہی تھی ـــ رضیہ کی حالت اس مسافر کی تھی جس کا قافلہ اسے صحرا میں تنہا چھوڑ کر آگے جا چکا ہو۔ وہ دیر تک بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹا اور دم بھر کے لیے تاریک فضا میں نور کے خزانے بکھیر کر روپوش ہو گیا۔ اچانک اسے کسی کی آواز سنائی دی۔

"کون ہے؟"

رضیہ نے قلعہ دار کی آواز پہچانتے ہوئے جواب دیا۔ "میں ـــ میں رضیہ ہوں۔ صدیق علی کہاں ہیں؟"

"وہ ایک مہم پر جا چکے ہیں لیکن آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔ چلیے اندر، وہ مجھے آپ کے متعلق تاکید کر گئے ہیں۔ آپ کے سفر کا بندوبست ہو جائے گا۔ اب آپ کو آرام کرنا چاہیے۔"

"وہ کہاں گئے ہیں؟"

"وہ اننت پور گئے ہیں۔ ابھی اننت پور کی فوج کا ایک افسر یہاں پہنچا تھا اور اس نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ انگریزوں کی فوج اننت پور کا رخ کر رہی ہے اور بدنور کا گورنر وہاں کے سپاہیوں کو یہ ہدایت بھیج چکا ہے کہ قلعہ کسی مزاحمت کے بغیر انگریزوں کے حوالہ کر دیا جائے۔ صدیق علی تین سو سواروں کے ساتھ روانہ ہو چکا ہے اگر وہ وقت پر پہنچ گیا تو مجھے یقین ہے کہ اننت پور کا قلعہ بچا سکے گا۔"

"ان کا بھائی کہاں ہے؟"

"وہ بھی فوج کے ساتھ جا چکا ہے لیکن وہ آپ کو سرنگا پٹم پہنچانے کے لیے تین سپاہی چھوڑ گئے ہیں۔ صدیق علی نے اپنے والد کے نام ایک مختصر سا خط لکھ کر آپ کے ذکر کو دیا تھا۔"

رضیہ نے کہا "اگر آپ مجھے ضرور بھیجنا چاہتے ہیں تو میں اسی وقت یہاں سے روانہ ہونا چاہتی ہوں۔"

"یہ وقت موزوں نہیں۔ آپ رات آرام کریں۔ صبح دیکھا جائے گا۔"

رضیہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "اننت پور میں ان کی مہم زیادہ خطرناک تو نہیں؟"

"اننت پور کا قلعہ ہمارا مضبوط ترین قلعہ ہے۔ وہاں ساٹھ بڑی توپیں نصب ہیں۔ اگر صدیق علی کے پہنچنے سے پہلے غداروں نے اسے دشمن کے حوالے نہ کر دیا تو ہم انگریزوں سے بڈنور اور حیدر گڑھ کی شکست کا بدلہ لے سکیں گے۔"

رضیہ نے کہا: "میں پچھلے پہر یہاں سے روانہ ہو جاؤں گی اور اس وقت آپ کو جگانا مناسب نہ ہوگا۔ اس لیے آپ سونے سے پہلے میرے ساتھ جانے والے سپاہیوں کو ہدایت کر دیں کہ وہ پچھلے پہر تیار رہیں!"

"بہت اچھا! لیکن اگر آپ ایک دن اور ٹھہر سکیں تو ممکن ہے پرسوں تک میں آپ کے ساتھ ہی اپنے بال بچوں کو بھی روانہ کر دوں۔"

"نہیں! میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔" رضیہ یہ کہہ کر واپس مڑی، قلعہ دار کے مکان کے سامنے اسے اپنا نوکر دکھائی دیا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر بولا۔ "میں آپ کو تلاش کر رہا تھا۔ صدیق علی خاں کہیں چلے گئے ہیں وہ تاکید کرتے تھے کہ ہم یہاں سے فوراً سرنگا پٹم روانہ ہو جائیں۔ انہوں نے اپنے والد کے نام مجھے یہ خط

لکھ کر دیا تھا۔ لیجیے!"

رضیہ نے کاغذ کا پرزہ اپنے نوکر کے ہاتھ سے لے لیا اور کہا۔ "میں ابھی قلعہ دار سے مل چکی ہوں۔ تم جا کر تیاری کرو ہم پچھلے پہر یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد رضیہ اپنے کمرے کے اندر چراغ کی روشنی میں صدیق علی کا مختصر سا خط پڑھ رہی تھی:۔

"اباجان اور امی جان! میں ایک بے سہارا لڑکی کو آپ
کے پاس بھیج رہا ہوں۔ میرے پاس تفصیلات بیان کرنے کا
وقت نہیں — رضیہ کو آپ کی محبت، شفقت اور نیک دعاؤں
کی ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ اسے مایوس نہیں کریں گے۔
آپ کا بیٹا
صدیق علی"

صدیق علی اننت پور کے قلعے کے دروازے کے برج پر کھڑا مغرب کی سمت انگریز سواروں کی فوج دیکھ رہا تھا۔ ان کے ہراول دستے معمولی رفتار سے قلعے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سب سے آگے ایک سوار سفید جھنڈا بلند کیے ہوئے تھا۔

تھوڑی دیر بعد یہ سوار قلعے کی توپوں اور بندوقوں کی زد میں آ چکے تھے۔ صدیق علی کے اشارے پر چند سپاہیوں نے ہوائی فائر کیے۔ اس کے بعد ایک توپ چلائی گئی اور انگریزی فوج جو اطمینان سے آگے بڑھ رہی تھی، رک گئی۔ چند منٹ بعد انگریزی فوج کے چند سوار جن میں سے ایک کے ہاتھ میں سفید جھنڈا تھا، گھوڑے دوڑاتے ہوئے قلعے کے دروازے کے قریب پہنچے اور ان میں سے ایک نے جو فوج کا کوئی بڑا افسر معلوم ہوتا تھا۔ بلند آواز میں کہا۔ "سفید جھنڈے پر گولی چلانا جنگ کے اصولوں کے خلاف ہے۔ تمہارا کماندار ہمارے ساتھ وعدہ کر چکا ہے کہ وہ قلعہ ہمارے

حوالہ کردے گا۔ اگر کماندار کی نیت بدل گئی ہے تو یہ اس معاہدے کی خلاف ورزی ہو گی جو بڈنور کے گورنر نے ہمارے ساتھ کیا ہے۔"

صدیق علی نے جواب دیا "بڈنور کا گورنر حکومتِ میسور کا غدار ہے اور اس کماندار کو پھانسی دی جا چکی ہے جس نے ایک غدار کے حکم کی تعمیل کا ارادہ کیا تھا۔ ہم نے تمھارے سفید جھنڈے پر گولی نہیں چلائی بلکہ تمھیں خبردار کیا تھا کہ تم اس امید پر قلعے کی توپوں کی زد میں آنے کی کوشش نہ کرو کہ یہاں سب غدار بستے ہیں"۔

انگریز افسر نے کہا۔ "ایاز خاں نے بڈنور کے گورنر کی حیثیت سے اس کے قلعے کے متعلق ہمارے ساتھ معاہدہ کیا ہے اور میسور کی حکومت اپنے ایک بااختیار گورنر کی طرف سے کیے گئے معاہدوں کی پابند ہے۔"

"بڈنور کے گورنر کی سرکاری حیثیت اس دن ختم ہو گئی تھی۔ جب اس نے تمھارے ساتھ بڈنور اور حیدر گڑھ کا سودا کیا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک غدار ہے۔"

"ہم تمھیں خبردار کرتے ہیں کہ تم غلطی کر رہے ہو۔ تم چند گھنٹوں سے زیادہ ہمارے لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم تمھیں پندرہ منٹ سوچنے کے لیے مہلت دیتے ہیں۔ اس کے بعد اگر تم نے مزاحمت کی تو ہم بدعہدی کے جرم میں اس قلعے کے کسی سپاہی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

صدیق نے جواب دیا "اگر تم دو منٹ کے اندر اندر واپس نہ چلے گئے تو میں سپاہیوں کو گولی چلانے کا حکم دے دوں گا۔"

انگریز سپاہیوں نے چند ثانیے آپس میں کچھ باتیں کیں اور اس کے بعد اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑ لیں۔

اچانک صدیق علی کو دائیں طرف حدِ نگاہ پر چند سوار دکھائی دیئے۔ اس نے ایک افسر کے ہاتھ سے دوربین لی اور افق کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ ہمارے آدمی معلوم ہوتے ہیں" اس نے بلند آواز میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد اسے پانچ سوار اچھی طرح دکھائی دینے لگے اور پھر اچانک وہ اپنے دل میں ناخوشگوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگا۔ چند ثانیے غور سے دیکھنے کے بعد اس نے دوربین نیچے کرتے ہوئے اپنے بھائی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "مسعود! رضیہ نے میرا کہا نہیں مانا۔ نیچے جا کر پہرداروں سے کہو کہ وہ انھیں اندر آنے دیں۔ انگریز محاصرے کے لیے اپنی صفیں درست کر رہے ہیں اور ابھی شاید ان کی توجہ اس طرف مبذول نہیں ہوئی لیکن ممکن ہے کہ وہ انھیں قلعے میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کریں!"

مسعود علی جلدی سے نیچے اتر گیا اور صدیق علی اضطراب کی حالت میں کبھی اپنے بائیں ہاتھ انگریزوں کی فوج کی طرف دیکھ رہا تھا اور کبھی دائیں جانب قلعے کی سمت آنے والے پانچ سواروں کی طرف۔ اب وہ دوربین کے بغیر بھی رضیہ اور اس کے ساتھیوں کو پہچان سکتا تھا۔ اچانک انگریزوں کی فوج کے چند سوار گھوڑے بھگاتے ہوئے آگے بڑھے اور انھوں نے رضیہ اور اس کے ساتھیوں کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی لیکن فصیل پر سے گولیوں کی بارش کے باعث انھیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ انگریز سپاہیوں نے جواب میں گولیاں برسائیں لیکن اتنی دیر میں رضیہ اور اس کے ساتھی قلعے کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ صدیق علی بھاگتا ہوا صحن میں پہنچا۔ اسے اپنے جذبات کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ رضیہ کا چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ چند ثانیے اسے اس بات کا احساس نہ ہوا کہ وہ اجنبی لوگوں کے درمیان کھڑی ہے۔ پھر اس نے صدیق علی کی طرف دیکھا اور جلدی سے گردن نیچی کر کے اپنا نقاب درست کرنے لگی۔ مسعود علی نے اسے گھوڑے سے اترنے کے لیے سہارا دیا اور صدیق علی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "رضیہ تم نے بہت برا کیا۔ اس قلعے میں چار سو عورتیں اور بچے پہلے ہی پناہ لے چکے ہیں اور خدا معلوم اس کی دیواریں کب تک دشمن کی گولہ باری کے سامنے ٹھہر سکیں۔"

رضیہ نے جواب دیا۔ "میں اس قلعے میں پناہ لینے نہیں آئی۔ آپ میرا نام اپنے سپاہیوں میں شمار کر سکتے ہیں۔"

صدیق علی نے کہا۔ "اگر آپ عورتوں اور بچوں کی خبر گیری کر سکیں تو میں اسے غنیمت سمجھوں گا۔ مسعود! انہیں خواتین کے پاس پہنچا دو!"

"چلیے!" مسعود علی نے کہا اور رضیہ کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ قلعے کے اس حصے کی طرف چل پڑی جہاں عورتیں اور بچے ٹھہرے ہوئے تھے۔

صدیق علی نے اپنے افسروں اور سپاہیوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میرے دوستو! ہمارے عزم اور استقلال کے امتحان کا وقت آ پہنچا ہے۔ میں یہ ہدایت لے کر آیا ہوں کہ جب تک ہمارا لشکر یہاں نہیں پہنچتا اس قلعے کی ہر قیمت پر حفاظت کی جائے۔ اگر یہ قلعہ دشمن کے قبضے میں چلا گیا تو یہ تمام علاقہ خطرے میں پڑ جائے گا۔ انگریز کو فتوحات کا شوق ہزاروں میل دور سے یہاں تک لے آیا ہے۔ اس نے سات سمندر پار اپنی قوم کی سطوت کے پرچم لہرانے کے لیے ہمارے ساتھ جنگ مول لی ہے اور اس جنگ میں فتح یا شکست اس کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں لیکن ہم اپنی عزت، اپنی آزادی اور اپنی بقا کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ہمیں زندہ رہنے کے لیے اپنے دشمنوں کے سامنے یہ ثابت کرنا ہے کہ تم جس جنگل میں شکار کھیلنے آئے ہو، وہاں بھیڑ بکریوں کے ریوڑ نہیں، شیر بستے ہیں۔ ایک سپاہی کی زندگی میں ایسا وقت آتا ہے جب اسے فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر اپنی جان کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ میں تمہیں یہ نہیں بتا سکتا کہ انت پور میں ہماری جنگ کا نتیجہ کیا ہو گا۔ ممکن ہے ہمیں بر وقت کمک پہنچ جائے اور ہم دشمن کو دھکیل کر سمندر کی طرف لے جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم وطن کی آزادی کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ دونوں صورتوں میں ہماری آئندہ نسلیں ہمارے متعلق یہ نہیں کہہ سکیں گی کہ ہم نے ذلت کا راستہ اختیار کیا تھا۔ میں تمہیں

اس بات کا یقین دلا سکتا ہوں کہ اس قلعے کے ہر سپاہی کی قربانی قوم کے ہزاروں افراد کو تباہی اور بربادی سے بچا سکے گی۔ ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ دشمن ہماری لاشیں روندے بغیر انت پور سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

○

ایک گھنٹہ بعد لڑائی شروع ہو چکی تھی اور انگریزوں کی توپیں چاروں طرف سے قلعے پر گولہ باری کر رہی تھیں۔ قلعے میں بارود کے ذخیرے کا اندازہ لگانے کے بعد صدیق علی سپاہیوں کو یہ ہدایت دے چکا تھا کہ وہ اشد ضرورت کے بغیر فائر نہ کریں۔ تیسرے پہر انگریزوں نے چاروں طرف سے قلعے پر دھاوا بولنے کی کوشش کی لیکن قلعے کی توپوں نے پہلی بار پوری شدت سے گولہ باری کی اور حملہ آوروں کو شدید نقصان اٹھانے کے بعد پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس کے بعد دشمن صرف اپنے توپخانے سے گولے برسانے پر اکتفا کرتا رہا۔ غروب آفتاب کے وقت صدیق علی اپنی آنکھوں سے دوربین لگائے قلعے کے ایک برج پر کھڑا تھا۔ قلعے کے گرد دشمن کی تعداد پہلے سے زیادہ ہو چکی تھی اور وہ چاروں طرف چھوٹی توپوں کی جگہ بھاری توپیں نصب کر رہے تھے۔ مغرب کی اذان سن کر صدیق علی فصیل سے نیچے اترا اور نمازیوں کی صف میں کھڑا ہو گیا۔ اچانک باہر سے توپ کا ایک گولہ فصیل کے ایک برج پر لگا اور اس کے ریزے اڑ کر صحن میں آ گرے۔ پھر پوری شدت کے ساتھ چاروں طرف سے گولہ باری ہونے لگی۔ نماز ختم کرنے کے بعد سپاہی اور افسر اپنے اپنے مورچوں میں کھڑے ہو گئے۔

یہ رات قیامت کی رات تھی۔ دشمن کا توپخانہ اندھا دھند آگ برسا رہا تھا۔ قلعے کے کئی برج ٹوٹ چکے تھے۔ چھتوں اور فصیلوں میں جگہ جگہ شگاف پڑ چکے تھے۔ کئی سپاہی زخمی اور شہید ہو چکے تھے۔ پچھلے پہر صدیق علی فصیل کا چکر لگانے کے بعد نیچے اترا اور ایک سپاہی کے ہاتھ سے مشعل لے کر قلعے کے اندر گشت کرنے لگا۔ جگہ جگہ

اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھنے کے بعد وہ ایک وسیع کمرے میں داخل ہوا جہاں چند عورتیں زخمیوں کی تیمار داری کر رہی تھیں۔ کمرے کے ایک سرے پر ایک سپاہی جس کی قمیص خون سے تر تھی، درد سے کراہ رہا تھا اور رضیہ اس کے سر پر پٹی باندھ رہی تھی۔ صدیق علی اس کے قریب پہنچ کر رکا۔ رضیہ نے اس کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ صدیق علی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ وہ واپس مڑا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ فصیل پر پہنچا اور چاروں طرف چکر لگانے اور سپاہیوں کو ہدایات دینے کے بعد دروازے کے قریب ایک برج کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ رات کی تاریکی میں قلعے کے چاروں طرف توپوں کے دہانوں سے آگ کے شعلے اژدہوں کی پھنکار سے زیادہ مہیب معلوم ہوتے تھے۔ اچانک اسے اپنے قریب کسی کی دبی دبی سسکیاں سنائی دیں۔

"کون ہے؟" اس نے چونک کر سوال کیا۔

"میں ہوں رضیہ" کسی نے گھٹی ہوئی نسوانی میں جواب دیا۔

"آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

"کچھ نہیں!" اس نے جواب دیا۔ "آپ مجھ سے خفا ہیں؟"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "میں تم سے خفا نہیں ہوں رضیہ! لیکن تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"لیکن یہاں سینکڑوں عورتیں موجود ہیں۔ میرے آنے سے کیا فرق پڑ گیا ہے؟"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "یہ عورتیں اننت پور کی طرف دشمن کی اچانک پیشقدمی کے باعث مجبوری کی حالت میں یہاں جمع ہو گئی ہیں لیکن تمہارے لیے ایسی کوئی مجبوری نہ تھی۔ میں نے تمہیں اپنے گھر پہنچانے کا انتظام کر دیا تھا۔"

رضیہ نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "یہاں آ کر مجھے موت کا ڈر نہیں میرے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہے کہ آپ مجھ سے خفا ہوں۔"

"میں تم سے خفا نہیں رضیہ! لیکن کاش میں تمہیں یہ سمجھا سکتا کہ ہم یہاں زندگی کی بجائے موت سے زیادہ قریب ہیں۔ دشمن اپنی پوری قوت یہاں جمع کر رہا ہے خدا معلوم کل تک وہ کتنی اور بڑی توپیں اس قلعے کے سامنے نصب کر دے گا۔ ہمارا بارود کا ذخیرہ اب زیادہ سے زیادہ ایک دن اور چلے گا۔ میرے سپاہیوں کے حوصلے بلند ہیں لیکن عورتوں اور بچوں کا مسئلہ ہمارے لیے بہت پریشان کن ہے۔ کاش تم میرا کہا مانتیں!"

رضیہ نے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں کہ میں یہاں کیوں آ گئی ہوں۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ ہماری منزل ایک ہے اور ہمارے راستے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔"

صدیق علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "رضیہ تم صرف اس لیے یہاں آئی ہو کہ میں یہاں تھا؟"

صدیق علی کو جواب میں الفاظ کی بجائے سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ اس نے کہا۔ "رضیہ سچ کہو تمہارے دل میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ میں شاید اننت پور سے واپس آ کر تمہیں نہ دیکھوں؟"

رضیہ کی سسکیاں اچانک بند ہو گئیں اور اس نے چند ثانیے توقف کے بعد جواب دیا۔ "مجھے صرف اس بات کا احساس تھا کہ آپ کسی خطرناک مہم پر روانہ ہو چکے ہیں اور میں خطرے کے وقت آپ سے دور رہنا نہیں چاہتی تھی۔ آپ میری حفاظت کے خیال سے مجھے سرنگا پٹم بھیجنا چاہتے تھے لیکن آپ کے بغیر میرے لیے زندگی کے کوئی معنی نہ تھے۔"

اچانک ایک خوفناک دھماکا سنائی دیا اور اس کے بعد بُرج کے ایک ستون اور چھت کی کچھ اینٹیں نیچے گر پڑیں۔ پھر بیک وقت ایک کی زبان سے "رضیہ" اور دوسرے کی زبان سے "صدیق علی" کے الفاظ نکلے اور وہ اضطراب کی حالت میں ایک دوسرے کی گرفت میں آچکے تھے۔

"رضیہ تم ٹھیک ہو نا؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں آپ کے متعلق ڈر گئی تھی۔ آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟"

صدیق علی نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔ "رضیہ تم نیچے چلی جاؤ!"

"بھائی جان! بھائی جان!" چند قدم کے فاصلے سے مسعود علی کی آوازیں سنائی دیں۔

"کیا ہے مسعود؟"

مسعود تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور بولا: "بھائی جان یہ برج گر رہا ہے آپ ایک طرف ہٹ جائیں۔"

"بہت اچھا! تم رضیہ کو نیچے لے جاؤ!"

مسعود نے رضیہ کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے کہا: "آپ یہاں کیا کر رہی ہیں، چلیے!"

رضیہ کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ فصیل سے نیچے اتر آئی۔

صدیق علی آہستہ آہستہ فصیل پر چلتا ہوا آگے بڑھا۔ سپاہی اپنی اپنی جگہ پر کھڑے تھے اور صدیق علی کو ان کا سکوت چیخوں سے زیادہ اضطراب انگیز محسوس ہوتا تھا۔ دشمن کی گولہ باری ہر لحظہ شدت اختیار کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ فصیل کے دوسرے حصے پر ایک افسر سے باتیں کر رہا تھا کہ

اچانک نیچے صحن سے کسی نے بلند آواز میں کہا۔ "کمانڈر صاحب! کمانڈر صاحب!!"

صدیق علی نے آگے بڑھ کر جواب دیا: "میں یہاں ہوں! کیا بات ہے؟"

"مسعود علی خاں زخمی ہو گئے ہیں۔ آپ نیچے آئیں۔"

صدیق علی کا دل بیٹھ گیا۔ وہ جلدی سے نیچے اترا اور سپاہی کے ساتھ بھاگتا ہوا ایک کمرے میں داخل ہوا۔ مسعود علی جانکنی کے عالم میں فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا۔ چند سپاہی اس کے گرد کھڑے تھے اور رضیہ ایک سکتے کے عالم میں اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔

"مسعود! مسعود!!" صدیق علی نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ مسعود علی کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر چند ثانیے بعد اس نے آنکھیں بند کر کے گردن ڈھیلی چھوڑ دی۔ رضیہ کی پتھرائی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب پھوٹ نکلا۔

ایک افسر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے صدیق علی کے قریب آکر کہا۔ "جناب اب صبح ہو رہی ہے اور دشمن کی نقل و حرکت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قلعے پر دھاوا بولنے کا ارادہ کر رہا ہے۔"

دن کے آٹھ بجے تک قلعے کی فصیل جگہ جگہ ٹوٹ چکی تھی۔ اندر کئی مکان ملبے کے ڈھیر بن چکے تھے۔ لڑنے والے سپاہیوں کی نسبت زخمی اور شہید ہونے والے مجاہدوں کی تعداد زیادہ تھی۔ سپاہیوں کے علاوہ کئی عورتیں اور بچے گرتی ہوئی چھتوں کے ملبے کے نیچے دب کر ہلاک ہو چکے تھے۔ دوپہر کے وقت دشمن نے ایک بار پھر قلعے پر یورش کرنے کی کوشش کی لیکن قلعے کے محافظوں نے توپوں اور بندوقوں کی شدید فائرنگ سے انھیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ قلعے کے محافظوں کی یہ کامیابی بجھتے ہوئے چراغ کی آخری

تو تھی۔ ان کا بارود ختم ہو چکا تھا اور صدیق علی انھیں یہ حکم دے چکا تھا کہ اب توپوں سے کام نہ لیا جائے۔ اب اگر دشمن نے دوبارہ حملہ کیا تو بندوقیں، نیزے اور تلواریں ہمارا آخری سہارا ہوں گی۔

تیسرے پہر دشمن کی پیادہ فوج اپنے توپخانوں کی گولہ باری کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے سرک کر نئے مورچے تیار کر رہی تھی۔ صدیق علی فصیل کے ایک مورچے میں بیٹھا دشمن پر گولیاں برسا رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ فائر کرنے کے بعد اپنی بندوق بھرنے لگا تو کسی نے اسے اپنی بندوق پیش کرتے ہوئے کہا "یہ لیجیے! یہ بھری ہوئی ہے۔ خالی بندوق مجھے دے دیجیے! میں بارود اور گولی ڈالنا جانتی ہوں۔"

یہ رضیہ تھی۔ صدیق علی نے کچھ کہے بغیر اس کے ہاتھ سے بندوق لے لی اور وہ اس کے قریب بیٹھ کر خالی بندوق بھرنے لگی۔ صدیق علی نے نشانہ باندھتے ہوئے کہا۔ "رضیہ! ہماری منزل شاید اب بہت قریب آ چکی ہے۔ ہزاروں باتیں ایسی ہیں جو میں تم سے کہنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تمھارے پاس بیٹھ کر مسعود کے متعلق باتیں کروں اور تمھیں یہ بتاؤں کہ اس کا بچپن اور جوانی کیسی تھی۔ وہ مجھے کس قدر عزیز تھا۔ اس کی شہادت سے تھوڑی دیر قبل میں یہ تصور کر رہا تھا کہ ہم سرنگا پٹم پہنچ چکے ہیں — ہم دریائے کاویری کے کنارے سیر کر رہے ہیں — میں اپنے ابا جان اور امی جان کو تمھارے متعلق بتا رہا ہوں اور میرے چھوٹے بھائی تمھیں حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔"

رضیہ بولی۔ "اور میں شاید اس وقت آپ کے ساتھ کسی جہاز پر سفر کر رہی تھی — ہم کسی ایسے جزیرے کی طرف جا رہے تھے جہاں انسانیت جنگوں کے آلام و مصائب سے آزاد ہے۔ جہاں ملت فروش اپنے وطن کی آزادی اپنی قوم کے دشمنوں کے ہاتھوں فروخت نہیں کرتے۔"

صدیق علی نے فائر کرنے کے بعد رضیہ کے ہاتھ سے بھری ہوئی بندوق لیتے ہوئے

کہا۔ "رضیہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میں ایک کامیاب جہاز راں بنوں اور منگلور سے روانہ ہوتے وقت یہ بات میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھی کہ مجھے اچانک بری فوج کا ایک افسر بنا دیا جائے گا۔ جب تم جہاز پر سوار ہوئی تھیں تو اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ قدرت نے ہمیں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سنانے کے لیے اننت پور کا قلعہ منتخب کیا ہے۔"

رضیہ نے کہا۔ "میں آپ سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں اور وہ یہ کہ آپ کسی مرحلہ پر مجھے اپنی نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کا حکم نہیں دیں گے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "اگر چند گھنٹوں تک ہمیں کوئی کمک نہ پہنچی تو بچوں اور عورتوں کی خاطر ہم ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اگر دشمن انھیں یہاں سے نکلنے کا موقع دینے پر رضامند ہو گیا تو میں اپنے بچے کھچے ساتھیوں کے ساتھ ان کی قید میں جانا قبول کروں گا، اگرچہ ان کی قید ہمارے لیے موت سے بدتر ہو گی۔ بہر حال ان حالات میں اس قلعے کے کماندار کی حیثیت میں میرا جو حکم باقی عورتوں اور بچوں کے لیے ہو گا وہی تمھارے لیے ہو گا۔"

رضیہ نے پرامید ہو کر کہا۔ "ایسا وقت آنے پر میں آپ کے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں کروں گی اور مجھے یقین ہے کہ میری زندگی میں ایسا وقت نہیں آئے گا۔"

شام کے وقت قلعے کے باقی افسر صدیق علی سے یہ کہہ رہے تھے کہ ہمارا بارود اب بالکل ختم ہو چکا ہے۔ اگر تھوڑی دیر تک کوئی کمک نہ آئی تو ممکن ہے کہ رات کے وقت دشمن کسی مزاحمت کے بغیر قلعے میں داخل ہو جائے۔"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "اب ہمارا مقصد لڑائی میں دشمن کو زیادہ سے زیادہ دیر یہاں مصروف رکھنا ہے۔ ہمیں یہ رات گزارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

رات کے وقت قلعے کی توپوں کو خاموش دیکھ کر انگریز اپنی توپیں اور قریب

لا چکے تھے اور ان کی گولہ باری کے اثرات پہلے سے کہیں زیادہ تباہ کن تھے۔ جس مورچے میں صدیق علی بیٹھا ہوا تھا اس کے اردگرد فصیل کا کچھ حصہ منہدم ہو چکا تھا۔ اس نے رضیہ کو بڑے اصرار کے بعد نیچے جانے پر رضا مند کیا۔ وہ عورتوں کے ایک کمرے میں جا کر لیٹ گئی اور تھوڑی دیر بعد اس پر نیند کا غلبہ طاری ہو گیا۔

رات بھر کی گولہ باری کے بعد صبح کی روشنی میں اننت پور کا قلعہ ویرانی اور بربادی کا ایک دلخراش منظر پیش کر رہا تھا۔ قلعے کے محافظ اپنی آخری گولی چلا چکے تھے۔ صدیق علی نے حسرت و یاس کے عالم میں چاروں طرف دیکھا اور ایک سپاہی کو فصیل سے سفید جھنڈا لہرانے کا حکم دیا۔ دشمن کی توپیں اچانک خاموش ہو گئیں۔ صدیق علی گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا اور قلعے سے کوئی پچاس گز دور جا کر رک گیا۔ دشمن کی صفوں سے سواروں کا ایک دستہ نکلا اور آن کی آن میں صدیق علی کے قریب آ رکا۔ صدیق علی نے کہا: "میں آپ کے کماندار کے پاس یہ پیش کش لے کر آیا ہوں کہ اگر آپ اس قلعے میں پناہ لینے والی عورتوں اور بچوں کو نکل جانے کا موقع دیں تو ہم یہ قلعہ آپ کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

ایک انگریز افسر نے جواب دیا۔ "تمھیں یہ درخواست لے کر کماندار کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے کماندار ان لوگوں سے بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے جنھوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہمارے صلح کے جھنڈے پر فائرنگ کی تھی۔ اگر تم غیر مشروط پر ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہو تو گولہ باری پھر دوبارہ شروع کر دی جائے گی اور قلعے پر قبضہ کرنے کے بعد ہم تمھیں بدترین سلوک کا مستحق سمجھیں گے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "جس شخص نے اس قلعے کے متعلق آپ کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا تھا۔ وہ میسور کا غدار تھا۔"

افسر نے کہا۔ "ہم تمھارے ساتھ بحث میں الجھنا پسند نہیں کرتے۔ تم واپس جا سکتے ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم تمھاری مزاحمت کے باوجود ایک گھنٹے کے اندر اندر اس قلعے پر قبضہ کر لیں گے۔"

صدیق علی نے مایوس ہو کر کہا۔ "میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر ہم غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیں تو آپ عورتوں اور بچوں کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

افسر نے جواب دیا۔ "تمھارے ہتھیار نہ ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں معلوم ہے کہ تمھارا بارود ختم ہو چکا ہے اور تم نے اس وقت صلح کا جھنڈا بلند کیا ہے جب تمھارے لیے کوئی اور راستہ باقی نہیں رہا۔ تم ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔ تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ تم غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دو۔ عورتوں اور بچوں کے ساتھ زیادتی کرنا ہماری شان کے شایان نہیں لیکن ہم ان کے متعلق تمھارے ساتھ کوئی بات کرنے پر آمادہ نہیں تم جا سکتے ہو۔"

صدیق علی نے مڑ کر قلعے کی طرف دیکھا اور کچھ کہے بغیر اپنی کمر سے تلوار اتار کر انگریز افسر کو پیش کر دی۔

تھوڑی دیر بعد انگریزی فوج فتح کے نقارے بجاتی قلعے کے اندر داخل ہوئی انگریز کمانڈنٹ کے حکم سے قلعے کے محافظوں کو جن میں سے بیشتر زخمی تھے، غیر مسلح کر کے ایک طرف کھڑا کر دیا گیا۔ چند سپاہی ان کے سامنے بندوقیں تان کر کھڑے ہو گئے اور باقی بھوکے بھیڑیوں کی طرح عورتوں پر ٹوٹ پڑے۔ کوئی کسی کا زیور اتار رہا تھا اور کوئی کسی کا لباس نوچ رہا تھا۔ عورتوں اور بچوں کی چیخوں کیساتھ انگریزوں کے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔

صدیق علی یہ جگر خراش منظر برداشت نہ کر سکا۔ وہ جھپٹ کر آگے بڑھا اور اپنے راستے کے ایک سپاہی کو دھکا دے کر گرانے کے بعد آنکھ جھپکنے کی دیر میں ایک انگریز افسر پر پل پڑا جو ایک نوجوان لڑکی کو بالوں کو سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہا تھا اس نے ایک ہی

مکے سے اسے نیچے گرا دیا اور پھر دونوں ہاتھوں سے اسے گلا دبوچ لیا۔ سپاہیوں نے بندوقوں کے کندے مار مار کر اسے علٰحدہ کیا اور اس کے ہاتھ ایک رسّی سے جکڑ دیئے۔ اتنی دیر میں صدیق علی کے چند ساتھی ؟؟ سپاہیوں کے ہاتھوں سے سنگینیں چھین کر چھ آدمیوں کو ہلاک کر چکے تھے۔ انگریزوں نے اس کے جواب میں قتل عام شروع کر دیا اور آن کی آن میں پچاس قیدی موت کے گھاٹ اتار دیئے۔ اس وحشیانہ قتل عام کے دوران میں کئی عورتیں اور لڑکیاں دشمن کی وحشت اور بربریت سے بچنے کے لیے قلعے کے کنوئیں میں چھلانگ لگا کر جانیں دے چکی تھیں۔

انگریز کمانڈنٹ نے صورتِ حالات پر قابو پاتے ہی بقیۃ السیف قیدیوں میں سے بیس آدمی علٰحدہ کیے اور ان کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر فصیل کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ صدیق علی ان کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ انگریز سپاہیوں کا ایک دستہ دیوار سے چند قدم دور قیدیوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ رضیہ چند عورتوں کے ساتھ پشت بہ دیوار قیدیوں سے تھوڑی دور کھڑی سکتے کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ انگریز کمانڈنٹ نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور سپاہیوں نے اپنی بندوقیں سیدھی کر لیں۔

رضیہ اچانک عورتوں کے ہجوم سے نکل کر بھاگی اور "صدیق صدیق" کہتی ہوئی بندوقوں کی زد میں آگئی۔ اس کے ساتھ کمانڈنٹ نے "فائر" کہہ کر ہاتھ نیچے کر دیا۔ بندوقوں کے مہیب دھماکوں کے ساتھ ــــ ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ رضیہ، صدیق علی سے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر گری ــــ اٹھی ــــ پھر گری ــــ اور اس کے بعد زمین پر رینگتی ہوئی صدیق علی کی لاش سے لپٹ گئی۔

ایک انگریز افسر نے آگے بڑھ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی اور پھر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ مر چکی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد انگریز سپاہی قیدیوں کی ایک اور ٹولی پر اپنی بندوقوں کا

نشانہ آزما رہے تھے اور پھر جب فاتح لشکر انت پور کے قلعے پر اپنے پرچم کو سلامی دے رہا تھا تو چند زخمیوں اور بیماروں کے سوا جنہیں انتہائی بے ضرر سمجھ کر چھوڑ دیا گیا تھا، قلعے کے باقی محافظ اپنا سفرِ حیات ختم کر چکے تھے۔ وہ عورتیں جو بچ گئی تھیں۔ ان میں سے بہت کم ایسی تھیں جن کے چہروں پر زخموں کے نشان نہ تھے۔

اکیسواں باب

معظم علی، ایاز خاں کی غداری اور بدنور پر انگریزوں کے اچانک قبضے کی خبر سن چکا تھا۔ لیکن وہ صدیق اور مسعود کے انجام سے کئی دن بے خبر رہا۔ ایک صبح فرحت حسبِ معمول نماز سے فارغ ہو کر قرآن کی تلاوت کر رہی تھی اور معظم علی مراد کے ساتھ فوجی درسگاہ جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ صابر نے اندر آ کر کہا۔ "ایک فوجی افسر آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں ملیبار سے کوئی اہم اطلاع لے کر آیا ہوں۔ میں نے اسے دیوان خانے میں بٹھا دیا ہے۔"

معظم علی نے اپنے دل میں ناخوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا دیوان خانے کی طرف بڑھا اور تھوڑی دیر بعد وہ میسور کی فوج کے ایک بڑے افسر کے ساتھ مصافحہ کر رہا تھا۔ معظم علی نے کہا۔ "تشریف رکھیے۔ آپ ملیبار سے آئے ہیں؟"

"جی ہاں! میرا نام لطف علی بیگ ہے۔"

معظم علی نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کا نام سن چکا ہوں، فرمائیے!"

لطف علی نے کہا۔ "مجھے سلطانِ معظم نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔"

معظم علی نے لطف علی کے چہرے پر اپنی نظ[ریں] گا[ڑ]تے ہوئے کہا۔ "آپ صدیق، مسعود یا انور میں سے کسی کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"جی میں صدیق اور مسعود کے متعلق بہت بری خبر لے کر آیا ہوں۔"

چند ثانیے معظم علی کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ بالآخر اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اگر میرے بیٹوں نے کسی میدان میں پیٹھ نہیں دکھائی تو میرے لیے ان کے متعلق کوئی خبر بری نہیں ہو سکتی۔ بتائیے آپ کیا خبر لائے ہیں؟"

لطف علی نے کہا۔ "آپ اننت پور میں انگریزوں کے مظالم کے واقعات سن چکے ہیں؟"

"ہاں"

"صدیق علی خاں اننت پور کے قلعے کا محافظ تھا اور مسعود علی اس کے ساتھ تھا۔"

"اور وہ دونوں....؟"

"وہ دونوں شہید ہو چکے ہیں۔"

معظم علی سکتے کے عالم میں چند ثانیے لطف علی کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "لیکن صدیق علی تو بحری فوج میں تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ اننت پور کیسے پہنچا؟"

لطف علی نے جواب دیا۔ "وہ منگلور سے سامان جنگ لے کر کنڈاپور گیا تھا۔ وہاں ایاز خاں کی غداری کے بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ اسے کنڈاپور کی فوج کی کمان سنبھالنی پڑی۔ اس کے بعد بدنور کے علاقے میں ہماری رہی سہی افواج اس کے گرد جمع ہو چکی تھیں۔ مسعود علی پہلے سے وہاں تھا۔ وہ انگریزوں کے حملے سے چند دن پہلے اسد خاں کی کمان میں کنڈاپور پہنچ چکا تھا۔ اسد خاں کنڈاپور کی جنگ میں شہید ہوا۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنی ذمہ داریاں صدیق علی کو سونپ دی تھیں۔ میں نے سنا ہے کہ اسد خاں آپ کا دوست تھا؟"

"جی ہاں وہ میرا بہترین دوست تھا۔"

"سلطان معظم کو صدیق علی اور مسعود کی شہادت کی خبر سن کر بہت صدمہ ہوا تھا۔ انھوں نے مجھے آپ کے نام ایک ذاتی خط دے کر بھیجا ہے۔" لطف علی نے ایک خط نکالا اور معظم علی کو پیش کر دیا۔

معظم علی نے خط کھول کر پڑھا۔ سلطان ٹیپو نے لکھا تھا:

"میرے عزیز دوست! میں لطف علی کو ایک المناک خبر سنانے کے لیے آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ کاش میرے الفاظ آپ کے زخموں کا مداوا بن سکتے۔ میری سلطنت کے تمام خزانے صدیق علی اور مسعود جیسے جانبازوں کے خون کے ایک قطرے کی قیمت ادا نہیں کر سکتے۔ آپ نے کچھ عرصہ قبل جنگ میں حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی تھی اور میں نے آپ کی درخواست کا اس لیے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ مجھے محاذِ جنگ کی بجائے سرنگا پٹم کی فوجی تربیت گاہ میں آپ کی زیادہ ضرورت تھی۔ میری اب بھی یہی رائے ہے کہ آپ سرنگا پٹم میں زیادہ مفید کام کر رہے ہیں۔ تاہم اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو آپ جس وقت چاہیں سرنگا پٹم میں کسی موزوں آدمی کو اپنی ذمہ داریاں سونپ کر تشریف لے آئیں۔ مجھے جنگ میں بھی آپ جیسے لوگوں کے مشوروں کی ضرورت ہے۔"

خط پڑھنے کے بعد معظم علی دیر تک گردن جھکائے سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے لطف علی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "آپ ان کی شہادت کے متعلق اچھی طرح تصدیق کر چکے ہیں؟"

"جی ہاں! اننت پور کے وحشیانہ قتلِ عام کے بعد انگریزوں نے چند عورتیں اور بچے جن میں سے اکثر زخمی تھے، ہمارے حوالے کر دیے تھے اور انھوں نے آپ کے بیٹوں کی شہادت کی خبر کی تصدیق کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب اننت پور کے واقعات لوگوں کے سامنے آئیں گے تو میسور کا ہر باشندہ ان کی جرأت، ہمت اور غیرت پر فخر کرے گا۔"

معظم علی نے کہا۔ "کاش ان کی قربانی اس قوم کی تقدیر بدل سکتی جس کی عزت اور آزادی چند غداروں اور ابن الوقتوں کے رحم و کرم پر ہے۔ کاش میسور میں کوئی اور ایاز پیدا نہ ہو۔"

لطف علی نے کہا۔ "مجھے اب اجازت دیجیے میں آج ہی واپس جانا چاہتا ہوں۔

اگر آپ سلطانِ معظم کو کوئی پیغام بھیجنا چاہتے ہیں تو میں پہنچا دوں گا۔"

"آپ میری طرف سے سلطانِ معظم کا شکریہ ادا کیجیے اور ان سے کہیے کہ میں بہت جلد ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"



ایک ہفتہ بعد رات کے پچھلے پہر معظم علی اور فرحت مکان کے صحن میں کھڑے تھے۔ معظم علی سفر کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ مراد آنکھیں ملتا ہوا برآمدے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "ابا جان آپ تیار ہو گئے ہیں، ابھی تو بہت رات باقی ہے؟"

"نہیں بیٹا وہ دیکھو صبح کا ستارہ نمودار ہو چکا ہے۔"

مراد علی نے ماں کی طرف متوجہ ہو کر شکایت کے لہجے میں کہا۔ "امی جان آپ نے وعدہ کیا تھا کہ جب ابا جان اٹھیں گے آپ مجھے جگا دیں گی۔"

ماں نے جواب دیا۔ "بیٹا میں نے تو یہ وعدہ کیا تھا کہ تمھارے ابا جان تم سے مل کر جائیں گے۔"

معظم علی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بیٹا تم وعدہ کرو کہ میری غیر حاضری میں اپنا وقت ضائع نہیں کرو گے۔ صدیق اور مسعود ایک بہت بڑے مقصد پر قربان ہوئے ہیں اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے میسور کو بہترین آدمیوں کی ضرورت پڑے گی۔ میں تمھیں میسور کا بہترین نوجوان دیکھنا چاہتا ہوں۔"

مراد علی نے پوچھا۔ "ابا جان آپ کب تک واپس آئیں گے؟"

"بیٹا میں جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ اور اگر انور علی ملیبار پہنچ چکا ہے تو اسے چند دن کے لیے تمھارے پاس بھیج دوں گا۔" اس کے بعد معظم علی فرحت کی طرف متوجہ ہوا۔ "فرحت تمھیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں انشاء اللہ جلد واپس آجاؤں گا۔"

فرحت نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ "میں پریشان نہیں ہوں۔ میں یہ سوچ رہی تھی

کہ گذشتہ تیس برس میں ہمارے خاندانوں کی تین نسلیں یکے بعد دیگرے قوم کے غداروں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرتی چلی آرہی ہیں۔ خدا معلوم اس ملک میں میر جعفر کی روح کب تک زندہ رہے گی اور یہ سلسلہ کہاں ختم ہوگا۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "فرحت یہ دنیا خیر و شر کی رزمگاہ ہے مجھے یقین ہے، کہ ابن الوقتوں، غداروں اور ملت فروشوں کا یوم حساب اب قریب آچکا ہے۔ بدنور کے واقعات نے سلطان ٹیپو کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ جنگ سے فارغ ہونے کے بعد ان کے سامنے پہلا مسئلہ قوم کو ان گندے عناصر کے وجود سے پاک کرنا ہوگا۔ انگریزوں سے نپٹنے کے بعد میں سلطان سے یہ مطالبہ کروں گا کہ بدنور کے غداروں کا معاملہ میرے سپرد کر دیا جائے فرحت! جو قوم سلطان ٹیپو کو جنم دے سکتی ہے۔ اس کے لیے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں میں بہت جلد واپس آکر تمھیں یہ مژدہ سناؤں گا کہ صدیق اور مسعود کا خون رائگاں نہیں گیا اور اننت پور اور بدنور پر ہماری فتح کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔"

فرحت کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ معظم علی چند ثانیے خاموش اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر "خدا حافظ" کہہ کر چل دیا۔ جب وہ صحن سے باہر نکل گیا تو فرحت مراد علی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے مردانہ حصے کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے سے چند قدم آگے معظم علی گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا اور نوکر اس کے گرد جمع تھے۔ معظم علی نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور فرحت کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلے

مراد علی کچھ دیر اپنی ماں کے ساتھ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "چلیے امی جان!"

ماں نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "چلو بیٹا اب مجھے تمھارے سہارے کی ضرورت ہے۔"



میسور کی افواج انگریزوں سے ساحلی چوکیاں چھیننے کے بعد حیدر گڑھ اور بدنور کے اردگرد کئی چھوٹے چھوٹے قلعوں پر قبضہ کر چکی تھیں اور بدنور میں جنرل میتھیوز کی فوج سمندر کی طرف سے رسد و کمک کے تمام راستے بند ہو جانے کے باعث محاصرے کی سی حالت کا سامنا کر رہی تھی۔ سلطان ٹیپو حیدر گڑھ اور بدنور کے درمیان ایک وادی میں پڑاؤ ڈالے مختلف محاذوں پر لڑنے والی افواج کی نگرانی کر رہا تھا۔

وہ جنگ کے ایام میں بھی سلطنت کے تمام حالات سے باخبر رہتا تھا۔ وزیر، صوبیدار اور دوسرے عہدیدار اسے باقاعدگی کے ساتھ اپنی کارگزاریوں کی تفصیلات لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ سلطان ہر روز اپنے عمال کے بیشمار خطوط، اور رعایا کی درخواستوں کے جواب اور اہم مقدمات کے فیصلے لکھواتا۔ ملاقاتیوں سے ملتا اور اس کے بعد فوجی معاملات کی دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتا۔ ایک دن گیارہ بجے کے قریب سلطان اپنے دفتری کاموں سے فارغ ہوا تو اس کے سامنے حسبِ معمول ملاقاتیوں کی فہرست پیش کی گئی۔ سلطان نے کاغذ پر نگاہ ڈالتے ہی پوچھا "معظم علی کب آئے ہیں؟"

فہرست پیش کرنے والے افسر نے جواب دیا۔ "عالیجاہ! وہ کل رات یہاں پہنچے تھے۔"

سلطان ٹیپو نے کہا۔ "انھیں لے آؤ۔"

افسر باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر بعد معظم علی اندر داخل ہوا۔ سلطان نے مسند سے اٹھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور اسے اپنے قریب ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ ہم اننت پور کے جانبازوں کو بروقت کمک نہ بھیج سکے۔ دشمن نے اچانک منگلور پر حملہ کر کے ہماری افواج کو اس محاذ سے توجہ ہٹانے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن اب ان ظالموں کا یوم حساب شروع ہو چکا ہے۔ ہم نے سمندر کی طرف سے دشمن کے رسد و کمک کے راستے منقطع کر دیئے ہیں۔ حیدر گڑھ فتح ہو چکا ہے اور کل وہاں سے ہماری فوج کا ایک حصہ اننت پور روانہ ہو جائے گا اور اس کے بعد چند دن تک بدنور کا قلعہ بھی ہماری

توپوں کی زد میں ہوگا۔ میرے الفاظ اس باپ کے زخموں کے لیے مرہم کا کام نہیں دے سکتے جو صدیق علی اور مسعود علی جیسے ہونہار بیٹوں سے محروم ہو چکا ہے۔ لیکن میں آپ کو یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ اننت پور کے شہیدوں کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔"

معظم علی نے کہا۔ "ایک باپ کے لیے اس سے زیادہ حوصلہ افزا خبر کیا ہو سکتی ہے، کہ اس کے بیٹے آپ کی نگاہوں میں عزت کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔"

سلطان نے کہا۔ "آپ جنگ میں حصہ لینے پر مصر تھے۔ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو اننت پور پر حملہ کرنے والی فوج کی کمان سونپنے کے لیے تیار ہوں۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "عالیجاہ! اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں تو میں شکریے کے ساتھ یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔"

سلطان ٹیپو نے کہا۔ "جب آپ اس مہم سے واپس آئیں گے تو میں آپ کو اس سے زیادہ اہم ذمہ داری سونپنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مجھے بدنور کی صوبیداری کے لیے آپ سے زیادہ موزوں اور کوئی نظر نہیں آتا۔ آپ حیدر گڑھ جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ شام سے پہلے وہاں کے سپہ سالار کے نام آپ کی تقرری کے احکام پہنچ جائیں گے۔"

معظم علی نے احسان مندی کے ساتھ شیر میسور کی طرف دیکھا اور اُٹھ کر خیمے سے باہر نکل آیا۔

غروب آفتاب سے تھوڑی دیر قبل معظم علی گھوڑا دوڑاتا ہوا حیدر گڑھ کے قلعے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔ گھوڑے سے اترتے وقت معظم علی کی نگاہیں ایک نوجوان کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ یہ اس کا تیسرا بیٹا انور علی تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مغموم مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ چند ثانیے معظم علی کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ بالآخر اس نے کہا۔ "انور تم کب سے یہاں ہو؟"

انور کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور اس نے جواب دیا۔ "اباجان ہماری ۔۔۔ لمے

پہنچے یہاں پہنچ گئی تھی۔ مجھے ابھی سپہ سالار نے یہ بتایا تھا کہ آپ یہاں تشریف لا رہے ہیں۔ امی جان اور مراد کا کیا حال ہے؟"

"وہ ٹھیک ہیں بیٹا۔ تمھارے سپہ سالار کہاں ہیں؟"

"وہ اندر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ چلیے!"

معظم علی، انور علی کے ساتھ قلعے کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔ میسور کی فوج کا مایۂ ناز جرنیل غازی خاں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، اور اس کے سامنے کئی نقشے اور کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ غازی خاں نے اٹھ کر معظم علی کے ساتھ گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور کہا۔ "مجھے آپ کے متعلق حکم موصول ہو چکا ہے۔ آپ کی فوج علی الصباح کوچ کرنے کے لیے تیار ہے۔"



اننت پور کے قلعے پر دو دن سے شدید گولہ باری ہو رہی تھی۔ انگریز قلعے سے باہر اپنی رسد اور کمک کے راستے مسدود پا کر مایوس ہو چکے تھے۔ تیسرے دن معظم علی کی فوج قلعے پر فیصلہ کن حملہ کرنے کے لیے تیار کھڑی تھی کہ قلعے کے ایک شکستہ برج پر سفید جھنڈا دکھائی دیا۔ معظم علی نے فائرنگ بند کرنے کا حکم دیا اور فضا میں اچانک خاموشی چھا گئی۔ فوج کا ایک نوجوان افسر گھوڑا بھگاتا ہوا معظم علی کے قریب پہنچا اور اس نے کہا۔ "جناب اس قلعے کی فوج کو امان دینا گناہ ہے ان لوگوں کے ہاتھ ہمارے بے گناہ بھائیوں اور بہنوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ انھوں نے جنگی قیدیوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ ہم انھیں معاف نہیں کر سکتے۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "ہم برائی میں اپنے دشمنوں کی تقلید نہیں کریں گے۔ صلح اور جنگ کے متعلق ہمارا اپنا ایک ضابطہ ہے۔"

"لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے بیٹوں کے ساتھ انھوں نے کیا سلوک کیا تھا؟"

"مجھے معلوم ہے لیکن اپنے بیٹوں کی مظلومیت مجھے بھیڑیوں کی تقلید کرنے کی

قلعے کا دروازہ کھلا اور ایک انگریز افسر جس کے ہاتھ میں سفید جھنڈا تھا، گھوڑا دوڑتا ہوا آگے بڑھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ معظم علی سے کہہ رہا تھا "ہمارے کمانڈر مناکرؔ جنگ کے لیے آپ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔"

معظم علی نے جواب دیا "انھیں ہمارے ساتھ بات کرنے کی ضرورت نہیں، تم ان سے کہو کہ جنگ ختم کرنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ آپ ہتھیار ڈال دیں!"

انگریز افسر نے کہا۔ "اگر آپ ہمیں اپنی حفاظت میں سداشیو گڑھ پہنچانے کا ذمہ لیں تو ہم یہ قلعہ خالی کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

معظم علی نے تلخ ہو کر جواب دیا۔ "تم ہمارا وقت ضائع کر رہے ہو۔ جنگ بند کرنے کی صرف یہی صورت ہے کہ تم غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دو۔"

انگریز افسر نے قدرے تذبذب کے بعد کہا: "اگر ہم غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آپ ہمارے ساتھ جنگی قیدیوں کا سا سلوک کریں گے؟"

"ہم تمھیں کوئی ضمانت نہیں دے سکتے۔ تمھارے جرائم ایسے ہیں کہ تمھارے ساتھ بات کرنا بھی انسانیت کی توہین ہے لیکن تم اپنے کمانڈر کو میری طرف سے یہ بتا سکتے ہو کہ ہم تمھارے ساتھ وہ سلوک کریں گے جو تم نے اننت پور کا قلعہ فتح کرنے کے بعد ہمارے سپاہیوں اور ہماری عورتوں کے ساتھ کیا تھا۔ میں تمھیں فیصلہ کرنے کے لیے نصف گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں۔ اس کے بعد قلعے پر گولہ باری شروع کر دی جائے گی۔ تم جا سکتے ہو۔"

انگریز افسر نے کہا۔ "اگر آدھ گھنٹے کے بعد قلعے کا دروازہ کھول دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے آپ کا فیصلہ تسلیم کر لیا ہے۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "نہیں یہ کافی نہیں۔ آپ کو تمام فوج قلعے سے باہر کھڑی کرنی پڑے گی اور ان کے ہتھیار ایک جگہ ڈھیر کرنے ہوں گے۔ پھر جب ہم قلعے پر قبضہ کر لیں گے تو آپ کو کسی موزوں جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔"

انگریز افسر نے معظم علی کو فوجی سلام کرنے کے بعد گھوڑے کی باگ موڑ لی۔ کوئی بیس منٹ بعد قلعے کا دروازہ کھل چکا تھا اور انگریز باہر نکل کر فصیل سے چند گز آگے اپنا اسلحہ ڈھیر کر رہے تھے۔

معظم علی نے قلعے پر قبضہ کرنے کے بعد انگریز عورتوں کو چند کوٹھڑیوں میں بند کر دیا۔ قلعے کے اندر میسور کی فوج کے وہ قیدی جو انگریزوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ گئے تھے، ہڈیوں کے ڈھانچے معلوم ہوتے تھے اور چلا چلا کر صدیق علی اور اس کے ساتھیوں کے انتقام کا مطالبہ کر رہے تھے۔

معظم علی نے انھیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ میں صدیق اور مسعود کا باپ ہوں۔ جب معظم علی نے شہداء کی قبروں کے متعلق پوچھا تو ایک قیدی نے بتایا کہ ان سب کو قلعے سے باہر ایک ہی گڑھے میں دفن کر دیا گیا تھا اور وہ گڑھا ہم سے کھدوایا گیا تھا۔"

تھوڑی دیر بعد فاتح لشکر قلعے سے باہر مٹی کے ایک انبار کے گرد کھڑا تھا اور اس انبار کے اوپر میسور کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ معظم علی قیدیوں کی زبانی اس لڑکی کے متعلق سن رہا تھا جس نے صدیق علی کے ساتھ جام شہادت نوش کیا تھا۔ کسی کو اس کی پوری داستان معلوم نہ تھی۔ اپنے ان گنت سوالات کے جواب میں وہ صرف یہ معلوم کر سکا کہ اس کا بیٹا کسی عالی نسب اور بے یار و مددگار لڑکی کا آخری سہارا تھا اور اس نے اسے شموگہ کے قلعے سے اپنے گھر بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔

معظم علی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور صدیق اور مسعود کے بچپن اور جوانی کی بے شمار تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئیں۔ پھر اپنے بیٹوں کے ساتھ وہ ایک لڑکی کی مختلف خیالی تصویریں دیکھنے لگا ——— "میری بیٹی!" وہ اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔ "مجھے معلوم نہیں تو کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی، کس خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ میں

تمھیں کبھی نہیں دیکھوں گا لیکن اگر تمھاری روح میری آواز سن سکتی ہے تو میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے بچوں سے کم عزیز نہیں ہو"۔

○

اگلے دن معظم علی نے چار سو سپاہی قلعے کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر باقی دستوں کے ساتھ سلطان کے پڑاؤ کا رخ کیا۔ راستے میں اسے یہ اطلاع ملی کہ سلطان کا لشکر بدنور کی طرف روانہ ہو چکا ہے۔ معظم علی اپنی پیادہ فوج کو پیچھے چھوڑ کر سوار دستوں کے ہمراہ یلغار کرتا ہوا بدنور پہنچا تو وہاں لڑائی شروع ہو چکی تھی۔

معظم علی نے شہر کی مشرقی دیوار سے کوئی آدھ میل کے فاصلے پر اپنے ساتھیوں کو رکنے کا حکم دیا اور خود گھوڑے سے اتر کر بھاگتا ہوا ایک ٹیلے پر چڑھا۔ اس نے آنکھوں سے دوربین لگا کر صورتِ حالات کا جائزہ لیا۔ کچھ دیر بعد وہ ٹیلے سے اترا اور اپنے ساتھیوں کو گھوڑوں سے اترنے کا حکم دے کر ایک افسر کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم اپنے سپاہیوں سے کہو کہ وہ گھوڑوں کو پیچھے لے جائیں، میں باقی دستوں کے ساتھ آگے جا رہا ہوں"۔

چند منٹ بعد وہ شہر کی مشرقی سمت غازی خاں کی قیادت میں لڑنے والے سپاہیوں کی صف میں شامل ہو گیا۔ سلطان کی فوج کا فرانسیسی توپخانہ فصیل کے مشرقی دروازے پر گولہ باری کر رہا تھا اور توپخانے کے دائیں بائیں غازی خاں کی فوج فیصلہ کن حملے کے لیے حکم کا انتظار کر رہی تھی۔ فرانسیسی توپخانے کی گولہ باری کے باعث مشرقی دیوار میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے شگاف پیدا ہو چکے تھے۔ تاہم انگریز فصیل کے مورچوں پر ڈٹے ہوئے تھے اور ان کی جوابی گولہ باری کافی شدید تھی۔ شہر کی مغربی سمت سے نقاروں کی صدائیں یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ اس طرف عام حملے کا حکم ہو چکا ہے —
غازی خاں نے نقاروں کی صدائیں سنتے ہی اپنے دستوں کو پیش قدمی کا حکم دیا۔ سپاہی

اپنے اپنے مورچوں سے نکلے اور رینگتے ہوئے شہر پناہ کی طرف بڑھنے لگے۔ پھر کئی نوجوان اچانک بانس کی سیڑھیاں اٹھا کر بھاگے اور آن کی آن میں فصیل کے قریب پہنچ گئے لیکن دشمن کی شدید مزاحمت کے باعث وہ فصیل کے کسی حصے پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہوئے اور انھیں مشرقی دروازے کے آس پاس چند لاشیں چھوڑ کر پیچھے ہٹنا پڑا۔

معظم علی فصیل سے کوئی تیس چالیس قدم دور ایک زخمی سپاہی کو سہارا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ دو فرانسیسی جوان جن میں سے ایک کے ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل تھی اور دوسرا اپنے بازوؤں میں ایک بارودی گولہ تھامے ہوئے تھا۔ بے تحاشا فصیل کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے فرانسیسی سپاہیوں کا ایک دستہ فصیل کے مورچوں پر گولیاں برساتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ معظم علی بلند آواز میں چلایا۔ "دشمن کو اپنی طرف متوجہ رکھو"۔ اور اس کے ساتھیوں نے پلٹ کر فصیل پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ غازی خاں اور فوج کے دوسرے افسر دم بخود ہو کر فرانسیسی جانبازوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بارودی گولے کے بوجھ کے باعث فرانسیسی سپاہی اپنی دوڑ کا آخری مرحلہ بڑی مشکل سے طے کر رہا تھا اور دوسرا جس کے ہاتھ میں مشعل تھی، چند قدم بھاگ کر اپنے ساتھی سے آگے نکل جاتا اور پھر اچانک زمین پر لیٹ کر اس کا انتظار کرتا۔ فصیل سے آٹھ دس قدم دور یہ دونوں یکے بعد دیگرے زخمی ہو کر گر پڑے ایک ثانیہ بعد ان میں سے ایک دوبارہ اٹھا اور گولہ اٹھا کر فصیل کے ساتھ جا گرا۔ پھر اس نے گولے کو فصیل کے شگاف کے اندر دھکیل دیا اور زمین پر رینگتا ہوا واپس مڑا۔ اپنے گرے ہوئے ساتھی کے قریب پہنچ کر اس نے جلتی ہوئی مشعل اٹھائی اور دوبارہ مڑ کر فصیل کی طرف رینگنے لگا لیکن اچانک اس کے سر پر گولی لگی اور وہ بے حس و حرکت لیٹ گیا۔

معظم علی اچانک اٹھ کر پوری رفتار سے بھاگا اور پھر اچانک زمین پر منہ کے بل لیٹ گیا۔ پھر چند قدم اٹھا کر بھاگا اور دوبارہ لیٹ گیا۔ تیسری کوشش میں وہ فرانسیسی

سپاہی کے ہاتھ سے گری ہوئی مشعل اٹھا چکا تھا۔ پھر یکے بعد دیگرے اس کی ران اور اس کے سینے میں دو گولیاں لگیں لیکن وہ گرتے پڑتے بارودی گولے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ فصیل کے شگاف کے اندر سمٹنے کے بعد وہ اوپر سے آنے والی گولیوں کی زد سے محفوظ تھا۔ اس نے جلتی ہوئی مشعل بارودی گولے کے فیتے پر رکھ دی پھر اپنی رہی سہی قوت بروئے کار لاتے ہوئے فصیل کے شگاف سے باہر نکلا اور بھاگنے لگا۔

اتنی دیر میں فصیل کے مورچوں میں بھگدڑ مچ چکی تھی۔ فصیل سے بیس گز دور معظم علی گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ایک زبردست دھماکا سنائی دیا۔ دھوئیں اور گرد کے بادل اڑے اور میسور کے سپاہی قلعے کی مشرقی دیوار میں ایک چھوٹے شگاف کی جگہ ایک بڑی گزرگاہ دیکھ رہے تھے۔



معظم علی نے ہوش میں آکر آنکھیں کھولیں تو وہ ایک خیمے کے اندر لیٹا ہوا تھا۔ انور علی اور میسور کی فوج کا ایک بہترین طبیب اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن نقاہت کے باعث اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ طبیب نے جلدی سے اسے سہارا دے کر لٹاتے ہوئے کہا۔ "آپ آرام سے لیٹے رہیں!"

معظم علی نے چند ثانیے سستانے کے بعد انور علی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میں کہاں ہوں بڈنور فتح ہوا یا نہیں؟"

"اباجان! بڈنور کا شہر فتح ہو چکا ہے۔ اب صرف قلعہ باقی ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "بیٹا! تمھیں میری خاطر اپنے فرائض سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔"

"اباجان مجھے سلطان معظم اور غازی خاں نے آپ کے پاس ٹھہرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ ابھی آپ کو دیکھ کر گئے ہیں۔ برہان الدین بھی آپ کو دیکھنے آئے تھے۔ ابھی قلعے پر حملہ شروع نہیں ہوا۔ اس کے گرد ابھی توپیں نصب کی جا رہی ہیں۔"

معظم علی نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ "بیٹا شہر کی لڑائی میں ہمارا زیادہ نقصان تو نہیں ہوا؟"

"نہیں اباجان! شہر کی فصیل ٹوٹنے کے بعد انگریز چاروں اطراف سے بھیڑوں کی قلعے کی طرف دوڑ رہے تھے۔"

طبیب نے دوا کی پیالی معظم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "باتیں کرنے سے آپ کی تکلیف میں اضافہ ہوگا۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ یہ دوا پی لیجیے!"

معظم علی نے جواب دیا۔ "اگر یہ دوا مجھے بیہوش کرنے کے لیے ہے تو میں نہیں پیوں گا۔ میں اپنی زندگی کی باقی گھڑیوں میں سے ایک لمحہ کے لیے بھی بیہوش رہنا پسند نہیں کروں گا اور آپ اس حقیقت کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ میں صرف چند گھڑی کا مہمان ہوں۔"

انور علی نے کہا۔ "اباجان! غازی خاں کہتے تھے کہ اگر آپ پسند فرمائیں تو امی جان اور مراد علی کو یہاں لانے کا انتظام ہو سکتا ہے؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "نہیں بیٹا! تم جاؤ اور کہیں سے کاغذ اور قلم لے آؤ۔ میں ان کے نام ایک خط لکھنا چاہتا ہوں۔"

انور علی اٹھ کر باہر نکل گیا اور طبیب نے کہا۔ "دیکھیے آپ اس حالت میں خط نہیں لکھ سکتے۔"

"آپ کو مجھے اپنی زندگی کا آخری فرض ادا کرنے سے منع نہیں کرنا چاہیے۔ میں خود لکھنے کی بجائے انور علی یا آپ میں سے کسی کو چند سطریں لکھوا دوں گا۔"

طبیب نے کہا۔ "میں آپ کو کسی بات سے منع نہیں کر سکتا لیکن آپ کم از کم دل کی تقویت کے لیے یہ دوا ضرور پی لیں۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "فتح کی خبر سے زیادہ میرے دل کے لیے اور کونسی چیز تقویت کا باعث ہو سکتی ہے۔ بہرحال میں دوا پی لیتا ہوں۔"

طبیب نے ایک بوتل سے چند گھونٹ دوا نکال کر پیالی میں ڈالی اور معظم علی کو پلادی۔

انور علی قلمدان اور کاغذ اٹھائے خیمے میں داخل ہوا اور اپنے باپ کے بستر کے قریب بیٹھ گیا۔ طبیب نے معظم علی سے کہا۔ "آپ اطمینان سے خط لکھوائیں۔ میں باہر انتظار کرتا ہوں۔" پھر وہ انور علی کی طرف متوجہ ہوا "اگر ضرورت پڑے تو مجھے آواز دے دینا۔"

طبیب باہر نکل گیا اور معظم علی فرحت کے نام خط لکھوانے میں مصروف ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد جب یہ طویل خط ختم ہوچکا تھا تو معظم علی اپنے بیٹے سے کہہ رہا تھا۔

"بیٹا! یہ خط اپنی ماں کو دے دینا۔ میں تمھیں یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ میرے بعد تم پر اپنی والدہ، اپنے بھائی اور سب سے زیادہ اپنے ملک و قوم کے متعلق کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایک سعادت مند بیٹے اور ایک شفیق بھائی ثابت ہوگے لیکن میری امیدیں اور آرزوئیں اس سے بہت زیادہ ہیں۔ تمھارے لیے اور تمھارے بھائیوں کے لیے میری دعائیں ہمیشہ یہ رہی ہیں کہ تم قوم کی عزت اور آزادی کے امین بنو اور تمھاری آئندہ نسلیں اس درخت کی شاخوں پر جھولے ڈالیں جسے تمھارے اسلاف کے خون نے آبیار کیا ہے۔ میسور ہندوستان کے مسلمانوں کا آخری حصار ہے۔ سلطان ٹیپو کی فتح ان کروڑوں انسانوں کی فتح ہوگی جو اس ملک میں عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ تمھارے متعلق میری آخری خواہش یہ ہے کہ جب میسور کی عزت اور آزادی کے محافظ فتح و نصرت کے پرچم لہرائیں تو تم فخر کے ساتھ سر اونچا کرکے یہ کہہ سکو کہ میسور کی خاک پر میرے باپ اور میرے بھائیوں کا خون گرا تھا۔ تم کسی دن میری قبر پر آؤ اور مجھے یہ مژدہ سناؤ کہ اباجان آپ نے جس عظیم مقصد کے لیے قربانیاں دی تھیں وہ پورا ہوچکا ہے۔ آزادی کے جس سورج کی تلاش میں آپ مرشد آباد سے نکلے تھے وہ میسور میں پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے

بیٹا! تمھاری منزل بہت دور اور تمھارا راستہ بہت کٹھن ہے لیکن قدرت نے تمھیں ایک ایسا رہنما عطا کیا ہے جو عزم و ثبات اور ایثار و خلوص کی نعمتوں سے مالا مال ہے۔ ایک قافلے کی اس سے زیادہ اور کیا خوش بختی ہوسکتی ہے کہ اس کا رہنما مہیب تاریکیوں، آندھیوں اور طوفانوں میں اپنی منزل دیکھ سکتا ہو۔"

انور علی بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس نے کہا۔ "اباجان مجھے یقین ہے کہ آپ تندرست ہوجائیں گے۔ سلطان کو آپ جیسے ساتھیوں کی ضرورت ہے اور میسور میں ابھی آپ کے حصے کا بہت سا کام باقی ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "بیٹا! شاہراہِ زندگی کے ہر مسافر کی ایک آخری منزل ہوتی ہے اور میں اپنی زندگی کے آخری سانس کے لیے اس سے بہتر مقام کی تمنا نہیں کرسکتا تھا۔ تمھاری عمر میں میری سب سے بڑی خواہش یہ ہوا کرتی تھی کہ میں حق کے لیے زندہ رہوں، حق کے لیے لڑوں اور حق کے لیے جان دوں۔"

طبیب خیمے میں داخل ہوا اور اس نے معظم علی کے قریب بیٹھ کر اس کی نبض دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کے چند دوست آپ کو دیکھنے آرہے ہیں لیکن میں آپ کو اب زیادہ دیر باتیں کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ آپ اپنے زخموں میں زیادہ درد محسوس تو نہیں کرتے؟"

معظم علی نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں! باتیں کرتے وقت مجھے درد کا احساس نہیں رہتا۔"

غازی خاں، برہان الدین اور فوج کے تین اور بڑے افسر خیمے کے اندر داخل ہوئے۔ غازی خاں نے آگے بڑھ کر معظم علی کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کیسے ہیں؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "میں ٹھیک ہوں۔ قلعہ فتح ہوچکا ہے؟"

غازی خاں نے جواب دیا۔ "نہیں! قلعے کی فتح کی خبر سننے کے لیے آپ کو شاید

چند دن انتظار کرنا پڑے ۔ اس وقت اہم مقامات پر توپیں نصب کی جارہی ہیں اور شام تک گولہ باری شروع ہو جائے گی ۔ سلطان معظم آپ کے متعلق بہت فکر مند ہیں اور انھوں نے یہ فرمایا ہے کہ اگر آپ پسند کریں تو آپ کے بچوں کو یہاں بلا لیا جائے ۔"

معظم علی نے جواب دیا ۔" نہیں ! میں اس حالت میں انھیں پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھتا ۔"

معظم علی سے چند منٹ اور باتیں کرنے کے بعد غازی خاں اور اس کے ساتھی خیمے سے باہر نکل گئے ۔ برہان الدین نے خیمے سے باہر نکلتے وقت مڑ کر دیکھا اور طبیب کو ہاتھ سے اشارہ کیا ۔ طبیب جلدی سے خیمے کے دروازے کی طرف بڑھا ۔ برہان الدین اسے ہاتھ سے پکڑ کر باہر لے آیا اور بولا ۔" سلطان معظم کا حکم ہے کہ آپ ان کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں ۔ اب ان کی حالت خطرے سے باہر ہے نا ؟"

طبیب نے سر ہلاتے ہوئے کہا ۔" نہیں ! ان کا اس وقت تک اطمینان سے باتیں کرنا بھی ایک معجزہ ہے ۔ زخم بہت شدید ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ ان کی ہمت اچانک جواب دے جائے گی ۔"

برہان الدین نے کہا ۔" ان کی جان بہت قیمتی ہے ۔"

طبیب نے کہا ۔" آپ اطمینان رکھیں ، میری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہو گی ۔"



اگلی رات معظم علی کی حالت بہت نازک ہو چکی تھی ۔ وہ کبھی کبھی ہوش میں آکر انور علی سے کوئی بات کرتا لیکن چند منٹ کے بعد اس کی طاقت جواب دے جاتی اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں آنکھیں بند کر لیتا ۔ آدھی رات کے قریب اس نے انور علی سے کہا ۔" بیٹا ! میرا خیال تھا کہ میں آخری سانس لینے سے پہلے سلطان معظم سے چند باتیں کر سکوں گا لیکن

وہ بہت مصروف ہیں ۔"

انور علی نے کہا ۔" ابا جان ! اگر آپ چاہیں تو میں غازی خاں کی وساطت سے ان تک آپ کا پیغام پہنچا سکتا ہوں ۔ سلطان معظم عشاء کی نماز کے بعد آپ کو دیکھنے آئے تھے لیکن اس وقت آپ بیہوش تھے ۔"

معظم علی نے آنکھیں بند کرتے ہوئے جواب دیا ۔" انھیں اس وقت تکلیف دینے کی ضرورت نہیں اور بیٹا تم بھی لیٹ جاؤ ۔"

انور علی نے کہا ۔" ابا جان ! طبیب کسی زخمی کو دیکھنے کے لیے گیا ہے جب وہ واپس آئے گا تو میں سو جاؤں گا ۔ آپ میری فکر نہ کریں ۔"

رات کے پچھلے پہر طبیب اسے دوا پلا رہا تھا اور انور علی اس کے قریب بیٹھا اونگھ رہا تھا ۔ خیمے سے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی ۔ پھر کوئی یہ کہتا ہوا سنائی دیا ۔" تم یہیں ٹھہرو ۔" اور ایک ثانیہ بعد انسانی سطوت و جبروت کا ایک پیکر مجسم خیمے کے اندر داخل ہوا ۔ معظم علی نے آنکھیں کھول دیں اور اس کی نگاہیں سلطان ٹیپو کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں ۔ طبیب ادب سے سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا ۔ انور علی نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور جلدی سے اٹھ کر ایک طرف ہٹ گیا ۔ معظم علی نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کی ہمت جواب دے گئی ۔ سلطان نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے اپنے ہاتھوں کا سہارا دیا اور کہا ۔" آپ اطمینان سے لیٹے رہیں ۔" پھر وہ بے تکلفی سے اس کے قریب بیٹھ گیا ۔

معظم علی نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا ۔" عالیجاہ ! مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور تشریف لائیں گے ۔ اگرچہ ایسی خواہش آپ کے ایک خادم کو زیب نہیں دیتی ۔"

سلطان نے کہا ۔" آپ میرے دوست ہیں اور مجھے آپ کی دوستی پر فخر ہے ۔"

معظم علی نے کہا ۔" آپ ان لوگوں سے خبردار رہیں جو قوم کی عزت اور آزادی

کو تجارت کا مال سمجھتے ہیں۔ ایک غدّار ہزاروں شہیدوں کی قربانی پر پانی پھیر سکتا ہے۔ خدا معلوم اس ملک میں ابھی کتنے ایاز ہیں۔ بدنور اور ملیبار کے باقی علاقوں سے دشمن کو نکالنے کے بعد آپ کسی غدّار کو زندہ نہ چھوڑیں!"

سلطان نے جواب دیا۔ "غدّار اپنا وار کرنے سے پہلے ہمارے سامنے نہیں آتے۔ انھیں ختم کرنے کے لیے ایک حکمران کی بصیرت سے زیادہ پوری قوم کے اجتماعی احساس کی بیداری کی ضرورت ہے۔ خطرناک ناسور اس جسم پر ظاہر ہوتے ہیں جس میں صالح خون کی جگہ فاسد مادہ جمع ہو چکا ہو۔ غدّار ہمیشہ اس قوم کی آغوش میں جنم لیتے ہیں جس کی قوتِ مدافعت کمزور ہو چکی ہو۔ میری پونجی وہ تہی دست قوم ہے جس کی غیرت اور حمیّت کے خزانے لٹ چکے ہیں۔ اس قوم میں زندگی کی نئی روح بیدار کرنے کے لیے مجھے وقت کی ضرورت ہے۔ اگر خدا نے مجھے ان جنگوں سے فرصت دی تو شاید میں یہ کام بھی کر سکوں لیکن میری جنگ صرف انگریزوں کے ساتھ ہی نہیں ہے بلکہ مرہٹے اور نظام بھی مجھے اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔"

معظم علی نے نقاہت سے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ قدرت نے آپ کو جس مقصد کے لیے منتخب کیا ہے۔ وہ ضرور پورا ہوگا۔"

سلطان نے طبیب کی طرف دیکھا اور وہ جلدی سے آگے بڑھ کر معظم علی کی نبض ٹٹولنے لگا۔ سلطان نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "معظم علی!"

معظم علی نے آنکھیں کھولیں اور سلطان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور کہا۔ "عالیجاہ! مجھے موت کے لیے اس گھڑی کا انتظار تھا۔ خدا آپ کو فتح دے۔" پھر محبت، اطاعت اور عقیدت سے لبریز نگاہیں سلطان ٹیپو کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

چند ثانیے بعد معظم علی نے ایک گہری اور لمبی سانس لی اور سلطان کے ہاتھ پر اپنی

گرفت ڈھیلی چھوڑ دی۔ مرشد آباد کی تاریک رات کا مسافر میسور کی حسین صبح کے آفتاب کے سامنے دم توڑ چکا تھا۔ طبیب سلطان کا اشارہ پا کر آگے بڑھا۔ اس نے معظم علی کی نبض دیکھی اور سر ہلا دیا۔

سلطان "انا للہ وانا الیہ راجعون" کہہ کر اٹھا۔ انور علی بے حس و حرکت اپنی جگہ کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ سلطان نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! ان کی زندگی قابلِ تقلید اور ان کی موت قابلِ رشک تھی۔"



چند دن بعد سہ پہر کے وقت موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ فرحت اور مراد علی مکان کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے اچانک مراد علی چلّایا۔ "امی جان! امی جان!! بھائی جان آ گئے!" پھر وہ اٹھ کر بھاگتا ہوا صحن کی طرف بڑھا اور انور علی سے لپٹ گیا۔ انور علی کا لباس پانی اور کیچڑ سے لت پت تھا وہ مراد علی کو اپنے ساتھ چمٹائے آگے بڑھا۔ فرحت اپنی نگاہوں میں ہزاروں دعائیں لیے اٹھی اور برآمدے کی سیڑھیوں کے قریب کھڑی ہو گئی لیکن انور علی کے چہرے پر حزن و ملال کے آثار دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔ انور علی نے برآمدے کی سیڑھیوں پر پاؤں رکھتے ہوئے مرجھائی ہوئی آواز میں سلام کیا اور پھر آگے بڑھ کر ماں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے بیٹا؟" ماں نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "تم بہت پریشان نظر آتے ہو!"

چند لمحات کے لیے انور علی کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔ پھر اس نے اچانک جھک کر مراد علی کو اپنے سینے سے لگا لیا اور سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "امی جان! ابا جان شہید ہو چکے ہیں۔"

فرحت کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑی رہی اور پھر لڑکھڑاتی ہوئی دیوار کی طرف

بڑھی اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس کی خاموشی چیخوں سے زیادہ دردناک اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں آنسوؤں سے زیادہ کرب انگیز تھیں۔ انور علی آگے بڑھ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی کمر کے تھیلے سے معظم علی کا خط نکال کر ماں کو پیش کرتے ہوئے کہا "امی جان! زخمی ہونے کے بعد ابا جان نے آپ کے لیے یہ خط لکھوایا تھا۔"

فرحت نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے خط پکڑ لیا لیکن کھول کر پڑھنے کی بجائے اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ مراد علی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "امی جان! آپ نے ابا جان کا خط نہیں پڑھا؟"

فرحت کے ہونٹ کپکپائے اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ پھر اچانک اس نے مراد علی کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب پھوٹ نکلا۔

صابر "انور علی انور علی" کہتا ہوا صحن میں داخل ہوا لیکن برآمدے کے قریب پہنچ کر ایک غیر متوقع صورتِ حالات کا سامنا کرنے کے بعد ٹھٹک کر رہ گیا۔ "کیا ہوا بی بی جی؟" اس نے سہمی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

فرحت جواب دینے کی بجائے اٹھی اور کمرے کے اندر چلی گئی۔ مراد علی اٹھ کر آگے بڑھا اور صابر کے ساتھ چمٹ کر سسکیاں لینے لگا۔ انور علی نے کہا "چچا صابر! ابا جان شہید ہو گئے ہیں۔"

صابر کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

فرحت کمرے میں جا کر ایک مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے شوہر کا خط کھولا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ معظم علی نے لکھا تھا:-

"رفیقۂ حیات! میں زخموں سے نڈھال ہوں اور بستر پر لیٹا ہوا تمھیں یہ خط لکھوا رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ قدرت کو میرا زندہ رہنا منظور

ہو اور میں تمھیں دوبارہ دیکھ سکوں لیکن اب مجھے زندہ رہنے کی خواہش بھی ایک خود فریبی معلوم ہوتی ہے۔ میرے زخم بہت شدید ہیں اور اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ تمھارے نام یہ خط میرا آخری پیغام ہو۔

میں نے اپنی زندگی کے بہترین ایام تمھاری رفاقت اور تمھاری رفاقت سے پہلے تمھاری یاد میں گزارے ہیں۔ میری امیدوں، آرزوؤں امنگوں اور ولولوں نے ان سپنوں کے ساتھ جنم لیا تھا جو میں تمھارے متعلق دیکھا کرتا تھا۔ تمھاری رفاقت نے میری زندگی کو اعلیٰ و ارفع مقاصد عطا کیے۔ مجھے تمھارے بچوں کے لیے ایک ایسے وطن کی تلاش تھی جہاں وہ عزت اور آزادی کی زندگی بسر کر سکیں اور میسور میرے خوابوں کی جنت ہے۔ ایک بڑی آرزو کی تکمیل کے لیے عظیم قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ میرا اور میرے بیٹوں کا خون میسور کے ان ان گنت مجاہدوں کے خون سے زیادہ قیمتی نہیں جو قوم کی عزت اور ناموس پر قربان ہو چکے ہیں۔ میں نے اننت پور میں مٹی کا وہ انبار دیکھا تھا جس میں صدیق اور مسعود کے ساتھ سینکڑوں اور شہیدوں کی لاشیں دفن تھیں۔ کتنے والدین، کتنی بہنیں اور بھائی، کتنے بچے اور بیویاں اننت پور سے کوسوں دور ان کا انتظار کر رہے ہوں گے اور آنے والے دور میں نہ معلوم اننت پور کی داستان میسور کے کتنے قلعوں، کتنے شہروں اور کتنی بستیوں میں دہرائی جائے گی۔

سلطان ٹیپو ان مجاہدوں کے قائد ہیں جنھیں قدرت نے ایک زوال پذیر قوم کے ماضی کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔ میں تمھیں یہ نہیں بتا سکتا کہ سلطان کی جدوجہد کا آخری انجام کیا ہوگا۔

— آگ اور خون کے کتنے طوفان ہیں جو ان کی منزل کے راستے میں حائل ہیں — بیرونی حملہ آوروں کے علاوہ ملک کے اندر کتنے ابن الوقت، کتنے ضمیر فروش، منافق اور غدار ایسے ہیں جو قوم کے اس بطلِ جلیل کو اپنے راستے کا کانٹا سمجھیں گے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اگر جنوبی ہندوستان کے مسلمانوں نے خودکشی کا ارادہ نہیں کر لیا تو میسور ان کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بن جائے گا۔ وہ سلطان ٹیپو کو اپنا نجات دہندہ سمجھ کر اس کے اشاروں پر جان دینا اپنے لیے باعثِ سعادت خیال کریں گے لیکن اگر ذلت اور رسوائی ان کے لیے مقدر ہو چکی ہے تو انھیں عزت اور سربلندی کا راستہ دکھانا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ ہماری روحوں کو یہ اطمینان ہوگا کہ ہم خدا کی زمین پر اپنا آخری فرض ادا کر چکے ہیں اور جزا و سزا کے مالک کے دربار میں کھڑے ہو کر ہم کسی دن یہ کہہ سکیں گے کہ جب قوم گمراہی کی تاریکیوں میں بھٹک رہی تھی تو ہم نے اسے روشنی دکھلانے کی کوشش کی تھی۔ جب حق و باطل کا معرکہ گرم تھا تو ہم باطل کی بجائے حق کا ساتھ دینے والوں میں تھے اور جب قدرت نے ایک گرتی ہوئی قوم کو سنبھالا دینے کے لیے ایک رجلِ عظیم کو بھیجا تھا تو ہم نے قوم کے دامن سے ذلت اور رسوائی کا داغ دھونے کے لیے اپنا خون پیش کیا تھا۔

رفیقۂ حیات! میں دعا کرتا ہوں کہ صدیق اور مسعود کی طرح انور اور مراد بھی ہمیشہ سلطان ٹیپو کے جانبازوں کی صفِ اول میں نظر آئیں۔ ایک زمانہ وہ تھا جب میں صرف جنگ اور اس کے نتائج کے متعلق سوچ سکتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ جب جنگ میں کسی فوج

کو شکست ہوتی ہے تو اس کے سپاہیوں کا خون رائگاں جاتا ہے لیکن اب یہ حقیقت میرا جزوِ ایمان بن چکی ہے کہ جو مجاہد فتح و شکست سے بے پروا ہو کر کسی ارفع و اعلیٰ مقصد کے لیے جان دیتے ہیں۔ ان کی قربانیاں کبھی رائگاں نہیں جاتیں اور وہ مقاصد جن کے لیے یہ بے لوث قربانیاں دی جاتی ہیں۔ انسانیت کی قیمتی میراث بن کر ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ جب حق و صداقت کے علمبرداروں کا ایک قافلہ گرتا ہے تو قدرت اس کے پرچم اٹھانے کے لیے کسی اور قافلے کو بھیج دیتی ہے۔ میں جب اپنی قوم کے ماضی کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانیت کا جھنڈا سلطان ٹیپو نے اٹھایا ہے، اسے گزشتہ صدیوں میں کئی اولوالعزم انسان بلند کر چکے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے تھے جن کی پکار پر لبیک کہنے کے لیے زندہ اور باحمیت اقوام موجود تھیں اور ان کے مقدر میں کامیابیاں اور کامرانیاں تھیں۔ بعض ایسے بھی تھے جو اپنی اولوالعزمی اور غیر معمولی جرأت اور ہمت کے باوجود مغضوب اقوام کو راہِ راست پر نہ لا سکے اور جن مٹھی بھر سرفروشوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا ان کا مقدس خون قوم کی تاریخ کے روشن صفحات لکھنے کے کام نہ آ سکا۔ جب میں مستقبل کے متعلق سوچتا ہوں تو بھی میرا ضمیر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ہمارا پرچم کبھی سرنگوں نہیں ہوگا۔ اس ملک کے کسی نہ کسی گوشے سے کوئی نہ کوئی اولوالعزم انسان اسے سہارا دیتا رہے گا اور پھر ایک دن ایسا آئے گا جب پوری قوم منظم اور متحد ہو کر اس جھنڈے تلے جمع ہو

جائے گی اور اس کا ہر قدم کامیابیوں اور کامرانیوں کی طرف ہوگا لیکن ان کامیابیوں اور کامرانیوں میں وہ لوگ برابر کے حصّے دار سمجھے جائیں گے جنھوں نے ماضی کے بھیانک طوفانوں میں حق و انسانیت کا یہ پرچم بلند رکھا تھا۔ قیامت کے دن مختلف ادوار میں حق و انسانیت کے لیے قربانیاں دینے والے لوگ ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے اور میری آخری دعا یہ ہے، کہ یوسف، آصف، افضل، میرے اباجان اور صدیق اور مسعود کی طرح انور اور مراد بھی حق پرستوں کی اسی صف میں کھڑے ہوں۔

تمھارا شوہر

جب فرحت خط پڑھنے میں منہمک تھی تو انور اور مراد کمرے میں داخل ہوئے اس کے سامنے کھڑے ہو گئے لیکن اسے اپنے گرد و پیش کا احساس نہ تھا۔ کبھی بھی خط کے الفاظ اور اس کی آنکھوں کے درمیان آنسوؤں کے پردے حائل ہو جاتے وہ آنسو پونچھتی اور دوبارہ خط پڑھنے میں مصروف ہو جاتی۔ خط ختم کرنے کے بعد وہ دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہی۔ بالآخر اس نے گردن اٹھائی اور اپنے بیٹوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تمھارے اباجان مرے نہیں، وہ زندہ ہیں۔ وہ اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اس دنیا میں عزت اور آزادی کا تصور زندہ ہے۔ یہ خط تمھاری میراث ہے اور کوئی باپ اپنی اولاد کے لیے اس سے بہتر میراث نہیں چھوڑ سکتا۔"

ایک ہفتہ بعد انور علی محاذ جنگ کی طرف روانہ ہو چکا تھا اور اس کے بعد مراد علی ہر روز مکتب سے واپس آکر اپنی ماں کو سلطان کی فتوحات کی نئی نئی خبریں سنایا کرتا

تھا۔ "امی جان! بدنور فتح ہو چکا ہے۔ جنرل میتھیوز اور اس کی فوج کو پابہ زنجیر چتل ڈرگ کے قید خانے کی طرف لایا جا رہا ہے — امی جان! آج خبر آئی ہے کہ سلطان کی افواج منگلور کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ آج یہ خبر آئی ہے کہ منگلور کا شہر فتح ہو چکا ہے اور قلعے کا محاصرہ جاری ہے۔" پھر ایک دن وہ بھاگتا ہوا آیا اور بلند آواز میں چلایا۔ "امی جان! منگلور کا قلعہ فتح ہو چکا ہے۔"